جزو نمبر ۱ — جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت:- پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبیؐ عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات، اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بہ روایات صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق و فضائل، اور آداب کے عنوانوں اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے،

قیمت بڑی تقطیع	حجم	قیمت اصلی	قیمت رعایتی	قیمت چھوٹی تقطیع	حجم	قسم اول	قسم دوم
سیرۃ النبیؐ حصہ اول	×	×	×	سیرۃ النبیؐ حصہ اول	۵۶۱	×	للعہ
" " دوم	۳۵۱	سعہ	للعہ	" " دوم	۴۳۸	صہ	سعہ
" " سوم	۵۹۶	للعہ	عہ	" " سوم	۷۹۴	معہ	صہ
" " چہارم	۶۰۶	للعہ	سعہ	" " چہارم	۸۸۸	معہ	عہ
" " پنجم	۳۶۰	للعہ	عہ	" " پنجم	۴۹۳	صہ	سعہ
" " ششم	۶۱۲	صہ	للعہ	" " ششم	۸۴۲	معہ	عہ

جلد ۵۳ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۴ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو اور ہندوستانی کے مقابلہ میں ایک نئی زبان "ہندی ہندستانی" کی پُرفریب اصطلاح سب سے اوّل "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کے اجلاس ناگپور ۱۹۳۶ء میں وضع ہوئی، پھر یہیں "ودیا مندر" کی اُردو کش تعلیمی اسکیم مرتب ہوئی، آج بھی اُردو نوازی میں صوبہ متوسط بہت "نیک نام" ہے، اس لئے یہاں اردو کے بقا وتحفظ کے لئے خدامِ اردو کی خاص توجہ کی ضرورت تھی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب عرصہ سے اس فرض کو انجام دے رہے تھے، اب اس سلسلہ میں کل ہند انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس ۱۹ر۲۰ر۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء کو نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی صدارت میں بڑے اہتمام سے ناگپور میں منعقد ہو رہا ہے اور اس میں اردو زبان وادب کی اشاعت وترقی کے لئے بہت اہم تجاویز پیش ہونگی، توقع ہے کہ یہ اجلاس اردو کی عام نشر واشاعت خصوصاً صوبہ متوسط میں اس کے تحفظ اور ترقی کے مفید عملی نتائج پر مشتمل ہوگا،

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے عربی کے دس دیوان ہیں، اب تک ان کے مکمل چھپنے کی نوبت نہیں آئی عرصہ ہوا حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان میں پہلے سات دیوانوں کا جو سبعہ سیارہ کے نام سے موسوم ہیں انتخاب شائع کیا تھا، آسی پریس نے اس انتخاب کو علحدہ کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا تھا جو شاید اب بھی کتب فروشوں کے یہاں ملتا ہو، آخری تینوں دیوان یعنی آٹھویں نویں اور دسویں کمیاب تھے، مولانا راغب صاحب بدایونی لکچرار شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے ان کو تلاش کرکے حاصل کیا ہے اور ان کو تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے

جن اصحابِ علم کے پاس ان دواوین یا آزاد کی مثنوی مظہر العجائب کا کوئی نسخہ ہو وہ مہربانی کرکے مولانا موصوف کو اس سے مطلع فرمائیں، یہ ایک علمی خدمت ہوگی، دسویں دیوان کے آخر میں آزاد کے قلم سے دسوں دیوانوں کی تصنیف کے مختصر حالات ہیں، مثنوی مظہر البرکات کا ایک عمدہ نسخہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہے،

انجمن عربی صوبہ متحدہ الہ آباد کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مسلمان طلبہ میں عربی زبان کی تعلیم کی ترغیب وتشویق اور ان کی حوصلہ افزائی کا کام عرصہ سے انجام دے رہی ہے، اس سلسلہ میں اس نے گذشتہ سال ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب لکچرار عربی گورنمنٹ کالج لاہور کے انگریزی رسالے "ہم عربی زبان کیوں سیکھیں" (why we learn the Arabic language) کی بہت سی کاپیاں لکھنؤ، الہ آباد اور علی گڈھ کی یونیورسٹیوں کے ایم اے کے طلبہ میں مفت تقسیم کیں، اب وہ ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کے عربی طلبہ میں تقسیم کرنے کے لئے اس کا اردو ترجمہ شائع کرنا چاہتی ہے، کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اس میں کافی مصارف ہوں گے، جس کا تحمل تنہا انجمن مذکور کے لئے دشوار ہے، اس لئے جو اصحاب خیر اس میں مالی مدد دینا چاہیں وہ پروفیسر نعیم الرحمن صاحب نمبر ۲ ایلی روڈ الہ آباد سے خط وکتابت فرمائیں،
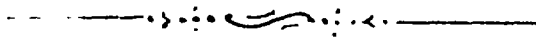
حیدرآباد کے ایک خانگی کتب خانہ میں حافظ ابن قیم جوزی کی جانب منسوب ایک کتاب "احکام اہل الذمہ" دستیاب ہوئی ہے، مصنف کے کل پچاس ساٹھ سال بعد کی لکھی ہوئی ہے، اس کی ضخامت چھ سو صفحات ہے، کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ "دوسرے حصہ میں دلیل خامس سے بیان شروع ہوگا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور بھی حصے ہیں، ابن جوزی کی معلوم کتابوں میں اس کتاب کا نام نہیں ہے اور نہ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کی فہرستوں میں اس کا کوئی ذکر ہے، اگر کسی صاحب

کو بحث و مباحثہ کی ممانعت کردی گئی تھی لیکن ساتھ ہی قرآن کریم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس پر تدبر و فکر کی دعوت بار بار دی گئی ہے، اور جس کے سمجھنے کی انسان کو ضرورت ہے۔۔۔۔ معمولی انسان اوامر و فرائض سے متعلق آیات کو فوراً سمجھ لیتے تھے لیکن بہت سے مضامین ایسے ہوتے تھے، جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھے، اسلئے جب صحابۂ کرام کو کسی آیت کے صحیح مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی، تو وہ خود رسول کریم کی خدمت میں حاضر ہوکر سمجھ لیتے تھے۔۔۔۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی آیات الٰہی کی ضروری تشریح صحابۂ کرام کے سامنے کردیا کرتے تھے"

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ کسی نے تفسیر لکھنے کی کوشش کی، نہ تفسیر کے متعلق زیادہ روایات ہیں۔۔۔۔ وہ تمام تفسیری روایتیں جو صحابۂ کرام کے ذریعہ رسول سے آئیں، کل بیس صفحات پر مشتمل ہیں (ص ۱۴۳)

"خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب اور زید بن ثابت نے بہت سی آیات قرآنی کی تفسیریں روایت کیں لیکن پہلی صدی کے اخیر تک کوئی تفسیر کتابی شکل میں نہیں لکھی گئی (ایضاً)

"عہدِ صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا، اس وقت سب سے پہلے تفسیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اور مسلمانوں کو اس طرف توجہ ہوئی اور انھوں نے احادیث رسول اور تفسیروں کو لکھنے کا ارادہ کیا، (ص ۱۴۴)

"سب سے پہلی تفسیر مجاہد بن جبیر المتوفی ۱۰۳ھ نے لکھی، تاریخ القرآن میں سعید بن جبیر کو پہلا مفسر قرآن بتایا گیا ہے لیکن ابن خلکان کے بیان کے مطابق سب سے پہلی تفسیر اسلام میں ابن جریج نے لکھی، یہ ۸۰ھ میں ایمان لائے، اور ۱۵۰ھ میں وفات پائی، اس زمانہ میں ان کے علاوہ عطاء ابن دینار المتوفی ۱۲۶ھ، مقاتل بن سلیمان المتوفی ۱۵۰ھ، سفیان ثوری المتوفی ۱۶۱ھ اور دیگر چند علماء نے تفاسیر میں کتب کی تصنیف کا آغاز کیا، لیکن تیسری صدی کے آخر تک پورے قرآن کی

تفسیر کا ثبوت نہیں ملتا، ہارون رشید کے زمانہ میں جب جعفر برمکی نے کاغذ کو رائج کیا، تو کتابت کا شوق بڑھا، اس زمانہ مین پورے قرآن کی تفسیرین بھی لکھی گئین، (ص ۱۴۴)

"اسلام کے دور اول یعنی خلافت راشدہ کے ختم ہونے تک رومی اور عجمی عقائد کی زہر یلی ہوائین اس کے مضبوط حصار مین داخل نہ ہونے پائی تھین ...... لیکن جب خلافت کو سلطنت کا جامہ پہنا دیا گیا، اور خلفاء کے بجاے ملوک و سلاطین مسلط ہوئے جنھون نے حکومت کو اپنے خاندان مین محفوظ رکھنے کے لئے خود قرآن کریم کے مستقر اول یعنی مکہ اور مدینہ دونون بلاد امنا کو میدان کارزار و فتنہ و فساد بنا ڈالا، اور اسلام اپنے وطن سے بیگانہ سا ہوگیا تو رومی اور عجمی عقائد کی طوفان خیز ہواؤن کو کون روک سکتا تھا، جب چمن کا باغبان غافل ہو تو گلچین کے دست برد سے اس کو کون محفوظ رکھ سکتا ہے؟ جب عرب کے یہود و نصاری اور ایران کے مجوسیون نے اسلام مین داخل ہونا شروع کیا تو یہ سب اپنے آبا و اجداد کے مذہبی تخیلات قدیم و پارینہ روایات اپنے ساتھ لے کر آئے، ادھر کوئی طاقت ان کو روکنے یا اصلاح کرنے والی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان قصص و روایات اور اسرائیلیات و خرافات کا ایک بے پناہ سیلاب اسلام مین داخل ہوگیا، اور اس کے سیدھے سادے اور فطری اصول و عقائد کے صاف و شفاف چشمون کو اپنے ساتھ لائی ہوئی گندگیون مین آلودہ کر دیا، (ص ۱۴۶)

"تکوین عالم تخلیق آدم اور گذشتہ انبیا کے واقعات و قصص جب مسلمانون کے سامنے قرآن مجید مین آئے تو انھون نے ان کو یہودی علماء سے دریافت کرنا شروع کر دیا، کیونکہ ان تمام چیزون کا ذکر ان کی کتابون میں آچکا تھا، (صفحہ ۱۴۷)

مصنف کا یہ بیان اگرچہ انفرادی واقعات کی حیثیت سے ایک حد تک صحیح ہے لیکن اغلاط سے پاک نہین، اور اس مین واقعات کا صرف ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے، خصوصًا جس نہج اور ترتیب سے اس کو پیش کیا گیا ہے، اور اس سے جو نتائج نکلتے ہین، وہ سراسر غلط ہین، اس بیان کے پڑھنے سے یہ اثر پڑتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ

تفسیر قرآن کا زیادہ اہتمام نہ تھا، کلام اللہ کا بڑا حصہ صحابہ خود سمجھ لیتے تھے جو نہ سمجھ سکتے تھے، اس کو آنحضرت صلعم سے پوچھ لیا کرتے تھے، یا آپ خود اس کی تشریح فرما دیا کرتے تھے، اسی لئے نہ صحابہ سے تفسیر کی زیادہ روایتیں ہیں اور نہ انھوں نے تفسیر لکھنے کی طرف توجہ کی، سب سے اول تابعین کو ادھر توجہ ہوئی لیکن انھوں نے پورے قرآن کی تفسیر نہیں لکھی، اس کا آغاز چوتھی صدی میں ہوا، اس وقت یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے خیالات و روایات مسلمانوں میں پھیل چکے تھے، جو تفسیروں میں داخل ہو گئے تھے اسلئے یہ تفسیریں لائق اعتماد نہیں،

ان میں سے ایک نتیجہ بھی صحیح نہیں، مصنف کو اتنا تو تسلیم ہی ہوگا، کہ قرآن مجید ہی اسلام کی بنیاد اور مسلمانوں کی دینی اور دنیوی صلاح و فلاح کا واحد صحیفہ ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی تبلیغ کے لئے مبعوث ہوئے تھے، اس لئے آپ کا سب سے مقدم فرض اس کی وضاحت و تشریح اور مسلمانوں میں اسکی تعلیم کی اشاعت تھا، اس لئے اس کی تعلیم کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی مصنف کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے، کہ صحابہ خود قرآن کو سمجھ لیتے تھے، اور جہاں کوئی مشکل پیش آتی تھی، اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے تھے، یا آپ خود اس کی تشریح فرما دیتے تھے اور اسی پر قرآن کی تعلیم و تشریح ختم ہو جاتی تھی، اس کے برخلاف عہد نبوی عہد صحابہ، عہد تابعین ہر دور میں کلام مجید کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا، جن صحابہ میں تعلیم و تعلم کی صلاحیت تھی، انکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس خصوصیت کے ساتھ قرآن کی تعلیم دیتے تھے، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب اور بعض دوسرے صحابہ کو آپ نے خاص طور سے خود قرآن کی تعلیم دی تھی حضرت ابی بن کعبؓ نے پورے قرآن کی تعلیم خود زبان مبارک سے پائی تھی[1] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آپ سے ستر سورتیں سیکھی تھیں،[2]

حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے بھی قرآن کی تعلیم براہ راست زبان وحی والہام سے حاصل کی تھی، گو عہد نبوی میں حضرت ابن عباسؓ کم سن اور حضرت ابن عمرؓ نوجوان تھے لیکن ان دونوں میں فہم قرآن کی فطری صلاحیت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۱۳ [2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۴۸،

کے لئے دعا فرمائی تھی کہ خدایا ان کو دین میں سمجھ اور تاویل قرآن کا علم عطا فرما[1] اس دعائے مستجاب کے اثر اور اپنے شوق و محنت سے وہ جماعت صحابہ میں قرآن کے اتنے بڑے عالم بن گئے تھے، کہ ترجمان القرآن لقب ملا تھا، عبد اللہ بن عمر میں فہم قرآن کا ایسا ملکہ تھا کہ گو وہ نوجوان تھے لیکن اکابر صحابہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، اور اس مجمع میں ان کے فہم قرآن کے جوہر نمایاں نظر آتے تھے[2]،

اس انفرادی طریقہ تعلیم کے علاوہ تعلیم قرآن کے اجتماعی حلقے بھی تھے[3] جن میں صحابہ کرام باہم مذاکرہ کرتے تھے ان میں کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوتے تھے، صفہ کی درسگاہ میں دو حلقے تھے، ایک اصحاب ذکر و فکر کا، دوسرا قراء کا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لاتے، تو قراء کے حلقہ میں بیٹھتے، اور فرماتے کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں[4] اس درس گاہ میں حافظ قرآن صحابہ تعلیم دیتے تھے، ان میں ایک حضرت عبادہ بن صامت تھے[5] جن لوگوں کو کاروبار کی مشغولیت کی وجہ سے دن کو تعلیم کا موقع نہ ملتا تھا، ان کے لئے رات کی تعلیم کا انتظام تھا، چنانچہ بعض اصحاب صفہ رات کو قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے[6]،

جو جدید الاسلام اشخاص اور قبائل مدینہ سے دور رہتے تھے، اور ان کو مدینہ آنے کا کم موقع ملتا تھا، ان کی تعلیم انصار کے سپرد تھی، وفد عبد القیس کا بیان ہے، کہ انصار ہم کو ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دیتے تھے[7] اس قسم کے جدید الاسلام قبائل کی تعلیم کے اور بہت سے واقعات حدیث و سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں،

جو اشخاص یا قبائل کسی معذوری کی بنا پر مدینہ نہیں آسکتے تھے یا بقدر ضرورت یہاں قیام نہیں کرسکتے تھے، ان کی تعلیم کبھی وہاں کے مسلمان عمال کے سپرد کر دی جاتی تھی، اور کبھی مستقل معلم بھیجے جاتے تھے، چنانچہ یمن کے مسلمانوں کی قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم حضرت معاذ بن جبلؓ کے متعلق تھی، جو وہاں کے قاضی تھے[8] ہجرت سے

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۵۳۴ [2] بخاری کتاب التفسیر سورہ ابراہیم و کتاب العلم باب الفہم [3] ابوداؤد فضل العلم والحث علی العلم [4] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۲۴ [5] ایضاً [6] اسد الغابہ ج ۴ ص ۳ [7] استیعاب تذکرہ معاذ بن جبل

پہلے جب مدینہ کے چند انصاری گھرانوں نے اسلام قبول کیا، تو ان کی تعلیم قرآن کے لئے حضرت مصعب بن عمیرؓ اور ابن ام مکتومؓ بھیجے گئے،[۱] تعلیم قرآن سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے، کہ وہ محض ناظرہ اور حفظ قرآن تک محدود تھی، بلکہ حسب ضرورت قرأۃ اور قرآن کی تفسیر و تشریح ہر طرح کی تعلیم ہوتی تھی، بعض لوگ محض قرأۃ یا احکام کی آیات سیکھتے تھے، بعض پوری تکمیل کرتے تھے، حضرت ابی بن کعبؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم کو دس آیتیں پڑھاتے تھے، تو اس وقت تک ہم آگے نہ بڑھتے تھے جب تک ان پر عمل نہ سیکھ لیتے تھے،[۲] ابن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے کہ جب ہم میں سے کوئی شخص دس آیتیں سیکھ لیتا تھا، تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتا تھا جب تک ان کے معنی اور ان پر عمل نہ سیکھ لیتا تھا،[۳]

تابعین کے زمانہ میں بھی تعلیم کا یہی انداز تھا، ابو عبد الرحمن سلمی تابعی کا بیان ہے کہ جب ہم قرآن کی دس آیتیں سیکھ لیتے تھے، تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے جب تک ان کے حلال و حرام اور امر و نہی سے پوری طرح واقف نہ ہو جاتے،[۴]

مشہور مفسر تابعی مجاہد بن جبیر نے ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے کامل تیس مرتبہ قرآن کا دورہ کیا تھا، اور اس محنت کے ساتھ کہ ہر سورۃ کے جملہ متعلقات کی پوری تحقیق کرتے جاتے تھے،[۵]

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اپنے محبوب غلام اور نامور تابعی عالم عکرمہ کو اس توجہ اور انہماک سے تعلیم دی تھی کہ اپنا سارا علم ان کے سینہ میں منتقل کر دیا تھا، ان کے فیض سے عکرمہ جماعت تابعین میں بڑے نامور عالم ہوئے، خصوصاً تفسیر میں ابن عباسؓ کے تمام تلامذہ میں وہ ممتاز تھے،[۶]

حفاظ قرآن صحابہ خصوصاً حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے فیض سے تابعین میں بڑے بڑے مفسر پیدا ہوئے ان میں سعید بن جبیر، ضحاک بن مزاحم، عطا بن رباح، حسن بصری اور محمد بن کعب قرظی خاص طور سے قابل ذکر ہیں

۱؎ بخاری کتاب التفسیر ۲؎ تفسیر قرطبی ج اول ص ۳۳ ۳؎ ابن جریر ج اول ص ۲۹ ۴؎ تفسیر قرطبی ج اول ص ۳۴ ۵؎ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳ ۶؎ ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۲ و تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۶۵،

ان میں سے ہر ایک امام تفسیر تھا، سعید بن جبیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد رشید تھے، قرأت اور تفسیر دونوں کی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی، اور جماعت مفسرین میں امام وقت شمار ہوتے تھے[1] عطا بن رباح نے ابن عباسؓ کے علاوہ اور بزرگوں سے بھی استفادہ کیا تھا، یہ بھی جلیل القدر عالم اور مفسر قرآن تھے، تفسیر کا درس بھی دیتے تھے[2] حضرت حسن بصری علم باطن کے ساتھ علم ظاہر کے بھی جلیل القدر عالم تھے، تفسیر میں خاص ملکہ تھا، اور اس کا درس بھی دیتے تھے[3] محمد بن کعب قرظی بھی نامور عالم قرآن تھے[4] یہ تو صحابۂ کرام اور تابعین کے انفرادی حلقہائے درس کا حال تھا، حکومت کی جانب سے علٰحدہ قرآن کی تعلیم کا نہایت مکمل انتظام تھا، حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ممالک میں قرآن کے مدارس قائم کئے، اور قرآ صحابہ کو ان میں تعلیم کے لئے بھیجا، حضرت عبادہ بن صامت معاذ بن جبل اور ابودرداء انصاری کو شام بھیجا، حضرت عبادہؓ نے حمص میں قیام کیا، ابودرداءؓ نے دمشق کو مستقر بنایا، معاذ بن جبل نے فلسطین میں اقامت اختیار کی، پھر عبادہؓ بھی اسی ارض مقدس میں چلے آئے[5] عمران بن حصین قرآن اور فقہ کی تعلیم کے لئے بصرہ بھیجے گئے[6] ایک قاری ابوسفیان کو بدوؤں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا، وہ قبائل کا دورہ کرکے ہر شخص کا امتحان لیتے تھے، جس کو قرآن یاد نہ ہوتا تھا اس کو سزا دیتے تھے[7] سورۂ بقرہ، مائدہ، حج اور نور کا جن میں احکام و فرائض ہیں، ہر شخص کے لئے سیکھنا ضروری قرار دیا[8] اس سے ظاہر ہے کہ اس میں تفسیر بھی شامل تھی۔

قرآن کے معنی اور مفہوم کو صحیح سمجھنے کے لئے لغت اور کلام عرب کی تعلیم کی ہدایت کی۔ غیر عالم لغت کو قرآن کی تعلیم دینے کی ممانعت کر دی[9]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لیکر تابعین کے زمانہ تک کے تعلیم قرآن کے نظام کا یہ سرسری خاکہ ہے، اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان زمانوں میں قرآن کی تعلیم کی کتنی اہمیت تھی اور اس کا کتنا اہتمام تھا،

---

[1] ابن خلکان ج اول ص ۲۰۴ و ۲۰۵ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ [3] شذرات الذہب ج اول ص ۱۳۶ و تہذیب تذکرہ جابر بن زید [4] تہذیب جلد ۹ ص ۴۲۱ [5] اسد الغابۃ تذکرہ عبادہ بن صامت [6] فتوح البلدان بلاذری ص ۳۵۶ [7] اصابۃ تذکرہ اوس بن خالد [8] کنز العمال ج اول ص ۲۲۴ [9] کنز العمال،

مصنف کے بیان کے مطابق محض اسی پر بس نہین تھا، کہ "احکام و فرائض و محکمات خود صحابہ سمجھ لیتے تھے، اور جب کسی صحابی کو کسی آیت کا صحیح مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے یا آپ خود ضروری تشریح فرما دیتے" اگر مصنف کا بیان صرف اسی حد تک ہوتا تو بھی ہم کو اس کے ماننے مین تامل نہ ہوتا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس دور مین تعلیم و تفسیر قرآن کا اہتمام نہ تھا" اسی لئے حیات نبوی میں نہ کسی نے تفسیر لکھنے کی کوشش کی، اور نہ تفسیر کے متعلق صحابہ کی زیادہ روایات ہین، بلکہ ان کی پوری تعداد بیس سے زیادہ نہین بڑھتی" کس قدر غلط ہے،

بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین کوئی تفسیر نہین لکھی گئی لیکن اس بنا پر نہین کہ اس کی کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی مین تفسیر لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، صاحب وحی و الہام ان کے درمیان خود موجود تھے، پھر عہد صحابہ مین اکابر صحابہ خود عالم قرآن تھے، اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی، کہ اس زمانہ مین کسی علم و فن کو قلمبند کرنے کا رواج ہی نہ تھا، اور اس کا خزانہ علماء کا سینہ ہوتا تھا، عرب جاہلی کا سارا کلام محض سینون مین محفوظ تھا، تعلیم و اشاعت کا طریقہ زبانی درس و روایت تھا، بنی امیہ کے زمانہ تک یہی طریقہ رائج رہا، اگرچہ تاریخون مین اس عہد کی بعض تالیفات کا ذکر ہے لیکن وہ نہ ہونے کے برابر ہین، تصنیف و تالیف کا باقاعدہ آغاز عباسی دور سے ہوا، لیکن تحریری یادداشتون کا طریقہ عہد نبوی مین بھی تھا، چنانچہ متعدد صحابہ حدیث کے متعلق یادداشتین قلمبند کرتے تھے، حضرت ابی ابن کعبؓ کی تو ایک تفسیری کتاب کا بھی ثبوت ملتا ہے، شیخ محمد خضری قسیاطی لکھتے ہین، کہ ابی بن کعبؓ کا ایک بڑا تفسیری نسخہ موجود تھا جس سے ابن جریر، ابن ابی حاتم، احمد بن حنبل اور حاکم نے اپنی کتابون مین فائدہ اٹھایا ہے[۱]، تابعین مین مجاہد بن جبیر اور سعید بن جبیر تبع تابعین مین ابن جریج کے متعلق خود مصنف کو اعتراف ہے، کہ انھون نے تفسیرین لکھیں، گو وہ ان کے نزدیک پورے قرآن کی تفسیر نہ تھیں تاہم اس سے کم از کم اتنا ثابت ہے، کہ گو اس زمانہ مین تفسیر پر موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے مستقل کتابین نہ لکھی گئی ہون

---

[۱] مبادی التفسیر صفحہ ۱۱

لیکن ان کے متعلق تحریری سرمایہ فراہم ہوگیا تھا، مصنف کا یہ بیان کس درجہ مضحکہ خیز ہے کہ صحابہ سے تفسیری سو آیتیں بہت کم مروی ہیں، اوران کی تعداد بیس صفحوں سے زیادہ نہیں" لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ اعتراف بھی ہے کہ "خلفاے راشدین، حضرت عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب اور زید بن ثابت نے بہت سی آیاتِ قرآنی کی تفسیریں روایت کیں" کیا سات صحابۂ کرام کی "بہت سی تفسیری روایات مل کر بھی بیس صفحوں سے زیادہ نہ ہوں گی، اگر تنہا ابن عباسؓ ہی کی روایات لے لیجائیں تو بھی ایک پوری کتاب تیار ہو جائے، مصنف نے ایک موقع پر ابن جریر کی بڑی تعریف کی ہے، لکھتے ہیں:۔

"ابن جریر کی تفسیر کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس کو امام التفسیر کہا جاتا ہے، اور بعض علما کا قول اس تفسیر کے متعلق یہ ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر تفسیر طبری (ابن جریر) کو حاصل کرنے کے لئے کیا تو بھی کوئی زحمت نہیں اٹھائی، اس تفسیر میں سب سے پہلے ذہنی کاوش اور دماغی کوشش سے کام لیا گیا ہے اور اس وقت تک جتنے علوم قرآن کی تفسیر کے متعلق جمع ہو چکے تھے، اس میں ان سب کو جمع کر دیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ہر روایت کی سند بھی دے دی گئی ہے"۔

یہ کتاب تیس جلدوں میں ہے، اور اس میں تمام تر روایات ہی روایات ہیں، لیکن ان روایات میں صحابۂ کرام کی مستند روایات کا بھی معتد بہ حصہ ہے، اس کے بعد یہ کہنا کہ صحابۂ کرام کی روایات بیس صفحوں سے زیادہ نہیں کس درجہ حیرت انگیز ہے،

مصنف کا یہ بیان تشریح طلب ہے کہ "تابعین نے پورے قرآن کی تفسیر نہیں لکھی" اگر اس سے ان کی یہ مراد ہے کہ موجودہ کتابوں کے طرز پر پورے قرآن کی مرتب تفسیر نہیں لکھی، تو یہ صحیح ہے، اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا، کہ اس زمانہ میں کتابوں کے لکھنے کا طریقہ نہ تھا، اور اگر یہ مراد ہے کہ قرآنی مشکلات کا حل باقی رہ گیا جس کو بعد کے مصنفین نے اپنی ذہانت سے گڑھا، تو یہ غلط ہے، تمام مشکلات قرآنی کا حل خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول اور صحابۂ کرام سے مروی ہے، جو حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں محفوظ ہے، یہ اور بات ہے کہ بعد کے علماء

مصنفین نے اپنے علم و نظر اور اپنے اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق اس مین اور اضافے کئے، صرف ابن جریر کی روایات اس کے ثبوت کے لئے کافی ہین، کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ مین کلام مجید کی کسی حل طلب آیۃ کی تشریح باقی نہ رہ گئی تھی، گو وہ بعد مین کتابی صورت مین مدون ہوئی، اس لئے تفسیرون کے بعد مین مدون ہونے سے کلام مجید کی صحت تفسیر پر اثر نہین پڑ سکتا،

یہ بھی واضح رہے کہ کلام مجید کی ہر آیۃ کی تفسیر تو کسی بڑی سے بڑی تفسیر مین بھی نہین، بہت سی آیات اتنی ظاہر و واضح ہین، کہ ان کی تفسیر کی ضرورت ہی نہ تھی، بعض اہم مشکلات کی متفقاً تمام مفسرین نے تفسیر کی ہے، بعض ایسی ہین جن کی تفسیر بعض مفسرین کے نزدیک ضروری تھی، بعض کے نزدیک غیر ضروری، اس کی مثال بلا تشبیہ دنیاوی کتابون کی شرح سے دیجا سکتی ہے کہ ایک کتاب کی مختلف شرحین لکھی جاتی ہین، جامعیت کے اعتبار سے ممکن ہے ایک شرح دوسری سے بہتر ہو، لیکن پوری کتاب کی شرحین سب کہلائین گی، اس لئے دیکھنا صرف یہ چاہئے کہ مجموعی حیثیت سے تمام حل طلب آیات کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی زبانی منقول ہے یا نہیں، اگر ہے تو پورے قرآن کی تفسیر کے لئے اتنا کافی ہے، یہ ضروری نہیں کہ مرتب طریقہ سے کسی ایک کتاب مین مدون یا کسی ایک صحابی یا ایک تابعی سے منقول ہو، یہ واضح رہے کہ صحابہ کی جن تفسیری روایات مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کی تصریح نہیں ہے، وہ بھی درحقیقت آپ ہی سے سُنی ہوئی ہین، یا کم از کم صحابۂ کرام کے فہم قرآن کا نتیجہ ہین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم کا فیض ہے،

یہ انکشاف بالکل نیا ہے، کہ ہارون رشید کے زمانہ مین جب جعفر نے کاغذ کو رائج کیا، اس وقت کتابت کا شوق بڑھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کاغذ رائج نہ ہوا تھا، ممکن ہے آغاز اسلام مین عرب مین اسکا استعمال نہ ہوتا ہو، لیکن عہد نبوی کے آخر مین تو رائج ہو چکا تھا، بخاری کی حدیث قرطاس تو بہت مشہور ہے، مصنف کو یہ تو سوچنا چاہئے تھا، کہ خلفاء راشدین اور بنی امیہ کے زمانہ مین اتنی بڑی سلطنت کا دفتری کاروبار کیا صرف اونٹ کی ہڈیون اور کھجور کے پتون سے چلتا تھا، حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ مین باقاعدہ رجسٹر تیار ہو گئے تھے، لیکن مصنف کو

عقل و درایت سے کیا سروکار انھین تو محض اعتراض چاہئے، خواہ وہ کتنا ہی بے سروپا کیون نہ ہو،

یہ تسلیم ہے کہ ملوک و سلاطین کے زمانہ مین اسلام کے حصار مین رومی و عجمی عقائد کی طوفان خیز آندھیان آئین اس سے بھی انکار نہین کہ عرب کے یہود و نصاری اور ایران کے مجوسی اپنے آبا و اجداد کے مذہبی تخیلات اور پارینہ روایات اپنے ساتھ لائے، اوران کے قصص و روایات و اسرائیلیات و خرافات کا بے پناہ سیلاب اسلام مین آگھسا، لیکن یہ غلط ہے کہ اس کا سبب ملوکیت تھی، اور اس کا کوئی روکنے والا نہ تھا، اوران بیرونی اثرات کی آمیزش کی وجہ سے حدیث و تفسیر کا سارا دفتر بے کار ہوگیا، ملوکیت کو اس سے کوئی تعلق نہین، بلکہ جیسا کہ ہم نے کسی مقام پر کہا ہے، یہ مختلف قومون اور مذہبون کے باہمی اختلاط کا فطری نتیجہ تھا، جس کے ابتدائی اثرات خلافتِ راشدہ ہی کے زمانہ سے شروع ہوگئے تھے، لیکن اس کا پورا ظہور اموی اور عباسی عہد مین ہوا، جس کو حکومت اور اسلام کے اصلی محافظین یعنی صحابہ تابعین اور علماء و محدثین نے روکنے کی پوری کوشش کی،

مصنف کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام نے اپنی اور مسلمانون کی حفاظت کی ذمہ داری تنہا حکومت پر کبھی نہین رکھی ہے، بلکہ یہ فرض علیٰ قدر مراتب تمام مسلمانون پر عائد کیا ہے، اور اس کے سب سے بڑے ذمہ دار حاملین قرآن و حدیث ہین، اور الحمدللہ کہ مسلمانون مین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والی جماعت ہر دور مین موجود رہی ہے، خود خلفاے راشدین کے زمانہ مین بھی جنھون نے اسلام کی حفاظت کا پورا حق ادا کیا، یہ جماعت اپنے فریضہ سے غافل نہ رہی اور حکومت سے الگ صحابہ خود اپنے طور پر بھی اس فرض کو انجام دیتے رہے، خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے دور مین بھی جب اموی اور عباسی سلاطین نے بعض امور مین غفلت اور مسامحت سے کام لیا، تو اسلام لاوارث نہین ہوگیا تھا بلکہ یہ جماعت برابر اپنا فرض انجام دیتی رہی، درحقیقت اسلام کے اصلی محافظ یہی لوگ تھے، جو ہر زمانہ مین موجود اور اپنے فرض کو ہمیشہ انجام دیتے رہے، حتی کہ حکومت کے مقابلہ مین بھی ان کی حق گو زبانین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے خاموش نہ رہین، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس لئے بعض امور مین گو ملوک و سلاطین نے غفلت ضرور کی، لیکن اس کی وجہ سے اسلام کی حفاظت

مین فرق نہین آنے پایا،

اس سے انکار نہین کہ تفسیرون بلکہ حدیثون تک مین اسرائیلی روایات داخل ہوگئین لیکن اس زہر کا تریاق بھی مہیا ہوتا رہا، اور ہر دور کے محدثین اس آمیزش کو برابر چھانٹتے رہے، اسی کی پرکھ کے لئے رجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا، جس مین ہزارون رواۃ حدیث کے صحیح حالات مندرج ہین، فن روایت و درایت کے اصول بنائے، موضوعات پر کتابین لکھین، غرض کلام نبی کو دوسرے کلام کی آمیزش سے پاک رکھنے کے لئے طاقت بشری مین جتنی کوششین اور احتیاطین ممکن تھیں صرف کر دین، اور ایک ایک باطل حدیث کو چھانٹ کر الگ کر دیا، احادیث و تفسیر پر جن لوگون کی نظر ہے، وہ ایک نگاہ مین اسرائیلیات کو پہچان سکتے ہین، بلکہ اسرائیلیات کا موضوع اور اس کا دائرہ تو اتنا معلوم اور متعین ہے، کہ جس کو تھوڑا سا بھی اسلامی علوم مین درک ہے، وہ بہ یک نظر ان کو پہچان لے گا، پھر یہ کہ ان اسرائیلیات کا تعلق اسلام کے ارکان و عقائد سے مطلق نہین ہے، بلکہ وہ صرف گذشتہ انبیاء و رسل اور ان کی امتون یا دنیا کی قدیم تاریخ ترغیب و ترہیب یا دوسرے قصص و حکایات پر مشتمل ہین، اور ان مین کسی چیز کو بھی اسلامی ارکان و عقائد سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اس لئے اسرائیلیات کی آمیزش سے اسلام کی حقیقی تعلیمات پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ اصلی تعلیمات مین بھی اسرائیلیات داخل ہوگئین تو ان کو الگ کرنے کی تدبیرین اور صورتین اختیار کیجائین گی، یا ان کی وجہ سے مذہب کا پورا دفتر بیکار کر دیا جائے گا، اور اسرائیلیات کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثین اور روایتین بھی مسترد کر دیجائین گی، سچ میں جھوٹ کی آمیزش تو زندگی کے روزانہ کے واقعات مین ناگزیر چیز ہے جس سے کسی حالت میں مفر ممکن نہیں، مقدمات میں جھوٹ کی آمیزش تو روزانہ کا مشاہدہ ہے، لیکن کیا اس آمیزش کی وجہ سے سچائی کی تحقیق کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، اور ایک حاکم محض جھوٹ کی آمیزش کی وجہ سے سچی شہادتون اور سچے واقعات کو بھی مسترد کر دیتا ہے، اور سچائی کی تلاش و تحقیق سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے، جھوٹی روایات میں سچائی اور اصلیت کی تلاش و تحقیق تو اس کا فرض ہے، اگر جھوٹ کی وجہ سے سچ کو بھی ناقابلِ اعتبار قرار دیا جائے، اور سچائی کی تلاش چھوڑ دیجائے، تو زندگی کا سارا کاروبار ہی معطل ہو جائے، جب دنیاوی امور

مین جھوٹ کے خاطر سچ کو ترک نہین کیا جا سکتا، تو کیا محض اسرائیلیات یا جھوٹی روایات کی وجہ سے قول رسول کو مسترد کر دیا جائے گا،

اس کے بعد اسلامی عقائد اور تفسیرون مین ایرانی و یونانی خیالات و عقائد کی آمیزش کے سلسلہ مین ارشاد ہوتا ہے:

"یہود و نصاریٰ کے خرافات سے بھی زیادہ جس چیز نے اسلامی عقائد کو متاثر کیا، وہ ایران و یونان کا فلسفۂ قدیم تھا، جب ان ممالک کے علما، و حکما اسلام مین داخل ہونے لگے، تو ایران سے زردشت مزدک اور مانی کے خیالات اور یونان سے افلاطون، ارسطو اور دوسرے حکما، کی تعلیمات نے مفسرین اسلام کو اس قدر متاثر کیا، کہ انھون نے ان حکما، کے غیر الہامی اور انسانی دماغ کے بنائے ہوئے مسائل کو مسلمات سمجھکر اختیار کر لیا، اور تمام تفاسیر مین دور از کار بحثین اور غیر مفید الجھنین شامل ہو گئیں، مثلاً برق، رعد، سما، وغیرہ قرآن مجید مین خود اپنے مستقل معنی رکھتے تھے، مگر جب یونانی علم الاصنام کی اصطلاحات کا ترجمہ اس قسم کے الفاظ مین کیا گیا، تو وہی مطالب تفسیرون مین شامل کر لئے گئے جو طبیعات یونانی مین مستعمل تھے، متکلمین نے اسلامی عقائد و خیالات کو ارسطو کی کسوٹی پر رکھکر ان سے مطابقت دینے کو بڑی خدمت سمجھا، یہی وجہ ہے کہ چوتھی صدی سے آج تک بے شمار تفسیرین اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیون سے بھری پڑی ہین، انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے، کہ وہ اپنے وقت کے رجحانات کے سامنے سپر ڈالدیتا ہے اور اپنے ماحول کا شکار ہو جاتا ہے،...... وقت کے غلط تخیلات سے اثر پذیر ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر تفسیرین مفسرین کے ذاتی رجحانات کا شکار ہو گئین، متکلمین نے اپنی تفاسیر مین منطق، فلسفہ اور خطابت کا تمام زور صرف کر دیا، جو صرف و نحو اور بلاغت مین ید طولیٰ رکھتے تھے، انھون نے فنی زاویۂ نظر سے بحثون کے دروازے کھول دیئے، جو علم تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے، انھون نے قصص و امثال ہی کو اصل قرآن سمجھکر پوری قوت ان کی تشریحات مین صرف کر دی، جو فروعات فقہ مین ماہر تھے، ان کی تفاسیر مسائل فقہ پر ملین گی، پھر جب فقہ اور فلسفہ کی بناپر مختلف مذہب قائم ہو گئے، تو ہر ایک مذہب نے اپنے اپنے عقائد

کے مطابق تفسیریں شروع کردیں، معتزلہ اور اشعریہ نے ایک دوسرے کی ضد میں صفات و ذات الٰہی کی بحثوں میں بے شمار کتب تفسیر مدوّن کیں، تو صوفیہ نے عزلت نشینی تزکیۂ قلب اور جہاد بالنفس کا رنگ بھر دیا (ص ۱۴۹ و ۱۵۰)

لائق مصنف نے اس بیان میں مختلف النوع مسائل کو خلط ملط کردیا ہے، اور تفسیر کی بحث میں کلام کے مسائل چھیڑ دیئے، ان مسائل پر آئندہ مستقل گفتگو ہوگی، اس لئے اس موقع پر ہم اس کی تفصیل میں نہیں پڑتے، مصنف کے اس بیان میں بھی چند در چند غلطیاں ہیں، یہ تسلیم ہے کہ یونانی فلسفہ نے بعض اسلامی عقائد کو متاثر کیا، اور اس کی بنا پر مسلمانوں میں مختلف فرقے پیدا ہوگئے، لیکن ایران کا اثر محض تمدن و معاشرت تک محدود رہا، اسلامی عقائد پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا، کسی اسلامی عقیدہ میں زردشت، مزدک اور مانی کے خیالات کا اثر نہیں مل سکتا، فرق کی کتابوں میں بعض ایسے عجمی فرقوں کا حال ضرور ملتا ہے جنھوں نے زردشتی، مزدکی، مانوی اور اسلامی عقائد کا ایک معجون مرکب تیار کیا لیکن ان کو کسی زمانہ میں بھی مسلمان نہیں سمجھا گیا، اور نہ صرف محدثین بلکہ حکما تک نے انھیں مسلمان نہیں مانا، اور تفسیروں میں تو زردشتی، مزدکی یا مانوی اثرات کا کوئی خفیف پرتو بھی نہیں مل سکتا، یونانی فلسفہ کے اثرات بھی جن سے مسلمان زیادہ متاثر ہوئے محض ذات و صفات الٰہی کے چند مسائل تک محدود ہیں، تفسیروں سے ان کا بھی کوئی تعلق نہیں، بعض تفسیروں میں تردیداً ضرور یہ خیالات نقل کئے گئے ہیں، جس کو قبول اثر سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، نیز یہ مصنف کا محض زور بیان ہے، کہ "مفسرین نے یونانی حکما کے غیر الہامی خیالات کو مسلمات سمجھ کر اختیار کرلیا، اور تمام تفسیروں میں دوراز کار بحثیں شامل کردیں، اور چوتھی صدی سے آج تک بے شمار تفسیریں اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں سے بھری پڑی ہیں" جو سراسر غلط ہے، نہ مفسرین نے ان خیالات کو کبھی قبول کیا، اور نہ تفسیروں میں ان کو جگہ دی، بعض متکلمانہ تفسیروں میں تردید کے لئے البتہ یہ خیالات نقل کئے گئے ہیں، جن کو ان کے قبول سے تعبیر کرنا غلط ہے، کاش مصنف نے ان بے شمار تفسیروں میں چند ہی کا نام لے لیا ہوتا،

فلسفۂ یونان سے مسلمانوں اور اسلامی عقائد کے اثر پذیر ہونے کا جملہ جسے راقم الحروف نے بھی

جا بجا استعمال کیا ہے، تشریح طلب ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانون کی ساری قوم اور ان کے تمام عقائد اس سے متاثر ہو گئے، بلکہ اہل علم کی ایک جماعت اور بعض عقائد پر اس کا اثر پڑا تھا، جو لوگ فلسفہ یونان سے زیادہ متاثر ہوئے وہ حکماء کہلائے، مگر ان کو کسی زمانہ مین بھی مذہب کا ترجمان، اسلام کا نمائندہ اور مسلمانون کا رہنما نہین سمجھا گیا، بلکہ وہ ہمیشہ اس مقدس دائرہ سے الگ رکھے گئے، اسلام کے اصلی ترجمان اور اس کے محافظ اور مسلمانون کے ہادی و رہنما محدثین کرام تھے، جو ہمیشہ مسلمان حکما کے خیالات کی تردید اور اس سے تبری کرتے رہے، اور اسلام کے صاف و شفاف چشمے کو اس کی کدورتون سے پاک رکھنے کی پوری کوشش کی، اکابر حکما رمین کندی فارابی، ابن سینا، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن ہثیم ابن مسکویہ، کسی کو یہ منصب حاصل نہ ہوا، اور نہ ان مین سے کسی نے تفسیر لکھی، بلکہ قاضی ابن رشد تک کو جو جلیل القدر عالم دین بھی تھے محض فلسفہ کے داغ کی وجہ سے کبھی دین کی ترجمانی کا منصب نہ ملا،

لیکن اس سے انکار نہین کیا جا سکتا، کہ اہل علم کی ایک جماعت فلسفہ یونان سے متاثر تھی، اور اوس کے اثر سے مسلمانون کے ایک طبقہ مین یہ خیالات پھیل رہے تھے، ٹھیک اسی طرح جس طرح آج مغربی علوم و فنون کے اثرات پھیل رہے ہین، ایسی صورت مین علما یا خاموش بیٹھے رہتے اور مسلمانون کو ان ملحدانہ خیالات کا شکار ہونے دیتے، یا ان کی تشفی بخش تردید کرتے، عقلی علوم کی تردید کے لئے تنہا نقل کافی نہ تھی، اس لئے علما کی ایک جماعت کو محض اسلامی عقائد کو یونانی علوم کے حملہ سے بچانے کے لئے اس مین حصہ لینا پڑا، اور چونکہ محض نقلی علوم سے ان کی تردید ممکن نہ تھی، اس لئے ان کو بھی فلسفہ اور عقلیات کے اسلحہ سنبھالنے پڑے جس سے علم کلام کی بنیاد پڑی، ان علما مین بہت سے صاحب بصیرت اور ارباب عزیمت متکلم اور فلسفی علما نے فلسفہ یونان پر تنقید کرکے اس کے نقائص دکھائے، اور ان کا رد کیا، مثلاً امام غزالی، امام رازی، ابوالبرکات بغدادی، شیخ شہاب الدین مقتول اور ابن تیمیہ اور امام شہرستانی وغیرہ،

جن علما مین اتنی ہمت و بصیرت نہ تھی، انھون نے اسلامی عقائد اور فلسفہ یونان مین مطابقت دینے کی کوشش کی گو ان کا یہ طریقہ صحیح نہ تھا، لیکن ان کی نیت نیک تھی، اس کے باوجود چونکہ یہ طرز کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف تھا، اور اس مطابقت مین کہین کہین اسلامی تعلیمات میں تاویل سے کام لینا پڑتا تھا، اور آیات قرآنی کے ظاہری معنی سے

ہٹنا پڑتا تھا، اس لئے محدثین اور دیندار علما نے اس کو بھی خلاف مذہب قرار دیا، اور ان کی تردید کی البتہ اس سے ضرور بعض فلسفیانہ خیالات اسلامی عقائد مین آگئے، جن کو مصنف نے فلسفہ یونان کے قبول سے تعبیر کیا ہے، ان خیالات کے قبول کرنے کا تو سوال الگ رہا، محدثین نے تو ان کے حملہ سے اسلامی عقائد کو بچانے کے لئے ایسے طریقہ دفاع تک کو گوارا نہ کیا، جس سے صاف و سادہ اسلامی عقائد مین کوئی ایسی خفیف تاویل بھی کرنی پڑے جس کی سند کتاب اللہ وسنت رسول مین موجود نہین ہے، رہا یہ امر کہ یہ طریقۂ دفاع مفید ثابت ہوا یا مضر تو اس کے فائدہ مین کوئی شبہہ نہین، اس سے بعض اسلامی تعلیمات اور اسلامی عقائد کے بارہ میں اس زمانہ کے عقل پرستون کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگیا، لیکن اسی کے ساتھ مذہب مین بعض غیر ضروری مسائل پیدا ہو گئے، جن کو اسلام کے سادہ اور صاف عقائد سے کوئی علاقہ نہ تھا، لیکن متکلمین کے حسن نیت مین کوئی شبہہ نہیں، اللہ تعالی ان کی نیتون کا اجر ضرور دے گا، دین کے اصلی محافظون کو تو بیشک ان پر اعتراض کا حق ہے، لیکن دور جدید کے مصلحین کو ہرگز اس کا حق نہین پہنچتا، جو لوگ سر سید احمد خان، مولوی چراغ علی اور ان کے ہم مشربون کی قرآنی تاویلات اور اسلامی تعلیمات کی غلط تعبیرون کو جو متکلمین اسلام کی غلطیون سے کہین زیادہ گمراہ کن ہین، صحیح اور اس کو خدمت دین سمجھتے ہون، انھین متکلمین اسلام پر اعتراض کا کیا حق ہے،

مصنف کا یہ اعتراض کہ "ہر فن کے علما نے اپنے فن کی روشنی مین کتاب اللہ کی تفسیر کی، اور اکثر تفسیرین مفسرین کے ذاتی رجحانات کا شکار ہو گئیں" قرآن مجید سے ان کی ناواقفیت کا ثبوت ہے، یہ ان مفسرون اور ان کی تفسیرون کا عیب نہین، بلکہ ان کا کمال و ہنر اور ان کی بہت بڑی دینی خدمت ہے، یہانتک تو تسلیم ہے، کہ کلام مجید کو یونانی فلسفہ سے کوئی علاقہ نہین، اور جن لوگون نے اس کی روشنی مین اس کی تفسیر کی ہے، انھون نے دین کی خدمت انجام نہین دی، لیکن مصنف نے اور جن علوم کا نام لیا ہے مثلاً صرف و نحو، معانی و بیان، تاریخ، فقہ اور تصوف تو قرآن تو ان سب کا جامع ہے، اور اس کو ان سے نہایت گہرا تعلق ہے، قرآن عربی زبان مین ہے، اور غیر عرب کے عربی زبان کے صحیح پڑھنے اور اس کے معنی سمجھنے کا دارومدار تمامتر صرف و نحو کے علم پر ہے، اس سے ناواقف

شخص نہ صرف یہ کہ عربی کے صحیح معنی نہیں سمجھ سکتا، بلکہ عبارت تک صحیح نہیں پڑھ سکتا، پھر اس میں جا بجا صرفی و نحوی اشکالات ہیں جن کے حل کے لئے صرف و نحو میں بصیرت کی ضرورت ہے، اس لئے کلام مجید کی صرفی اور نحوی تشریح اس کی خدمت ہوئی یا مخالفت، خود فاضل مصنف نے عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر کلام مجید کے سمجھنے میں جو جو غلطیاں کی ہیں، اس کی مثالیں آیندہ آئیں گی، کلام مجید میں گذشتہ انبیا و رسل اور ان کی امتوں اور قدیم اقوام کے سبق آموز تاریخی واقعات ہیں، اس لئے اگر کسی مورخ نے تاریخی پہلو سے اس پر نگاہ ڈالی تو کیا گناہ کیا، اسی طرح کلام مجید فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، بلکہ اوس نے فصحائے عرب کو اپنا جواب بنانے کی تحدی کی جس سے وہ عاجز رہے، اگر کسی نے کلام مجید کے اس دعوی کے ثبوت میں فصاحت و بلاغت کے پہلو سے آیاتِ قرآنی کی تشریح کی، تو اوس نے اوس کی خدمت کی یا اوس کو بگاڑا، کلام مجید میں طہارت، عبادت، معاملات، نماز روزہ حج زکوٰۃ نکاح و طلاق و راثت تجارت لین دین وغیرہ کے صدہا مسائل و قوانین ہیں بعض کلی مسائل سے جزئیات کا استنباط ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی نے اس کے فقہی پہلو پر نگاہ ڈالی، اور اس سے مسائل استنباط کئے، تو اس نے دین کی خدمت کی یا اس کی مخالفت کی، اسی طریقہ سے کلام مجید کا اصل مقصد تزکیۂ روح و قلب اور تعلق مع اللہ ہے، اور جہاد نفس اس کا وسیلہ ہے، اس کے بغیر روح کا تزکیہ ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے اگر کسی صاحب نظر اہل دل مفسر نے اس روح کو نمایاں کیا، تو اوس نے کلام مجید کے اصل منشا کو پورا کیا یا اوسے اپنے ذاتی رجحانات کا شکار بنایا، درحقیقت کلام مجید، فصاحت و بلاغت کا نمونہ بھی ہے، دنیاوی قانون کا ضابطہ بھی ہے، زندگی کا دستور العمل بھی ہے، تزکیۂ قلب و روح کا نسخہ بھی، نجات اُخروی کا صحیفہ بھی ہے، غرض وہ ایک مسلمان کے لئے دین بھی ہے، دنیا بھی، وہ تو ایسی جامع الحیثیات کتاب ہے کہ اس کے محاسن کا احاطہ مشکل ہے،

دامانِ نگہ تنگ و گل حسنِ تو بسیار

گلچینِ جمالِ تو ز داماں گلہ دارد

اسلئے جن علماء نے ان مین سے کسی جہت کی تشریح و تفسیر کی، اونھون نے اس کے جمال رُخ کو نمایان کیا یا اوس کو بگاڑا، یہ تو مسلمانون کا نہایت پر فخر کارنامہ ہے، کہ اونھون نے اپنی مذہبی کتاب کے سیکڑون پہلوؤن پر کتابین لکھین، اور حتی الامکان اوس کا کوئی گوشہ تشنہ نہین چھوڑا، اور علوم قرآنی پر ایسا عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہو گیا جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم نہین پیش کر سکتی، لائق مؤلف نے مسلمانون کے اس سارے کارنامے پر بہ یک جنبش قلم خط نسخ پھیر دیا،

(باقی)

خط و کتابت کیلئے

ضروری اطلاع

معارف کے مضامین اور علمی استفسارات اور ان کے متعلق جملہ خط وکتابت شخصی نام کے بجائے صرف اڈیٹر معارف کے پتہ سے، اور معارف اور دار المصنفین کے انتظامات اور فرمایشات کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے کیجائے، ان تمام امور کے متعلق میرے نام خط لکھنے سے تعمیل مین وقت ہوتی ہے، امید ہے کہ احباب مجھے زحمت سے بچانے کے لئے اس کا خاص طور سے خیال فرمائین گے،

سید سلیمان ندوی

ابن منظور افریقی

کی

لسان العرب پر ایک نظر

از جناب پروفیسر عبد القیوم صاحب ایم اے، لکچرار زمیندار کالج گجرات

جن جن ملکون مین اسلام کا پرچم لہرایا، اور جہان جہان عربون نے دینِ حنیف کا پھریرا اڑایا، وہان علم و عرفان کے چشمے ابل پڑے، جو ملک بھی اسلام کے زیرِ اثر آیا، عربی علم و ادب کا مرکز بن گیا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عربی علوم و آداب کی تاریخ کے ایک طالب علم کی نگاہ سے پوشیدہ نہین رہ سکتی،

افریقہ بھی مسلمانون کے انہی مفتوحہ ممالک مین سے ہے جہان عربون نے اپنی تہذیب و ثقافت کے اتنے گہرے نقوش چھوڑے ہین، کہ زمانہ کی دستبرد اب تک انھیں مٹا نہین سکی، اور باوجودیکہ افریقہ وحشت اور بربریت مین شہرۂ آفاق ہے لیکن عربی زبان کی گرفت مین کچھ اس طرح آیا، کہ صدیان گذر جانے کے بعد بھی وہان اسلامی اثرات بڑے نمایان اور ابھرے ہوئے نظر آتے ہین، چند برس ہوئے ایک امریکن مسیحی مبلغ نے لکھا تھا :

"اسلام نے افریقہ کے لئے ایک مخصوص تعلیمی اسکیم تیار کر رکھی ہے سینی گال مین جو فرانس کے ماتحت ہے، عربی زبان اسکولون مین پڑھائی جاتی ہے، اور اس قسم کے اٹھارہ سو ابتدائی مدارس موجود ہین، ان سب مدارس مین بارہ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہین، فرانسیسی سوڈان میں بھی عربی کی تعلیم کا انتظام ہے، وہان دو ہزار ایک سو تیرہ مدارس ہین، جن مین پچھتر ہزار طلبہ پڑھتے ہین، فرانسیسی گِنا مین بھی عربی تعلیم ترقی پر ہے، آئیوری کوسٹ مین اگرچہ مسلمانون کی آبادی صرف گیارہ فیصدی ہے لیکن

وہان تین سو مسجدین اور چار سو پچیس مدارس قرآن ہین، برٹش نائیجیریا کے تمام مدرسون مین بھی ع.بی پڑھائی جاتی ہے"

یہ حالت اس زمانہ مین نظر آتی ہے جب افریقہ کی حکومت کی باگ دوسری اقوام کے ہاتھون مین ہے، اگر اپنی حکومت کے دور مین ہم وہان جلیل القدر علما، ائمہ اور ادبا، اور مختلف علوم و فنون کے ارباب کمال دیکھتے ہین تو چندان تعجب کی بات نہین،

مؤلف لسان العرب کے مختصر حالات

اس مضمون کے موضوع بحث لسان العرب کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ صاحب کتاب کے حالات چند سطرون مین پیش کر دیئے جائین، یہ بڑے افسوس کی بات ہے، کہ تاریخ اسلام کے اس جلیل القدر لغوی اور ادیب کے حالات کی جانب تاریخ اور تذکرہ نگارون نے بہت کم توجہ کی ہے اور کتابون مین اس کے نہایت مختصر اور مجمل حالات ملتے ہین، اگر اتنا بڑا عالم یورپ مین پیدا ہوا ہوتا، تو اس کی سیرت پر مستقل کتابین لکھی جاتین، اور اس کی زندگی کا کوئی گوشہ ہماری نظرون سے اوجھل نہ رہنے پاتا، اس ضمن مین یہ عرض کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہوگا، کہ صاحب لسان العرب کے حالات زیادہ تر اس کے دو معاصرین کی روایت پر منحصر ہین، ایک صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی (۶۹۶ھ-۷۶۴ھ) اس نے اپنی کتاب نکت الھمیان مطبوعہ ۱۹۱۱ء (ص ۲۷۵ و ما بعد) اور الوافی بالوفیات مطبوعہ ۱۹۳۱ء (ج اول ص ۵۰) مین اس کے حالات لکھے ہین، دوسرے محمد بن شاکر الکتبی (۶۸۶ھ-۷۶۴ھ) نے اپنی کتاب فوات الوفیات مطبوعہ ۱۲۹۹ھ (جلد ۲ ص ۲۶۵) مین حالات قلمبند کئے ہین، بعد کے تمام سیرت نگارون نے انھی دونون سے استفادہ کیا ہے، اور بیشتر انھی دونون کے بیانات نقل کر دیئے ہین، اس مین حافظ ابن حجر کی الدرر الکامنۃ (جلد ۴ ص ۲۶۲) سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ مطبوعہ ۱۳۲۶ھ (ص ۱۰۶) ابن العماد حنبلی کی شذرات الذہب (جلد ۶ ص ۲۶) سرکیس کی معجم المطبوعات، زرکلی کی الاعلام (ج ۳ ص ۹۹۰ - ۹۹۱) کسی کا استثنار نہین، المنہل العذب فی تاریخ طرابلس الغرب (ص ۱۵۰) اور مفتاح السعادۃ (ج اول ص ۱۰۱) مین بھی کچھ حالات مندرج ہین،

ولادت اور تعلیم | محمد نام، جمال الدین لقب، ابو الفضل کنیت اور الافریقی اور المصری نسبت ہے، پورا سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن مکرم بن علی بن احمد بن ابی القاسم بن حبقہ بن منظور[۱] سیوطی نے سلسلہ نسب میں علی (دادا کے نام) کے ساتھ کسی دوسری روایت کے مطابق رضوان بھی لکھا ہے۔ اور صفدی[۲] نے الرویفعی الانصاری نسبت درج کی ہے، اس نسبت کے لحاظ سے مؤلف حضرت رویفع بن ثابت صحابیؓ کے خاندان کی یادگار تھے، ابن منظور اور ابن مکرم کے نام سے عام طور پر مشہور ہیں،

۲۲ محرم الحرام ۶۳۰ھ کو دوشنبہ کے دن مصر کے ایک بڑے علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے[۳] بچپن ہی سے علم وادب کی طرف میلان تھا مختلف اساتذہ کے۔ اپنے زانوے تلمذ تہ کیا، ان میں ابن المقیر، مرتضی بن حاتم، عبد الرحیم بن الطفیل اور یوسف المخیلی زیادہ مشہور ہیں[۴]، نحو، لغت، تاریخ اور کتابت میں کمال حاصل کیا[۵]، مؤلف کا انداز تحریر نہایت سلیس، شگفتہ، متین اور سنجیدہ ہے۔ ادبیات میں نہایت بلند درجہ ہے، نظم ونثر دونوں میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، شعر کے نمونے صفدی اور ابن شاکر نے نکت الہمیان اور فوات الوفیات میں درج کئے ہیں

مشاغل | بعض تاریخی حقائق بڑے ہی تعجب انگیز ہوتے ہیں، ہماری حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ ہمارے اسلاف زندگی کی دوسری مشغولیتوں کے باوجود علمی مشاغل میں کتنا انہماک رکھتے تھے یاقوت حموی امام ابن جریر کے متعلق لکھتا ہے، کہ اگر ان کی تصنیفات اور تالیفات کے اوراق کو ان کی زندگی کے دنوں پر تقسیم کیا جائے، تو چالیس ورق یعنی اسی صفحات روزانہ کا اوسط پڑتا ہے، حافظ ابن حجر کی تصانیف کتنے مختلف علوم پر ہیں، فتح الباری، اصابہ، درر کامنہ اور تہذیب جیسی ضخیم کتابیں ابن حجر کے علم وفضل کی شاہد ہیں، سیوطی کی روایات کے استناد وعدم استناد کے متعلق جو بھی کہا جائے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے

---

[۱] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۰۶، [۲] نکت الہمیان ص ۲۷۵ [۳] ایضاً [۴] الدرر الکامنہ ج ۴ ص ۲۶۲، ۲۶۳، نکت الہمیان میں عبد الرحیم کی بجائے عبد الرحمٰن بن الطفیل مرقوم ہے جو زیادہ قرین صحت ہے،

[۵] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۰۶،

کہ چار پانچسو کے درمیان کتابین ان کے قلم سے نکلین، یاقوت حموی ابن کثیر، ابن تیمیہ اور دوسرے بے شمار علماء ہین جن کے قلم کی روانی اور برق رفتاری دیکھ کر ایک انسان انگشت بدندان رہ جاتا ہے، اور اندازہ نہین کرپاتا کہ یہ بزرگ لکھنے پڑھنے کے لئے اتنا وقت کیسے نکال لیا کرتے تھے،

ہمارے مؤلف کو کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا، باوجودیکہ قاہرہ مین مدت العمر دیوان الانشار سے وابستہ رہے[۵۱] پھر طرابلس مین نظارت اور قضار کے فرائض انجام دیتے رہے، لیکن لکھنے پڑھنے کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا، کہ ان مشغولیتون کے باوجود تاریخ و ادب کی بہت کم کتابین ایسی ہونگی جو ابن منظور کی نگاہ سے بچ سکی ہون گی، محض مطالعہ ہی کا شوق نہ تھا، بلکہ اس کے ساتھ تالیف و تصنیف کا بھی ذوق تھا، ابن شاکر نے فوات الوفیات میں ان کو کثیر الخط لکھا ہے، صلاح الدین صفدی نے خود ابن منظور کے صاحبزادے قاضی قطب الدین کا یہ بیان نقل کیا ہے، کہ اُن کے والد ابن منظور نے پانسو کتابیں اپنے ہاتھ کر لکھی ہوئی چھوڑین[۵۲] صفدی کا بیان ہے کہ "وما اعرف فی کتب الادب شیئًا الّا اختصرہ" سیوطی لکھتے ہین کہ روایات و نقل کے اعتبار سے ابن منظور کی مختصرات کی تعداد پانچ سو مجلدات تک پہنچتی ہے[۵۳] ابن منظور نے جو مختصرات و مختارات لکھے ہین، ان مین سے چند حسب ذیل ہین:

(۱) مختار الاغانی بہ ترتیب حروف تہجی (۲) مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر قریبًا چوتھائی حصہ مین اختصار لکھا ہے (۳) مختصر تاریخ بغداد للسمعانی (۴) مختصر مفردات ابن البیطار (۵) مہذب سرور النفس بمدارک

---

[۵۱] فوات الوفیات، دیوان الانشاء مین خدمت کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، اس کے لئے بڑے علم و فضل کی ضرورت تھی، قلقشندی نے صبح الاعشی میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ کتنے علوم و فنون مین کمال حاصل کئے بغیر دیوان الانشاء مین کام کرنا قطعًا ناممکن تھا[۵۲] نکت الہمیان ص ۲۰۶،

[۵۳] بغیۃ الوعاۃ ص ۲۰۶، اس زمانہ مین قدیم علماء کی مطول کتابون کو محفوظ کرنے کے لئے اون کی تلخیص کا زیادہ رواج تھا،

الحواس الخمس للتیفاشی (۶) مختصر العقد لابن عبدربہ (۷) مختصر ذخیرہ لابن بسام (۸) مختصر زہرالآداب للحصری (۹) مختصر یتیمۃ الدہر للثعالبی (۱۰) مختصر نشوان المحاضرۃ (۱۱) مختصر صفوۃ الصفوۃ (۱۲) مختصر تاریخ الخطیب (۱۳) مختصر الحیوان للجاحظ (۱۴) انتشار الانوار فی اللیل والنہار۔

انہی چند کتابوں سے اندازہ ہوسکتا ہے، کہ ابن منظور کتب بینی اور تصنیف و تالیف میں کس درجہ استغراق اور انہماک رکھتے تھے کتنی ضخیم ضخیم کتابوں کو اوّل سے آخر تک بنظر غائر پڑھا، یاد رکھا، اور پھر ان کے مختارات اور مختصرات لکھے، ایک الاغانی ہی کو لے لیجئے، کہ بقول صاحب الوافی الوفیات[1] ابوالفرج اصفہانی نے اس کتاب کو پچاس برس کی طویل مدت میں تالیف کیا، پھر غور فرمائیے، کہ اس کتاب کے مطالعہ اور بلحاظ حروف تہجی اس کے اختیار اور ترتیب کے لئے کتنی مہلت اور محنت کی ضرورت تھی، یہ بھی پیش نظر رہے کہ مؤلف کے لئے تنہا یہی ایک کام نہ تھا، بلکہ دفتری مشاغل بھی تھے، اور پھر تنہا یہی ایک کتاب مؤلف کے قلم کا ثمرہ نہیں ہے، بلکہ ایسی بہت سی کتابیں ہیں جن میں سے ایک ایک کے مطالعہ کے لئے عمر درکار ہے،

ابن العماد حنبلی کے قول کے مطابق ابن منظور مصر اور دمشق میں حدیث کا درس بھی دیتے رہے ہیں[2]، اور سیوطی رقمطراز ہیں کہ امام سبکی اور حافظ ذہبی نے ابن منظور سے روایت بیان کی ہے[3]، لیکن ان کا شمار محدثین کے اس زمرہ میں کیا ہے جو لم یبلغوا درجۃ الحفظ والمنفردین بعلو الاسناد[4]" مگر جہاں تک نحو و لغت کا تعلق ہے، ابن منظور کا شمار ان علوم کے ائمہ میں ہے[5]، حافظ ابن حجر نے ابن فضل اللہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ ابن منظور آخری عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے[6]، ظاہر ہے کہ یہ محرومیٔ بصارت کتب بینی اور کتب نویسی میں حد درجہ انہماک کا نتیجہ تھی، آخر میں مصر میں قیام اختیار کیا، اور وہیں بیاسی برس کی عمر میں شعبان ۷۱۱ھ میں وفات پائی[7]،

---

[1] جلد اول ص ۵۰ [2] شذرات الذہب ج ۶، ص ۲۶ [3] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۰۶ [4] جلد اول ص ۱۶۳ [5] ،، ص ۲۲۹ [6] الدرر الکامنہ جلد ۴ ص ۲۶۳ [7] حسن المحاضرہ، ج ۱ ص ۱۹۳

ابن شاکر[۱] نے ابن منظور کے تشیع بلا رفض کا بھی ذکر کیا ہے لیکن معاصرانہ چشمک سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہین، دوسرے سیرت نگارون نے بھی اس کی تقلید مین اس کو نقل کر دیا، اور یہ نہ سوچا کہ یہ الزام کہاں تک حقیقت و اصلیت پر مبنی ہے،

لسان العرب — ابن منظور کی سب سے قیمتی اور اہم تالیف لسان العرب ہے، اس کا پہلا ایڈیشن مصر سے بیس ضخیم جلدون مین شائع ہوا، یہ عربی زبان کا بڑا مستند اور مفصل لغت ہے، کتاب کے نام کے ضمن مین یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا، کہ ابن منظور ہی پہلا مؤلف نہین جس نے لسان العرب کے نام سے عربی کا اتنا ضخیم لغت ترتیب دیا ہو، اس سے کئی صدی پہلے شیخ ابو علی سینا (۳۷۰ھ-۴۲۸ھ) نے اسی نام سے ایک ضخیم لغت مرتب کیا تھا، ڈاکٹر جمیل صلیبا نے اپنی کتاب ابن سینا کے صفحہ ۴۴ پر عربی لغت کی ایک کتاب موسوم بہ لسان العرب دس جلدون مین ابن سینا کی جانب منسوب کی ہے، شہرزوری کی کتاب نزہۃ الارواح مین ابو علی سینا کے ترجمہ کے تحت زیادات مین مرقوم ہے:

"ثم صنف الشیخ کتاباً فی اللغۃ وسماہ لسان العرب، لم یصنف مثلہ فی اللغۃ

ولم ینقل الی البیاض فبقی علی مسودتہ لم یھتد احد الی ترتیبہ"

شیخ کی لسان العرب کی عدم موجودگی مین ہم نہین کہہ سکتے کہ ابن منظور نے اپنی اس کتاب کا نام محض اتفاقی طور پر رکھا یا مستعار لیا، ورنہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لسان العرب پہلی لسان العرب کا کہاں تک چربہ ہے

وجہ تالیف — ابن منظور کے لغت سے پہلے بھی عربی کے مستند لغات موجود تھے، خلیل بن احمد (المتوفی ۱۷۵ھ) کی کتاب العین اگرچہ اب ناپید ہے[۲] لیکن بعد کے مولفون نے اس سے استفادہ کیا ہے، اور اندلس کے مشہور مصنف ابوبکر زبیدی (المتوفی ۳۷۹ھ) نے اس کا انتخاب بھی کیا، اس کے بعد ابن درید (المتوفی ۳۲۱ھ) نے کتاب العین

---

[۱] فوات الوفیات ج ۲، صفحہ ۲۶۵،

[۲] لسان العرب ج ۱ صفحہ ۲،

کے انداز پر کتاب الجمہرۃ فی اللغۃ لکھی، بعد کی مشہور کتب لغت مین سے ابو علی القالی (المتوفی ۳۵۶ھ) کی البارع، ابومنصور الازہری (المتوفی ۳۷۰ھ) کی التہذیب، صاحب ابن عباد (المتوفی ۳۸۵ھ) کی المحیط، ابوالحسین ابن فارس (المتوفی ۳۹۵ھ) کی المجمل، الجوہری (المتوفی ۳۹۳ھ) کی الصحاح، ابوغالب قرطبی (المتوفی ۴۳۶ھ) کی الموعب، ابن سیدہ (المتوفی ۴۵۸ھ) کی المحکم، زمخشری (المتوفی ۵۳۸ھ) کی اساس البلاغہ اور صاغانی (المتوفی ۶۶۰ھ) کی العباب قابل ذکر ہین، لیکن ان کتب کی موجودگی بھی ابن منظور کے لئے وجہ تسلی نہ ہوئی، اور ان کو ان مین سے ہر ایک کتاب مین کچھ نہ کچھ ایسی کمی اور کوئی نہ کوئی خامی نظر آئی کہ ایک لغت کی تالیف کی ضرورت محسوس کی انھیں اگر کسی کتاب میں علم و ادب کا کوئی بڑا ذخیرہ نظر بھی آیا تو اسکی ترتیب انکی نگاہ مین ناپسندیدہ ٹھہری اور اگر کسی کی ترتیب تسلی بخش نظر آئی تو اسکو علمی و ادبی خامیون سے مبرا نہ پایا، اسلئے ایک ایسے جامع لغت کی ترتیب کی ضرورت محسوس کی جو انکے نقطہ نظر سے ترتیب اور علم و ادب کے ذخیرہ دونون لحاظ سے تسلی بخش اور قابل اعتبار ہو، اس مقصد کے پیش نظر ابن منظور نے لسان العرب کی تیاری شروع کی، لیکن انھین اپنے پیش رو مؤلفین لغت کی طرح الفاظ کی تشریح و تحقیق کے لئے بڑے بڑے طول طویل سفر اختیار نہین کرنے پڑے، اور نہ بے آب و گیاہ صحراؤن کی خاک چھاننی پڑی، مؤلف نے کتاب کے دیباچے میں یہ اعتراف کیا ہے، کہ انھون نے پہلی کتب لغت پر انحصار کرتے ہوئے انھی کی مختون سے استفادہ کیا ہے[۵] سیوطی بغیۃ الوعاۃ مین لکھتے ہین:

"جمع فی لسان العرب بین التھذیب والمحکم والصحاح وحواشیہ الجمھرۃ والنھایۃ"

لیکن احمد پاشا تیمور، سیوطی کی تغلیط کرتے ہوئے اپنی کتاب تصحیح لسان العرب مین یون رقمطراز ہین:

"وَالصَّوابُ اَنَّ الجمھرۃ لیست مما جمعہ ابن منظور، بل مبنی کتابہ علی خمسۃ فقط وھی التی صرح باسمائھا فی خطبتہ"

لسان کی ترتیب | مولفین لغت نے اپنی کتب لغت کو تین طریقون سے ترتیب دیا ہے،

---

[۵] لسان العرب ج ۱ ص ۳۔

(۱) خلیل نے کتاب العین کو مخارجِ الفاظ کے لحاظ سے مرتب کیا ہے، المحکم اور التہذیب مین بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے،

(۲) ابن درید نے الجمہرۃ مین حروف تہجی کی اصل ترتیب کے لحاظ سے الفاظ کو ترتیب دیا ہے، المجمل، المحیط، اساس البلاغۃ وغیرہ بھی اسی طریقہ سے مرتب کی گئی ہین،

(۳) تیسرے گروہ کا امام جوہری ہے، اس نے الصحاح مین نیا انداز ترتیب اختیار کیا، اور الفاظ کے حرفِ آخر کے اعتبار سے کتاب مرتب کی، لسان العرب، قاموس اور تاج العروس مین بھی یہی ترتیب اختیار کی گئی ہے،

کتاب کی اہمیت لسان العرب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے، کہ مؤلف نے ساٹھ ہزار الفاظ کے مصادر اور مادّون پر بحث کی ہے، اور ان کی تشریح و توضیح مین کلام عرب، ان کے ضرب الامثال، محاورات، خطبات، آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے استشہاد کیا ہے، اس ضمن مین کم و بیش سترہ سو شعرا کے نام اور بے شمار اشعار لسان العرب میں محفوظ ہوگئے ہین،

غور فرمائیے کہ اتنے ضخیم اور مفصل لغت کی تدوین کے لئے کتنے صبر و استقلال، عزم و ہمت، علم و فضل، محنت و مشقت اور ذہانت و ہوشمندی کی ضرورت تھی، آج اس ترقی کے زمانے مین اگر ایک اتنا بڑا لغت لکھنا ہو تو ایک چھوڑ کئی علمی مجالس قائم کرنی پڑ ین، بلکہ کیجاتی ہین، مولفین کے بورڈ بنائے جاتے ہین، مختلف شعبون کے ماہرین کی امداد حاصل کیجاتی ہے، تب کہیں جا کر یہ بیل منڈھے چڑھتی ہے، لیکن اوس زمانے مین جب کہ یہ علمی سہولتین مفقود تھین، نہ پریس اور مطابع تھے، نہ نقل و حمل کے وسائل و ذرائع آج کے جیسے تھے، اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھانا کتنا مشکل کام تھا، اور اس کو تکمیل تک پہونچانا تو اور بھی دشوار تھا، مگر آفرین ہے ان اولوالعزم بزرگون کی جوانمردی اور ہمت پر جنھون نے اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے کہ انھین دیکھکر آج دنیا فرط حیرت و استعجاب سے انگشت بدندان رہ جاتی ہے،

سالہا سال کی مسلسل و پیہم محنت کے بعد ابن منظور نے لسان العرب کو ۶۸۹ھ میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا، اور لغت کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا اتنا شاندار اور قابلِ فخر ذخیرہ جمع کر دیا، کہ یہ کتاب محض ایک لغت ہی نہیں بلکہ عربی علوم کی انسائیکلوپیڈیا بن گئی، اگر ابن منظور اور کوئی کتاب نہ لکھتا اور صرف لسان العرب ہی چھوڑ جاتا تو تنہا یہی اتنی بڑی یادگار تھی، کہ رہتی دنیا تک اس کا نام فراموش نہ کیا جا سکتا،

یورپ کے بڑے بڑے مستشرقین نے دوسری زبانوں کے مقابلہ میں عربی زبان و لغت کی وسعت کا اعتراف کیا اور ایڈورڈ ولیم لین (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۶ء) جس نے عربی لغت کے مطالعہ و تدوین میں ساری عمر صرف کر دی، اس اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا، کہ عربی زبان نے لغات علمی تحقیق، وسعتِ نظر اور محنت و تفصیل کے اعتبار سے تمام لغات سے سبقت و فوقیت لے گئی ہے[۱]، لیکن المانی مستشرق نلدکے اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود عربی زبان سے اس میں وسعتِ نظر کی کمی کا بھی اظہار کیا ہے، افسوس کہ اس نے لسان العرب نہیں دیکھی، ورنہ اس کو ابن منظور کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا، وہ عجمی الفاظ کی اصلیت و ماخذ کا پتہ بھی دیتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

"الفلسفة الحکمة اعجمی (۱۱: ۱۸، سطر ۳) والتریاق بکسر التاء معروف فارسی معرب نیز (حبق) الجوسق ۔۔۔۔ معرب واصله کوشک بالفارسیة (۱۱: ۳۱۵) القندع والقندُع والقندوع کله الدیوث سریانیة لیست بعربیة محضة (۱۰: ۱۷۷) نستق کانه بلسان الروم تکلمت به العرب (۱۲: ۲۳۰)

اسی طرح جہاں کہیں اس قسم کے الفاظ آگئے ہیں، ابن منظور نے ان کے ماخذ اور ان کی اصل بتانے کا پورا اہتمام کیا ہے، ان چار مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ عربی لغت نویس، فارسی، سریانی، ترکی، رومی وغیرہ ماخذوں کا بھی پتہ دیتے ہیں،

تسامحات: کسی کتاب کے متعلق نقص سے یکسر برأت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے لسان العرب جیسی

---

[۱] دیباچہ مد القاموس ۵ [۲] لسان العرب ج ۴ صفحہ ۹۴،

بڑی کتاب میں مسامحات کا رہجانا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک انسان کا حافظہ اور علم کہاں تک کام دے سکتا ہے،

لیکن افسوس ان لوگوں پر ہے جنھوں نے لسان العرب کی نقل میں اس کے تسامحات پر نظر نہ ڈالی، اور انھیں

جو کچھ ملا بے کم و کاست نقل کر دیا، مثلاً لسان میں معقل بن خویلد کا یہ شعر مرقوم ہے[۱]

وسو دِجعا دالس قا بِمِثلھُم یرھَبُ الراھِبُ

مصحح نے اس کی تصحیح کی زحمت اٹھائے بغیر حاشیہ پر لکھدیا "کذا فی الاصل بحذف بعض الشطر الاول"

تاج العروس کے مولف شہیر سید مرتضیٰ زبیدی (المتوفی ۱۲۰۵ھ) نے بھی لسان العرب کے تتبع میں یہی ناقص شعر نقل

کر دیا[۲]، وہاں بھی حاشیہ نگار صاحب نے لکھدیا کہ لسان میں اسی طرح مرقوم ہے، حالانکہ اشعار الہذلیین میں یہ

شعر یوں ملتا ہے:

وسو دِجعا دِغلاظِ الرّقا بِ مثلھُمو یرھب الراھب

لسان العرب (۱۵: ۱۲۳) میں عبید بن الابرص کا ایک شعر یوں مندرج ہے:

اعاقرٌ کذاتِ رِحْمٍ امرغانمٌ کمن یخیبُ

لیکن عبید کے دیوان (ص) میں یہ شعر اس طرح ہے:

اعاقرٌ مثل ذ ت رِحْمٍ اَمْ غانمٌ مثل من یخیب

ایک دو مثالیں اس کی بھی ہیں، کہ ایک جگہ ایک شعر ایک ترتیب سے درج ہے، لیکن دوسرے مقام پر اسی شعر

کا مصراع اوّل مصراع ثانی بن گیا ہے، مثلاً حمید الارقط کے شعر میں (۹: ۴۱) اور (۱۸: ۱۶) میں مصرعے الٹ

گئے ہیں، یا (۲۰: ۲۹) پر مؤلف نے بطور استشہاد کمیت کا شعر درج کرنا چاہا ہے، اور "قال الکمیت" لکھکر شعر

کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت مؤلف کو شعر بھول گیا، اور بعد میں درج کر دینے

کے لئے جگہ خالی چھوڑ دی لیکن بات ذہن سے اُتر گئی، اور شعر درج نہ ہو سکا،

---

[۱] لسان العرب جلد ۴ صفحہ ۹ [۲] تاج العروس ج ۲، صفحہ ۳۲۰،

(۴: ۴، ۴) پر ایک شعر ہے،

ترکضنَ الخیل فیھا بین بُسّ الی الاولاد تنحط بالنھاب

اس سلسلہ میں مؤلف نے قال عباس بن" لکھکر شاعر کے باپ کا نام درج نہیں کیا، اور جگہ خالی چھوڑ دی لیکن بعینہ یہی شعر دوسرے مقام پر درج کرتے ہوئے لکھا: قال عباس بن مرداس السّلمی، (ج، ص، ۳۲۶)

اس کی مثال بھی ہے کہ مؤلف کو شعر نقل کرتے وقت شاعر کے متعلق شک ہوگیا ہے اور بجائے ایک شاعر کا نام لکھنے کے دو کا لکھ دیا ہے مثلاً (۲: ۳۲۶) پر لکھتا ہے قال ابو ذویب او صخر الغی بعض دفعہ ایسا بھی کہ ایک مقام (۲: ۲۸) پر ایک شعر عبداللہ بن غنمۃ الضبی کی جانب منسوب کیا ہے پھر بعینہ وہی شعر دوسرے مقام (۱۹: ۱۴۳) پر اسی شاعر کی جانب منسوب کرنے کے بعد انتساب میں شک پیدا ہوگیا، پھر خود ہی اس کی تصحیح کردی ہے والصحیح انہ لسلمۃ بن عوبۃ الضبی

یا ایک شعر ایک مقام پر (۶: ۷) غسان بن وعلہ کی جانب منسوب کیا ہے لیکن وہی شعر دوسرے مقام (۱۹: ۱۹۴) النمر بن تولب کی طرف منسوب کردیا، اس قسم کی مثالیں اور بھی ملتی ہیں انتساب میں اختلاف کے علاوہ خود شعروں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، ایک مقام پر ایک شعر درج ہے دوسرے مقام پر وہی شعر تھوڑے سے اختلاف سے مرقوم ہے، اس کی مثالیں بھی بہ کثرت ملتی ہیں،

بعض ایسے اشعار ہیں کہ مؤلف لسان العرب نے ان کو کسی شاعر کی جانب منسوب کیا ہے لیکن وہ اشعار اس شاعر کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے، مثلاً ذیل کا شعر طرماح کی جانب منسوب کیا ہے، (۶: ۲۵۸)

کل مشکوک عصا فیرہ قانیٔ اللون حدیث الزمام

یہ شعر طرماح کے دیوان میں موجود نہیں، اور نہ اس کے ملحقہ ضمیمہ میں ہے جس میں مختلف کتب سے اس کے اشعار جمع کرکے درج کئے گئے ہیں، بعض اشعار لسان العرب اور دواوین میں باختلاف الفاظ پائے جاتے ہیں،

اسی طرح اور بھی بہت سے مسامحات ہیں جنھیں میں نے لسان العرب کی فہارس مرتب کرتے وقت جمع کیا تھا، اگر ان سب کا ذکر کیا جائے تو اس کے لئے کئی مقالوں کی ضرورت ہوگی،

زندگی مین غم کیون ہے؟[1]

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا، استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

بے خلش ہا زیستن نا زیستن! باید آتش در تہ پا زیستن

زیستن این گونہ تقدیرِ خودی است از ہمین تقدیر تعمیرِ خودی است (اقبال)

ابتلا، یا آزمایش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلا ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزون کے روک لئے جانے یا فنا کر دیئے جانے سے ان پر آفات کے نزول سے ان کے حصول مین مشکلات کے پیدا ہونے سے خلش سے درد و غم سے، رنج و الم سے، قلب کے تار ٹوٹنے سے یا زیادہ جامع الفاظ مین یون کہو، خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے، اور ابتلا کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی پختگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص و عام رحمتون و راحتون کا نزول ہوتا ہے، اور جو شخص ابتلا سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی و وجوبی قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اور نادانستہ طور پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہین چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہیں چاہتا! وہ بھول جاتا ہے کہ

دوامِ ما زسوزِ نا تمام است چو ماہی جز تپش بر ما حرام است

مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل تپیدِ یک دم و مرگِ دوام است! (اقبال)

---

[1] یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس نظام آباد، دکن مین سنایا گیا،

اپنے اس دعوی کی تائید مین ہم آپ کو کچھ دیر کے لئے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہین، اور کائنات و
فطرتِ انسانی کے چند کلی و ضروری قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہین، ع

یک تنقیہ دماغ می باید کرد!

انسان، احتیاج کا دوسرا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقیید ہی سے احتیاج پیدا ہوتی ہے
جس کی فطرت ہی مین احتیاج ہے، وہ حاجت مند ہے، فقیر ہے، اور درد نتیجہ ہے اسی فقر و احتیاج کا!
فطری طور پر وہ اس درد کی دوا چاہتا ہے:

عالم ہمہ در دست دو وای خواہد از خوانِ کرم برگ و نوائی خواہد

کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویش غذا شہ اشتہائی خواہد

(سحابی استرآبادی)

اب اس عالمِ اسباب و علل مین جس کی تشبیہ انگارہ سے دیجا سکتی ہے، مجاہدہ اور عمل ہی سے احتیاج و
فقر اور درد و غم بڑی حد تک دور کئے جا سکتے ہین، جو اپنی بنیاد و اساس کے طور پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ
بغیر علم صحیح کے ممکن نہین، اور علم صحیح عمل سے علٰحدہ ہو کر نافع نہین ہو سکتا، اس لئے ہم انھین دو پہلوؤن کو
یہان اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعوی کی تائید کرین گے،

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنی مین ہمیشہ خطرناک زندگی ہے، کہ درد و غم، سوز و الم اس کی ماہیت
مین داخل ہین، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہین، ان کا ایقان ہے، کہ کائنات کا مبدء
حق تعالیٰ ہین، جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لامحدود ہین، وہی اس کائنات پر حکمران ہین، حکم ان ہی کا
چلتا ہے، مشیئت ان ہی کی نافذ ہو رہی ہے، لہذا یہ کائنات مظہر ہے خیر و حکمت کا، ہر درد و غم جو انسان کی
زندگی کا ساتھ نہین چھوڑتے، اور ہر رنگ مین انسان جو جلتا رہتا ہے، اس مین کونسی حکمت ہے، اور خیر کا کونسا
نمایان پہلو ہے؟ ان ہی واقفانِ راز کا بیان ہے، کہ اہلِ ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے، اس کی

توضیح تین قوانین کی شکل مین پیش کیجا سکتی ہے،

(۱) درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے جرم و معصیت کا، گناہ و بد کرداری کا، ذمائم اخلاق اوران سے پیدا ہونیوالے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآن حکیم نے اس آیت مین پیش کیا ہے :-

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ	تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمھارے ہی
اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ	ہاتھون کے کئے ہوئے کامون سے ہے اور بہت
(پ ۲۵ ع ۵)	سے تو درگذر ہی کر دیتا ہے،

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ مین یون ظاہر فرمایا گیا ہے :۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ	اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی، کہ تم اس
مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ	سے دوچند پہنچا چکے ہو، تو کہتے ہو، کہ یہ کہان
عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ط	سے آئی، آپ فرما دیجئے کہ یہ تکلیف تم کو تمھارے
(پ ۴ ع ۸)	ہی طرف سے پہنچی،

صاحب کتاب (رضی اللہ علیہ) نے اس اصول کی تفسیر مین فرمایا کہ انّما ھیَ اَعْمَالُکُم تُرد علیکم[1] یہ تمھارے ہی اعمال ہین جو تم پر لوٹائے جاتے ہین، قرآن و خبر سے اس راز کو معلوم کر کے حکما و صوفیاے اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے، کہ

اِنّ جمیع الوجود یقابلکم بحسب ما برز منکم من الاعمال فانظروا کیف تکونون'

فانّ الظل تابع للشاخص فی العوج والاستقامۃ (شیخ ابوالنجا)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہین ویسے ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے' اس لئے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شے ٹیڑھی ہے، تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا، اور اگر سیدھی ہے

---

[1] انّما ھیَ اعمالکم احصیھا علیکم فمن وجد خیراً فلیحمد اللہ ومن وجد غیرھا فلا یلومنّ الا نفسہ

محال کی تمنا کی، مَنْ طلبَ استقامةَ الظل مع عوج الشاخص فقد رام المحال! اسلئے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو، کہ یہ جو سوز و غم تمھارے قلب کو کھائے جا رہا ہے، یہ نتیجہ ہے تمھارے ہی اعمال بد کا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ تکلیف دے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے، تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی، جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی؟ ممکن ہے کہ فوراً یاد نہ آئے لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے، وہ ایک روز تمھارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائے گا، ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار سے کام لیا جائے اور دیانت فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے، کہ اللوم علی لا علیھم، ملامت مجھ پر ہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن، میرے ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں، ع

زادۂ طبع من اند آنکہ خصمان من اند (خاقانی)

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگے گا، کہ "اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک" تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے! درد و الم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے، یداک کسبتا و فوک نفخ![1]

جو مصیبت و آفت اور درد و غم گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے، کہ انسان نزول بلا پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بے کس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے، جزع و فزع کرتا، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، مقام شکوی میں داخل ہو جاتا ہے، اور مقام صبر سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے، کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہام باطلہ سے تخلیہ کرے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف پلٹے، ظلمتوں سے نکل جائے، غم و الم

---

[1] قول شیخ اکبرؒ، تیرے ہاتھوں نے کمایا، اور تیرے منہ نے پھونکا۔

کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائیں گی، اور راحت و مسرت کا نور اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگے گا،

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں، ان کا وجود اس پر اسرار کائنات میں بے معنی نہیں، شر محض نہیں، یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لیجانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں یہ جرائم و معاصی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں کہو کہ یہ خام کو پختہ بنانے کیلئے ضروری ہیں، اقبال نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے :

جہان ما کہ جز انگارۂ نیست — اسیر انقلاب صبح و شام است
ز سوہان قضا ہموار گردد — ہنوز این پیکر گل ناتمام است

سوہان قضا پیکر خاکی کے نقص و تحدید کو کجی و خامی کو، غم و الم کے انگارہ سے دور کرتا جاتا ہے اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لاتا ہے !

(۲) بعض دفعہ درد و الم سوز و غم، معاصی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں عائد کئے جاتے، مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے تکفیر و تمحیص ہوتی ہے، شہوتوں و لذتوں کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوامر الٰہی کی مخالفتوں سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، درد و غم سوز و الم نفس سے ظلمتوں کو رفع کرتے ہیں، مردہ قلب کو جلاتے جگاتے ہیں، حق تعالیٰ کی طرف اُس کا رُخ پھیرتے ہیں، جو نور مطلق ہیں، وہ ان کی طرف رُخ کرکے نورانی ہو جاتا ہے، اور گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل خوار ہو جاتا ہے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان سے جڑ جاتا ہے، ربط قائم کر لیتا ہے غم سے زیادہ مؤثر تطہیر کے لئے کوئی اور شے نہیں، اور بلا آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر ع

این بلائے دوست تطہیر شما است (رومی)

اسی مقصود کے پیش نظر رکھکر عارف روم درد و غم (قبض) سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اس کو سالک کے لئے مفید قرار دیتے ہیں،

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بین تازہ باش و چین میفگن بر جبین

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو آن صلاحِ تست آیس دل مشو

اسی خیال سے صوفیۂ کرام نے بلا و مصیبت کو حق تعالیٰ کے انعامات سے زیادہ بہتر قرار دیا ہے "البلاء محبوب به از انعام محبوب" بلا ہی عطا ہے، اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است و از عطا نالیدن خطا ست:

کے ز آزار تو بیزار شود جانِ حسین زخم چون از تو رسد با ہمہ آزار خوشیم

(مثنوی ج ۱)

بلا و غم جب تکفیر و تمحیص کے لئے آتے ہیں، تو اس کی صاف علامت یہی ہے کہ متقی جزع و فزع نہیں کرتا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستوں اور ہمسایوں کے سامنے اپنی مصیبت کو پیش کرکے شکوہ و شکایت نہیں کرتا، صبر کرکے بے حساب اجر کا امیدوار رہتا ہے:

(۳) اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لئے بھی نہیں آتی، بلکہ ارتفاعِ درجات اور بلوغِ منازلِ عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون ان اللہ کے متعلق ہے جنھوں نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے قلوب پاک و مصفّٰی ہیں، جنھیں ربطِ حق قائم ہے، او دیکھا جاتا ہے کہ کثرت سے بلائیں ان ہی پر نازل ہوتی ہیں، محبت البلاء للولاء، بلا دوستوں کے لئے ہوتی ہے، مشہور خاص و عام ہی ہے، اس قانون کو رازدانِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:

اذا احب اللہ عبداً ابتلاہ فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ۔

یعنی جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ بنا لیتے ہیں، اور اگر راضی رہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہیں، اسی لئے حضرت معروفؒ فرمایا کرتے تھے

لیس بصادق فی دعواہ من لم یتلذذ بضرب مولاہ، جو اپنے مولا کی مار سے لذت نہیں لیتا وہ سچا غلام ہی نہیں!

اسی مفہوم کو کسی عاشق نے ان پُر درد نغموں میں ادا کیا ہے:

جان بلب آمد ز درد کردم از دو طلب	گفت اگر تو عاشقی صبر کن و رضا طلب
یار دے کہ بر سرت تیغ زند تو دم مزن	سر بفدائے یار کن ہیچ نہ خون بہا طلب
محوِ مراد یار شو تا شود او بہ کام تو	قابل التفات نیست عاشق مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضاءات و قابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، کہ منازلِ عالیہ تک رسائی کے لئے درد و غم لابدی و لازمی ہے، تقییدِ جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہو سکتی، درد و الم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیت پیدا ہو تی جاتی ہے، یہ اطلاقیت گیا ہے نفس کی تحدیدات سے رہائی ہے، ذمائم اخلاقیہ تحدید ہی کا نتیجہ ہیں، صفاتِ حسنہ کا پیدا کرنا مشقتوں کا برداشت کرنا ہے، تحمل مشاق موجبِ الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفاتِ حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں، تو انسان ترقع محسوس کرنے لگتا اور ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے، گو درد و غم کو وہ فطرۃً مکروہ سمجھتا ہے، لیکن نتائج سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے، کہ

عسیٰ ان تکرھوا شیئاً و یجعل اللہ	یعنی شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ
فیہ خیراً کثیراً،	نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو،

اولیاء پر جو بلائیں نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لئے ہوتی ہیں، حق تعالیٰ انھیں اپنا قرب عطا کرتے ہیں، فقر و نیستی میں انھیں مبتلا کرتے ہیں، درد و حزن ان پر طاری کرتے ہیں، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطیٰ الا باولیاءہ عشاقِ بلا کی اہمیت و قیمت سے واقف ہوتے ہیں، متأثر وار وہ اس کے طالب ہوتے ہیں، کہ

دردِ قدح درد کہ آن می باید	درد یکہ زتست بیشتر می باید
تلخست عجب لیک بسے خوش خوار است	ہر چند ہمی خورم دگر می باید!

کبھی وہ اپنے ساتھیون کو یہ کہکر تسکین دیتے ہین، کہ

بفقر و نیستی، یک دو روزہ خوش می باش کہ یار خود ز کرم عذر خواہ می گردد!

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ مین تن کی زیادہ قدر نہین اور جان کی قدر بھی تو جانان کی وجہ سے ہے، تن اگر تکلیف مین ہو، لیکن جان جانان کے مراد کے مطابق ہو، اور اس کے جمال سے کیف اندوز تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت! اسی لئے بلا مین یہ عوام کالانعام کے خلاف

(۱) کسی غیر کے آگے شاکی نہین ہوتے، اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہین کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہین، کہ فَاِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْئًا،

ستم کشان محبت دم از فغان بستند

گرہ ز جبہ کشادند و بر زبان بستند

(۲) اپنے باطن مین اتہام اپنے رب پر نہین رکھتے، اس کی حکمت بالغہ مین انھین کوئی شک نہین ہوتا، وہ حق تعالیٰ سے یہ خطاب سنتے ہین،

بادرد بساز چون دوائے تو منم در کس منگر کہ آشنائے تو منم

گر بر سر کوے عشق ما کشتہ شوی شکرانہ بدہ کہ خونبہائے تو منم

(۳) انھین یقین کامل ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لئے اختیار کی ہے وہی ان کیلئے دین و دنیا مین اچھی ہے، ع

صلاح ما ہمہ آنست کان تراست صلاح

"حدیث الولی" مین اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے، کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہین، کہ میرے بندون مین کوئی ایسا بھی ہے کہ تونگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہین کر سکتی، اگر مین اوس کو فقیر کر دون تو وہ فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے

کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا کوئی چیز نیک نہیں بنا سکتی، اگر میں اوس کو غنی کر دوں تو غنا اوس کے ایمان کو فاسد کر دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز اس کو درست نہیں کر سکتی اگر میں اوس کو بیمار کر دوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے، کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی، اگر میں اوس کو تندرست رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کر دے، مجھے اپنے بندوں کے احوال سے پوری آگاہی ہے، اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں،

حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسن تدبیر، قضا و اختیار سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں، اور ہر حال میں "رضا بالعطا" اور "حفظ حال" کو ضروری سمجھتے ہیں، اور قلب کی گہرائیوں سے ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

کے قائل ہوتے ہیں! اسی لئے گو وہ "طبعی" غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن "عقلی سرور" سے اون کے قلب خالی نہیں ہوتے، یہ ہے "جمع بین الاضداد" اور "ضدوں کی جمع کا یہ ہنر" ان ہی کو آتا ہے! رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ ع

عالم ہمہ دردست و دوامی خواہد!

یہ درد یا تو گناہوں اور بد کرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لئے وارد ہوتا ہے یا رفع درجات کے واسطے عائد کیا جاتا ہے، بہر حال

لقد خلقنا الانسان فی کبد (ع پ ۳۰) ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا

کے کلی قانون کا کوئی استثنا نہیں دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ غم و اندوہ میں گذرتی ہے، سوز و الم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موج بیقرار کے مانند ہے، جس کی ماہیت ہی میں پیچ و تاب ہے، چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے ؎

چہ پرسی از کجایم چیستم من؟ بخود پیچیدہ ام تا زیستم من

درین دریا چو موج بیقرارم اگر بر خود نہ پیچم نیستم من!

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا درد و غم سوز و الم بے معنی نہیں، بغیر مقصد و غایت کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوتِ حیات کی توفیر ہے، اسی مقصود کو پیش نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت مین بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اوس کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور، اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف رومی نے فرمایا تھا ؎

چون بدانستی کہ ظلِ کیستی فارغی گر مردی و گر زیستی

قطرۂ نوری سراپا نور باش بگذر از غم دائماً مسرور باش

فافہم و تدبر!

الفاروق

حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرزِ حکومت، صحابہؓ کے فتوحات، عراق و شام، مصر و ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر۔

یہ کتاب مولنا شبلی کی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے مطبع معارف نے نہایت اہتمام سے اس کا نیا ایڈیشن تیار کرایا ہے جس کے ساتھ دنیاے اسلام کا رنگین نقشہ بھی شامل ہے طباعت کاغذ نہایت عمدہ قیمت ہے ضخامت ۲۱۳ صفحے

المامون

خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہد سلطنت کے حالات، مولنا شبلی مرحوم کی یہ پہلی تصنیف ہے جس مین ممدوح نے تاریخ اسلام کے پر فخر عہد کے سیاسی، علمی، مذہبی اخلاقی تمدنی حالات قلمبند کئے ہین جن سے دولتِ عباسیہ کے عروج و کمال کے زمانہ کا مرقع آنکھون کے سامنے پھر جاتا ہے، دار المصنفین نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے۔ قیمت عہ، ضخامت ۴۴۲ صفحے،

"مینیجر"

نواحِ دہلی

کی

اردو کی دو قدیم ترین کتابین

از

جناب ڈاکٹر رشید الدین احمد صاحب بی ایس سی علیگ خانقاہ شعیبیہ بجارہ

صاحب گلشنِ ہند و آبِ حیات وغیرہ نے شاہ ولی اللہ دکنی اورنگ آبادی متوفی ۱۱۵۵ھ کو زبان اردو کا پہلا شاعر لکھا ہے، جو سید ابو المعالی کے ساتھ بعہدِ سلطنت محمد شاہ ۱۱۳۴ھ میں دہلی آئے چنانچہ لکھتے ہین ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سون،

۱۱۴۱ھ مین اونھون نے مثنوی دہ مجلس لکھی، مثنوی مین ہے،

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال   تھا گیارہ سو پہ اکتالیسوان سال

مصنف دکن مین اردو نے وجدی کی مثنوی تحفۂ عاشقان کو ۱۱۰۵ھ کی تصنیف قرار دیکر زبانِ اردو کا پہلا شاعر وجدی کو مانا ہے، مگر بہارستان نظر مین ہے کہ وجدی مسمی وجیہ الدین توم شیخ کرنولی کی تحفۂ عاشقان جو مثنوی گل وہرمز عرف گل خسرو فریدی کا ترجمہ ہے، ۱۱۵۲ھ مین، اور پنچھی نامہ یا پنچھی باچھا جو منطق الطیر کا ترجمہ ہے ۱۱۴۶ھ مین اور باغ جانفزا ۱۱۴۵ھ مین لکھی گئی ہین، تحفہ کا ایک شعر یہ ہے ؎

کرون پاک دل جو زبان پاک سون   ثنا پاک اس عاشق پاک سون

جواہر سخن مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی جلد اول مین اردو کا پہلا شاعر وجہی دکنی کو لکھا

گیا ہے، جنھوں نے کتاب سب رس نثر میں بزبان دکنی ۱۰۴۵ھ میں لکھی،

تاریخ ادب اردو میں پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۲ھ کو لکھا گیا ہے، ان کا ایک شعر یہ ہے،

کرتے ہیں دعوی شعر کا سب اپنی طبع سوں	بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

اور حسب تحقیق ولی اللّٰہی حضرت شیخ رزق اللہ علوی دہلوی[۱] متوفی ۹۸۹ھ نے فارسی میں جن کا تخلص مشتاقی اور ہندی میں راجن ہے بہت اشعار ہندی میں تحریر فرمائے ہیں، ہندی میں رسالہ پیمان اور جوت نرجن وغیرہ بھی ارقام فرمائے ہیں،

مثنوی واقعات امامیہ | لیکن میرے نزدیک اردو کی سب سے قدیم تر مثنوی، مثنوی واقعات امامیہ ہے، یہ مثنوی حضرت شاہ غلام رسول تجاروی[۲] برادر حضرت شاہ حافظ منور بایزید ثانی معمر قریشی نے ہمایون کے عہد ۹۳۷ھ میں اردو میں جس کو اس زمانہ میں ہندی کہتے تھے، لکھی، چنانچہ مثنوی میں ہے،

ہمایون شہ آن شاہ جمشید جاہ	جو ہے حکمران اب بلا اشتباہ
غلام رسول است امیدوار	شہا شہریاران مرادش برآر
تجارہ شہر وطن مالوف اوست	درین ملک میوات معروف اوست

یہ مثنوی کتب خانہ مجیدی واقع خانقاہ شعیبی مملوکہ و مقبوضہ حضرت صاحب سجادہ نشین خانقاہ شعیبیہ تجارہ آفتاب میوات میں موجود ہے، جس کو عالیجناب میجر سی، ڈبلو، ایل، ہاردے صاحب بہادر، او، بی، ای، ایم سابق پرایم منسٹر ٹونک وغیرہ چیف منسٹر راج الور نے عجائبات میں شمار کرتے ہوئے میوزیم فنڈ سے حفاظت کتب کے لئے ایک سو بیس روپیے مرحمت فرماکر قدردانی کا ثبوت دیا ہے،

---

[۱] آپ کا مزار دہلی کی عیدگاہ کے پاس ہے [۲] تجارہ پہلے توابع دہلی میں شمار ہوتا تھا، آج کل ریاست الور میں ہے، کتاب صبح گلشن میں تجارہ من اعمال شاہجہان آباد تحریر ہے، اور زیر حکومت فخر الدولہ ولاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ مورث اعلیٰ نواب صاحب آف لوہارو کے بھی رہا ہے،

نمونہ کلام اس مثنوی کے چند اشعار یہ ہین،

الٰہی ترا فضل جو یار ہو	فلک اور ملک سب مددگار ہو
میرے دل مین ہے آرزوے تمام	حقیقت لکھون واقعات امام
بہندی زبان بعض در فرس ہم	نگارش نمودیم ترتیب نظم
کتھا درد دکھ کی جگر سوز ہے	دل افسردگان شعلہ افروز ہے
رضاے خدا اگر نہ ہووے چنین	ستمگر نہ بیتے میان پھر کہین
زمین پیٹ پھٹ کھائی جاتی بدم	فلک ٹوٹ پڑتا نہ با این ستم
غلام رسول آؤ سر کر سخن	گھڑی خلق تیرے سخن کو سُنن

اردو ہندی کے الفاظ اس مین اردو اور ہندی کے حسب ذیل الفاظ پائے جاتے ہین :-

جتن، آپ روپ، ہاہا، سریر، سہاگ، بالی (لڑکی)، بالا، اُگا، دلہن، راکھے، ساریان، چوک، دونون بل (طرف) تہوں، ہمھون، برین، دہن دہرو، پتنگا، چپٹ، اوکھٹ، کپٹ، نپٹ، بچن جھٹکن، سوہا، ماتھے، پات لاگو، بنگورا، کاپن، دلملے، ادسان بین، کبھو وی، موے، کارنے، ستن، کوں، سوں، جوں، پٹرا، گڈا، پڑھ، بڈا، کتھا، بیتی، بہت، کہائی، آدتی، جادتی، رودتی، دھودتی، پہرے (پڑھے) پچھانا (پہچانا) بھجایا ہیں بہوت (بہت) جل (پانی) انجھواں (آنسو) ادگے، اوتر، ندان، پڑ گئے، چھون اور، ترودار، سوگند، باگ (لگام) کتے، کنے، اسوں سورسا، نوت لایا، ہلاک، پہرییہ (پہن لیا) اینچ کر، انوں، لک، چونب (چوم) انکھیان، بجھہ، بنانا، تہ جین، مکھ سوں دیدن آپنا، سنگاتی، گلے لاگ، چاچا، وادینے، پتاسا، نراسا، انکھیوں، کملا، لوہو بہن، کھونترتدی، پچھیون کتک، ٹھک، بچھے، آوُتا، لاوتا، ہول، سراو پرلیا، جگ، بوتا، سورمان، لڑں، مکیاں (مکھ والے) کمل بلی، پلادن، راہ لورن لگے، کیتے، تینے، جدی، کنے، کرتیان، من بلن، بیاہلی، چہراون، بچاون، روس، جھیلیں، اپنے، بچل، ترت، کملا،

دیوان منعم تجاری | اسی دور کی دوسری کتاب دیوان منعم ہے، اس کے مصنف حضرت مولانا شاہ محمد اشرف عمرانی القریشی المتخلص بہ منعم ہیں، یہ حضرت شاہ غلام رسول مصنف اوقات امامیہ کے بھتیجے تھے، یہ دیوان بھی مذکورہ بالا لائبریری میں موجود ہے، اس کے اشعار کا نمونہ یہ ہے،

نمونۂ کلام

دیکھ کر اس قد موزون کو زبس شرم کے سات / گڑ گیا خاک میں سرو آج گلستان کے بیچ

ہے پیچ و تاب میں سنبل کا دل پڑی دیکھ / سن کر صبا سین طرۂ دستار کی خبر

شمع اس یار کے رخسار کون دیکھ / ہوئی فانوس مین جل کرکے روپوش

ٹک ایک تو چیت مت کھو عمر ضائع / نہین بہتر ہے منعم خواب خرگوش

رونق نہین ہے سفحہ کی جدول بغیر دیکھ / ایسے ہی حسن کے تئین دے ہے بہار خط

کونسا معشوق ہے جگ مین جلے عاشق کیسا / اس قدر عاشق نوازی کون ترے چھاتی ہو شمع

ابر ہے سبزہ ہے اور خندان ہو گل گلشن کے بیچ / حیف ہے اس وقت میں ساقی نہیں دیتا ایاغ

رات دن ہے شوق سیں گل کے چمن مین پابند / سب غلط ہے جو کوئی کہتا ہے سرو آزاد ہر

منعم ہو عاشقان میں اس وقت کا سلیمان / دیوے گر اپنی اسکون انگشتری نشانی

اردو اور ہندی کے الفاظ | بل گئے، جھکجھورے، بسرام، بسر، مان سون، ٹک، سیں، بیتی، جاگین، زرد، لوں، جوں، باج، کھوتا، بتاں، لباں، بوتے، (دبت) گلے ہار، بوجھ، تیں، نیں، نین، تس پی، سجد، تد، تدبہر، جد، پہیر، (پھر) جیک، ٹک، چیت، انے، آگیں، جہلکا، صحبت برار، جگ وو ہین، آجا والی، بوجھتی، آنکھاں، پریت، پاؤتی، تر بہتیگی، سرخوشی، چڈی، انکلا، بیٹں، کیھو، بوتے، (دبت) جاتا رہ دیو، (دیکھے) تجھ اوپر، پیڑو، جوش نیں، چاکھا، جیو، من، لگن، اگن، لکھن، تیکھی، نپٹ، بھنک، بڈھ، گھل مل، جھیلیں، اپتے، اپنا، کیدھر، اوڈگئے، وسکا، جس، اودر، تجن، ساجن، نندوک،

یا نام نداب وغیرہ،

سلسلۂ رسولیہ کے متعدد بزرگ ارشاد و ہدایت کے ساتھ صاحبِ علم بھی تھے، حضرت شاہ غلام رسول نے مثنوی واقعاتِ امامیہ تصنیف فرمائی، مولانا شاہ محمد اشرف، حضرت خواجہ محمد ارشد فردوسی، حضرت مخدوم محمد شعیب قریشی، حضرت مخدوم محمد یونس احمد قبلہ نما صاحبِ دیوان تھے، ان سب کے دیوان اردو مین ہین، حضرت شیخ الحدیث مولانا مفتی حافظ اجیرالدین نے الہ آباد مین مدرسۂ اسلامیہ قائم فرمایا آپ حضرت مولانا محمد حسین صاحب مرحوم الہ آبادی کے استاد بھی تھے،

تاریخ صقلیہ جلد اوّل

مسلمانون نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی، اور اسپین کی طرح اس کو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا، اور تقریباً پانچسو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی کوئی تاریخ اردو انگریزی مین کیا عربی مین بھی موجود نہ تھی، چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدون مین اس کی تاریخ مرتب کی گئی ہے، اس مین صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی اور جزائر سسلی پر اسلامی حملون کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دورون کا عروج، اور مسلمانون کے مصائب و جلاوطنی کا مرقع دکھایا گیا ہے، قیمت:- للعہ/ ۵۴۶ صفحے،

سیر الصحابہ جلد ششم

اس مین عہد صحابہ کی چار اہم ہستیون حضرت حسینؓ، امیر معاویہؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات وسوانح اخلاق و فضائل اور ان کے مذہبی، اخلاقی اور سیاسی مجاہدات اور کارنامون اور ان کے باہمی سیاسی اختلافات کی تفصیل ہے، واقعۂ کربلا اور امیر معاویہؓ کے متعلق اردو مین اس سے زیادہ مستند اور تحقیقی حالات نہین مل سکتے، قیمت عہ

"منیجر"

طبِ فرشتہ

از

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی

ذی الحجہ سنہ حال کے معارف مین عزیزی مولوی سید ابوظفر نے طبِ فرشتہ پر ایک مقالہ لکھا ہے، اون کے پیشِ نظر نسخہ دوسرے مقالے پر ختم ہو جاتا ہے،

میرے کتبخانہ مین بھی ایک نسخہ طبِ فرشتہ "دستور الاطبا" کا ہے، سنِ کتابت اس پر بھی نہین ہے، ایک جگہ لوح پر یہ عبارت تحریر ہے :-

"طب فرشتہ حکیم عسکری در ۱۱۹۱ھ ابتیاع نمود برائے اولاد خود"

اس سے معلوم ہوا کہ کم سے کم دو سَو برس کا لکھا ہوا یہ نسخہ ہے، اس مین تین مقالے ہین، تیسرا مقالہ معالجات میں ہے جس میں ۱۶۰ فصلین ہین، یہان کے نسخے میں ۱۵۷ (ایک سو ستاون) فصلین ہین، اخیر کی تین فصلین نہین ہین، آخر فصل اس نسخے کی تپ کے علاج پر ہے، اسی فصل پر یہ نسخہ ختم ہو جاتا ہے،

استفسار و جواب

مسلمان سلاطین کے لوازم شاہی

تخت، تاج، چتر و علم

پروفیسر غلام مصطفی خان صاحب
کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)

مخدومی و مکرمی دام ظلکم

"قدمبوسی و سلام مسنون عرض ہے، ایک بات کے لئے آپ کو تکلیف دیتا ہوں ہوں۔

بہرام شاہ غزنوی کی مفصل تاریخ بفضلہ تعالیٰ لکھ لی ہے، مجھے بعض شعراء کے اشعار ملے ہیں جو ابراہیم غزنوی (المتوفی ۴۹۲ھ ۱۰۹۹ء) اور اس کے بعد کے سلاطین کے متعلق ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنویوں کا علم سیاہ تھا، اس پر شیر اور ہلال کی تصویر تھی، تاج سفید تھا، اور چتر سیاہ تھا، آداب الحرب (ضمیمہ اورنٹیل کالج میگزین ص ۹) سے معلوم ہوتا ہے، کہ چتر پر باز تھا، جیسا کہ سنجر کے یہاں بھی تھا، (کلیاتِ انوری ۱۸۸۰ء ص ۱۰۳)

شیرِ علم کے متعلق رونی (ص ۶۱) کہتے ہیں :-

چو شیر رایتِ شیرِ دلیرِ او بیدل چو شاخ آہو شاخِ درختِ او بے بر

صفحہ ۹۰ میں کہتے ہیں :-

در جہد باسِ او بشیر فلک اگر اندر شود بہ شیر علم

سنائی (بمبئی ص ۳۴۰) کہتے ہین :-

آن چنان شیر علم سر بفرازد بشل | گوئی از چشمۂ خورشید کند آب خوری

وغیرہ وغیرہ،

اب آپ سے دو باتین معلوم کرنا چاہتا ہون :-

(۱) ان اشعار مین شیر علم سے کیا یہی مراد ہوگی، کہ علم مین شیر کی تصویر تھی ؟ یا یہ محض استعارہ ہے ؟

(۲) مسلمانون اور بالخصوص غزنوی عہد کے سلاطین کے علم، چتر اور تاج وغیرہ کا حال کہان معلوم ہوگا، ؟ کیا کسی صاحب نے اس موضوع پر کوئی مضمون لکھا ہے ؟

امید ہے کہ جواب سے جلد سرفراز فرمائین گے، اور تشنۂ علم کی تسکین فرمائین گے،

میرا تہنیت نامہ خدمت مین پہونچا ہوگا، والسّلام

معارف :- محترمی زاد لطفکم

السلام علیکم، گرامی نامہ ملا، آپ کے دونون استفسارون کے متعلق حسب ذیل گذارشین ہین :-

۱- بعض سلاطین کے علم مین "سورج" اور "شیر" کی تصویرین دراصل بنی ہوئی تھین، ابھی کچھ دن گذرے کسی مستند کتاب مین یہ روایت نظر سے گذری تھی، کہ "برج اسد" سے کچھ تفاول لے کر شیر کی تصویر کو علم مین داخل کیا گیا، آج حوالہ کے لئے یہ روایت بہت سی کتابون مین تلاش کی، لیکن افسوس ہے کہ نہ مل سکی تاہم اپنے حافظہ اور یادداشت کے بھروسہ پر یہ عرض کر سکتا ہون کہ آپ "شیر عَلَم" کو استعارہ کے بجائے حقیقت پر محمول فرمائین، اور جن اشعار مین آپ نے غزنویون کے علم کے سیاہ ہونے اور اس پر شیر اور ہلال کی تصویرون کے موجود ہونے کا تذکرہ دیکھا ہے، اس کو بھی حقیقت نگاری پر محمول فرمائین، جب کبھی وہ روایت دوبارہ نظر سے گذرے گی، انشاءاللہ اس کو نقل کرکے ارسالِ خدمت کرون گا، بہارِ عجم مین بھی شیر علم کا مختصر ذکر ملا ہے، چنانچہ مذکور ہے :-

شیر علم انقش شیر کہ بر علم کنند مولوی معنوی ؎

ما ہمہ شیران ولے شیر علم حملۂ شان از باد باشد دمبدم (جلد ۲ ص ۱۵۱)

اس کے ساتھ اس سلسلہ میں یہ امر بھی پیش نگاہ رہے، کہ خونخوار درندہ کی تصویر علم پر اس لئے بھی بنائی جاسکتی ہے، کہ علم بردار فوج دشمنوں کے لئے خونخوار ثابت ہو،

۲- سلاطین اسلام کے مختلف خانوادوں میں جو مختلف شاہی رسوم و مراتب رائج تھے، ان کا مفصل تذکرہ قلقشندی متوفی ۸۲۱ھ کی صبح الاعشیٰ کی مختلف جلدوں مثلاً ج ۳ ص ۲، ۴۷، ۴۹۸، ۵۲۲، ج ۴ ص ۶، ۸، ج ۵ ص ۲۰۶، ۳۲۳، میں ملے گا، اسی طرح مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۸۴، ۲۸۵، اور خطط مصر مقریزی ج ۳ ص ۳۴۰، ص ۳۴۲ وغیرہ میں مختلف مواقع پر شاہی تخت، چتر، تاج و علم غرض جملہ شاہی لوازم کا ذکر آیا ہے،

اردو میں ابھی تک اس موضوع پر کوئی مستقل مضمون نظر سے نہیں گذرا، مذکورۂ بالا ماخذ سے ان چیزوں کے متعلق ذیل میں سرسری معلومات مرتب کر دیئے جاتے ہیں، مزید تفصیلات کی ضرورت ہو تو اصل ماخذ کی طرف رجوع کریں،

ان لوازم شاہی میں مختلف شاہی خانوادوں میں کم و بیش مختلف چیزیں مثلاً تخت، تاج، چتر، علم، نقارہ، مجیرا، شہنائی، قرنا، خیمہ، سراپردہ، چاوش و تبردار، اور کوتل گھوڑے، اور ان کے چند مخصوص شاہی زین اور گردنی (الرقبہ) وغیرہ مختلف صورتوں اور شکلوں میں رائج تھیں، اور یہ مختلف شاہانہ موکب و جلوس و مجالس کے موقعوں پر استعمال کیجاتی تھیں، ابن خلدون ان لوازم پر فلسفیانہ انداز میں نظر ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ

سلاطین ان لوازم کو اپنے کر و فر اور دبدبہ و سطوت کی نمائش اور امراء، ارکان دولت اور عامۃ الناس سے اپنے امتیاز و اختصاص کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے، ارسطو کے خیال کے مطابق طبل و نقارہ کا رواج ان میں ابتداءً اس لئے ہوا کہ لڑائیوں میں اس کی آواز کی ہیبت سے دشمنوں کے دل دہلا جائیں، علاوہ ازیں نغموں کے سننے سے طبیعت میں سرور و نشاط پیدا ہوتا ہے اور اس وقت طبیعت مشکل سے مشکل کام کو انجام دینے

پر آمادہ ہو جاتی ہے، اس لئے عجم لڑائیون اور شاہانہ موکب وجلوس کے موقعون پر نشاط پیدا کرنے کے لئے موسیقی کے مناسب آلات استعمال کرتے تھے، اور عرب اپنی اس ضرورت کو اپنے مطربانہ اشعار سے پورا کرتے تھے، لیکن مسلمان سلاطین نے جب عجمی طریقے قبول کرلئے، تو ان کے تمام شاہانہ لوازم کو بھی اختیار کرلیا، اور شاہی امتیاز ونشان کے لئے چند خاص چیزین مخصوص شکل ووضع کی خاص کرلی گئین،

تخت جلوس سلطانی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا، اس مین بنیادی تخیل یہ تھا، کہ سلطان کی نشست گاہ مجلس کے حاضرین سے بلند رہے تخت کا استعمال قدیم زمانہ سے سلاطین کے دربار مین رائج تھا، وہ عموماً سونے کا ہوتا تھا، حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کا تخت ہاتھی دانت کا تھا، اور وہ سونے سے منڈھا ہوا تھا، اور جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہین، سلاطین اس کو اپنی سلطنت کی ترقی کرجانے کے بعد اختیار کیا کرتے تھے، اسلام مین اس کو سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے اختیار کیا تھا، اونھون نے اس کو استعمال کرتے وقت لوگون سے یہ کہکر کہ ان کے جسم مین فربہی آگئی ہے، اس کے استعمال کرنے کی اجازت چاہی، چنانچہ لوگون (صحابہ) نے ان کو اجازت دیدی اور اونھون نے اپنے لئے غالباً گدے دار اونچا تخت تیار کرایا، پھر آگے چل کر مسلمان سلاطین نے انہی کا اتباع کیا، ورنہ عربون مین پہلے اس کا رواج نہ تھا، چنانچہ حضرت عمرو بن العاصؓ والئ مصر کے متعلق روایت ہے کہ وہ اپنے قصر مین سب عربون کے ساتھ زمین پر بیٹھا کرتے تھے، جب مصر کا مقوقس ان سے ملنے کے لئے قصر مین آتا تھا تو اس کے ساتھ سونے کا ایک تخت بھی آدمیون کے ہاتھ مین اٹھا کر لایا جاتا تھا، اور وہ اسی تخت پر بیٹھا کرتا تھا، اور حضرت عمرو بن العاصؓ اس کے سامنے اپنی جگہ فرش پر بیٹھتے تھے، اور چونکہ وہ مقوقس اپنے یہان کی رسم کی پابندی کرتا تھا، اس لئے حاضرین اس کے اس طرح بیٹھنے کو برا نہ مانتے تھے،

اس کے بعد جب بنو عباس اور عبیدیین (فاطمین مصر) کا زمانہ آیا تو اونھون نے قیصر وکسریٰ کے یہ طریقے خود اختیار کرلئے، (مقدمہ ابن خلدون ملخصاً ص ۲۰۲ و ۲۰۵-۲۰۶)

چنانچہ مسلمان سلاطین کے مختلف خانوادون مین شاہی جلوس کے لئے مختلف قسم کے تخت و کرسیان تھے،

بنو عباس کا تخت زمین سے ۰ فٹ اونچا تھا، فاطمیین کا تخت سنگ رُخام کا ایک منبر تھا، جیسا کہ جامع مسجدون مین ہوتا ہے، لیکن اس کی پشت علٰحدہ سے ہونے کے بجائے دیوار سے لگی ہوئی تھی، اس منبر پر سلطان اہم موقعون پر جلوس کرتا تھا، ورنہ عام دنون مین حریر سے منڈھی ہوئی لکڑی کی ایک کرسی پر بیٹھا کرتا تھا، جو اس تخت شاہی کے پاس رکھی رہتی تھی، (صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۶، ۴۴)

ان شاہی تختون مین رفتہ رفتہ کس قدر تکلفات بڑھتے گئے، اس کا اندازہ ایران و ہندوستان کے تخت طاؤس وغیرہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے،

تاج، سلاطینِ اسلام مین تاج کا استعمال نسبتہً بعد مین ہوا ہے، موسیٰ بن نصیر کا لڑکا عبدالعزیز اندلس کی فتح کے بعد اس کا پہلا والی مقرر ہوا تھا، اسپین کے سابق فرمانروا راڈرک کی بیوہ ایجویلینا اس کے حبالۂ عقد مین آگئی تھی، عبدالعزیز کے خلاف اندلس کے عربون مین شورش پھیلائی گئی تھی، اور اس پر دو الزامات عائد کئے گئے تھے، جن مین سے پہلا الزام یہ تھا کہ راڈرک کی بیوہ نے جو اب ام عاصم تھی، عبدالعزیز سے کہا کہ ہمارے یہان کے حکمران جب تک اپنے سر پر تاج نہ رکھین وہ حکمران معلوم نہین ہوتے، اس کے پاس جواہرات موجود تھے چنانچہ اس نے انہی جواہرات سے مرصع سونے کا ایک تاج اپنے ہاتھون سے تیار کرکے عبدالعزیز کے سامنے رکھا، عبدالعزیز نے کہا کہ اس کا پہننا اس کے مذہب مین روا نہین ہے، با این ہمہ عبدالعزیز ایجویلینا کی دلدہی کے لئے اس کو خلوت مین اس کے سامنے پہننے پر آمادہ ہو گیا، اور خلوت کا یہ راز بعض ذرائع سے جلوت میں بیونچ کر مشت از بام ہو گیا اور اس کے خلاف ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا، (افتتاح الاندلس ابن القوطیہ ص ۱۱) لیکن مسلمان حکمرانون کی یہ احتیاط کچھ زیادہ دنون تک قائم نہ رہی، رفتہ رفتہ اس کا استعمال شروع ہو گیا، اور اس کا وقار سلطنت کے وقار کے مترادف سمجھا جانے لگا، چنانچہ فاطمیین مصر کا تاج "تاج شریف" کہا جاتا تھا، اس تاج مین بہت سے جواہر ٹنکے ہوئے تھے، ان مین کا سب سے بڑا گوہر "یتیمہ" کے نام سے معروف تھا، اور وہ وزن مین ۷ درہم کے مساوی تھا،

(صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۲، ۴)

چتر، شاہانہ جلوس مین سلطان کے سر پر سایہ افگن رہا کرتا تھا، یہ قبہ نما ہوتا تھا، اس کی کمانیان اوپر جاکر سونے کے ایک حلقہ مین پیوست رہتی تھین، فاطمین کے چتر کا کپڑا ان کے لباس شاہانہ کے رنگ سے ملتا جلتا رہتا تھا، چونکہ چتر شاہی خلیفہ کے سر پر بلند رہتا تھا اسلئے وہ بھی بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، چتر افگنی کی خدمت امرائے نامدار مین سے کسی ایک کے سپرد رہتی تھی، (صبح الاعشیٰ لقلقشندی ج ۳ ص ۲، ۴۷۳، ۴۷۴)

فاطمین کا یہ چتر ایوبین کے قبضہ مین آیا، اور اسی طرح استعمال کیا گیا، ان کے عہد مین اس کا کپڑا زرد حریر کا تھا، جو سنہرے نقش و نگار سے آراستہ تھا، اور "مظلہ" کے بجائے چتر ہی کہا جاتا تھا، چتر کے اوپر چڑیا کی ایک نقرئی مورتی تھی جس پر طلا کاری تھی، (صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۷، ۸)

اس سے معلوم ہوا کہ فاطمین کے چتر مین بھی اسی طرح کسی چڑیا کی تصویر تھی، جیسا کہ مبارک شاہ نے آداب الحرب مین غزنویون کے چتر کے متعلق لکھا ہے، کہ اس پر باز بنا ہوا تھا، (ص ۹) عجب کیا کہ فاطمین کے چتر مین بھی باز ہی کی تصویر ہو، غزنویون کے چتر میں باز کی تصویر کے ہونے سے ذہن ایک روایت کی طرف منتقل ہوتا ہے جس سے شاہی چتر سے باز کے تعلق پر قیاساً ایک رائے قائم کیجا سکتی ہے، مسعودی نے اسپین کے قدیم حکمرانون کے سلسلہ مین یہ دلچسپ روایت نقل کی ہے کہ

اسپین کے یہ عیسائی حکمران جب کشتیون پر سوار ہوتے تھے، تو شاہین شاہانہ سواری پر سایہ افگن کشتی کے ساتھ ساتھ اوپر اوپر جلو مین اڑتے ہوئے چلتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان مین کے ایک حکمران "اذرق" نامی کی کشتی پر شاہین سایہ افگن جا رہے تھے، کہ ایک چڑیا سامنے آگئی، شاہین نے جھپٹ کر اس کا شکار کر لیا، اور انسانون کے علم مین پہلی مرتبہ یہ بات آئی کہ شاہین شکار بھی کر سکتے ہین، چنانچہ اس کے بعد شاہین کے ذریعہ سے شکار کھیلنے کا عام رواج ہوگیا، (مسعودی ج ۲ ص ۳۶، ۳۷، ۲۰۰، و ۲۰۱)

اس روایت سے قدر مشترک کے طور پر یہ معلوم ہوا کہ شاہین سلاطین کے جلوس مین ان کے سرون پر سایہ افگن رہتے تھے، اسلئے شاہی سواریون سے ان کا تعلق قدیم زمانہ سے ثابت ہوتا ہے اور شاہانہ جلوس مین ان کا

سر پر سایہ افگن رکھنے کا ایک مدعا یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح سوار و پیادہ شاہ کی سواری کے جلو مین اس کی حفاظت اور اس کے مرتبہ کے بڑھانے کے لئے ہوتے ہین، اس لئے طیور کا یہ حکمران فضا مین انہی خدمات کی بجا آوری پر مامور ہوتا ہے،

علم کے متعلق ابن خلدون لکھتا ہے کہ علم عہدِ قدیم سے لڑائیون کی نشانیون مین داخل ہے، میدان جنگ مین اس کی کثرت، اس کے مختلف رنگ اور اس کے طول سے نفسیاتی طور پر دشمن کے دلون پر خوف و ہراس طاری کرنا مقصود ہوتا تھا، اسلام مین عہدِ نبوی کے آغاز سے اس کو اختیار کیا گیا، چنانچہ غزوات مین علم موجود رہتے تھے، امتدادِ زمانہ سے اس کے استعمال کے طریقون مین فرق ہوتا گیا، چنانچہ عہدِ رسالت وخلافتِ راشدہ مین صرف لڑائیون کے موقع پر استعمال کرتے تھے، جب بعد کے خلفار نے شاہانہ طور وطریق اختیار کئے، اسی طرح علم کو بھی استعمال کرنے لگے، جیسے عجمی سلاطین استعمال کرتے تھے، پھر خلفا و سلاطین کے علاوہ امرا، وعمال بھی اپنی شان وشوکت کے اظہار کے لئے اس سے اپنے جلوس وموکب کی زینت بڑھانے لگے، اور آگے چل کر علم کی کثرت وقلت خلفار وعمال کے جلوس و موکب مین فرق وامتیاز قائم رکھنے کا ایک ذریعہ بن گئی،

پھر علم کے مختلف رنگون سے مختلف خانوادون کی تمیز کیجانے لگی، مثلاً عباسیون نے اپنے علم کے لئے سیاہ رنگ اختیار کیا، تاکہ وہ ہاشمی شہدار پر اپنے پائدار غم والم کا اعلان کرتے رہین، اس لئے وہ "مسودہ" کہے گئے، پھر جب بنو ہاشم مین تفریق ہوئی، اور بنو طالب بنو عباس کے خلاف اٹھنے لگے، تو انھون نے اپنے علم کا رنگ سفید اختیار کیا، اور وہ "مبیضہ" کہے گئے، اس کے بعد المامون نے ماتمی سیاہ لباس کو چھوڑ کر سبز رنگ اختیار کر لیا، اور اس کے جھنڈے کا رنگ بھی سبز ہو گیا،

دوسری طرف مغرب مین بربری سلاطین صنہاجی وغیرہ نے علم کے لئے کوئی مخصوص رنگ اختیار کرنے کے بجائے رنگین ریشمی کپڑے اختیار کئے، ان کپڑون پر وہ سنہرا کام بنا لیتے تھے، اس کے بعد جب موحدین کا دور آیا، تو انھون نے علم وطبل وغیرہ شاہی لوازم کے استعمال کو سلطان کے لئے مخصوص کر دیا، اور دوسرے عمال وامرا، کو ان کے استعمال کرنے کی ممانعت کر دی، پھر مختلف سلاطین نے اپنے ذوق کے لحاظ سے اپنے جلوس

کے لئے علم کی مختلف تعداد مقرر کی، چنانچہ موحدین اور اندلس کے بنو احمر سات علم رکھتے تھے، پھر بعضوں نے یہ تعداد بڑھا کر دس کر دی، پھر بیس ہوئی، یہاں تک کہ سو تک پہنچی، چنانچہ ابن خلدون کہتا ہے کہ اس کے زمانہ میں سلطان ابو الحسن جلوس میں سو علم رکھتا ہے، جو سنہرے کاموں سے آراستہ، رنگین ریشمی کپڑوں کے ہوتے ہیں، پھر اسی زمانہ میں ولاۃ، عمال، اور قواد کو سفید کتان کے صرف ایک چھوٹے علم اور صرف ایک چھوٹے نقارہ کی اجازت دی گئی، وہ لڑائیوں کے موقعوں پر بھی اس ایک علم سے زیادہ علم میدان جنگ میں نہیں لیجا سکتے تھے۔

اسی طرح سلاجقہ کے یہاں ابتدأً صرف ایک بہت بڑا علم رہتا تھا، جس کے سرے پر بالوں کا گندھا ہوا ایک بڑا گچھا ہوتا تھا، یہ علم خاص سلطانی نشان سمجھا جاتا تھا، اور "شاش" کہا جاتا تھا، اور چھوٹے چھوٹے علم بھی ہوتے تھے، وہ "سنجق" کہے جاتے تھے، (مقدمہ ابن خلدون ص ۲۸۴، ۲۸۵)

فاطمیین کا علم جیسا کہ ابن خلدون کے بیان میں اوپر گذرا، سفید رنگ کا ہوتا تھا، ان کے جھنڈوں میں دو سب سے اونچے ہوتے تھے، وہ "لواء احمد" کہے جاتے تھے، یہ دونوں دو لمبے نیزوں میں ہوتے تھے، جو اپنی نوکوں تک سونے کے خول میں ڈھکے ہوئے تھے، ان دونوں کے اوپر سفید حریر کی دو جھنڈیاں جن پر سونے کے بوٹے کڑھے ہوئے تھے، ہوتی تھیں، یہ جھنڈیاں ان نیزوں میں لپٹی رہتی تھیں، جلوس میں یہ دونوں علم دو ممتاز امیروں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے، پھر ان دونوں علم سے دو پست نیزے ہوتے تھے، ان کے سروں پر ٹھوس سونے کے ہلال ہوتے تھے اور ان میں سے ہر ایک میں سرخ اور زرد رنگ کے سات دیبا ہوتے تھے، پھر ان کے پیچھے پیچھے، نازک نازک رنگین جھنڈیاں بوٹے دار حریر کی ہوتی تھیں، جن پر آیت کریمہ "نصرٌ من اللّٰہ و فتحٌ قریب" کڑھی رہتی تھی، (صبح الاعشیٰ قلقشندی ج ۳ ص ۳، ۴، ۴۷۴)

موحدین کے پرچم کی تصویر لیبان کی تمدن عرب کے اردو ترجمہ میں شائع ہوئی ہے، اس پرچم میں آیات قرآنی سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں (تمدن عرب ص ۱۳۳)

اسی طرح بنو مرین کا علم سفید حریر کا ہوتا تھا جس پر دائرہ کی شکل میں سنہرے حروف میں آیات قرآنی نقش کیجاتی تھیں، (ر ج ۵۔ ص ۲۰۶)

طبل دیگر لوازم شاہی میں موسیقی کے آلات، نقارہ، قرنا، شہنائی وغیرہ کا رواج عہد رسالت و خلافت راشدہ میں نہ تھا، ابن خلدون نے یہ صحیح لکھا ہے کہ اہل حق کے لئے اس دور میں ان لوازم کی حاجت نہ تھی، کہ وہ ان کی مدد سے میدان جنگ میں کامیابی حاصل کریں، جب خلافت بادشاہت میں منتقل ہوگئی، تو دیگر لوازم کے ساتھ رفتہ رفتہ یہ چیزیں بھی مسلمانوں کے تمدن میں داخل ہوگئیں، اور سلاطین کے مختلف خانوادوں میں یہ چیزیں استعمال کی گئیں، موحدین نے جس طرح علم پر پابندی عائد کی تھی، طبل و نقارہ پر بھی پابندیاں عائد کردی تھیں، پھر امراء کو جب ایک علم استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تو طبل و مجیرے کے استعمال کی ممانعت اٹھالی گئی، پھر وہ لڑائیوں اور جلوسوں میں کثرت سے استعمال کئے جانے لگے، (مقدمہ ابن خلدون ۲۸۴ - ۲۸۵)

مختلف خانوادوں میں طبل و نقارہ کس قسم کے تھے، اور کیا خصوصیات تھے، قلقشندی نے ان کو جا بجا لکھا ہے، اسی طرح چند دیگر لوازم تھے، مثلاً فاطمین کے یہاں ایک عصائے شاہی تھا، یہ ڈیڑھ بالشت کا ایک دستہ تھا، اس پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا، اور موتیوں اور جواہرات سے مرصع تھا، اسی طرح مرصع تلوار، دوات، نیزہ، گھوڑے کی اطلسی زین اور قیمتی جواہرات یاقوت وغیرہ سے مرصع طلائی زیورات وغیرہ سے آراستہ و پیراستہ رہواروں سے شاہی جلوس کی زینت بڑھائی جاتی تھی، اسی طرح سلطانی سراپردہ و خیمہ و خرگاہ وغیرہ تھے، قلقشندی اور مقریزی وغیرہ نے ان لوازم شاہی کی تفصیلات کے ساتھ سلاطین کی تخت نشینی اور شاہی موکب و جلوس کے مختلف مراسم جزئی تفصیلات کے ساتھ بیان کئے ہیں، اگر ان امور کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو براہ کرم اصل ماخذ کی طرف رجوع کریں، (صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۲، ۴۷۲، ۳، ۴، ج ۴ ص ۹،۱۷ و خطط مقریزی ج ۳ ص ۳۴۰، ۲۴۲، ۳۴۳ وغیرہ)

افسوس ہے کہ غزنوی عہد کے متعلق بتخصیص معلومات ہمارے پیش نظر ماخذ میں دستیاب نہ ہوسکے، اگر ان معلومات کے لئے غزنوی عہد کی پوری تاریخ بالاستیعاب دیکھی جائے، اور موقع بہ موقع سے معلومات اخذ کئے جائیں، تو وہ فراہم ہوسکتے ہیں، غزنویوں سے متعلق کوئی ایسا ماخذ ہمارے سامنے موجود نہیں، جس میں ان کے

احوال جداگانہ طور پر قلمبند کئے گئے ہون،

ہندوستان کے عہد تغلق پر تفصیلی معلومات قلقشندی نے صبح الاعشیٰ مین لکھے ہین، جوایک مقالہ کی صورت
ن ہندوستان آٹھوین صدی ہجری مین " کے عنوان سے ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء کے معارف مین راقم سطور کے قلم سے
نب ہوکر شائع ہوچکا ہے، اس مقالہ کے مطالعہ سے اس عہد مین ہندوستان کے شاہی لوازم کا اجمالی علم حاصل
رتا ہے، مثلاً دربار عام کے سلسلہ مین مذکور ہے :۔

سلطان ہفتہ مین ہر سہ شنبہ کو دربار عام منعقد کرتا ہے، اس دربار کے لئے ایک بہت بڑا وسیع ایوان
صوص ہے، جو ہر قسم کے تکلفات سے آراستہ و پیراستہ رہتا ہے، صدر مین ایک نہایت بلند مرصع تخت زرنگار
بچھا ہوتا ہے، سلطان اسی پر جلوس کرتا ہے، دائین بائین، ارباب حکومت ایستادہ رہتے ہین، پشت پر ہتھیار بند
سلحہ دار اور سامنے ارباب وظائف و اہل مناصب حسب حیثیت و مرتبت کھڑے رہتے ہین، سلطان خود سات
دروازون کے اندر بیٹھتا ہے، باریاب ہونے والون کو پہلے ہی دروازہ پر سواریون سے اتر جانا پڑتا ہے،.....
پہلے دروازہ پر بوق و طبل کا اہتمام ہوتا ہے، جب معزز عہدہ دار حاضر بارگاہ ہوتے ہین، توان کی شان امتیاز
کے لئے وہ بجائے جاتے ہین، شاہی جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلتا ہے، ایک شخص گھوڑے پر سوار تاج
شاہی پر چتر لگائے رہتا ہے، سلاح دار زرق برق لباس مین ملبوس اپنے چمکیلے ہتھیار سنبھالے ہوے سواری
کے پیچھے ہوتے ہین، دائین بائین تقریباً ۱۲ ہزار خدام پاپیادہ رہتے ہین، سواری کے آگے طبل بجتا ہے، طبل
ن ۲۰۰ نقارے ۴۰ کوس، ۲۰ بوق اور ۱۰ اچنگ ہوتے ہین، سلطان کے ساتھ دوسرے اعیان حکومت
پنے اپنے امتیازی جھنڈون کے ساتھ ہمرکاب ہوتے ہین، بعض خوانین کو سات سات جھنڈے رکھنے کی اجازت
ہوتی ہے، ان اعیان حکومت کے چند دیگر امتیازات خصوصی بھی ہوتے ہین، مثلاً خوانین عام طور پر دس کوتل
گھوڑے اپنے ہمرکاب رکھ سکتے ہین، اور امرا کو صرف ۲ کوتل گھوڑون کی اجازت ہوتی ہے، حالت جنگ مین سلطان
کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہین، جن مین سے دو خصوصیت کے ساتھ نہایت مرصع مطلا اور مذہب ہوتے ہین،

ہندوستان کے عہد مغلیہ کے شاہی لوازم کو ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں کم و بیش "شکوہ سلطنت" کے زیرِ عنوان یکجا کر دیا ہے، آپ اس کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، چنانچہ اورنگ سلطنت سونے اور چاندی کا مرصع تخت تھا، ہندوستان کا تختِ طاؤس شہرتِ عام رکھتا ہے، اردو میں "تختِ طاؤس" کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی لکھی جا چکی ہے، چتر بے شمار قیمتی جواہرات سے مرصع تھا، ابوالفضل لکھتا ہے کہ چتر میں کم سے کم سات جواہرات کا موجود ہونا ضروری تھا، آفتاب گیر کے نام سے جواہرات سے پورا مرصع زربفت کا شامیانہ تھا، جو دھوپ کے وقت سر پر راہ میں سایہ افگن رہتا تھا، علم کی کئی قسمیں تھیں، علم، چتر، توق، تمن توق وغیرہ، یہ مختلف امتیازوں کے ساتھ بلند کئے جاتے تھے، چتر توق کا علم تبت کے بازی دم سے بنایا جاتا تھا،

طبل میں نقارہ، دہل، قرنا، سرنا، نفیر، سنج، اور سنگ وغیرہ تھے، جو مختلف موقعوں اور ترتیبوں کے ساتھ بجائے جاتے تھے، (آئینِ اکبری) "ر"

روایاتِ معراج

جناب مولوی سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی

جامع مسجد اورنگ آباد ضلع گیا

محترم دام بقائہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ واقعۂ معراج میں حضرت مالک بن صعصعہ رض کی روایت میں سدرۃ المنتہیٰ سے بیت المعمور کو روانہ ہوتے وقت صاحبِ معراج علیہ السلام کے حضور میں شراب (خمر)، دودھ، شہد کا ایک ایک ظرف پیش کیا جانا اور آنحضورؐ کا دودھ کے ظرف کو اٹھا لینا اور حضرت جبرئیلؑ کا فرمانا کہ یہی فطرت ہے، جس پر آپ اور آپ کی امت ہے، اور حضرت انسؓ کی روایت میں بعد فراغت نماز مسجد اقصیٰ سے نکلنے اور آسمان کی طرف روانہ ہونے کے وقت شراب اور دودھ کا ایک ایک ظرف حضور اقدسؐ میں حضرت جبرئیلؑ کا پیش کرنا اور دودھ کا ظرف لے لینا اور حضرت جبرئیلؑ کا فرمانا کہ آپ نے فطرت کو پسند کیا ہے،

امام المرسلین ہادیٔ عالم سید اولاد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حضرت جبرئیلؑ کے ہاتھوں

خمر جیسی نجس اور حرام شے کے پیش کئے جانے کا منشا صحیح کیا ہو سکتا ہے ؟ اس واقعہ سے بعض احباب کے دل میں خلش پیدا ہوتی ہے، اس کا ازالہ ضروری ہے،

۲- روایاتِ معراج میں ہے کہ آسمان اوّل پر حضرت آدمؑ اور آسمانِ دوم پر حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور آسمان سوم پر حضرت یوسفؑ اور آسمانِ چہارم پر حضرت ادریسؑ، آسمانِ پنجم پر حضرت ہارونؑ، آسمانِ ششم پر حضرت موسیٰؑ، آسمان ہفتم پر حضرت ابراہیمؑ سے اور صاحبِ معراجؐ سے ملاقاتیں ہوئیں انبیاے نامیدہ کا تقرر بایں ترتیب کیا منشا ہے،

اور پھر انہی حضراتِ کرام کا تقرر کیوں ہوا، حالانکہ ان کے علاوہ اولوالعزم جلیل القدر صاحب کتاب اور پیغمبران بھی مذکور ہیں،

۳- انبیاے مذکورین کا تقرر اپنی اپنی منزلوں پر بغرض افادہ تھا یا استفادہ ؟ اگر افادہ کی غرض سے تھی، تو کیا وہ غرض دیگر انبیاء سے پوری ہو سکتی تھی یا نہیں ؟ اور نیز مفید کا مستفید سے افضل و اکمل ہونا ضروری ہے یا نہیں، اگر ضروری ہے تو مستفید کی افضلیت و اکملیت خود واقعۂ معراج اور مسجد اقصیٰ میں امامت انبیاے مرسلین سے دیگر صفات و حیثیات سے ثابت ہے، نظر بران کسی صاحب کا یہ کہنا کہ انبیاے مذکورین کا تقرر بغرض افادہ تھا، اور ملاقاتیں بغرض استفادہ تھیں، کہاں تک صحیح ہے ؟

معارف:- دودھ فطرتِ صالحہ اور شراب فطرت فاسدہ کی جس کا دوسرا نام ضلالت ہے تمثیل ہے، حضرت انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دونوں چیزیں پیش کی گئیں، حضرتؐ نے اپنے اختیار سے دودھ کو جو فطرت صالحہ تھی، قبول فرمایا، اور فطرت فاسدہ کو رد فرمایا، حضرت صلعم کی تمثیل ذوقی میں امت کا وجود پنہاں تھا، آپ نے اپنی امت کی طرف سے فطرتِ صالحہ کو پسند فرمایا، جس کا دوسرا نام اسلام ہے، فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا،

۲- دوسرے سوال کا پہلا جزیہ ہے کہ انبیا علیہم السلام باین ترتیب کیون ہوئے تو ظاہر ترتیب مین ابتدار و انتہا، و اوسط کی مناسبت ہے، حضرت آدم پدر اوّل، اور حضرت ابراہیم پدر آ بیچ کے انبیار علیہم السلام اخوان ہین ۔

سوال کا دوسرا جزیہ ہے کہ انہی کا انتخاب کیون ہوا، جواب یہ ہے کہ اوس فطرتی مناسبت ہوا، جو ان انبیاے کرام علیہم السلام مین فرداً فرداً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مین مجمعاً تھی،

۳- یہ نہ افادۃً تھا، نہ استفادۃً بیلکہ اکراماً للضیف اور استیناساً للمتناسبین تھا،

وَاللہ اعلم وعلمہ اتم ۔

"س"

تابعینؓ

علم وعمل اور مذہب واخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد انہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس مین حـ ابنؓ عبد العزیز، حضرت حسن بصریؓ، حضرت اویسؓ قرنی، حضرت امام زین العابدینؓ، حضرت امام باقرؓ امام جعفر صادقؓ، حضرت محمدؓ بن حنفیہ، حضرت سعید بن مسیبؓ، حضرت سعیدؓ بن جبیر، حضرت محمد بن شـ ابن شہاب زہریؓ، امام ربیعہ رائیؓ، امام مکحولؓ شامی، قاضی شریحؓ وغیرہ چھیانوے اکابر تابعینؓ کے کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور علمی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ: شاہ معین الدین احمد ندوی،

ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت :- للعہ

منیجر

وفیات

آہ! شمس العلما مولانا محمد حفیظ اللہ سابق مدرس اعلیٰ دار العلوم ندوہ

حضرت مولانا ابوالحسنات عبدالحیٰ صاحب فرنگی محلی کی آخری یادگار مٹ گئی یعنی اُن کے آخری شاگرد رشید مولانا محمد
اللہ صاحب جوان کی مجلسِ درس کی اکیلی یادگار رہ گئے تھے ۱۳۶۲ھ کے خاتمہ ماہ میں وفات پاگئے،

مرحوم ۱۸۵۶ء کے آخر میں ضلع اعظم گڈہ کے چھوٹے سے گاؤں بندی میں پیدا ہوئے تھے، غدر ۱۸۵۷ء میں وہ دو ما
ھے اور اسی قدر وہ مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ سے بڑے تھے ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھکر وہ اپنے عزیز مولانا سلامت اللہ
ب جیراجپوری (والد حافظ اسلم صاحب جیراجپوری) کے ہمراہ بنارس تعلیم کیلئے گئے وہان سے واپس آکر مدرسہ چشمۂ رحمت
ور میں پڑھنے کیلئے گئے اور وہان فارسی کی اونچی کتابیں پڑھین اس زمانہ میں غازیپور میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی کے
د رشید مولانا غلام جیلانی صاحب تھے ان سے ابتدائی عربی کتابیں شروع کین چند سال مین اُن سے متوسطات تک پڑھکر انہی
ورہ سے فرنگی محل لکھنؤ مین مولانا ابوالحسنات عبدالحیٰ صاحب فرنگی محلی کی مجلسِ درس میں حاضر ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب دارو
بش کی مسجد جو چوک میں عربی اور طب پڑھنے والونکا گویا دارالاقامہ تھا، نئی بنکر تیار ہوئی تھی چنانچہ حضرت مولانا عبدالحیٰ
ب کی سفارش سے انکو اس کے حجرہ میں رہنے کی جگہ ملی اور یہان کئی سال رہکر معقولات اور دینیات کی تعلیم حاصل کی
ت کے بعد جو غالباً ۱۸۸۰ء میں ہوئی ہوگی، وہ کاکوری ضلع لکھنو کے ایک مقامی مدرسہ مین مدرس مقرر ہوئے یہی سلسلہ ہے
کہ وہ جناب منشی محمد احتشام علی مرحوم رئیس کاکوری سے ملے، اور ایسے ملے کہ پھران کے دل الگ نہ ہوئے، اگلے زمانہ میں دوستوں کی
داریان آج عجیب معلوم ہوتی ہین چند ہی سال کے بعد ریاست رامپور کی مشہور مدرسۂ عالیہ میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے یہ وہ
تھا جب رامپور اہلِ کمال کا مرکز تھا، مولانا عبدالحق خیرآبادی کا وہان طوطی بول رہا تھا، اس عہد مین ان کا وہان جانا،

اور اہل علم کی نگاہوں میں وقار پیدا کرنا معمولی کارنامہ نہیں، دونوں میں نواب صاحب کے سامنے ایک دفعہ کسی فلسفیانہ مسئلہ پر مناظرہ بھی ہوا،

مولانا مرحوم کو زیادہ تر شوق معقولات ہی کا تھا، قدیم فلسفہ و منطق میں بڑی دسترس حاصل کی تھی، ساتھ ہی ریاضیات میں کمال پیدا کیا تھا، چنانچہ رامپور کے زمانہ قیام میں تصریح پر ۱۳۱۲ھ میں حاشیہ لکھا جو عام طور سے شائع ہے،

رامپور کے زمانہ قیام میں جنرل عظیم الدین مرحوم کا عہد دیکھا تھا ان کے شجاعانہ کارنامے وہ خوب خوب بیان کرتے تھے، یہ تو رزم تھی، بزم میں جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے شاعرانہ کمالات اور بعض مشاعروں کے حالات بڑی دلچسپی سے سناتے تھے آداب مجلس سے خوب واقف تھے، اور بڑی مزہ دار باتیں کرتے تھے، لطائف و ظرائف کی بھی کمی نہ تھی، سیر و شکار کا بھی شوق تھا، بڑے قادر انداز تھے،

رامپور سے وہ لکھنؤ آئے اور دار العلوم ندوہ کے افتتاح کے وقت ۱۳۱۷ھ میں وہ اس کے مہتمم اور مدرس اول مقرر ہوئے جس پر وہ ۱۹۰۸ء تک قائم رہے، ہیچمدان نے اسی زمانہ میں اُن سے مدرسہ دار العلوم میں معقولات و منقولات کی کتابیں پڑھیں، مولانا شبلی مرحوم کے وہ معاصر تھے، اسلئے جب صحبت ہوتی تو دونوں میں خوب نوک جھونک ہوتی، گفتگو کا موضوع کوئی فلسفہ کا مسئلہ یا عقل و نقل کی تطبیق کی معرکہ آرائی ہوتی،

دار العلوم سے وہ ۱۹۰۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں گئے ۱۹۲۷ء میں وہاں سے پنشن یاب ہوئے اسی سال وہ حج کو گئے اور وہاں سے واپس آکر لوگوں کے اصرار سے دوبارہ ندوہ کی صدر مدرسی قبول کی اور کئی سال تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۳۰ء میں ندوہ سے الگ ہو کر وطن واپس آگئے تھے، اور یہیں ۲ ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ کو وفات پائی،

مولانا عبد الحی مرحوم کی شاگردی کی باوجود مرحوم آخر میں عامل بالحدیث ہوگئے تھے، عدم تقلید کا میلان پہلے سے رکھتے تھے، جو شاید مولوی سلامت اللہ صاحب کی ابتدائی صحبت کا اثر رہا ہو، انکی تصانیف میں تصریح الافلاک کا حاشیہ علمی یادگار ہے، ۱۸۵۶ء کے آخر میں پیدا ہوئے تھے اس حساب سے وفات کے وقت انکی عمر تقریباً ستاسی اٹھاسی سال کی تھی لیکن دو چار سال پہلے انکی صحت و توانائی قابل رشک تھی، اور ان کے جسمانی قویٰ نہایت اچھے تھے، ادھر چند برسوں سے البتہ ضعف و اضمحلال کا اثر نمایاں اور آخری زمانہ میں ذہول و نسیان کا غلبہ زیادہ ہوگیا تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے،

"س"

ادبیات

غزل

از جناب نجم احسن صاحب ایڈوکیٹ پرتاب گڈھ، اودھ

موت ہی اُس کے لئے زیست کا سامان ہوجائے
آدمی عشق مین مٹ جائے تو انسان ہوجائے

حُسنِ صورت ہو بشر مین تو گلستان ہوجائے
حُسنِ معنی مین ترقی ہو تو انسان ہوجائے

عشق مین حُسن کی ہر آن نمایان ہوجائے
عشق جانان ہی اگر جلوۂ جانان ہوجائے

یا تو محجوب ہی یہ عالمِ امکان ہوجائے
ورنہ جو کچھ ہے سبھی جلوۂ جانان ہوجائے

حُسن ہوجائے مرا عشق جو پنہان ہوجائے
عشق ہوجائے ترا حُسن جو حیران ہوجائے

مرحلہ دید کا مشکل ہو کہ آسان ہوجائے
چشمِ پُرشوق کو لازم ہے کہ حیران ہوجائے

ذوق آرا کبھی ہوجائے جو رنگینیٔ درد
کچھ تو مخموریِ احساس کا سامان ہوجائے

یا خدا جس کو محبت نے کیا ہے برباد
اُس ستم گر کی محبت مرا ایمان ہوجائے

تب اُسے آئین گے کچھ بادۂ رنگین کے مزے
شیخ ظالم جو کبھی صاحبِ عرفان ہوجائے

بے تامل ترے قدمون پہ فدا ہوتا ہون
عشق کا فرض یہ ہے حُسن پہ قربان ہوجائے

کم سے کم دردِ محبت نے نوازا تو مجھے
یا خدا ہر رگِ تن اب تو رگِ جان ہوجائے

جان لیں کچھ جو ملک منزلِ عصیان کے رموز
شہپرِ ہر ملک آلودۂ عصیان ہوجائے

نازِ قاتل تو نمک ریز نمک پاش بھی ہو
زخمِ دل کیون مرا محتاجِ نمکدان ہوجائے

غیرتِ حُسن کا حق یون ہی ادا ہوتا ہے کیا کرے دیکھنے والا جو نہ حیران ہو جائے

ہر فرشتہ اُسی منزل پہ کرے آکے قیام جو اُسے معرفتِ منزلِ عصیان ہو جائے

آگ ہو جاتی ہے گلزار پئے اہلِ وفا کیون جہنم بھی نہ اب گلشنِ رضوان ہو جائے

کچھ تو احسن کو محبت مین مزے آنے لگین

میرے اللہ یہ کافر بھی مسلمان ہو جائے

بدمستی

از جناب ثاقب گورکھپوری

کُلابیان اُتار لے کہ کام ہے مدام سے شفق کے سُرخ طاق سے فلک کے سبز جام سے

فلک کی مے سے کام ہو زمین کی مے سے کیا غرض اسی قدر ہے فاصلہ حلال کو حرام سے

عنب کی تاک میں ہے کیا بجز قطارِ آبلہ انھین کا آب مشتہر ہے سب میں مے کے نام سے

وہ شمعِ عقل آندھیون سے جو کبھی بجھی نہین خموش ہو کے رہ گئی ہے اس کے ایک جام سے

بری ہے مے کی واقعی بنائے سے بنی نہین نہ میرے اجتناب سے نہ تیرے احترام سے

سبو سے انبساط کیون میں کہ تنگ ظرف ہے خمون کا اشتیاق کیون فقط خیالِ خام سے

ملا رہے ہین ناشناس ساغر شراب کو کبھی تو آفتاب سے کبھی مہِ تمام سے

اسی نجس شراب کا تو نام آفتاب ہے مآل مین سیاہ ہے جو زلف مشک فام سے

یہ جس گلے مین آ گئی اُسی کا دم گھٹا کیا صراحیون کی ہچکیون کو پوچھ گوشِ جام سے

یہ مے کشون کی آرزو ہے ایک خونِ آرزو لہو ٹپک رہا ہے اس کے رنگِ لالہ فام سے

قدم قدم پہ ایک حشر اور پھر جزا نہیں یہ نیتین رہی ہیں جو اُٹھین نہ احترام سے

اسی خرامِ ناز کا خمار ایک نام ہے نہ چل وہ راستہ جہان خمار ہو خرام سے

جسے شراب کہتے ہیں یہی تو شہر آب ہے | نہ کام ہے یہ کام ہے بجا زبان کو نام سے
وہ میکدہ فلک کا ہی جو طاہر و طہور ہے | جہاں میں صبح ہوتی ہے اُسی کے ایک جام سے
مخرب دماغ ہے سُرور رنگ و کیف ہے | حواس بھاگتے ہیں مسکرات زشت کام سے

منشیات بالعموم لائق نفور ہیں
یہ مستفاد مجملاً ہے رشحۂ کلام سے

سوزدرون

از

جناب اسد ملتانی

ابھی تک تو نہیں دیتے لگا سوز درون میرا | بس اتنا ہے کہ اکثر کھولنے لگتا ہے خون میرا
نہیں ہیں بے خبر احباب میرے زخم پنہاں سے | کہ غماز دل پرخون ہے اشک لالہ گون میرا
جو ہنگامے سے مقصد ہو فقط ہنگامہ آرائی | تو ان بے کار ہنگاموں سے بہتر ہو سکون میرا
تلاش خضر کو سنگ رہ منزل سمجھتا ہوں | وفور شوق ہے دست طلب میں رہنمون میرا
میں کاخ و کوہ میں کر سکتا ہوں شیوہ خو پا | نہیں ہے پائے بند وسعت صحرا جنون میرا
زمانے کی نظر کو دیکھکر حیران رہتا ہوں | اُسی پر داد ملتی ہے جو ہو صید زبون میرا
وہی مومن ہے جس کو دیکھکر باطل پکار اٹھے | کہ اس مرد خدا پر چل نہیں سکتا فسون میرا

اسد ذوق سلیم و چشم روشن کی علامت ہے
نئی تہذیب کی محفل میں جام واژگون میرا

باب التقریظ والانتقاد

انگریزی ترجمۂ قرآن مجید مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی اعظم گڈھ

اس زمانہ مین جب مسلمان نوجوانون کے اندر براہ راست صحیفۂ اسلام کے ذریعہ سے اسلام کے مطالعہ کا شوق روز افزون ہے، اس بات کی سخت ضرورت تھی، کہ قرآن پاک کا کوئی ایسا ترجمہ ان کے ہاتھون مین ہو جو تاویلات بعیدہ اور زمانہ کے تغیرات کے مطابق رنگ آمیزی سے بالکل پاک ہو اور قرآن پاک کو بعینہ اسی رنگ اور اسپرٹ مین پیش کرے جس مین وہ صدر اوّل مین سمجھا جاتا تھا،

انگریزی مین اس وقت تک دو قسم کے ترجمے ہین یا تو وہ عیسائیون کے کئے ہوئے ہین جن کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہین، یا بعض ایسے لوگون کے قلم سے نکلے ہین جن کے عقائد و افکار سے جمہور اسلام کو موافقت نہین مسٹر عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ جو ابھی حال میں شائع ہوا ہے، بے شبہہ بہت حد تک ان مفاسد سے بری ہے لیکن اعلیٰ انشاء پردازی کے تخیل نے مترجم کو اس بات پر مجبور کیا ہے، کہ قرآنی الفاظ کی پابندی کے بجائے حاصل مطلب پر قناعت کرے، اسی طرح مسٹر محمد پکتھال کا ترجمہ بھی اوّل تو اغلاط سے پاک نہین ثانیاً اس مین بھی یہی نقص ہے، ان حالات کی موجودگی مین ایک ایسے ترجمہ کی حاجت تھی، جو کسی صحیح الخیال اور پابند دین مترجم کے قلم سے نکلا ہو، اور جمہور اسلام کے معتقدات کے مطابق ہو، لفظون کے حدود سے باہر نہ ہو، اور جس کے حواشی مین

موجودہ زمانہ کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو اور جس کی زبان بھی صاف ستھری اور عام پسند ہو،

جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی بی اے جن کو ہم مدت تک فلسفی کی حیثیت سے جانتے رہے، اور جن کی اردو تصنیفات ادب اور دانش کا مجموعہ ہین جب سے ان کے مذہبی خیالات مین انقلاب پیدا ہوا، اور وہ فلسفی سے صوفی بنے، ان کے قلمی فیوض سے اپنے کو محروم سمجھ رہے تھے، لیکن چند سال کی خاموشی کے بعد اُن کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہمارے سامنے آیا اور یہ قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ ہے جس کی تیاری مین وہ کئی سال سے معروف تھے" جس کو وہ تکمیل تک پہنچا سکے، اور اب ایک ایک پارہ کرکے تاج کمپنی لاہور کے ذریعہ سے شائع ہو رہا ہے، اور اس وقت اس کا پہلا حصہ جو پارۂ اول ۱ تا ۱ مٓ پر مشتمل ہے، ہمارے سامنے ہے، اس ترجمہ کو دیکھ کر ہم کو بڑی خوشی ہوئی، کہ مولانا نے وقت کا ایک اہم کام کیا اور مسلمان نوجوانون کے ہاتھون مین ہدایت کا ایک چراغ دیدیا، اس ایک پارے کو دیکھکر اس ترجمہ کی حسب ذیل خصوصیات نظر آئین،

(۱) زبان صاف ستھری صحیح اور فصیح ہی لیکن نہ بہت اونچی ہے اور نہ بہت نیچی ہے، اور اس بنا پر اس سے معمولی انگریزی دان بھی اسی طرح فائدہ اٹھا سکتے ہین جس طرح اعلیٰ انگریزی کے تعلیم یافتہ،

(۲) مترجم نے ترجمہ مین مقدس بائبل کی زبان اور محاورات کی پابندی کی ہے، گو موجودہ زمانہ کے بعض کم فہمون کو یہ بات قابل اعتراض نظر آئے گی لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہین کرنی چاہئے، کہ مقدس" اور آسمانی کتابون کی زبان اور طرز ادا عام ادبی کتابون کی زبان سے قطعاً الگ ہونی چاہئے تاکہ پڑھنے والے پر یہ اثر پڑے، کہ وہ عام ادبی کتابون سے بالاتر ایک صحیفۂ ربانی کو پڑھ رہا ہے جس کا تقدس اور جس کی عظمت زبان اور طرز بیان مین بھی اپنی انفرادیت کی شان لئے ہوئے ہو،

(۳) ترجمہ کی لفظی خصوصیت صرف اہل نظر کو نظر آئیگی، جس قدر زیادہ باریک بینی سے غور کیا جائے گا مترجم کی تلاش اور عربی لفظ کے بالمقابل اس کے صحیح انگریزی مفہوم ادا کرنے کی کوشش جھلکتی ہوئی نظر آئیگی اگر انگریزی کا کوئی لفظ عربی کے بالمقابل ہم معنی ان کو نظر نہیں آیا ہے، تو عام انگریزی لفظ دیکر حاشیہ مین

اس کی تشریح مناسب کر دی ہے، مثلاً رب کا ترجمہ انگریزی مین عام طور سے Lord یا Sovereign سے کیا جاتا ہے، مگر اس لفظ کے معنی مین جو حقیقت ہے، ان دو لفظون مین سے کسی ایک سے بھی ظاہر نہیں ہوتی، ہمارے مترجم نے اس کمی کو اپنے حاشیہ سے پورا کیا ہے،

(۴) اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے، کہ انگریزی انشا پردازی کی خاطر عربی لفظ کے صحیح معنی کو انگریزی لفظون مین بگاڑا نہ جائے، یعنی قرآن پاک کے مفہوم کو اپنی مفروضہ بلاغت اور فصاحت کے لئے برباد نہ کیا جائے

(۵) جمہور اسلام کے صحیح عقائد اور خیالات کی خلاف ورزی نہ کی جائے، اور موجودہ زمانہ کی عقلیت پسندی اور خلاف محاورہ منطقیانہ معنی آفرینی اور معجزات اور خوارق کو خلاف فطرت نہ ثابت کئے جانے کی خاطر سید احمد خان مرحوم سے لے کر مولوی محمد علی لاہوری تک جو کوششین کی گئی ہین، اون سے قطعاً پرہیز کیا جائے،

(۶) ان مسائل اور واقعات کے بیان مین ان عقل پسند مترجمون نے اپنے زعم مین قرآن پاک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے جو غلط طریقے اختیار کئے تھے، اُن سے پرہیز کیا جائے،

(۷) عام طور سے اردو اور انگریزی مترجمون نے یہ کیا ہے، کہ مضمون کی وضاحت کے لئے نفس ترجمہ ہی مین بریکٹ کے ساتھ یا بریکٹ کے بغیر الفاظ بڑھائے ہین، موصوف نے اس مین بڑی احتیاط برتی ہے، ایسے موقع پر اونھون نے نفظ پر حاشیہ دیکر زائد تشریح درج کر دی ہے تاکہ آیت کے صحیح معنون مین انسانی اضافون کا اختلاط نہ ہونے پائے،

(۸) حاشیون کے لکھنے میں موصوف نے بڑی خدمت انجام دی ہے، گویا یہ کہنا چاہئے کہ ان کے ذریعہ سے ایک نیا علم کلام مسلمانون کے ہاتھون آگیا ہے،

(۹) ان حاشیون مین بعض ایسی تحقیقات ہین، کہ جن سے عام طور پر پُرانے ترجمے خالی ہین، اور یہ وہ کوششین ہین کہ جو اونھون نے آیتون کے گرامر، تاریخ، جغرافیہ اور تورات وانجیل کے بالمقابل موازنون مین صرف کی ہین،

(۱۰) سب سے بڑھکر یہ کہ یہودی اور عیسائی تصنیفات مین قرآنی تائیدات کی جو تحقیقین ملی ہین، ان کو ان کے ساتھ موقع بموقع نقل کرتے گئے ہین، اور جدید مستند انگریزی لٹریچر مین بھی جو باتین ان کو قرآن کے لئے مفید نظر آئی ہین ان کو بھی اپنے موقع پر جگہ دی ہے،

(۱۱) عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کے حوالون مین اونھون نے اصل کتابون کے حوالون کو محنت اور کوشش سے تلاش کرکے ان کے باب اور آیت کے نمبر آسانی کے لئے دیدیئے ہین،

(۱۲) سب سے آخری چیز یہ ہے کہ ہمارے انگریزی خوان اصحاب عربی دانی کے کسی درجہ پر ہون، اس تحقیق، تقویٰ اور احتیاط سے عام طور سے یقیناً خالی ہین جو علمائے محققین اور صالحین کی خصوصیت ہے، اس بنا پر یہ چیز اس ترجمہ اور اس کے تشریحی بیانات کی صحت کے لئے بڑی طمانیت بخش ہے، کہ یہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمۂ قرآن اور تفسیر البیان کو سامنے رکھکر کیا گیا ہے،

اس ترجمہ کی ناشر تاج کمپنی ریلوے روڈ لاہور کو بھی مبارکباد دینی چاہئے، کہ اس نے اس زمانہ مین جبکہ کاغذ اور سامان طباعت کی گرانی بلکہ نایابی کا یہ عالم ہے، اس انگریزی ترجمہ کی اشاعت کی ہمت کی ہے، کاغذ اچھا، ٹائپ عمدہ اور نیا ہے، اور عربی عبارت کو بھی بلاک کے خوبصورت خط میں شائع کیا گیا ہے، صفحہ کے اوپر اصل مین ترجمہ اور نیچے کسی قدر باریک ٹائپ مین حواشی ہین، عارضی بارہ اس کی قیمت رکھی گئی ہے،

ضرورت ہے کہ انگریزی دان مسلمان اس کی خریداری کی طرف توجہ کرین اور اس کا ایک ایک نسخہ منگوا کر مطالعہ کرین،

المنہاج

از جی، ام، ڈی، صوفی، ام، اے، ال، ٹی (الہ آباد) ڈی، لٹ، (پیرس) تقطیع اوسط، صفحے ۱۴۸، لکھائی، چھپائی، عمدہ، ناشر، شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور، قیمت للعہ

مندرجۂ بالا کتاب ہندوستان کی اسلامی درسگاہون کے تعلیمی نصاب کے ارتقاء کی گویا تاریخ ہے جس کو

مؤلف نے ۱۹۳۵ء مین پیرس یونیورسٹی مین ڈاکٹریٹ کے مقالہ کی حیثیت سے پیش کیا تھا، اور اس پر اُن کو ڈگر
ملی تھی، دراصل یہ مقالہ فرانسیسی زبان مین لکھا گیا تھا، ہندوستان کے ارباب علم کے استفادہ کے لئے مؤلف نے
کا انگریزی ترجمہ کر دیا ہے، جس کو شیخ محمد اشرف ناشر لاہور نے اپنی اور مطبوعات کی طرح اعلیٰ طباعت کیساتھ شائع

کتاب مین تمہید اور مقالہ کے علاوہ چار ابواب ہین (۱) ترکون اور افغانون کے عہد مین نصاب تعل
مغلون کے عہد مین نصاب تعلیم (۳) برطانیہ کے عہد مین نصاب تعلیم (۴) آزاد ہندوستان کے نصاب تعلیم پر چ
آخر مین ماخذ کی فہرست اور اشاریہ ہے، ایک طویل ضمیمہ بھی ہے، جس میں کلکتہ اور بمبئی کے مختلف امتحانات
مضامین کی تفصیل ہے،

یہ کتاب اس حیثیت سے مفید اور پُر از معلومات کہی جا سکتی ہے، کہ انگریزی زبان مین مسلمانون کے گ
اور موجودہ تعلیمی نصاب کے خاکے کو مرتب طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، جس سے مختلف دور کے نصاب کا تدریجی ارتقا
کے سامنے آجاتا ہے، مگر جب اس کے پہلے دو ابواب کے ماخذ پر نگاہ ڈالتے ہین، تو اس کے علمی وقار مین بڑی کمی
ہو جاتی ہے، مؤلف نے ان دو ابواب کے مباحث مین صرف دو کتابون ان۔ ان۔ لا کی تصنیف پروموشن آ و
محمڈن لرننگ" اور مولانا ابوالحسنات صاحب ندوی مرحوم (رفیق دار المصنفین) کی کتاب "ہندوستان کی قدیم
کو ماخذ بنایا ہے، اس مین شک نہین کہ یہ دونون کتابین اپنے معلومات کے لحاظ سے استفادہ کے لائق ہین، مگر
تحقیقی مقالہ کی ترتیب مین صرف ان دونون کتابون کو ذریعۂ معلومات بنانا اس کے تحقیقی درجہ کو کم کر دیتا
مولانا ابوالحسنات صاحب مرحوم نے اپنی کتاب کے خاتمہ پر تحریر کیا تھا، کہ "یہ اسلامی عہد حکومت مین ہند
کی اسلامی تعلیم اور تعلیم گاہون کا مختصر سا خاکہ ہے، مین نے علی العموم اجمال و اختصار سے کام لیا ہے،
تفصیل و تشریح کی طرف توجہ کیجائے، تو پھر دفتر کا دفتر چاہیے، جس کے لئے نہ موقع ہے اور نہ وقت لیک
اس مین کوئی شک نہین کہ مزید توجہ کے بعد قطرہ دریا بن سکتا ہے" لیکن المنہاج کے مؤلف نے اس قطرہ کو
بنانے کے بجائے صرف "دس سے پیاس بجھانے پر اکتفا کی، اگر کہیں کسی نئی بات کا اضافہ بھی کیا ہے تو تجدد پسند

روشن خیالی کے جوش میں ان کے بیانات جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں، مثلاً نصاب موسیقی کے سلسلہ میں ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ موسیقی کی تعلیم کلام مجید، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صوفیائے کرام کی عین تعلیم کے مطابق ہے، (ص ۲۰۳) جو سراسر غلط ہے ممکن ہے کہ مصنف کو موسیقی سے دلچسپی ہو یا موجودہ تمدن و معاشرت کے زیر اثر اس فن کو تعلیم کا ضروری جزء سمجھتے ہوں لیکن اس کے لئے انھیں مذہب کو آڑ بنانے کی کیا ضرورت ہے، اگر موسیقی سے مراد خوش گلوئی، خوش الحانی اور ترنم ہو تو اس کی البتہ اسلام نے ممانعت نہیں کی ہے لیکن محض اتنی سی بنیاد پر موسیقی یعنی گانے اور ساز وغیرہ کو جائز بتانا سراسر غلط ہے مذہبی احکام کی غلط تعبیر سے خواہ وہ حسن نیت ہی سے کیوں نہ ہو، طرح طرح کے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں، اس قسم کے خطرات کو پیش نظر رکھنا ایک محتاط مصنف اور مقالہ نگار کا اولین فرض ہونا چاہئے،

اسلامی دور حکومت کی صنعتی اور فوجی تعلیم پر بھی مباحث ہیں، مگر یہ بہت ہی سرسری اور تشنہ ہیں تیموری عہد میں فوجی تعلیم کے متعلق مؤلف نے گویا صرف اس پر قناعت کی ہے کہ "ابو الفضل کی لکھی ہوئی تفصیلات سے اس تعلیم کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے، جو فوجوں کی مختلف جماعتوں کو دیجاتی تھی"۔ اگر تھوڑی سی محنت اٹھا کر اس فوجی تعلیم کی تفصیل بھی درج کر دیجاتی تو کتاب کا معیار بلند ہو جاتا، حالانکہ اس سلسلہ میں تیموری بادشاہوں اور شاہزادوں کے سپاہیانہ اور بہادرانہ کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، مگر اس ذکر سے صرف ان کی ذاتی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے، اس عہد کے لشکریوں کی فوجی تعلیم کا خاکہ سامنے نہیں آتا، بعجلت میں مؤلف نے ہندوستان کے بعض اہم مسلمان فرمانرواؤں کے عہد کے تعلیمی نصاب کا استقصا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا ہے، مثلاً اکبری دور کے فضلا اور علما کا ذکر تو کیا ہے مگر اس زمانہ کے نصاب تعلیم کو نظر انداز کر کے اورنگزیب اور اسکے بعد کے تعلیمی نصاب کی فہرست پر بحث کی گئی ہے، حالانکہ آئین اکبری میں اکبری دور کے نصاب تعلیم کی تفصیل موجود ہے، اسی طرح تھوڑی سی توجہ سے فیروز شاہ کے عہد کا تعلیمی نصاب بھی معاصر تاریخوں سے مرتب کیا جا سکتا تھا، اسلامی دور کی تعلیم نسواں پر بھی کافی معلومات فراہم ہو سکتے تھے اگر صرف مالوہ کے فرمانروا سلطان غیاث الدین ابن محمود خلجی کے عہد میں عورتوں کی تعلیم پر نظر ڈالی جاتی، سنین میں بھی کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں،

مگر عام اور سرسری مطالعہ کے لئے یہ کتاب مفید کہی جاسکتی ہے، طرز بیان صاف، رواں اور دلچسپ ہے۔ "ص ع"

مطبوعات جدیدہ

محمد علی از مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر،

قیمت عہ/ ۱۲، پتہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

مولانا محمد علی مرحوم کی وفات کے بعد مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی نے مرحوم پر اپنے اخبار سچ مین مضامین کا ایک سلسلہ لکھا تھا، مذکورۂ بالا کتاب مین ان مضامین کو مرتب طریقہ سے جمع کر دیا گیا ہے، مولانا محمد علی مرحوم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ان مضامین کی حیثیت اُن سے مختلف ہے، مولانا مرحوم اور فاضل مضمون نگار مین خاص ربط و اخلاص تھا، بعض کامون مین وہ انکے شریک بھی رہے تھے، اسلئے انھیں مرحوم کی خلوت و جلوت، پبلک اور پرائیوٹ زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور اس کا کوئی رُخ اُن کی نگاہ سے مخفی نہین تھا، ان مضامین مین اسی کی عکاسی کی گئی ہے، اس کتاب مین ۱۹۱۲ء سے لیکر ۱۹۲۴ء تک صاحبِ سوانح کے جستہ جستہ اجمالی حالات ہین، اور ۱۹۲۵ء سے آخر زندگی تک کے کسی قدر تفصیلی، یہ حالات ایک واقعہ نگار کے بیان کی طرح محض تاریخ کی کھتونی نہین ہین، بلکہ اس سے مولانا مرحوم کے ملکی و ملی خدمات کے ساتھ ان کے فضل و کمال، ذہانت و ذکاوت، عقائد و خیالات، جذبات و رجحانات، غیرت قومی و حمیت دینی، اخلاص و للّہیت، حق گوئی و حق پرستی، مزاج و افتادِ طبع، ان کے اخلاق و کردار کی پوری تصویر، اور ان کی مجاہدانہ زندگی کی پوری روح سامنے آجاتی ہے، مرحوم کے گوناگون اوصاف و کمالات کی اس سے زیادہ جامع مصوری ممکن نہ تھی، اس کو پڑھ کر مرحوم کے مرقعۂ حیات کے تمام خط و خال نظر آجاتے ہین، سیرت محمد علی کی تالیف کے سلسلہ مین مولانا سے جو سہو ہوا تھا، اس کتاب سے

اس کی تلافی ہوگئی، انداز تحریر کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، مولانا کی سحر طرازی نے خشک تاریخی واقعات کو دلآویز افسانہ بنا دیا ہے، اور اس کتاب کے متعلق یہ فقرہ بالکل صحیح معنون مین صادق آتا ہے، کہ جب تک ختم نہ ہوجائے ہاتھ سے نہین چھوٹتی، یہ ایک ایسے پُرشور دور کے حالات ہیں، جس میں بہت سے اختلافی مسائل پیش آئے، بعض مین خود مؤلف کی حیثیت بھی فریق کی تھی، اس لئے ان مسائل کا زیر بحث آنا ناگزیر تھا، تاہم ان کے رمز شناس قلم نے اظہار حق کے ساتھ سنبھالنے کی پوری کوشش کی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب مولانا محمد علی مرحوم کے قدر دانون اور فاضل مصنف کی تحریرون کے قدرشناسون مین مقبول ہوگی،

ابوالکلام آزاد، مرتبہ جناب عبد اللہ بٹ صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۳۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور،

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے متعلق مختلف جماعتون کے متعدد اکابر و ممتاز اشخاص اور بعض عام لوگون نے بھی تحریری شکل مین اپنے تاثرات ظاہر کئے ہین، اس کتاب کے لائق مرتب نے ان سب کو اس کتاب مین یکجا کر دیا ہے، اس سے مولانا کے کمالات کے متعلق مختلف اہل نظر کی رائین اور اس کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہین، اگر اس کتاب کو محض اکابر کے تاثرات تک محدود رکھا جاتا، تو اسکی قدر وقیمت اور زیادہ بڑھ جاتی، مولانا کی ذات ایسی جامع کمالات ہے، اور ان کے واقعی اور صحیح کمالات اتنے گوناگون ہین، کہ ان مین کسی فرید اضافے کی مطلق ضرورت نہین، پھر معلوم نہیں بعض مضمون نگارون کو غیر صحیح واقعات لکھنے کی ضرورت کیون پیش آئی، بلکہ انکا اس سے مولانا کی عظمت مین کوئی اضافہ نہیں ہوتا، مثلاً ایک مضمون مین ہے کہ آپ نے قاہرہ کی مشہور عالم یونیورسٹی الازہر مین تعلیم حاصل کی، اور ۱۴ سال کی عمر میں آپنے جامع ازہر میں علوم مشرقی کا نصاب پورا کیا، اور اس قدر استعداد پیدا کرلی، کہ آپ کو مختلف مضامین کے پڑھانے پر مامور کردیا گیا" یا تذکرہ بیس سال کی عمر میں لکھا" ایک دوسرے مضمون مین ہے کہ ۱۹۰۵ء میں آپ کو قاہرہ کی یونیورسٹی الازہر میں بھیجا گیا .... ۱۹۰۷ء مین آپ عراق و شام و فلسطین کی سیاحت کرکے ہندوستان واپس آئے ص(۳۰۶) اسی مضمون مین ہے کہ ۱۹۰۵ء

مین آپ الندوہ کے اڈیٹر تھے، اور ۱۹۱۰ء مین وکیل کے اڈیٹر مقرر ہوئے حالانکہ مولانا نے اپنے "مولد و منشا و طفولیت وادی غیر ذی زرع" یعنی مکہ معظمہ سے ہندوستان آنے کے بعد پھر یہان سے باہر قدم نہین نکالا، مضمون کا یہ تضاد بیان بھی دلچسپ ہے کہ ایک طرف تو مولانا کو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں الندوہ اور وکیل کا اڈیٹر لکھا گیا ہے، اور اسی زمانہ مین ان کو الازہر مین بھی دکھایا گیا ہے، درحقیقت مولانا کی شخصیت اور ان کا علم ازہر کی تعلیم سے بلند ہے، کسی درسگاہ کی جانب ان کا تعلیمی انتساب ان کے لئے کوئی سند کمال نہیں ہے، ع

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبا را

تذکرہ اونھون نے بیس سال کی عمر مین نہین بلکہ اس وقت لکھا "جب قافلۂ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا تھا" (تذکرہ ص ۲۸۹) تیس سال کی عمر مین بھی ایسی کتاب لکھنا بجائے خود کمال ہے، ان خفیف فروگذاشتون سے قطع نظر کتاب دلچسپ ہے،

ضرورۃ القرآن حصہ اول از جناب قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۶ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عاریۃً مصنف دار الاشاعت والتصنیف ڈاکخانہ شمس آباد ضلع اٹک پنجاب۔

اس کتاب کا مقصد دنیا کے لئے قرآن مجید کی ضرورت کا اثبات ہے، اس حصہ مین لائق مصنف نے انسانیت اور کائنات کے متعلق بعض اسلامی تعلیمات کو پیش کرکے ان کے لئے مذہب، انبیاء اور الہامی کتابون کی ضرورت دکھائی ہے، ان کی صداقت کا معیار بتایا ہے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کے دلائل دیئے ہین، اور دوسرے مذاہب کی الہامی اور غیر الہامی کتابون کے نقائص ظاہر کرکے ان کے مقابلہ مین کلام مجید کے کمالات دکھائے ہین، ان مباحث مین مصنف کو موضوع سے متعلق وغیر متعلق ضروری وغیر ضروری اور معتبر وغیر معتبر جس قسم کے معلومات مل سکے ہین ان کو بے کم وکاست نقل کر دیا ہے، بعض باتین نہ صرف غیر ضروری بلکہ ناقابل تحریر تھین، اس حصہ میں اتنی غیر ضروری بحثین آگئی ہین کہ اصل موضوع تشنہ رہ گیا ہے، ممکن ہے دوسرے حصہ میں اس کی تلافی ہو، یہ کتاب مواد، ترتیب اور زبان وبیان مختلف حیثیتون سے نظر ثانی کی محتاج ہے، لیکن

خوش عقیدہ عوام کے لئے مفید ہے، اللہ تعالیٰ مصنف کو ان کے حسن نیت کا صلہ عطا فرمائے،

ہم کیسے پڑھائیں، از جناب سلامت اللہ صاحب ایم اے، معلم جامعہ ملیہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی، اور اس کی شاخیں لکھنؤ، بمبئی، نمبر ۳۔

بچون کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہے لیکن اب تک اس کی طرف پوری توجہ نہ ہو سکی، یون تو اس کا پورا نظام تعلیم موجود ہے لیکن وہ جدید قومی ضروریات اور نئے تعلیمی اصولون سے مطابقت نہیں رکھتا، اور نہ اس موضوع پر اردو مین کتابین ہیں، غالباً جامعہ ملیہ ایک ایسی درسگاہ ہے، جہان جدید تعلیمی اصولون کے مطابق اس کا عملی تجربہ ہو رہا ہے، اسلئے یہیں کے ایک استاد نے معلمین کی واقفیت کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، اس مین تعلیمی مواد یا نصاب تعلیم کے انتخاب اس کے باہمی ربط و تعلق کے اصولون پر بحث کی گئی ہے، اور اس کے قبول کے لئے بچون کی ذہنی تربیت کے طریقے بتائے گئے ہین اور پڑھانے میں مختلف نئے طریقون کو جن کا یورپ و امریکہ مین تجربہ ہو چکا ہے تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ان مباحث مین ہندوستان کی ضروریات اور یہان کے حالات کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے، ہر بحث کے آخر مین ماخذ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے، کتاب کی اصلی خوبی کا صحیح اندازہ تو فن تعلیم کے واقفکار ہی کر سکتے ہین لیکن بظاہر کتاب مفید تعلیمات پر مشتمل اور اساتذہ و معلمین کے استفادہ کے لائق ہے،

طریق مستقیم مترجمہ جناب محمد اسماعیل صاحب ایم اے، تقطیع اوسط، ضخامت ۹۹ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- مطبوعہ فاین پریس، ہیوٹ روڈ۔ لکھنؤ،

حضرت شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا مجموعہ کتاب الصدق عربی مین تصوف کی مشہور و معروف کتاب ہے، اس میں حضرت شیخ نے کلام مجید، احادیث نبوی اور صلحاء و اخیار امت کے اقوال و حالات کی روشنی مین تصوف کے مہمات مسائل اور تقرب الی اللہ جملہ قلبی اعمال، اخلاص، صبر، معرفت نفس، معرفت ابلیس، حلال صافی یا اکل حلال، ترک دنیا، خشیت الٰہی، حیا، محبت، رضاے الٰہی، اور انس مع اللہ میں صدق کی حقیقت

اور اس کی تشریح بیان فرمائی ہے، ہر بحث شریعت کی روح اور عرفان و تصوف کا عطر ہے، کتاب اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، ترجمہ سلیس و رواں ہے،

علماے کرام کا مستقبل از جناب مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۴ صفحے،

کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور،

مصنف حیدرآباد کے سنجیدہ صاحب قلم ہیں اُن کے خیالات مین قدیم وجدید کا معتدل امتزاج ہی وہ مذہب و ملت کا بھی درد رکھتے ہین، اور زمانہ کے نئے تقاضون پر بھی ان کی نگاہ ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر انھون نے علماے کرام کے مستقبل پر غالباً یہ مضمون لکھا تھا، جسے کتابی صورت مین شائع کر دیا گیا ہی اس مین انھون نے علماے کرام کے منصب اوران کے فرائض و ذمہ داریون کو دکھایا ہے، اوران کے جمود و بےحسی، زمانہ کے حالات اور نئی ضروریات سے ان کی ناواقفیت و بےخبری، مسلمانون کی حالت سے ان کی غفلت اوراس کی دوسری خامیون اور کوتاہیون کو ظاہر کرکے مسلمانون کے حق مین اس کے مضر نتائج دکھائے ہین، اور علما، کو اُن کے فرائض کی جانب متوجہ کیا ہے، علما کے فرائض کے بارہ مین لائق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل صحیح ہے، ان کی بعض کوتاہیون اور مسلمانون کی زبون حالی سے بھی انکار نہین اس سلسلہ مین مصنف کے بعض مشورے یقیناً غور و توجہ کے لائق ہین لیکن حُسنِ نیت کے باوجود اس بحث مین جابجا ان کا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا ہے، اوراُن کے دینی احساس پر دورِ جدید کی تجدید و اصلاح کا غلبہ نظر آتا ہے، ان کے نزدیک شروع سے اب تک تمام علماے کرام نہ صرف مسلمانون کی حالت سے غافل اور خود غرضی مین مبتلا رہے، بلکہ انھون نے تجدید و اصلاح کی راہ مین مزاحمت پیدا کی، جو سراسر مبالغہ ہی مصنف نے مسلمانون کی جو جو خرابیان اور جو جو اصلاح طلب باتین شمار کرائی ہین، ان مین دینی نقطۂ نظر سے کوئی ایسا اصلاح طلب امر نہین ہے، جس کی اصلاح کی جانب علمانے توجہ نہ کی ہو، پھر نفس تجدید و اصلاح کے بارہ مین بھی مصنف کے بہت سے خیالات محلِ نظر ہین، مثلاً وہ موجودہ فقہ کو دفتر پارینہ قرار دیتے ہین اور اکثر کون کی غیر اسلامی

اصلاحات کو بھی جائز شمار کرتے ہین، جدید حالات و مسائل کے حل کی ضرورت سے انکار نہین، لیکن اس کے خاطر فقہ کو دفتر پارینہ قرار دے دینا صحیح نہین، اس فقہ کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی مصنف نے سمجھی ہی، بہرحال یہ کتاب بعض خیالات سے قطع نظر غور و توجہ کے لائق ہے،

اسلامی معاشرت از جناب غلام احمد صاحب پرویز تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر، پتہ :- تسنیم منزل شیدی پورہ قرول باغ نئی دہلی،

کلام مجید مسلمانون کی جملہ دینی و دنیوی ضروریات کا ضابطہ ہے، اس مین مسلمانون کی فوز و فلاح کے تمام مسائل بھی ہین، اور اجتماعی زندگی مین ایک دوسرے کے ساتھ حُسنِ معاملت اور حُسنِ معاشرت کی ہدایت بھی ہین، اگرچہ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتین ہین، لیکن انسانی اخلاق و کردار کی تربیت سے ان کا گہرا تعلق ہے، اس لئے اسلام مین ان کی بڑی اہمیت ہے، اور تکمیل اخلاق، اسلام کی تعلیم کا بڑا ضروری جز ہے، لائق مؤلف نے اس کتاب مین کلام مجید سے اجتماعی زندگی کی حُسنِ معاشرت اور حُسنِ معاملت کی ہدایات کو جمع کر دیا ہے، جابجا ضروری تشریح بھی کر دی ہے، کتاب مسلمانون کے لئے مفید ہے،

سی پی میں کانگریس راج، از جناب حکیم اسرار احمد صاحب کریوی تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عار، پتہ مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب جنرل سکرٹری مسلم لیگ ناگپور، سی پی،

کانگریسی وزارت کے دور مین صوبہ متوسط کے مسلمانون کو اس کے خلاف جو شکایتین تھین، اس کتاب میں ان کو مع شواہد و ثبوت کے جمع کر دیا گیا ہے، اس مین سرکاری محکمون، لوکل بورڈون، اور کونسل مین مسلمانون کی جو جو حق تلفیان اور ان پر جو زیادتیان ہوئین، ان کی پوری تفصیل درج ہے، بعض واقعات کے ثبوت مین سرکاری دستاویزون کی نقلین بھی شامل ہین، لیکن اب یہ داستان بعد از وقت ہے، البتہ آئندہ کے لئے اس سے حاکم و محکوم دونون سبق حاصل کر سکتے ہین،

آریائی زبانیں از جناب سدھیشور ورما شاستری ایم اے، ڈی لٹ، پروفیسر سنسکرت و لسانیات پرنس آف ویلز کالج جموں، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، قیمت ۱عہ پتہ:- ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد، حیدرآباد دکن،

لسانیات یا فیلالوجی اپنی خشکی کے باوجود نہایت دلچسپ فن ہے، لیکن اردو مین اس موضوع پر مستقل کتابین نہین ہین، بعض ادبی کتابون مین ضمناً کچھ لسانیاتی بحثیں ملتی ہین، لائق مولف نے اس کتاب مین لسانی نقطۂ نظر سے ہندوستان اور ایران کی آریائی زبانون کی مختصر تاریخ، ان کی خصوصیات، ماخذ و ارتقا، عہد بعہد کے تغیرات، ان کی باہمی عرفی و صوتی مشابہت و اختلافات وغیرہ کو دکھایا ہے، ہندوستان کی زبانون پر نسبتہً زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب اس فن سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے

اپنے خواب از جناب سید کاظم دہلوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عا، پتہ دفتر کہکشان گلی تاراشاہ دہلی،

مصنفِ کتاب موجودہ دور کے اچھے افسانہ نگارون مین ہین، ان کے افسانون کے بعض مجموعے اس سے پیشتر شائع ہو چکے ہین، اپنے خواب بارہ افسانون کا نیا مجموعہ ہے، تقریباً کل افسانے رومانی ہین لیکن ان مین حسن و عشق کی محض تفریحی اور بے نتیجہ افسانہ طرازی نہیں ہے، بلکہ روزانہ کے واقعاتِ زندگی، اور ہماری معاشرت کی صحیح تصویرین ہین، افسانون کے پلاٹ دلچسپ، خیالات ستھرے اور زبان پاکیزہ ہے،

مفتاح العربیہ جزاول و دوم، مؤلفہ احمد بن ناصر العیسری استاذ عربی عثمانیہ ٹرننگ کالج حیدرآباد دکن، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ہر دو حصہ ۴ار، پتہ:- مصنف سے ملے گی،

مصنف نے عربی زبان کے مبتدی طلبہ کے لئے یہ ریڈرین لکھی ہین، وہ اہل زبان بھی ہین اور تعلیم کا بھی عملی تجربہ رکھتے ہین، اسلئے یہ ریڈرین زبان اور تعلیمی نقطۂ نظر دونون حیثیتون سے مفید ہین ان میں روزانہ کی ضروریات کے الفاظ اور اسباق مین تدریج، اور ان کی مشق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، عربی کے مبتدیون کے لئے یہ مفید ریڈرین ہین،

"م"

جلد ۵۳ ماہ صفر المظفر ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۴ء عدد ۲

مضامین

بیرونی اجنبی قوموں نے خاص سیاسی اغراض کے ماتحت ہندوستان کے اسلامی عہد کی نہایت غلط اور مسخ تاریخیں لکھیں، جن کا مقصد یہاں کے مختلف فرقوں میں باہم بغض و منافرت پھیلانا، ان کے دلوں سے اُن کے شاندار ماضی اور ان کے اسلاف کے کارناموں کی وقعت گھٹانا، ان کی پستی اور نئی حکمران قوم کی عظمت و برتری کا نقش جمانا تھا، اس کے جو مذموم نتائج نکلے وہ نگاہوں کے سامنے ہیں، اسی قسم کی تاریخیں تعلیمگاہوں میں داخل کی گئیں، اس لئے جدید تعلیم یافتہ نسل کے دل و دماغ ابتداہی سے ان کے زہریلے اثرات سے متاثر ہوتے رہے، اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود ان ہندوستانیوں نے جو تاریخیں لکھیں وہ بھی بالعموم ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں، اس لئے عرصہ سے ایسی تاریخ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں واقعات کی صحت، غلط واقعات کی تحقیق و تنقید اور قومی تعمیر کے عناصر کا خاص لحاظ رکھا جائے، بعض اصحاب علم نے اپنے مضامین اور تحریروں میں اس مقصد کو پیش نظر رکھا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے بس کا نہیں ہے، اب بعض علمی و تعلیمی اداروں نے بھی اجتماعی طور سے یہ کام شروع کیا ہے، چنانچہ انڈین ہسٹری کانگریس، بھارتیہ اتہاس پرشد اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تاریخ ہندوستان کی تدوین کا کام ہو رہا ہے، دار المصنفین نے بھی اس کو شروع کیا ہے جس کا تذکرہ ان صفحات میں آچکا ہے،

تاریخوں کے لکھنے کا موقع بار بار نہیں آتا، اس لئے ان اداروں کو ابتدا ہی سے مذکورۂ بالا اہم اور ضروری پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہئے، ورنہ اگر ان تاریخوں میں بھی فروگذاشتیں ہو گئیں تو پھر اس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی، اور چونکہ یہ اپنی قومی تاریخیں ہوں گی اس لئے ان کی غلطیاں دوسری اقوام کی لکھی ہوئی تاریخوں کی غلطیوں سے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوں گی،

اس سلسلہ میں چند باتیں خاص طور سے توجہ کے قابل ہیں، ایک یہ کہ تاریخ لکھنے میں کسی قوم اور فرقے کا اپنے ذاتی

نقطۂ نظر اور مخصوص قومی مقاصد سے یکسر خالی الذہن رہنا بہت دشوار ہے، اس لئے اس کی توقع بھی نہیں کی جاتی، لیکن اگر مذکورہٗ بالا اہم مشترکہ مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر دوسرے امور میں اپنے مخصوص قومی نقطۂ نظر کی ترجمانی میں چنداں مضائقہ نہیں ہے، دوسری یہ کہ دنیا کی کسی حکومت کا دامن خامیوں اور کوتاہیوں سے پاک نہیں اور نہ سب کے سب حکمران عدل و مساوات کا نمونہ ہوتے ہیں، کیا خود اپنی قومی حکومت کے ہاتھوں اپنے ہم قوم محکوموں کے ساتھ بے عنوانیاں نہیں ہوتیں اور کیا خود اپنی قوم کے ہاتھوں حکومتوں کو نقصان نہیں پہنچے اور کیا عدل و مساوات کا یہ دور جس کو مذہبی تعصب سے خالی کہا جاتا ہے ایسی مثالوں سے خالی ہے، ایسی حالت میں کسی حکومت یا حکمران کے ہر فعل کو محض اختلاف مذہب یا تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، بعض بے عنوانیاں حکومت کے ذاتی مصالح، عام سیاسی پالیسی، اور مذہب سے قطع نظر ان کی قومی سرشت کا نتیجہ ہوتی ہیں، جن کو مذہبی جذبہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور جس کا اثر بلا تفریق مذہب تمام محکوموں پر پڑتا ہے، اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ گذشتہ حکومتوں کے ہر جائز و ناجائز فعل کو سراہا جائے، بلکہ یہ ہے کہ ان کو محض اختلاف مذہب کی عینک سے نہ دیکھا جائے اور ان کی غلطیوں اور بے عنوانیوں کو ان کی حد کے اندر محدود رکھا جائے، انہیں آب و رنگ دے کر چمکایا نہ جائے اور ان کی کوتاہیوں کے ساتھ فراخ دلی سے ان کے محاسن کا بھی اعتراف کیا جائے، یہ بھی واضح رہے کہ محض حسن ظن اور سوء ظن سے ایک ہی واقعہ کے متعلق نتائج بالکل بدل جاتے ہیں، بلکہ بسا اوقات متضاد ہو جاتے ہیں،

کسی تاریخ خصوصًا اپنی قوم کی تاریخ کی تدوین میں اعلیٰ قومی مقاصد کا لحاظ رکھنا تاریخ نگاری کی دیانت کے خلاف نہیں ہے، تاریخی دیانت اور خیانت کا مقصد یہ ہے کہ ذاتی جذبات، فرقہ وارانہ اغراض اور پست مقاصد کے لئے تاریخ کو مسخ یا اس پر ملمع نہ کیا جائے یہ نہیں ہے کہ غایت دیانتداری اور غیر جانبداری میں قومی تعمیر کے عناصر کو نظر انداز کر دیا جائے، اور نہ اس دیانت کا ثبوت آج تک کسی قوم کے مورخ نے دیا ہے، موجودہ زمانہ کی تاریخوں کو نہ صرف قوموں کو نیک نام اور بدنام کرنے بلکہ ان کو بنانے اور بگاڑنے میں بھی دخل ہے، اس لئے ان کی تدوین

میں کسی حال میں بھی قومی مقاصد سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ میں جبکہ ابھی تعمیر دور ہے،

گذشتہ مہینہ کی آخری تاریخوں میں کاشی پرچارنی سبھا کی سلور جوبلی منائی گئی، اس کے محترم صدر نے اُردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں بڑی پرزور تقریر کی، اس میں دو باتیں خاص طور سے دلچسپ نظر آئیں ایک ہندی کی عالمگیریت یعنی ہندوستان کے باہر اس کی مقبولیت اور اشاعت کا دعویٰ، دوسرے ہندوستان میں ریڈیو کے ذریعہ عربی اور فارسی کلچر کی اشاعت کی سازش کا انکشاف، اب تک ہندی کے مشترکہ اور عمومی زبان ہونے کا دعویٰ ہندوستان کے اندر تک محدود تھا، اس کی عالمگیری کی یہ پہلی آواز ہے' دیکھیں آیندہ اس تخم ریزی سے کیا کیا شاخیں پھوٹتی ہیں' لائق صدر نے غالباً اس لئے ریڈیو پر غصہ کا اظہار کیا ہے کہ اس میں عام فہم زبان کیوں بولی جاتی ہے، ٹھیٹھ ہندی کیوں نہیں بولی جاتی لیکن وفور جوش میں جناب صدر کی نگاہ اس پہلو پر نہیں گئی، کہ ان کا یہ غصہ اور الزام دوسرے لفظوں میں اس کا اعتراف ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان وہی ہے، جو ریڈیو پر بولی جاتی ہے، اس لئے کہ ریڈیو میں وہی زبان چل سکتی ہے، جسے سارا ہندوستان سمجھتا ہو،

مالوی جی کا لہجہ البتہ اس مرتبہ خلاف معمول اردو کے حق میں مشفقانہ تھا، انھوں نے اس کو ہندی کی بہن تسلیم کیا ہے، اور اس کی ترقی کی بھی خواہش ظاہر کی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہندی کو یہ ترجیحی حق عطا فرمایا ہے کہ عدالت کی زبان اسی کو ہونا چاہئے، اردو کو ہندی کی بہن تسلیم کرنے کے بعد پدرِ ہند کے اس ترکہ میں ہندی کا ترجیحی حق کیوں ہے، اردو تو ہندو قانون وراثت کے مطابق بھی اس سے محروم نہیں ہوسکتی، اس پورے مجمع میں ایک بلبلِ ہند کے نغمہ میں صداقت تھی کہ "ہندوستان کی زبان وہی ہونی چاہئے جو صوبہ متحدہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے" اردو کے حامی بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے،

مقالات

حکیم الامت کے آثارِ علمیہ

حضرت حکیم الامتہ مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہین کہ اُن سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکتا، اور یہی ان کی جامعیت ہی جو ان کے اوصاف و محامد مین سب سے اول نظر آتی ہے، وہ قرآن پاک کے مترجم ہین، مجوّد ہین، مفسر ہین، اوس کے علوم و حکم کے شارح ہین، اوس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہین، وہ محدث ہین، احادیث کے اسرار و نکات کے ظاہر کرنے والے ہین، وہ فقیہ ہین، ہزارون فقہی مسائل کے جوابات لکھے ہین، نئے سوالون کو حل کیا ہے، نئی چیزون کے متعلق انتہائی احتیاط کے ساتھ فتوے دیئے ہین،...... وہ خطیب تھے، خطبِ ماثورہ کو یکجا کیا ہے، وہ واعظ تھے، ان کے سیکڑون وعظ چھپ کر عام ہو چکے ہین، وہ صوفی تھے، تصوف کے اسرار و غوامض کو فاش کیا ہے، شریعت و طریقت کی ایک مدت کی جنگ کا خاتمہ کر کے دونون کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے، ان کی مجلسون مین علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے، اور یہ موتی جن گنجینون مین محفوظ ہین، وہ ملفوظات ہین، جن کی تعداد بیسیون تک پہنچی ہے، وہ ایک مرشد کامل تھے، ہزارون مسترشد و مستفید اُن کے سامنے اپنے احوال و واردات پیش کرتے تھے، اور وہ ان کے تسکین بخش جوابات دیتے تھے، اور ہدایات بتاتے تھے، جن کا مجموعہ تربیۃ السالک ہے، اونھون نے بزرگون کے احوال و کمالات کو یکجا کیا، اور اس ذخیرہ سے سب کو آشنا کیا، اُن کی متعدد کتابین اس مضمون پر ہین

اونھون نے حضرات چشت کے احوال واقوال مین سے بظاہر اعتراض کے قابل باتون کی حقیقت ظاہر کی، اور انکی تاویلات کین، اون کی کتابون کے خلاصے، اقتباسات اور تسہیلات ان سے الگ ہین جن کی ترتیب ان کے مسترشدین نے کی ہے، وہ مصلح امت تھے، امت کے سیکڑون معائب کی اصلاح کی، رسوم و بدعات کی تردید، اصلاح رسوم اور انقلاب حال پر متعدد تصانیف کین، وہ حکیم امت تھے، مسلمانون کے علاج اور نشأۃ واحیاء پر حیوٰۃ المسلمین وغیرہ رسائل تالیف فرمائے، غرض ان کی زندگی مین مسلمانون کی کم کوئی ایسی مذہبی ضرورت ہوگی جس کا مداوا اس حکیم الامۃؒ نے اپنی زبان اور قلم سے نہین فرمایا، اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر مین آسکتا ہے، ان کی تصنیفات ہندوستان کے پورے طول و عرض مین پھیلین، اور ہزارون مسلمانون کی صلاح و فلاح کا باعث ہوئین، اردو اور عربی کے علاوہ مسلمانون نے اپنے ذوق سے اُن کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانون مین بھی کیا، چنانچہ ان کی متعدد کتابون کے ترجمے انگریزی، بنگالی، گجراتی اور سندھی مین شائع ہوئے، ان کی تصانیف کی تعداد جن مین چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہین، آٹھ سو کے قریب ہے، ۱۳۵۴ھ مین اون کے ایک خادم مولوی عبدالحق صاحب فتحپوری نے ان کی تصنیفات کی ایک فہرست شائع کی تھی، جو بڑی تقطیع کے پورے ۷۰ صفحون کو محیط ہے، اس کے بعد نو برسون مین جو رسائل یا تصانیف ترتیب پائین وہ ان کے علاوہ ہین، کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کا مجدد اپنی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو یہ صدی جو مطبوعات و منشورات کے کمالات سے مملو ہے، اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات و اظہار مین ہو یا باطل کی نشر و اشاعت مین، پریس اور مطبع ہی کے برکات ہین، زبان و قلم اس صدی کے مبلغ ہین، اور رسائل و منشورات دعوت کے صحیفے ہین، اس بنا پر مناسب تھا کہ اس صدی کے مجدد کی کرامت بھی انہی کمالات مین جلوہ گر ہو، علمائے اسلام مین ایسے بزرگون کی کمی نہین جنکی تصانیف کے اوراق اگر انکی زندگی کے ایام پر بانٹ دیئے جائین تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے، امام جریر طبری، حافظ خطیب بغدادی، امام رازی، حافظ ابن جوزی، حافظ سیوطی وغیرہ متعدد نام اس سلسلہ مین لئے جاسکتے ہین، ہندوستان مین مولانا ابوالحسنات

عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم کے نام بھی اس سلسلہ مین داخل ہین، اس سلسلہ کا اخیر نام حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا ہے،

مولانا کی تصانیف کی انواع | مولانا کے رسائل اور تصانیف کی تعداد گو آٹھ سو کے قریب ہے، مگر ان مین چھوٹے چھوٹے رسالے بھی جن کو نئی اصطلاح مین مضامین و مقالات کہتے ہین داخل ہین، ان مین بعض اتنے مختصر ہین کہ صرف ایک دو صفحے مین ہین بعض ایسے ضخیم ہین کہ کئی کئی جلدون مین ہین،

زبان | بیشتر تصانیف نثر مین اور اردو زبان مین ہین، البتہ بارہ تیرہ رسائل و کتب عربی زبان مین ہین جن کے نام یہ ہین سبق الغایات فی نسق الآیات، انوار الوجود، التجلی العظیم، حواشی تفسیر بیان القرآن، تصویر المقطعات، التلخیصات العشر، مائۃ دروس، الخطب الماثورہ، وجوہ المثانی، سبع سیارہ، زیادات، جامع الآثار، تائید الحقیقۃ، اور تین فارسی مین ہین: مثنوی زیر و بم، تعلیقات فارسی، عقائد ربانی کا حج۔

نظم و نثر | نظم مین مولانا کی تصنیف صرف یہی ایک مثنوی زیر و بم ہے، اور یہ طالب العلمی کے بعد ہی لکھی ہے، بظاہر اس مین ایک بیوقوف عاشق اور چالاک معشوق کا قصہ ہے، مگر درحقیقت یہ نفس انسانی کی بصیرت افروز حکایت ہے، ایک اور نظم اوراد رحمانی کے آخر مین ہے،

مولانا کو فارسی کے بیشمار اشعار یاد تھے، حافظ اور مولانا رومی کے اشعار بیشتر نوک زبان تھے، اور نظم کا ملکہ اور سلیقہ بھی تھا، مگر کبھی اس سے کام نہین لیا، ایک دفعہ مین نے اپنے برادر گرامی قدر مولوی مسعود علی صاحب کو جو تھانہ بھون مین مقیم تھے، اپنے حاضر ہونے کے قصد سے مطلع کیا، اور ریاض مرحوم کا یہ مصرع لکھدیا:

زندگی ہے تو فقیرون کا بھی پھیرا ہوگا

برادر موصوف نے یہ اطلاع مولانا کو دی، اور یہ مصرع بھی سنا دیا، تو فوراً فقیرون کو بدل کر یون فرمایا،

زندگی ہے تو سلیمان کا بھی پھیرا ہوگا

ایک دفعہ حضرت نے خاکسار کو ایک تسبیح عنایت فرمائی، تو خاکسار نے ایک بیت کہی ؎

خواجہ بخشید مرا حجۂ بصد وانہ بلطف وانہ انداخت و در حلقہ مرا کرد اسیر

وصل مرحوم نے موقع سے حضرت کو یہ سنا دیا، تو فرمایا، "تو پھر مجھے بھی اس کا جواب کہنا پڑے گا"، مگر کچھ فرمایا نہیں سب سے آخر میں جب خاکسار نے از خود حضرت کی تحریک و اشارہ کے بغیر اپنے احساس سے مجبور ہو کر رجوع و اعتراف کا مضمون معارف میں شائع کیا، اور ملاحظہ کے لئے بھیجا تو بہت مسرت ظاہر فرمائی، اور مثنوی کے وزن پر دس بارہ شعر لکھ کر بھیجے، جو اس ہیچ میرز کے لئے وجہ سعادت ہیں، یہ غالباً آخری نظم کی تصنیف ہے، اور اس کا ایک نام بھی حضرت نے رکھ دیا ہے،

موضوعات نثر تصانیف کا بیشتر حصہ اصلاحی اور فقہی ہے، اور کم تر کتب درس کے متعلق، تاہم دو چار درسی کتابوں پر بھی رسائل ہیں، مذہبی تصانیف میں علوم القرآن، علوم الحدیث، کلام و عقائد، فقہ و فتاوی اور سلوک و تصوف اور مواعظ اکثر ہیں،

قرآن پاک کی خدمت اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود اسلام کا صحیفہ ہے یعنی قرآن پاک، مولانا نے اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی، وہ بجائے خود ان کی ایک علمی کرامت ہے، کانپور کے زمانۂ قیام میں مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے، وہاں جبرامت اولین مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللّٰھم علمہ الکتاب کی دعا دی تھی اور بشارت سنائی تھی، مولانا فرماتے تھے، کہ اس رویا کے بعد سے میری مناسبت قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور یہ رویا اسی کی طرف اشارہ تھا،

قرآن پاک کی خدمت کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی، بلکہ لفظ و معنی دونوں حیثیتوں سے وہ حافظ تھے، اور بڑے جید حافظ، وہ قاری تھے، اور فنون تجوید و قرأت کے بڑے ماہر، اخیر زمانہ میں پانی پت کو قاری عبد الرحمان صاحب پانی پتی رحمہ اللہ کی برکت سے قرأت سے ایک خاص مناسبت حاصل ہو گئی تھی، مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے، تو لوگوں نے انکو بالقصد کسی جہری نماز میں امام بنا دیا، مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر ایسی قرأت فرمائی کہ قاریوں نے تعریف کی، کہ صحت مخارج کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر مؤثر قرأت نہیں سنی تھی

اور مقام پر جہاں اہلِ نظر موجود تھے صبح کی نماز پڑھائی، تو ایک صاحب نے کہا کہ موسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قرأت میں بھیروین کی کیفیت تھی، جو صبح کی ایک سہانی راگنی کا نام ہے۔

مولانا کی قرأت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مخارج کی پوری صحت ہوتی تھی، لیکن لہجہ میں عام قاریوں کی طرح بناوٹ نہ تھی، اور نہ تحسین آواز کے لئے تکلف اتار چڑھاؤ ہوتا تھا، بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسب موقع گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتی تھی کہ ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد،

۱-تجوید و قرأت و متعلقاتِ علوم قرآنی

علوم القرآن میں سے یہ پہلا فن ہے، مولانا نے اس فن پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں

۱-جمال القرآن یہ فنِ تجوید کا رسالہ ہے، جس میں قرآن مجید کو ترتیل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل ہیں، مخارج اور صفاتِ حروف، اظہار و اخفاء، ابدال و ادغام و تفخیم و ترقیق و وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں

۲-تجوید القرآن اس مختصر منظوم رسالہ میں بچوں کی یاد کے لئے تجوید کے عام مسائل لکھے ہیں،

۳-رفع الخلاف فی حکم الاوقاف، اوقافِ قرآنی کے بارہ میں قاریوں میں جو اختلاف ہے اس رسالہ میں اس کی توجیہ و تطبیق کی صورت بیان کی گئی ہے،

۴-وجوہ المثانی اس میں قرآن شریف کی مشہور قراتوں کے اختلافات کو قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے اور اخیر میں تجوید و قرأت کے کچھ قواعد تحریر فرمائے ہیں،

۵-تنشیط الطبع فی اجراء السبع قرأت سبع اور اس فن کے رواۃ کی تفصیل درج کی گئی ہے،

۶-زیادات علی کتب الروایات اس میں قرأت کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں، یہ وجوہ المثانی کے اخیر میں بطور ضمیمہ ہے،

۷-ذنابات لما فی الزیادات یہ اگلے رسالہ کا ضمیمہ ہے،

۸-یادگار حق القرآن اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے، یہ تجوید القرآن

کا اختصار اور ضمیمہ ہے،

۹۔ متشابہات القرآن لتراویح رمضان قرآن پاک کے حفاظ کو تراویح مین قرآن سنانے مین بعض مشہور مقامات پر جو متشابہات لگتے ہین، اُن سے بچنے کے لئے اس مین چند قواعد کلیہ یعنی گر بعض آیات کے ضبط فرمائے گئے ہین،

۱۰۔ آداب القرآن، قرآن پاک کی تلاوت کے آداب، اور تلاوت کرنے والون کی کوتاہیون کی اصلاح کے لئے ہدایات و تنبیہات ہین،

۲۔ ترجمہ و تفسیر قرآن

۱۔ ترجمہ۔ قرآن پاک کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ جس مین زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے، جس سے حقیر کی نظر میں بڑے بڑے ترجمے خالی ہین، قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے، لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے، اس لئے عام اردو خوانون کے فہم سے باہر ہے، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ مین دونون خوبیان یکجا ہین، یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے، اس ترجمہ مین ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے، کہ اس زمانہ میں کم فہمی یا ترجمون کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والون کو معلوم ہوتے ہین، ان کا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان ترجمون کے پڑھنے سے پیش نہ آئین، اور پھر قرآن پاک کے لفظون سے عدول بھی ہونے نہ پائے اسی لئے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین مین ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہین، یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے،

۲۔ تفسیر بیان القرآن، یہ بارہ جلدون مین قرآن پاک کی پوری تفسیر ہے، جس کو ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا ہے، اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں، سلیس و بامحاورہ حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ نیچے ف کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر، تفسیر مین روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے، فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے، لغات اور نحوی ترکیبون کی تحقیق فرمائی گئی ہے، شبہات اور شکوک کا

ازالہ کیا گیا ہے، صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں، تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھکر اون میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے، ذیل میں اہل علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں، اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات وحقائق ومعارف الگ لکھے گئے ہیں، ماخذون میں غالبًا سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر روح المعانی پر اعتماد فرمایا گیا ہے، یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقۃً مفید ہے کہ تیرہوین صدی کے وسط مین لکھی گئی ہے، اس لئے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے، اور مختلف ومنتشر تحقیقات اس مین یکجا مل جاتی ہین ؛

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیرین صرف عوام اردو خوانون کے لئے علما رکھتے ہین یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علما ء کو تھا لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحب نے اٹھاکر دیکھی تو فرمایا کہ مین سمجھتا تھا کہ اردو مین یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی، مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے، خود میرا خیال یہ ہے کہ قدیم کتب تفسیر میں راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے، ساتھ ہی ربط آیات وسور کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے، اور اس کا لحاظ اس تفسیر مین بھی کیا گیا ہے، مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں، اس لئے وجوہ ربط مین قیاس اور ذوق سے چارہ نہین، اس لئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس مین اختلاف کی گنجایش ہے، اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال مین سے کسی قول کی ترجیح مین زمانہ کی خصوصیات اور ذوق ووجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے، اس لئے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے،

۳- چونکہ مسلمانون پر شفقت اور ان کی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت غالب تھی، اس لئے وہ ہمیشہ ان کو گمراہیون سے بچانے مین بجان ودل ساعی رہتے تھے، اردو مین حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے جو ترجمے شائع تھے، وہ بالکل کافی تھے، مگر نئے زمانہ مین پہلے سر سید نے بعض تفسیر اور پھر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے نئے اردو ترجمے شائع کئے، تو انھون نے پہلی دفعہ یہ کوشش کی کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمے کرین اور اولین توجہ زبان کی طرف رکھین، اور اقوال سلف کی پروا نہ کرین، اس طرز عمل نے علماء کو مضطرب کردیا، اور ان کو ضرورت محسوس ہوئی، کہ اس کی اصلاح کی جائے، مولانا نے اپنا ترجمہ اسی ضرورت

سے مجبور ہو کر کیا، مگر اسی پر کفایت نہین کی، بلکہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو بغور پڑھا، اور اس کے اغلاط پر نشان دیکر ایک رسالہ اوس ترجمہ کی اصلاح پر لکھا جس کا نام اصلاح ترجمۂ دہلویہ ہے،

۴- مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کی عام اشاعت نے دہلی کے ایک بلند بانگ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا، اور انھون نے پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ پر اعتراضات شروع کئے، اور پھر اپنا ترجمہ چھپوایا جس کی نسبت عام طور سے مشہور ہے کہ وہ لکھنؤ کے ایک عالم کا کیا ہوا ہے، لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چھپا ہے، کیونکہ مرزا صاحب خود عربی سے نابلد تھے، بہرحال مولانا نے اس ترجمہ کے اغلاط کی اصلاح پر بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا جس کا نام اصلاح ترجمۂ حیرت ہے،

۵- بعض معاصر علمار نے اردو مین قرآن شریف پر حواشی لکھے ہین جن مین ربط آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے، اور آیات کو بتاویل و اعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کیا ہے، اور اس تاویل و اعتبار میں کہیں کہیں حد اعتدال سے قلم باہر نکل گیا ہے، مولانا نے ان تاویلات بعیدہ پر تنبیہات لکھین جن کا نام التقصیر فی التفسیر ہے،

۶- لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدون مین تفصیل البیان فی مقاصد القرآن کے نام سے جمع کیا ہے، اس کے مؤلف کی درخواست پر اُس مین جو شرعی نقائص نظر آئے وہ مولانا نے الهادی للحیران فی وادی تفصیل البیان کے نام سے ظاہر فرمائے،

۷- مولانا کے خاندان کی بعض لڑکیون نے مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا، اور اکثر آیات کی تفسیر و تقریر کو ضبط تحریر میں کر لیا تھا، وہ ایک مجموعہ ہو گیا، اور اس کا نام تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الآیات کھا مگر چھپا نہین،

۸- رفع البناء فی نفع السماء اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً کی تفسیر ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سے کیا کیا فائدے ہین، یہ درحقیقت ایک سوال کے جواب مین ہے،

۹- احسن الاثاث فی النظر الثانی فی تفسیر المقامات الثلث، سورہ بقرہ کی تین آیتون کی تفسیر پر نظر ثانی فرمائی ہے،

۱۰- اعمالِ قرآنی قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص جو بزرگوں کے تجربوں میں آئے، ان کو بیان کیا گیا ہے،

۱۱- خواص فرقانی، اس کا موضوع بھی وہی ہے، اس کا ایک اور حصہ ہے جس کا نام آثارِ تبیانی ہے، ان رسائل سے مقصود عوام کو ناجائز، غیر شرعی تعویذ، گنڈوں اور عملیاتِ سفلی سے بچا کر قرآنی آیات کے خواص کی طرف ملتفت کرنا ہے، اور اس قسم کے بعض خواص احادیث میں بھی مروی ہیں،

۳- علوم القرآن

علوم قرآن کے متعلق مختلف مباحث و مسائل تو مولانا کی ساری تصانیف، مواعظ، ملفوظات اور رسائل میں ملتے ہیں، اگر ان کو کوئی یکجا کر دے تو اچھی خاصی ضخیم کتاب ہو جائے، مگر ان پر مستقل طور پر بھی بعض کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں سے اول سبق الغایات ہے،

ا- سبق الغایات فی نسق الآیات، یہ قرآن پاک کے آیات و سور کے ربط و نظم پر عربی میں ۵۶ صفحوں کی کتاب ہے، جس کو ۱۳۱۶ھ میں ڈھائی مہینوں میں تصنیف فرمایا، اس میں مولانا نے سورۂ فاتحہ سے سورۂ ناس تک تمام سورتوں اور ان کی آیتوں کے ربط پر کلام فرمایا ہے، اور اس کا بڑا حصہ امام رازی کی تفسیر کبیر اور مفتی ابو سعود بغدادی المتوفی ۹۵۱ھ کی ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم سے ماخوذ و مستنبط ہے، جس کی تصریح کتاب کے دیباچہ میں کر دی گئی ہے، ان دو کے علاوہ مولانا نے خود اپنے اضافوں کو قال المسکین لکھکر بیان فرمایا ہے، یہ حصہ بھی اچھا خاصہ ہے، اور اخیر کی سورتوں میں زیادہ تر اضافات ہی ہیں، جن میں مؤلف نے ان سورتوں کے موضوع اور عمود کی تعیین فرمائی ہے، چونکہ یہ امور زیادہ تر ذوقی ہیں، اس لئے ان ذوقیات کی نسبت ہمیشہ رائیں مختلف ہو سکتی ہیں، تاہم ان سے مولانا کے ذوقِ قرآنی کا اندازہ بہت کچھ ہو سکتا ہے،

تفسیر البیان میں بھی ربط و نظم پر گفتگو التزام کے ساتھ کی گئی ہے،

ذوقِ ربطِ آیات | مولانا کے ذوقِ ربطِ آیات و سور کا حال چونکہ عام طور سے لوگوں کو معلوم نہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مواعظ میں سے دو تین نقل کر دئیے جائیں جن سے ان کا ذوق اور ان کے بعض اصولِ ربط

واضح ہو جائیں سبیل النجاح ص ۹ میں فرماتے ہیں[۵۱]

۸۸- جواب اس شبہہ کا کہ مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے ان ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں

"اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے، اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں، اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوتِ مصحف اور ہے یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا، کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہوگئی، پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہوگئی، وعلیٰ ہذا، تو ترتیب نزول تو حسبِ واقعات ہے، اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی، تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عز اسمہ نے بدل دی یعنی حدیث میں آتا ہے، کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی تو جبرئیل علیہ السلام بحکم خداوندی حضورؐ سے یہ کہتے کہ آیت کو مثلاً سورہٴ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جاوے، اور اس کو فلاں آیت کے بعد، اور اس کو فلاں سورۃ کے ساتھ، وعلیٰ ہذا، تو مصحف میں ترتیب آیات، ترتیب نزول پر نہیں، بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے، دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہوا تو ترتیبِ نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا" (سبیل النجاح ص ۹)

پھر اسی کتاب کے ص ۶ میں ارشاد ہے[۵۲]

۸۷- قرآن کریم بے ترتیب اور غیر مرتبط کلام نہیں ہے

"قرآن میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ویسی رعایت نہیں ہے' قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا، اس مضمون کو آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ حکام دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو بعض ضابطہ کے پابند ہیں، ضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے وہ کر دیا، اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دیئے، ان کو اس کی ضرورت

[۵۱] منقول از اشرف الجواب لشفاء المرتاب حصہ سوم ص ۲۹۶ و ص ۲۹۶ [۵۲] ،، ص ۲۹۳ تا ص ۲۹۶،

نہین کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کرین یا انکے سہل و یا آسان کرنے کی تدبیر بتائین، دوسرے وہ حکام ہین، جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے، اور مخلوق کو راحت پہنچانا چاہتے ہین، اور حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہین کرتے، اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہین تو رعایا کو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہن، اور اس تجویز مین ان پر تعب ضرور ہوتا ہے، مگر یہ شفقت پر مبنی ہے، اتنی رعایتین وہی حاکم کرسکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو، اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے، کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاد ہوتا ہے، اور ایک باپ ہوتا ہے، باپ کی نصیحت مین عام لوگون کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے، استاذ تو ضابطہ پوری کردیتا ہے، مگر باپ ضابطہ پوری نہین کرسکتا، وہ نصیحت کرتے ہوے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کرون جو اس کے دل مین گھر کرے، کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے بیٹے میں کوئی کمی نہ رہ جائے، اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی تبلاتا ہے، تو اس طریقہ کو وہ اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہوجاوے، اور ان سب رعایتون کا منشا، وہی شفقت ہے، شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤن کی رعایت کیجاسکتی ہے، اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ربط اور بے ترتیب بھی ہوجاتا ہے، مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے، کہ بری صحبت مین نہیں بیٹھا کرتے، اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو، اسی درمیان مین اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے، تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کرکے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے، لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے، اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کردے گا، اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو، وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے، بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر، مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے، شفقت کا مقتضا یہی ہے، کہ ایک بات کرتے ہوے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے، دوسری بات کو بیچ میں رکھکر پھر پہلی بات کو پورا کرے، یہی راز ہے اس کا کہ خداے تعالیٰ کا کلام ظاہر مین بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے، اس ظاہری بے ربطی کا منشا شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے، کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون

اس میں نہ آسکے، بلکہ وہ ایک نئے مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں، تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں، اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے، سورہ قیامۃ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے، کہ انسان اُس وقت بڑا پریشان ہوگا، اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا، اپنے اعمال پر اُسے اطلاع ہوگی، اُس روز اس کو سب اگلے پچھلے کیے ہوئے کام جتلا دیئے جائیں گے، پھر فرماتے ہیں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا، بلکہ اُس دن) انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہے کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا) اگرچہ وہ (باقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے، مگر دل میں خود بھی جانیں گے، کہ ہم جھوٹے ہیں، غرض انسان اُس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا، اس لئے یہ جتلانا محض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا، نہ کہ یاددہانی کے لئے،

یہاں تک تو قیامت ہی سے متعلق مضمون ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کو ارشاد فرماتے ہیں قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے، ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جما دینا اور زبان سے پڑھوا دینا، تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتہ کی قرأت کا اتباع کیجئے، پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے، اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے، كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ، کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو، پھر فرماتے ہیں وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ، بعضوں کے چہرے اُس دن تر و تازہ ہوں گے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے، الخ تو لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے، اور درمیان میں یہ مضمون ہے، کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے، لوگ اس مقام کے

ربط میں تھک گئے ہیں، اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں، مگر سب میں تکلف ہے، اور کسی نے خوب کہا ہے "کلامے کہ محتاجِ یعنی باشد لایعنی است" تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور کے ساتھ ہے، اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے، کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے، سو جو اس کا وہی موقع ہے، جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا، کہ بُری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے، اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا، کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھکر کہنے لگا یہ کیا حرکت ہے، لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے، لیکن جو باپ ہوا ہوگا، وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا، باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی، اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں، جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے، تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا، کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں، یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے، آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں، قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے، اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی، مگر پھر بھی باوجود اس کے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے، اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے"۔ (سبیل النجاح ص ۶)

۲- اشرف البیان لما فی علوم الحدیث والقرآن، مولانا کے چند مواعظ سے اون کے ایک معتقد و خادم نے اون اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے جن میں آیاتِ قرآنی اور احادیث کے متعلق لطیف نکات و تحقیقات ہیں، افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو کئی حصے اس کے مرتب ہو سکتے تھے،

۳- دلائل القرآن علی مسائل النعمان، مولانا کو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ سے جو شدید شغف تھا، وہ ظاہر ہے ان کا مدت سے خیال تھا کہ احکام القرآن ابوبکر جصاص رازی اور تفسیرات احمدیہ ملاجیون

کی طرح خاص اپنی تحقیقات اور ذوق قرآنی سے اون آیات اور ان کے متعلق مباحث و دلائل کو یکجا کر دین جن سے فقہ حنفی کے کسی مسئلہ کا استنباط و اخراج ہو، لیکن یہ کام انجام نہ پاسکا، آخر مین یہ خدمت اونھون نے اپنے مسترشد خاص مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو سپرد فرمائی کہ وہ اون کی ہدایت کے مطابق اس کو تالیف فرمائین چنانچہ مفتی صاحب اس کام مین مصروف ہو گئے، ابھی حال مین جب وہ مدرسہ سے الگ ہوئے، تو خانقاہ امدادیہ مین جا کر خاص اس کام کی تکمیل مین لگ گئے، مولانا روزانہ کی مجلس مین اس کے متعلق جو جو نکتے ان کو یاد آجاتے تھے بیان فرماتے، اور جناب مفتی صاحب اس کو اپنے مقام پر آکر قلمبند فرمالیتے، یہ تصنیف اس طور سے جاری تھی، کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا، اور کام ناتمام رہ گیا، امید ہے کہ مفتی صاحب اس کام کو جاری رکھین گے، اور ان شاء اللہ تعالیٰ اتمام کو پہنچائین گے،

مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی روایت میں نے سُنی ہے جن کو خود بھی ماشاء اللہ قرآن پاک کے فہم کا ذوق ہے، وہ نقل کرتے تھے کہ مجلس میں مولانا ان آیات پر جب گفتگو فرماتے تھے، اور فقیہانہ دقتِ نظر سے کسی حنفی مسئلہ کی صحت پر استدلال کرتے تھے تو اچنبھا ہوتا تھا، کہ یہ مسئلہ اس میں موجود تھا، لیکن اب تک اون کی اس حیثیت سے نظر نہین پڑی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادل چھٹ گیا اور آفتاب نکل آیا، اسی کے ساتھ وہ مفتی صاحب موصوف کے حافظہ کی تعریف کرتے تھے، کہ مولانا سے سُنکر اپنے مستقر پر پہونچ کر اس کو بعینہٖ اسی طرح قلمبند کر لیتے تھے جس طرح مولانا نے اس کی تقریر فرمائی تھی،

۴۔ تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبارات، تفسیر بیضاوی مین حروفِ مقطعات کا جو مجمل و مغلق بیان ہے، اس رسالہ مین بزبان عربی اس کو آسان کر کے بیان کیا گیا ہے جس سے حروفِ مقطعات کی تاویل کا ایک طریق معلوم ہوتا ہے،

۵-۶، مولانا کے دو رسالے علم القرآن سے متعلق اور ہین اور ان دونون کا تعلق سلوک سے ہے ایک کا نام مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور دوسرے کا نام تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ ہے، ان

دونوں رسالوں کا موضوع قرآن پاک کی اُن آیتوں کی تفسیر ہے جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں، اس دوسرے رسالہ کی بنا ایک سابق مولف کی تالیف ہے جس کا قلمی رسالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۲۶ھ میں بھاولپور میں ملا تھا، اس پر مزید اضافہ کرکے یہ رسالہ مرتب ہوا ہے،

۳ - علوم الحدیث

حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کو علوم حدیث میں جو مہارت حاصل تھی، اس کی شہادت ان کے مواعظ و رسائل و تالیفات کے ہزاروں صفحات دے رہے ہیں جن میں بے شمار احادیث کے حوالے، اشارے اور تلخیصات، ان کے مشکلات کی شرح، ان کے دقیق مطالب کے حل اور ان کے نکات و لطائف کا بیان ہے، خصوصیت کے ساتھ شیخ کے مواعظ میں جو زبانی تقریریں ہیں برمحل حدیثوں کے حوالے اور اکثر احادیث کے بعینہٖ الفاظ مع ان کی تخریجات اور کتابوں کے حوالوں کے اس کثرت سے ملتے ہیں، کہ ان کو دیکھکر کسی انصاف پسند کو ان کے حافظ احدیث ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا،

اس کے بعد اُن کی اون تصانیف کو لیجئے جو گو فقہ و فتاویٰ اور احکام و مسائل یا اصلاح رسوم اور سلوک میں ہیں، لیکن ان کی بنیاد احادیث پر ہے، اُن میں احادیث کے حوالے دلائل کی مضبوطی اور صحت بیان کی تائید و شہادت کے لئے آئے ہیں، جو مؤلف کے علم و معرفت پر دلیل قاطع ہیں،

حضرت حکیم الامۃ کو فن سلوک کی تجدید کی جو توفیق عنایت ہوئی تھی، اس کا ایک مبارک اثر یہ ہے کہ حضرت نے احادیث کی کتابوں سے اُن تمام حدیثوں کو یکجا فرمایا جن میں اس فن شریف کے مسائل متفرق تھے، اگرچہ بعض حضرات محدثین نے اپنی کتابوں میں بعض ابواب زہد و رقاق کا تذکرہ کیا ہے تاہم ان کی حیثیت فن کی نہیں، قدما میں سے صرف ایک بزرگ حضرت امام عبداللہ بن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہم کو معلوم ہے، جنھوں نے کتاب الزہد و الرقاق کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے، مگر یہ ہیچمدان اس کی زیارت سے محروم رہا ہے، اس لئے اس کی نسبت کچھ عرض نہیں کر سکتا، مگر قیاس یہ ہے کہ وہ ابن ابی الدنیا کی کتاب کی طرح زہد و رقاق اور مذمت دنیا

کے مضامین کی احادیث پر مبنی ہوگی،

اہل سلوک نے جن روایات احادیث سے کام لیا ہے وہ عموماً ضعیف بلکہ موضوع تک ہیں، اسی لئے علمائے سلوک کو اس فن میں کمزور سمجھا گیا ہے، اور اسی بنا پر اہل حدیث و روایت نے یہ بر خود غلط خیال قائم کر لیا ہے کہ فن سلوک اور اس کے مسائل احادیث نبوی سے ثابت نہیں، اور صدیوں سے ان کا یہ اعتراض قائم تھا، گو بعض محدثین نے ادھر توجہ فرمائی، اور اس سلسلہ میں کچھ کام انجام دیا، مثلاً امام ابن ابی جمرہ اندلسی المتوفی ۶۹۹ھ نے صحیح بخاری کی شرح بہجۃ النفوس کے نام سے لکھی جس کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس میں اس کا التزام کیا ہے کہ احادیث کی شرح میں سلوک کے مسائل و نکات کی طرف بھی اشارے کرتے جائیں،

حضرت حکیم الامۃ نے اس کام کو مستقل طور سے انجام دیا، اور حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف کے نام سے دو کتابیں تالیف فرمائیں،

حقیقۃ الطریقۃ | ۱۳۲۷ھ میں تالیف پائی ہے، اور یہ درحقیقت حضرت کی کتاب التکشف بمہمات التصوف کا آخری جزء ہے، اور ساتھ ہی مستقل تصنیف بھی ہے، اس میں تین سو تیس احادیث سے جو عموماً صحاح میں مذکور ہیں، سلوک و تصوف کے مسائل کو مستنبط کیا گیا ہے، اور ان کو اخلاق، احوال، اشغال، تعلیمات، علامات، فضائل، عادات، رسوم، مسائل، اقوال، توجیہات، اصلاح اور متفرقات کے دس ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے، یہ اہل علم کے مطالعہ کی خاص چیز ہے،

التشرف | یہ کتاب چار حصوں میں ہے، ان میں اُن احادیث کی تحقیق ہے جو تصوف کی کتابوں میں یا صوفیہ کے کلام میں آتی ہیں، اور یہ دکھایا ہے کہ اصول و فن حدیث کے رو سے یہ حدیث کس درجہ کی ہے، اور حدیث کی کس کتاب میں ہے اور جو روایات ان میں دراصل حدیث نہ تھیں، بلکہ عوام نے غلط فہمی سے ان کو حدیث سمجھ رکھا ہے، اگر وہ اقوال نتیجہ کے طور پر کسی دوسری حدیث یا آیت پاک سے ثابت ہیں تو ان احادیث و آیات اور اُن سے ان اقوال کی صحت کے طریق و استنباط پر گفتگو فرمائی،

حصہ اول تشرف میں امام غزالی کی احیاء العلوم کی احادیث کی تخریج ہے، اس حصہ کا ماخذ زیادہ تر امام عراقی کی تخریج احیاء العلوم ہے، جس کا حوالہ دیا گیا ہے، اور اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں ہیں جن کا ماخذ ہر روایت کے ساتھ بتایا گیا ہے، یہ حصہ ۱۳۴۷ھ میں لکھا گیا ہے،

حصہ دوم میں دفتر اول مثنوی مولانا روم اور اسکی شرح کلید مثنوی میں آئی ہوئی احادیث و روایت کی تخریج کی گئی ہے، ان احادیث کی تحقیقات زیادہ تر امام سخاوی کی المقاصد الحسنۃ سے التقاط کی گئی ہے، یہ حصہ ۱۳۴۹ھ میں زیر قلم آیا،

حصہ سوم و چہارم ان دونوں حصوں میں حافظ سیوطی کی جامع صغیر سے جو احادیث کی ساری کتابوں کا بہ ترتیب حروف تہجی مجموعہ ہے، اُن احادیث کو یکجا کیا ہے جن سے مسائل سلوک مستنبط ہیں، اور ان کو بہ ترتیب حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے، ساتھ ہی تحقیقات خاصہ کا جا بجا اضافہ اور احادیث کے مطالب کی تشریح و تطبیق اور بعض مشکلات کا حل کیا گیا ہے، حصہ سوم صرف الف کی روایتوں پر مشتمل ہے، اور ۱۳۵۱ھ میں ترتیب پایا ہے، اور حصہ چہارم میں بقیہ حروف کی روایتیں ہیں، اور وہ محرم ۱۳۵۲ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے،

جامع الآثار | حضرات اہلِ حدیث کے اُس فرقہ کی طرف سے جو غالی ہے، اکثر حضراتِ حنفیہ پر یہ طعن کیا گیا کہ حنفی مسائل کی تائید میں احادیث بہت کم ہیں، اور چونکہ کتبِ حدیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی تالیف ہیں، اس لئے ان میں حنفیہ کی مؤید حدیثیں یکجا نہیں ہیں، گو امام محمد کی موطا اور آثار اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الآثار اور مسند ابی حنیفہ مرتبۂ خوارزمی اور امام طحاوی کی تصانیف سے ان کا جواب دیا جاتا رہا ہے، مگر کتب صحاح و مسانید و مصنفات سے جو رائج اور محدثین میں مقبول ہیں چن کر ان احادیث و روایات کو یکجا نہیں کیا گیا تھا جن سے مسائلِ حنفیہ کی تائید ہوتی تھی،

یہ ضرورت گو ہمیشہ سے تھی، مگر اس زمانہ میں اہلِ حدیث کے ظہور و شیوع سے اس ضرورت کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی، چونکہ اس تحریک کا آغاز پورب (عظیم آباد پٹنہ) سے ہوا، اسی لیے اس ضرورت کا احساس

بھی پہلے ہین کیا گیا، چنانچہ حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید مولانا محمد بن علی ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی نے آثار السنن کے نام سے کتب حدیث سے التقاط کرکے اس قسم کی حدیثون کو شائع کیا، اس کے دو ہی حصے شائع ہو سکے، اس کا دوسرا حصہ ۱۳۲۱ھ مین شائع ہوا، علماے احناف نے اس کتاب کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا، یہان تک کہ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس زمانہ مین مدرسۂ امینیہ دہلی مین مدرس تھے، اس کی مدح مین عربی قصیدے لکھے، افسوس ہے کہ مولانا نیموی کی وفات سے اُن کا یہ کام ناتمام رہا،

احیاء السنن | حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ نے بھی اس ضرورت کو محسوس فرمایا اور احیاء السنن کے نام سے اس قسم کی احادیث کا مجموعہ مرتب فرمایا، اور اس کی ترتیب ابواب فقہیہ پر رکھی لیکن افسوس کہ اس کا مسودہ ضائع ہوگیا،

جامع الآثار | کچھ دنون کے بعد پھر اس موضوع کا خیال آیا، اور دوبارہ ایک جدید اسلوب پر اس قسم کی حدیثون کا مجموعہ جامع الآثار کے نام سے مرتب فرمایا، لیکن یہ سلسلہ ابواب الصلوٰۃ سے آگے نہین بڑھا، تاہم جتنا مرتب ہوگیا، وہ چھپ کر شائع ہوگیا،

تابع الآثار | یہ بھی اسی موضوع پر ہے، اور اس کو جامع الآثار کا ضمیمہ بنایا گیا،

احیاء السنن کا احیاء | ۱۳۳۱ھ مین یہ خیال ہوا کہ یہ کام اتنا بڑا ہے، کہ حضرت والا خود اس کام کو تنہا انجام نہین دے سکتے، اس لئے یہ قرار پایا کہ اس کے لئے بعض مستعد علما کو رکھکر کام لیا جائے، چنانچہ مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا، انھون نے کام شروع کیا، جو کام وہ کرتے جاتے مولانا کی نگاہ سے گذرتے جاتے تھے، اس طور سے کتاب الحج تک کام ہوا، اور اس کا نام دوبارہ احیاء السنن رکھا گیا تاکہ مرحوم احیاء السنن کی یادگار ہو، اس کے دو حصے شائع ہوئے تھے کہ بعض اسباب سے اس کتاب کے بعض مضامین سے مولانا کی تشفی نہیں ہوئی، اور اس پر استدراک لکھوانے کا خیال ہوا، اور آیندہ کام کے لئے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا انتخاب ہوا،

ستدراک الحسن | مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے زیر ہدایت اس کام کو بڑی دیدہ ریزی،
عتِ نظر اور تحقیق و تنقید کے ساتھ انجام دینا شروع کیا، سب سے پہلے احیاء السنن کے شائع شدہ حصہ پر دوبارہ نظر
ے سکو الاستدراک الحسن کے نام سے شائع کیا گیا،

اء السنن | اس کے بعد احیاء السنن کے نام کو بدل کر اعلاء السنن کے نام سے اس کام کو شروع کیا گیا، او
ں وقت تک اس کی بارہ جلدین شائع ہو چکی ہین، جن مین مذہب حنفی کی مؤید حدیثون کو بڑے استیعاب کے
اتھ جمع کیا گیا، اور محدثین اور اہلِ فن کی تحقیقات اور اس کے شروح و حواشی مین یکجا کئے گئے ہین، امید ہے کہ
لانا ظفر احمد صاحب ابھی اس سلسلہ کو جاری رکھکر بانیٔ اول کے حق مین صدقۂ جاریہ کا باعث ہونگے،

طب الماثورہ من الآثار المشہورہ | جمعہ و عیدین کے خطبون مین اس درجہ تکلف و تصنع اور مضامین کے ابتذال
ے کام لیا گیا ہے، کہ یہ بازاری خطبے زبان اور طرز ادا اور مضامین و مطالب کے لحاظ سے عہد نبوت اور خلافتِ
شدہ کے اسلوب سے ہٹ کر بلغاء اور خطباء کے اظہار قابلیت کا دنگل بن کر رہ گئے ہین حکیم الامۃ کی اصلاحی نظر
ے محراب و منبر کا یہ گوشہ بھی مخفی نہین رہا، چنانچہ الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ کے نام سے آنحضرت صلی اللہ
لیہ وسلم اور حضرات خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع
ر دیا، تاکہ خطباے مساجد ان مسنون خطبون کو پڑھکر ان تکلفاتِ باردہ کے گناہ سے محفوظ رہین،

طبات الاحکام | جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبون کا یہ مجموعہ تالیف فرمایا، جس مین احادیث و آثار و آیات سے
رغیب و ترہیب کے مضامین کے علاوہ عقائد و اعمال و اخلاق کے مضامین درج فرمائے،

مناجاۃ مقبول | احادیث مین وارد شدہ ادعیہ و اذکار مسنونہ کے لئے حصن حصین و حزبِ اعظم ملا علی قاری وغیرہ کتابین
واج پذیر ہین، مگر وہ طویل ہونے کی وجہ سے سب کے کام کی نہین، حضرت حکیم الامۃ نے عام مسلمانون کے فائدہ
ے لئے ان سب کو تلخیص کرکے مناجات مقبول قربات عند اللہ و صلوات الرسول کے نام سے ایک مختصر مجموعہ تالیف
رمایا ہے، جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بیحد مقبول ہے،

۵۔علوم الفقہ

حضرت حکیم الامۃ کو مسائلِ فقہیہ کی تلاش وتحقیق کا خاص ذوق تھا، اور یہ ذوق ان کو اپنے شیوخ واساتذہ کرام سے ورثہ مین ملا تھا، چنانچہ ابھی وہ تعلیم سے فارغ بھی نہین ہوئے تھے، کہ حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے فتوی نویسی کی خدمت یعنی شروع کر دی تھی، اگر حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ کی فقہی خدمات کا آغاز ۱۳۰۱ھ سے بھی کیا جائے تو ۱۳۶۲ھ تک بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پوری ساٹھ سال اس فن شریف کی خدمت میں بسر کئے، اس طویل عرصہ مین ہزارون مسئلون کے جواب دیئے، ہزارون فتوے اور سیکڑون چھوٹے بڑے فقہی رسالے لکھے، متعدد ضخیم جلدون مین امداد الفتاویٰ اور تتمۂ امداد الفتاویٰ کے نام سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کے مجموعے جمع کئے گئے، جس کی نظیر ہندوستان مین کم از کم نہین ملتی، وذالک فضل اللہ یوتیہ مَنْ یَّشاءُ،

حوادث الفتاویٰ کے نام سے اون فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو اس زمانہ کے نئے مسائل اور نئے مصنوعات سے متعلق ہین، جن کے جوابات گذشتہ کتب فتاویٰ سے بآسانی حاصل نہین کئے جاسکتے،

بہشتی زیور کی دس جلدین جو گو عورتون کے ضروریات کے لئے ہین، مگر ان مین تمام ابواب فقہیہ کے مسائل مندرج ہین، جن کے جوابات ہندوستان کے حالات اور ضروریات اور اصطلاحات کے مطابق صرف انھی کتابون سے معلوم ہوسکتے ہین،

ترجیح الراجح۔ یہ وہ مجموعہ ہے جس کی نظیر سلف صالحین مین تو ملے گی، مگر متاخرین کے یہان یہ سلسلہ بالکل مسدود ہے، اس مجموعہ مین حضرت حکیم الامۃ نے اپنے ان مسائل کو جمع فرمادیا ہے، جن مین از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا، تو اس سے رجوع فرما کر مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کر دی، یہ سلسلہ حضرت کی انصاف پسندی، تواضع اور عدم نفسانیت کا بین ثبوت ہے، یہی حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرات تابعین

و تبع تابعین اور مجتہدین عظام کا طریق تھا، جس کو اس زمانہ میں حضرت حکیم الامتہ رنے زندہ کیا، اور اپنے کو بار آخرت سے بچایا،

فتاوی اشرفیہ کے نام سے مسائل دینیہ کے تین حصے الگ شائع ہوئے جو مختصر رسائل ہیں،

بہشتی گوہر، بہشتی زیور کے سلسلہ کا مردانہ حصہ ہے جس میں خاص طور سے ان مسائل کا بیان ہے جو مردوں سے خاص ہیں، جیسے جمعہ، جماعت، عیدین وغیرہ،

ان کے علاوہ مسئلہ حجاب، مسئلہ ربا، مسئلہ رشوت، مسئلہ بنک سینما اور فلم اور ریڈیو وغیرہ کے مسائل پر فقہی تحقیقات ہیں، اور بعض موضوعوں پر بار بار کئی رسالے تالیف فرمائے،

۴- علم کلام

علم کلام و عقائد و توحید پر متعدد رسالے قلم بند فرمائے، جو شائع و ذائع ہیں، نئے زمانہ کے حالات کا خیال کر کے خود چند کتابیں تالیف فرمائیں، اور دوسروں سے ترجمہ کرائیں، مثلاً

اسلام اور سائنس کے نام سے الحصون الحمیدیہ کا مولانا اسحاق صاحب سے ترجمہ کرایا، یہ عربی کی ایک جدید کلامی تصنیف ہے، اس کے مصنف علامہ جسری ہیں جنھوں نے سلطان عبدالحمید خان کے عہد میں اس کو ملک شام میں تصنیف فرمایا تھا اور جدید حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا، اس کی خاص صفت یہ ہے کہ اس میں تاویل فاسد کا دروازہ نہیں کھولا گیا ہے،

المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ تین حصوں میں ترتیب پایا ہے جس میں اسلامی احکام و مسائل کے مصالح و حکم بیان کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں نماز و زکوٰۃ، دوسرے میں روزہ عیدین، صدقۂ فطر، قربانی، حج، نکاح و طلاق و غلامی وغیرہ کے مسائل کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں، تیسرے حصہ میں خرید و فروخت و معاملات، حدود و قصاص، فرائض، عذاب قبر اور معاد کے متعلق اسلامی تعلیمات کے مصالح ہیں،

الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ، یہ بھی علم کلام ہی کا باب ہے، اس میں جدید تعلیم یافتہ

اصحاب کے مذہبی خدشون اور وسوسون کے تشفی بخش جوابات درج ہین،

اشرف الجواب بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ ہے جو مواعظ و ملفوظات سے جمع کیا گیا ہے جس مین بہت سے نئے اور پرانے شبہات اور خطرات کے جوابات فراہم کئے گئے ہین،

۷۔ علم سلوک وتصوف

علم سلوک وتصوف روح شریعت کا نام ہے، جس مین اخلاص دین اور اعمال قلب کے احکام اور دقائق سے بحث کیجاتی ہے، قدمار صوفیہ نے اس فن پر جو کتابین لکھی ہین، مثلاً رسالہ قشیریہ امام قشیری، قوت القلوب ابوطالب مکی، کتاب اللمع ابونصر عبداللہ بن علی سراج الطوسی کتاب الصدق ابوسعید خراز، فتوح الغیب شیخ سہروردی اور غنیۃ الطالبین شیخ عبدالقادر جیلانی اور متاخرین مین تصانیف امام شعرانی ان کو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے، افسوس ہے کہ مصنوعی اور دوکاندار صوفیہ اور مبتدعہ کی تلبیس نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا، کہ وہ کبھی تو بدعات کا مجموعہ، بلکہ بطلان وضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے، پھر ہندوستان میں ہندوؤن کے جوگ اور ویدانت کے اثر سے اس مین بہت سے ایسے مسائل شامل ہوگئے جو اسلام کی روح کے تمامتر منافی ہین، حتی کہ وحدتِ وجود، وحدتِ شہود و لطائف و دوائر کے مباحث و اعمال بھی اصل فن سے قطعاً الگ ہین، جو یا تو علم کلام و فلسفہ یا اوہام وخیالات و احوال سے وابستہ ہین جن کا تعلق نفسیات سے ہے، اور اصل شئی جو اخلاص فی الدین، طلب رضا، حصول قرب اور اعمال و اخلاق قلب و مقامات ہین، جن سے مقصود رذائل سے پاکیزگی اور فضائل سے آراستگی ہے تمام تر متروک ہوگیا تھا، صدیون کے بعد حضرت حکیم الامتہ کے تجدیدی مساعی نے اس فن کو پھر سلف صالحین کے رنگ مین پیش کیا، اور ہر قسم کے اضافون اور آمیزشون سے پاک کرکے کتاب وسنت کے نور مین اس تاریک زمانہ کے اندر پھر ظاہر کیا، اور زبان وقلم سے ان مسائل پر اتنا کچھ لکھا، اور بیان فرمایا کہ اب طالب پر اصل طریق کا کوئی گوشہ اندھیری مین نہین ہے، والحمد للہ!

اس سلسلہ مین پہلی چیز قصد السبیل ہے جو پچاس ساٹھ صفحون کا مختصر رسالہ ہے، لیکن اس کوزہ مین

دریا بند ہے، فنِ سلوک کے وہ تمام حقائق و تعلیمات جو سالہا سال مین معلوم ہو سکے ہین، اور جن کے نہ جاننے سے سالکین و طالبین غلط راستون پر پڑ کر منزل مقصود کو گم کر دیتے ہین، اس مین لکھ دیئے گئے ہین، اگر کوئی طالب صادق صرف اسی ایک رسالہ کی تعمیل و تکمیل مین عمر صرف کر دے تو اس کے لئے انشاء اللہ کافی و وافی ہو،

جاہل پیرون اور کاندار صوفیون نے ایک مسئلہ یہ گھڑا ہے، کہ شریعت اور طریقت دو چیزین ہین، اور اس زور شور سے اس کو شہرت دی ہے کہ عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھا گیا ہے، حالانکہ یہ تمامتر لغو اور بے معنی ہے، حضرت حکیم الامۃ نے تمام عمر لوگون کو یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے، احکام الٰہی کی باخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے، دگر ہیچ، اور یہی خواص امت کا مذہب ہے، اور جس نے اس کے سوا کہا وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فنِ سلوک سے ناآشنا ہے، اس بارگاہ کے ایک حلقہ بگوش کا شعر ہے،

اب تو مے نوشی ہے عین شرع بر فتوائے شیخ

اب وہی ہوگا فقیہ شہر جو مے نوش ہے

حضرت حکیم الامۃ نے اس فن کے مسائل کو سب سے پہلے کلام پاک سے مستنبط فرمایا، اور اس کے متعلق مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ نام دو رسالے تالیف فرمائے ہین، جن کا ذکر اوپر گذر چکا، پھر ان مسائلِ سلوک کی تشریح فرمائی جن کا ماخذ احادیث نبوی اور سنتِ صحیحہ ہے، اور یہ التشرف بمعرفۃ حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ مین مدون ہین،

اہل تحقیق کے لئے اس فنِ شریف پر ایک جامع کتاب التکشف عن مہمات التصوف تالیف فرمائی جو پانچ حصون مین منقسم ہے، یہ حقیقتِ طریقت، حقوقِ طریقت، تحقیق کرامت اور دیگر مضامینِ تصوف پر مشتمل ہے،

طریق اور سلوک کے اسرار و رموز اس قدر دقیق اور نازک ہین کہ ذرا ان کے سمجھنے مین بے احتیاطی کی جائے تو ہدایت کے بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جائین، اس سلسلہ مین حضرت مولانا رومی کی نے کی، جو مثنوی معنوی کے نام سے سرود نواز حقیقت ہے، خاص اہمیت ہے، اور اسی لئے وہ اس سلسلہ کے اکابر کے خاندانی درس مین رہی ہے، حضرت حاجی امداد اللہ

رحمۃ اللہ کو اس سے خاص ذوق تھا، اور وہ بھی خاص خاص لوگوں کو اس کا درس دیتے تھے، چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے ایما سے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے بڑے اہتمام سے اس کا حاشیہ لکھا، اور منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے مطبع نے اس کو چھاپا، اور یہ کہا جا سکتا ہو کہ مولانا بحر العلوم کے بعد مثنوی کی حکیمانہ شرح اس سے بہتر نہیں لکھی گئی،

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا رین سے حضرت حکیم الامۃ نے اس مثنوی کی خدمت محض فن کی حیثیت سے فرمائی، سلوک کے مسائل، طریقت کی تعلیمات اور مثنوی کے بیانات کی قرآن و حدیث سے اس خوبی کے ساتھ کلید مثنوی مین تطبیق فرمائی کہ اب فن کا مبتدی بھی چاہے، تو اس کلید کے ذریعہ سے مثنوی کے خزانہ کو کھول سکتا ہے،

دیوان حافظ کی پرجوش و مرد افگن شراب نے بھی بہت سے بے احتیاط مے نوشون کو راہ سے بے راہ کر دیا تھا، بدگمانون کو تو اس شرابِ معرفت پر شیراز کے بادۂ انگور کا شبہہ ہوا، اور بے احتیاط خوش گمانون نے اس سے اباحت کی تعلیم حاصل کی کہ

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

حضرت حکیم الامۃ کی معرفت اس تیز و تند شراب کے "منافع و اثم" سے پوری طرح باخبر تھی، حضرت نے عرفان حافظ کے نام سے اس کی ایسی شرح لکھی، کہ اس پھول سے ہر کانٹا الگ ہوگیا،

ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت کے لئے تربیۃ السالک و تنجیۃ الہالک کا سلسلہ الگ مرتب فرمایا، جس مین سالکین کے مشکلاتِ راہ، ذاکرین و شاغلین کے شبہات و خطراتِ راہ کے لیے ہدایات مندرج ہین، یہ کہنا بیجا نہین کہ علوم مکاشفہ و معاملہ کے متعلق کلیات و جزئیات اور احوال شخصی پر ایسی حاوی کتاب کی

نظیر تصوف کے سارے دفتر مین موجود نہین، ۲، ۲۱ صفحون مین یہ کتاب تمام ہوئی ہے،

ایک دوسرا اہم سلسلہ ملفوظات کا ہے، بزرگون کے ملفوظات مرتب کرنے کی رسم قدیم زمانہ سے قائم ہی، یہان تک کہ چشتیہ حضرات مین حضرت سلطان خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت قطب الدین بختیار کعکی اور حضرت سلطان الاولیار نظام الدین دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ملفوظات بھی موجود ہین، لیکن افسوس ہے کہ اہل شوق اس کام کو پورے استیعاب سے نہ کرسکے، کیونکہ ان اکابر کے جو ملفوظات قلم بند ہوسکے، وہ چند سال بلکہ چند ماہ سے زیادہ کے نہین ہین، اور نہ ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہو کہ لکھنے والون نے ان کو ان بزرگوں کی نظر کیمیا اثر سے گذرا بھی تھا، تاہم چونکہ لکھنے والے خود اہلِ کمال و اہلِ احتیاط تھے، اس لئے ان کی صحت میں کوئی شک نہین کیا جاسکتا، اور وہ اس اختصار پر بھی ہمارے لئے بڑی خیر و برکت کی چیزین ہین،

حضرت حکیم الامتہ کے ملفوظات کا سلسلہ تقریبًا ساٹھ مجلدات اور رسائل مین مدوّن ہوا ہے، اور ان مین سے ہر ایک ان کی نظر سے گذر ان کر چھاپا گیا ہے، اور جن مین اکثر حسن العزیز وغیرہ نامون سے چھپ کر شائع ہوچکے ہین، ان ملفوظات مین بزرگون کے قصے، سنجیدہ لطیفے، قرآن و حدیث کی تشریحات، مسائلِ فقہیہ کے بیانات، سلوک کے نکتے، اکابر کے حالات، طالبون کی ہدایات و تنبیہات، آداب و اخلاق کے نکات، اصلاح نفس و تزکیہ کے مجرّبات وغیرہ اس خوبی و دلچسپی سے درج ہین کہ اہلِ شوق کے دل اور دماغ دونون اس آبِ زلال سے سیراب ہوتے ہین،

۸ - اصلاحیات

حضرت حکیم الامتہ رحمۃ اللہ علیہ کے معارف کا یہ آخری باب ہے، اور خاصہ اہم باب ہے، مسلمانون کی اصلاح کی جو دقیق نظر اُن کو بارگاہِ الٰہی سے عنایت ہوئی تھی، اس کا اندازہ ان کی اصلاحی کتابون سے بخوبی ہوسکتا ہے، اصلاح کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بچّون، طالب علمون اور عورتون سے لے کر مردون اور علما و فضلا کے حلقہ تک پھیلا ہوا ہے، اور سب کے لئے مفید ہدایات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے،

دوسری طرف ان اصلاحات کی وسعت یہ ہے کہ مجالس و مدارس اور خانقاہوں سے شروع ہو کر شادی وغمی کے رسوم اور روزمرہ کی زندگی تک کو دیکھا ہیں، غرض ایک مسلم جدھر اپنی زندگی مین رُخ کرے اُن کے قلم نے شریعت کی ہدایات کا پروگرام تیار کر رکھا ہے،

اس سلسلہ مین حضرت کی سب سے اہم چیز **مواعظ** ہین، واعظ تو بحمد اللہ زمانۂ خیر کے بعد اسلام کی دس بارہ صدیون مین بے شمار گذرے ہون گے، مگر شاید واعظین میں ابن نباتہ اور ائمۂ سلوک مین حضرت شیخ الشیوخ عبد القادر جیلانی رح کے مواعظ کے سوا کوئی دوسرا مستند اور مفید مجموعہ موجود نہین لیکن یہ ان بزرگون کے صرف چند مواعظ پر مشتمل ہین، اللہ تعالیٰ نے اس اخیر دور مین امتِ اسلامیہ کی اصلاح کے لئے بہت بڑا فضل یہ فرمایا، کہ حضرت کے مستفیدین کے دل مین یہ ڈالا کہ وہ حضرت کے مواعظ کو جو شہر شہر ہوئے ہین عین وعظ کے وقت لفظ بہ لفظ قید تحریر مین لائین، اور حضرت کی نظر سے گذران کر اُن کو دوسرے مسلمانون کے عام فائدہ کی غرض سے شائع کرین، چنانچہ اس اہتمام اور احتیاط کے ساتھ تقریبًا چار سو مواعظ جو احکام اسلامی، ردِ بدعات نصائح دلپذیر اور مسلمانون کی مفید تدابیر وتجاویز پر مشتمل ہین، اور جن مین حقائق کے ساتھ ساتھ دلچسپیون کی بھی کمی نہین مرتب ہوے، اور اُکثر شائع ہوئے، اور مسلمانون نے اُن سے فائدے اوٹھائے،

سلسلۂ اصلاح وتربیت مین حضرت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عمومًا واعظین صرف عقائد و عبادات پر گفتگو فرماتے ہین حضرت ان چیزون کی اہمیت کے ساتھ مسلمانون کے اخلاق و معاملات اور عملی زندگی کے کاروبار کی اصلاح پر زور دیتے ہین، بلکہ اپنی تربیت وسلوک کی تعلیم مین بھی ان پر برابر کی نظر رکھتے تھے، حالانکہ عام مشائخ نے اس اہم سبق کو صدیون سے بھلا دیا تھا،

مواعظ کے علاوہ اس سلسلہ کی اہم کڑی ان کی کتاب حیٰوۃ المسلمین ہے جس میں قرآن پاک و احادیث نبویہ کی روشنی مین مسلمانون کی دینی و دنیاوی ترقی و فلاح کا مکمل پروگرام مرتب فرمایا ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا ارشاد فرمایا کہ انھون نے اپنی ساری تصنیفات مین اس کتاب کی تالیف مین جو محنت اٹھائی، وہ کسی مین

نہیں پیش آئی، اور اسی لئے یہ بھی ارشاد ہے کہ مین اپنی ساری کتابون مین اس کتاب کو اپنے لئے ذریعۂ نجات گمان کرتا ہون،

اس سلسلہ کی دوسری کتابین اصلاح الرسوم، صفائی معاملات، اصلاح امت، اصلاح انقلاب امت وغیرہ ہین، اور ہر ایک کا منشا یہ ہے کہ مسلمانون کی اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی زندگی، خالص اسلامی طریق اور شرعی نہج پر ہو، اور ان کے سامنے وہ صراط مستقیم کھل جائے، جو ہدایت کی منزل مقصود کی طرف جاتی ہے،

افسوس کہ اس مضمون کو جس استیعاب اور اہتمام کے ساتھ یہ ہیچمدان لکھنا چاہتا تھا، اپنی علالت و عدم صحت کی سبب سے اس کو اس طرح پورا نہ کرسکا، تاہم جو کچھ ہوا وہ اگر مسلمانون کیلئے فائدہ بخش ثابت ہو تو بہت ہے،

طوفان اشک لانے سے اے چشم فائدہ دو اشک بھی بہت ہین اگر کچھ اثر کرین

خط و کتابت

کیلئے

ضروری اطلاع

معارف کے مضامین اور علمی استفسارات اور ان کے متعلق جملہ خط و کتابت شخصی نام کے بجائے صرف اڈیٹر معارف کے پتہ سے اور معارف اور دار المصنفین کے انتظامات اور فرمائشات کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے کی جائے، اور ان تمام امور کے متعلق میرے نام خط لکھنے سے تعمیل میں وقت ہوتی ہے، امید ہے کہ احباب مجھے زحمت سے بچانے کے لئے اس کا خاص طور سے خیال فرمائین گے،

سید سلیمان ندوی

تاریخ افکار و سیاسیاتِ اسلامی

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۶)

اس کے بعد مصنف موصوف نے ان تفسیری روایتوں پر تنقید کی ہے، جو ان کے نزدیک اسرائیلی
مثلاً اقوام عاد و ثمود، ارم، قصص سلیمانی حضرت سلیمانؑ کیلئے ہوا، جن اور پرندوں کی تسخیر، ان کے نطق، جن، ملائکہ، تشبیہ
سحر ذو القرنین اور یاجوج و ماجوج وغیرہ کی روایات. یہ تنقیدیں اور بحثیں مصنف کے ذہن و دماغ کا نتیجہ
نہیں ہیں، بلکہ سر سید احمد خان اور مولوی چراغ علی وغیرہ کی کتابوں سے ماخوذ ہیں جن کے مفصل جوابا
بارہا دیئے جا چکے ہیں، اور ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کے علاوہ ان میں ملائکہ کے سوا اور کسی چیز کا تعلق
ارکانِ دین سے نہیں ہے، اس لئے ان فرسودہ مباحث میں پڑنا بے کار ہے، اس سلسلہ میں صرف چند
کہنی ہیں،

بلاشبہہ مذکورۂ بالا امور و مسائل کی بیشتر مروجہ روایات اسرائیلی ہیں، اور وہ اتنی کھلی ہوئی ہیں
انھیں ہر صاحبِ نظر آسانی کے ساتھ پہچان سکتا ہے، اور محدثین نے خود ان کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے
ان کو الزام کی صورت میں پیش کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن اس سلسلہ میں اس کی تصریح کر دینا ضروری
گو اسرائیلیات کا بڑا حصہ افسانہ و حکایات پر مشتمل ہے، اور وہ بالاتفاق سب کے نزدیک ناقابلِ اعتبار ہے
اس میں گذشتہ انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں خصوصاً یہود و نصاریٰ کے متعلق بعض صحیح روایتیں

جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بسند صحیح مروی ہین، اس لئے ان کے ردّ و قبول کا معیار یہ ہے کہ جو روایت سنداً صحیح ہو وہ قابلِ تسلیم ہے ورنہ قابلِ رد، سند کی صحت کی قید سے ان کا بڑا حصہ خود بخود چھٹ جاتا ہے،

لیکن مصنف کی تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کسی روایت کی صحت و عدم صحت کا معیار اس کی سند کی کیفیت نہین ہے، بلکہ عقل ہے، یعنی جو واقعہ عام انسانی عقلون یا کم از کم مصنف کی عقل کے خلاف ہو، خواہ سند کے اعتبار سے وہ کیسا ہی ہو، نا قابلِ قبول ہے، احادیث میں تو خیر یہانتک بھی غنیمت تھا، لیکن آیات قرآنی کے معانی اور مفہوم کی تعیین مین بھی اونھون نے یہی معیار مقرر کیا ہے۔ چنانچہ جس آیت کے ظاہری معنی ان کی محدود عقل مین نہ آسکے، اس کی انھون نے دور از کار تاویلین کی ہین جس کی مثال آیندہ آئیگی۔

گو اسلام کا کوئی عقیدہ عقل مطلق کے خلاف نہین، لیکن دینی امور مین محدود انسانی عقول کو معیار ماننا ہی سرے سے غلط ہے، اس لئے کہ ہماری عقلین تو محض مادیات کے دائرہ کے اندر تعقل و ادراک کر سکتی ہین، اس کے باہر وہ بے کار محض ہین، مذہب کے مابعد الطبیعی مسائل کو چھوڑیئے سطح زمین کے جو طبیعی قوانین ہین، اور اس مین زندگی بسر کرنے کے لئے جن قوی کی ضرورت ہے، وہ دس پانچ میل فضا کی بلندی مین بالکل بدل جاتے ہین اور وہان اس زمین کے انسانی قوی بالکل بے کار ہوجاتے ہین، اور اس مین زندگی بسر کرنے کے لئے ایک بالکل مختلف قسم کے قوی کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کسی دوسرے کرہ مین زندگی کا امکان ہو یا وہان انسانون سے مشابہ کوئی مخلوق پائی جائے، تو اس کے اعضاء و جوارح اور ادراک و تعقل کے قوی اور احساس و ادراک کے وسائل اس دنیا کے انسانون سے بالکل مختلف ہون گے، کہ اس دنیا کے قوی دوسرے کرون مین زندگی بسر کرنے کیلئے بالکل بے کار ہوجائیں گے، ایسی حالت مین عقل کو مابعد الطبیعی مسائل مین معیار ماننا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے، اسی لئے کلام مجید نے ہدایت کے لئے ایمان بالغیب کو ضروری قرار دیا ہے،

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى	یہ کتاب ایسی ہے جس مین کوئی شبہہ نہین، یہ
لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ	ہدایت ہے ان متقیون کے لئے جو غیب کی باتون

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ ، پر یقین رکھتے ہین، اور نماز قائم کرتے ہین،

اسلئے ایمان بالغیب ایمان کا ضروری جز ہے، دین کے مابعد الطبیعی اور روحانی مسائل مین عقل و خرد اور علم ک
نارسائی اور کورچشمی اتنی ظاہر ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہین، عقل کا کام محض نظریات کی ایجاد، مقدمات
ترتیب اور ظن و قیاس ہے، اس لئے وہ ذہن و دماغ مین آنیوالے تصورات کا تو ادراک کرسکتی ہے لیکن روحانی ح
اور مجردات کا تعقل اس کے بس سے باہر ہے، اس کے لئے وجدانِ سلیم اور ذوق یقین کی ضرورت ہے، عقل و
اور علم و استدلال کبھی اسرار دین کے محرم نہین سمجھے گئے،

گر زاستدلال کار دین بُدے فخر رازی رازدار دین بُدے

پاے استدلالیان چوبین بود پاے چوبین سخت بے تمکین بود

یہ موقع علم و عقل کی نارسائی کی بحث کا نہیں ہے، لیکن مصنف کی تشفی کے لئے اس بارہ مین
کے خیالات کو جن کے کلام پر ان کا ایمان ہے، پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، خودی کے بعد اقبال
چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، وہ عقل و علم کی نارسائی اور عشق و دل کی عظمت اور اسکی ہدایت و رہنمائی ہے، گو
عشق و دل کی اصطلاح کو جابجا ایمان و ایقان سے زیادہ وسیع معنون مین بھی استعمال کیا ہے، لیکن ا
کوئی استعمال قوتِ ایمانی، جذبۂ ایمانی اور حرارتِ ایمانی کے مفہوم اور مقصود سے خالی نہین ہے، جس
انھون نے عشق و دل سے کی ہے، یہی اصطلاح شرع مین ایمان ہے، انھون نے اس حقیقت کو اپنے کلا
سے اور اتنے مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے، کہ ان سب کا استقصا مشکل ہے، اس لئے صرف چند
پیش کی جاتی ہین،

عقل اسباب و علل کے پھیر مین مبتلا ہے، اور عشق میدانِ عمل کا چوگان باز ہے، عقل کا سر
تذبذب ہے، اور عشق کا مایۂ خمیر جزم و یقین ہے، عشق سوزِ دل یعنی حرارتِ ایمانی سے زندہ اور شرار لا الہ سے تا

عقل [illegible] اسباب و علل عشق چوگان باز میدان عمل

عقل را سرمایہ از بیم و شک است | عشق را عزم و یقین لاینفک است
عشق از سوز دل بازندہ است | از شرار لا الٰہ تابندہ است

علم محض تخمین و ظن ہے، سراپا حجاب ہے، مقام صفات ہے، ابن الکتاب ہے، اور عشق سراپا حضور، تماشائے ذات اور ام الکتاب ہے،

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن | عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن | عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات | علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

یہ محض شاعرانہ تخیل اور صوفیانہ نکتہ وری نہیں ہے، بلکہ عین حقیقت ہے، مومن کیلئے سب سے بڑا انعام جمال الٰہی کا مشاہدہ ہوگا، لیکن علمی نقطۂ نظر سے رویت باری میں طرح طرح کے استحالے ہیں، اسی لئے عقل کے حصہ میں صرف غیاب و جستجو آیا، اور عشق کو حضوری کا درجہ نصیب ہوا۔

تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے | عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب
انجام خرد ہے بے حضوری | ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

اسی لئے علم کو حجاب اکبر کہا گیا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ

بوعلی اندر غبار ناقہ گم | دست رومی پردۂ محمل گرفت
آن فروتر رفت تا گوہر رسید | آن بگردابے چو خس منزل گرفت

علم کی نگاہ کیف و کم اور ابتدا پر رہتی ہے، اور عشق کی انتہا، اور نتیجہ پر،

حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں | رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

یہ شعر درحقیقت علم و عقل کی حیرانی اور ان کی بے نتیجہ تحقیق و کاوش اور انجام سے بے خبری اور ایمان کی

حقیقت پسندی اور انجام بینی کی بہترین تمثیل ہے، کائنات کے متعلق علم و سائنس کی ساری تحقیق ا
اس پر صرف ہوئی ہے، کہ یہ کائنات کس طرح وجود میں آئی اور کن مراحل سے گذر کر اس درج
لیکن اس کا انجام کیا ہوگا اور اسکے بعد کون سی منزل شروع ہوگی، اس سے اس کو مطلق بحث نہین لیک
ان لایعنی باتون مین نہین پڑتا، اس کی ساری فکر اور تیاری اس کے لئے ہوتی ہے، کہ اس کے بع
جانا ہے، دنیا کی تخلیق کی سرگذشت کی علمی تحقیق سے چند ذہنی معلومات کے علاوہ انسان کو کیا حاص
آیندہ پیش آنے والا مرحلہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر انسان کی سعادت و شقاوت کا دا
اس لئے انسانی فلاح وسعادت کے لئے دنیا کی تخلیق کی سرگذشت مفید و کارآمد اور ضروری
کے انجام کی فکر اور تیاری،

اس تشریح کو ہمارے موضوع سے چندان تعلق نہین تھا، مذکورۂ بالا شعر پڑھکر بے اختی
زبان قلم پر آگئین، ابھی عقل و عشق کے فرقِ مراتب پر گفتگو تھی، کمالِ عشق و مستی یعنی ایمان کا
ظرفِ حیدر ہے، اور حرف رازی یعنی علم و عقل اس کے زوال کا مظہر ہے،

جمالِ عشق و مستی نے نوازی جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

عاشقی نام ہے قوتِ ایمانی کا،

عاشقی توحید را بر دل زدن وانگہے خود را بہ ہر مشکل زدن

اسی لئے

بے خطر کود پڑا آتش نمرود مین عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق کی بلندی اور عقل کی پستی یہ ہے کہ عشق و ایمان کا مظہر جمالِ مصطفوی صلعم ہے
کانپتی تو لہی حرون دحرا ادر جنود و انکار،

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا   عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

اب مصنف ان دونوں میں سے جس کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں،

عشق ہی اصل ہے، اسی سے عقل بھی روشنی حاصل کرتی ہے، جو عقل اس روشنی یعنی ایمان سے خالی ہو وہ ناکارہ ہے، زندگی کی آسودگی ایمان ہی کی حلاوت سے حاصل ہوتی ہے،

عقلے کہ جہان سوز دیک جلوۂ بیباکش   از عشق بیاموزد آئین جہانتابی

عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد   از تاب و تب رومی تا حیرت فارابی

این حرف نشاط آور می گویم و می رقصم

از عشق دل آساید با این ہمہ بے تابی

ہمارے فاضل مصنف نے دینی مسائل میں اسی کور چشم عقل کو رہنما بنایا ہے، اگر وہ محض اپنی خوش فہمی سے اپنے اغراض کے لئے کلام اقبال کو موقع بے موقع استعمال نہیں کرتے، اور اس کی صداقت پر واقعی ان کا عقیدہ ہے، تو ان کی خدمت میں گذارش ہی،

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں   راہ بر ہو ظن و تخمین تو زبون کار حیات

اور

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور   چراغ راہ ہے منزل نہیں ہی

اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ دین کے نام سے مذہب میں جو خرافات بھی شامل ہو گئے ہیں انکو بے چون وچرا تسلیم کر لیا جائے، بلکہ یہ مقصد ہے کہ کلام مجید کی ان آیات میں جو بالکل کھلی ہوئی ہوں، اور ان مسائل میں جو غیر مشتبہ طور پر صریحاً ثابت ہیں، کسی قسم کی تاویل جائز نہیں، خواہ وہ ہماری عقل کے ہی خلاف کیوں نہ ہوں، انھیں بے چون وچرا تسلیم کر لینا چاہئے، البتہ محتمل المعانی و مختلف الجہات آیات و مسائل میں تاویل کی گنجایش ہے، اس لئے ان تفسیری روایات میں جن کا اثر کلام مجید کے صریح کھلے ہوئے معنی اور مفہوم پر نہ پڑتا ہو، مصنف کو تنقید کا پورا حق ہے لیکن صریح آیات کی تاویل افکار اسلامی

کے مصلح کے لئے زیبا نہین،

مصنف نے اگرچہ اس بحث کا موضوع اسرائیلیات کو قرار دیا ہے، لیکن اس
آیاتِ قرآنی کی تفسیر کو بھی شامل کر لیا ہے، پہلی شق یعنی اسرائیلی روایات مین بعض روایتیں
قصص سلیمانی کی غیر قرآنی تفصیلات یقیناً اسرائیلی ہین جنھین کوئی بھی صحیح نہین مانتا، بعض
تاریخ سے ہے، مثلاً عاد، ثمود، ارم، ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج وغیرہ ان مین بھی ایک
کو بحث وگفتگو کا حق حاصل ہے، اور وہ تاریخی تحقیق کی روشنی مین غیر معتبر تفسیری روایات
ہی، اس لئے ہم ان مسائل کو نظر انداز کرتے ہین لیکن ملائکہ کا تعلق ارکان دین سے ہے
سے وحی الہی اور الہامی کتابون کی صداقت مشتبہ ہو جاتی ہے، اس لئے ان کے متعلق آیا
ضروری ہے،

ملائکہ اور جن کے بارے مین مصنف نے عجیب دورنگی اختیار کی ہے، ایک طرف
ان دونون کے صریح اور بکثرت تذکرہ کی وجہ سے ان کے وجود سے انکار نہ کرسکے، چنانچہ

"ملائکہ جن اور شیاطین کا وجود مسلمات اسلام مین سے ہے، اور ان تینون میں سے کسی کے
اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہین رکھتا"۔

لیکن چونکہ ان کا وجود محسوس نہیں ہے، اور مادیات کا ادراک کرنے والی عقل
پہلے پہلے تو اونھون نے ان کو قوائے مجردہ مانا، چنانچہ ملائکہ کے متعلق فرماتے ہین:۔

"نظام عالم کو چلانے کے لئے مختلف طاقتون اور قوتون کی (Energies
انہی قوی کا نام ملائک ہے، ملک عربی مین طاقت (انرجی) کو کہتے ہین"۔

لیکن اس پر بھی بس نہیں کیا، اور آخر مین اونھین مادی عناصر کے فطری قوی
ارشاد ہوتا ہے:۔

ایک درخت کو اگانے اور پرورش کرنے کے لئے مختلف قوائے نو کی ضرورت ہے، سمندر سے بھاپ بنانے
ور آسمان کی فضا میں بادل بنانے کے لئے بے شمار عناصر دقوتیں درکار ہیں، ان قوتوں کا وجود بہرحال
ضروری ہے۔ اسی وجود کا نام بعض مسلم مفکرین کے نزدیک ملک ہے، اسی طرح ناری مخلوق (جن)
کے لئے بھی یہ ضروری نہیں، کہ اس کے مادی جسم ہو، اگرچہ خدا میں قدرت ہے کہ وہ ہر وجود کو مادی جسم
سے آراستہ کر سکتا ہے، بہرحال جنوں کے وجود حقیقی میں کوئی اختلاف نہیں، (ص ۱۶۶)

س کے بعد اس معنی سے بھی گریز کرتے ہیں :-

"قرآن کریم میں جن متعدد دوسرے مقامات پر بھی آیا ہے، جہاں اس کے معنی وہ مخلوق ناری نہیں
ہیں جس کا اوپر ذکر گیا، بعض مفسرین کے نزدیک لفظ جن جہاں انس کے مقابلہ میں آیا ہے بالخصوص
حضرت سلیمان علیہ السلام کے سلسلہ میں جہاں اس لفظ کا ذکر آیا ہے، وہاں اس کے معنی غیر مہذب، وحشی
جاہلی پہاڑی کے ہوتے ہیں (ص ۱۰۱)

لیکن آگے چل کر یہ تخصیص بھی ختم ہو جاتی ہے، فرماتے ہیں :-

"عرب میں بھی جن مشہور قبیلہ تھا، جو بدوی لوگوں پر مشتمل تھا ..... یہ قبیلہ جنگلوں میں رہتا ہوگا،
..... اس سے ظاہر ہے کہ جنگلوں کے رہنے والے آدمیوں سے منسوب کیا گیا ہے"

آخری نتیجہ :- قرآن کریم کی بعض مشہور آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کو انسان ہی کے
معنی میں استعمال کیا گیا ہے، مثلاً

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ، — اے جن و انس کے گروہ کیا تمھارے پاس تم ہی میں رسول نہیں آئے،

مصنف کے خیالات کی یہ نیرنگی قابل ملاحظہ ہے، کہ پہلے ملائکہ کو ایک مجرد مخلوق مان کر پھر انہیں عناصر
کا قالب دیا اور جن کو ناری مخلوق تسلیم کر کے مختلف قالب دیتے ہوئے آخر میں انسان بنا دیا، سلئے کہ

ملائکہ کی تعبیر مادی عناصر سے کرنا نہ صرف اون کا استخفاف ہے، بلکہ قرآن کی صریح مخالفت ہے، مصنف کو معلوم ہونا چاہئے کہ انسانون کی طرح ان کو مادی مخلوق کوئی نہیں مانتا، لیکن ان کے روحانی مخلوق یا کم سے کم روحانی قوت ماننے سے انکار تو آیات قرآنی کا صریح انکار ہے، مصنف کے بیان سے ظا ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ملک و ملائکہ کوئی مخلوق نہین، بلکہ وہ صرف مختلف مادی عناصر کے امتزاج سے کو وفساد کے عمل کی قوت کا نام ہے، جو ایک خالص مادی اور غیر شعوری استعداد ہے، اس جدت تفہ کیلئے جن مسلم مفکرین کا حوالہ مصنف نے دیا ہے، وہ سر سید احمد خان ہین، اسی سے اس تفسیر کی حقیقت ظاہر ہے، یہ تفسیر سراسر آیات قرآنی کے خلاف ہے، ملائکہ عناصر کی قوت کون وفساد کا نام نہین، بلکہ وہ اون سے بلند باشعور روحانی قوت ہین جن کا کام خدا کی تقدیس وتمجید، اس کی خدمت گذاری، اس کے احکام کی بجاآور ان کا نفاذ، خدا اور انبیاء و رسل کے درمیان پیامبری، اور کارخانۂ عالم کے نظام کی نگرانی اور اس کا انـ ہے، کلام مجید مین بیسیون، بلکہ پچاسون مقام پر ان کا اور ان کے ان اوصاف کا ذکر ہے، فرشتے خدا اور اس برگزیدہ بندون اور مخلوقات کے درمیان پیامبری اور سفارت کی خدمت انجام دیتے ہین،

الحمد للہ فاطر السمٰوات والارض	حمد ہو اس خدا کی جو آسمانون اور زمین کا
جاعل الملٰئکۃ رسلا اولی اجنحۃ	پیدا کرنے والا اور فرشتون کو دو دو تین تین
مثنٰی وثلٰث وربٰع یزید فی الخلق	اور چار چار شہپر بازوٗن والے پیام رسان
ما یشاء ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر	بنانے والا ہے، وہ پیدایش مین جو چاہے بڑھا
(فاطر - ۱)	وہ ہر چیز پر قادر ہے،
اللہ یصطفی من الملٰئکۃ رسلا	خدا ہی ہے جو فرشتون اور آدمیون مین
ومن الناس ان اللہ سمیع بصیر	سے پیام رسان اور قاصد منتخب کرتا ہے، خدا
یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم	سننے والا اور دیکھنے والا ہے، اوران کے آگے

وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ،	اور پیچھے کا حال جانتا ہے، اور تمام کاموں
(حج - ۱۰)	کا مرجع ہے،
اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ	یا خدا اپنا ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس کی
(شوریٰ - ۵)	اجازت سے جو خدا چاہتا ہے وحی کرتا ہے،
یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ	خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے
یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ، (نحل - ۱)	بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے،

بارگاہِ ایزدی کے حاضر باش ہیں، اور اس کی تسبیح و حمد اور اہلِ زمین اور مومنین کے لئے استغفار کرتے ہیں،

وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ	اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح
وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ	کرتے رہتے ہیں، اور زمین والوں کی بخشایش
اللّٰہَ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ،	کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کہ بخشنے والا اور
(شوریٰ - ۱)	رحم کرنے والا خدا ہی ہے،
اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ	جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور
یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِہٖ	جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروردگار
وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا،	کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں، اور اس پر ایمان
	رکھتے ہیں، اور ایمان والوں کی بخشایش کی
(مومن - ۱)	دعا کرتے ہیں،
وَتَرَی الْمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ	اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے ارد
الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ،	گرد احاطہ کئے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و
(زمر - ۸)	ثنا میں مصروف ہوں گے،

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا وَّ	ہرگز نہیں جب زمین ریزہ ریزہ کر دیجائیگی،
جَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا،	اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا، اور فرشتے
(فجر - ۱)	قطار در قطار آئیں گے،

خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں،

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ	اس میں (لیلۃ القدر) فرشتے اور روح اپنے
رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ، (قدر - ۱)	پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لیکر نیچے اترتے ہیں
اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ	یاد کر جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی
مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا،	کر رہا تھا، کہ میں تمھارے ساتھ ہوں، تم
(انفال - ۲)	مومنوں کو ثابت قدم رکھو،

روح قبض کرتے ہیں،

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ	کہدو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے، وہ تم پر
وُكِّلَ بِكُمْ (سجدہ - ۱)	موت طاری کرے گا،
وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا	اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کی عمر پوری
الْمَلٰٓئِكَةُ، (انفال - ۷)	کر رہے ہوں،
وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ	اور وہ خدا تم پر نگران بھیجتا ہے یہاں تک کہ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ	جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے، تو ہمارے
لَا يُفَرِّطُوْنَ، (انعام - ۸)	قاصد اسکی عمر پوری کرتے ہیں، اور وہ کمی نہیں کرتے،

انسانوں کے اعمال و افعال کی نگرانی کرتے ہیں،

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ	بیشک تم پر نگہبان ہیں بزرگ ہیں لکھنے والے ہیں

يَعلمونَ ماتفعلونَ، (انفطار-۱)

جو تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں،

مايلفظ من قول الالديه رقيبٌ
عتيد، (ق-۲)

کوئی منہ سے بات نہیں نکالتا، لیکن اس کے
نزدیک ایک نگہبان حاضر ہے،

سَوآءٌ منكم من اسرالقول ومن
جهربه ومن هُوَ مستخفٍ بالليل
وساربٌ بالنهار لهٗ معقبٰت من
بين يديه ومن خلفه يحفظونه
من امرالله، (رعد-۲)

تم سے کوئی بات چھپا کر کہے یا زور سے کہے
یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے، خدا کے
تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور
اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اس کی نگرانی
کرتے ہیں،

جنت و دوزخ کے کاروبار کے نگران ہوں گے۔

انّ الّذين قالوا ربنا الله ثمّ
استقاموا تتنزل عليهم الملٰئكة
الّا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا
بالجنة التى كنتم توعدون نحنُ
اولياؤكم فى الحيٰوة الدّنيا
وفى الآخرة (فصلت-۴)

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے
پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے
اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی
خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم
جو تمھاری پہلی اور اس دوسری زندگی میں تمھارے
رفیق ہیں،

وَسيق الذين كفروا الى جهنّم
زمرًا حتّى اذا جآءوها فتحت
ابوابها وقال لهم خزنتها
الم ياتكم رسل منكم،

اور کفر کرنے والے گروہ کے گروہ دوزخ کی
طرف لیجائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اس
کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے
جائیں گے، اور اس کے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے

(زمر - ۸) کہ کیا تمھارے پاس تمھیں میں کے پیغمبر نہیں آئے

وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰى اِذَا جَاۗءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ، (زمر - ۸)

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے، وہ گروہ در گروہ جنت میں لیجائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے، اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے، اور اس کے پاسبان (فرشتے) کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو خوش خوش ہمیشہ کے لئے جنت میں داخل ہو جاؤ،

وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد - ۳)

اور جنتیوں پر فرشتے ہر دروازے سے داخل ہوکر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، یہ تمھارے صبر کا بدلہ ہے، یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے،

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰۗىِٕكَةً (مدثر - ۱) اور ہم نے دوزخ کے اہل کار فرشتوں ہی کو

دنیا میں نیکوکاروں کے لئے بشارت کا پیام لاتے ہیں،

وَلَقَدْ جَاۗءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى (ھود) اور ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لیکر آئے

بدکاروں کی تباہی کے سامان مہیا کرتے ہیں،

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ (ھود - ۷)

انھوں نے کہا اے لوط ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں،

حسب ذیل آیات خاص طور سے غور کے لائق ہیں،

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً، (بقرہ - ۴)

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب،

تو فرشتوں نے اس کے جواب میں عرض کیا،

قَالُوا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا	فرشتے کہنے لگے کہ آپ پیدا کریں گے زمین
وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ	میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں
وَ نُقَدِّسُ لَكَ ،	اور خونریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے
(بقرہ - ۴)	ہیں آپ کی حمد کی اور تقدیس کرتے رہتے ہیں

خلیفہ پیدا کرنے کے بعد بارگاہ ایزدی سے فرشتوں کو حکم ہوتا ہے،

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ	پھر ہم نے فرشتوں کو فرمایا کہ آدم کو سجدہ
فَسَجَدُوْا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ لَمْ یَكُنْ مِّنَ	کرو، سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے وہ سجدہ
السّٰجِدِیْنَ ، (اعراف)	کرنے والوں میں شامل نہ ہوا،

ایک دوسرے موقع پر ہے،

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ	جب آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد
بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ	فرمایا کہ میں گارے سے ایک انسان بنانے والا
فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ	ہوں جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور
فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّاۤ	اس میں اپنی جان ڈال دوں تو تم سب اسکے
اِبْلِیْسَ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ	روبرو سجدہ میں گر پڑنا، چنانچہ سارے کے
(ص - ۵)	سارے فرشتوں نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے وہ
	غرور میں آگیا، اور کافروں میں سے ہوگیا

فرشتوں میں انسانوں کی طرح افراد ہیں جنھیں خدا باطل قوتوں کے مقابلہ میں پیغمبروں کی مدد کے لئے مامور فرماتا ہے،

اذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤمِنِیْنَ اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ	اور جب آپ مسلمانون سے یون فرمارہے تھے
یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ	کہ تم کو یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمھارا رب تمھاری
الْمَلٰٓئِکَةِ مُنْزَلِیْنَ بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَ	مدد کرے تین ہزار فرشتون سے جو اتارے
تَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْکُمْ	جاوین گے، ہان کیون نہین اگر مستقل رہوگے
رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ	اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آپہنچین گے تو
مُسَوِّمِیْنَ،	تمھارا رب تمھاری امداد فرمائے گا، پانچ ہزار
(آل عمران - ۱۳)	فرشتون سے جو ایک خاص وضع بنائے ہونگے،

یہ اور اس قسم کی اور بہت سی آیات ہین جن سے فرشتون کی حقیقت، ان کی جنس اور ان کے کامون پر روشنی پڑتی ہے، کیا ان صریح آیات کے بعد یہ کہنے کی گنجایش باقی ہے کہ فرشتے محض عناصر کے فطری قوی کا نام ہے،

اسی طریقہ سے جن کی تفسیر بدوون، پہاڑی اور جنگلی انسانون سے بھی سرسید احمد خان کی رہین منت ہے، جو ملائکہ کی تفسیر کی طرح بالکل غلط اور آیاتِ قرآنی کے یکسر خلاف ہے، جن اور اجنہ سے مراد بدوی اور جنگلی انسان نہین، بلکہ انسان کی طرح اور اس کے مقابل مستقل ایک مخلوق ہے، کلام مجید مین ایک سے زیادہ مقامون پر اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ	انسان کو ایسی مٹی سے پیدا کیا جو ٹھیکرے
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ،	کی طرح بجتی تھی، اور جنات کو خالص آگ
(رحمٰن - ۷)	سے پیدا کیا،

اس لئے دو مختلف بلکہ متضاد عناصر سے ترکیب پانے والی مخلوق ایک کس طرح ہوسکتی ہے، کلام مجید کی آیتکے انکار سے بچنے کے لئے یہ پہلو اختیار کرنا کہ اس آیت مین تو جن سے جن ہی مراد ہے، لیکن اس کے علاوہ

اور جہان کہین جن کا ذکر آیا ہے، اس سے مراد یہ ناری مخلوق نہین ہے، بلکہ پہاڑی اور جنگلی انسان مراد ہین، آخر کس اصول پر، اس اختلافِ معانی کے لئے کوئی قرینہ ہونا چاہئے، یا محض اس لئے کہ اور مقامون پر جہان جن سے جن مراد لینے مین عقلی استبعاد نظر آتا ہے، اس سے مراد پہاڑی اور جنگلی انسان لئے جائین، اس سے انکار نہین کہ عربی مین اس اطلاق کی بھی بعض مثالین ملجائین گی، لیکن اس کی حیثیت تشبیہ و مجاز کی ہے، دوسری زبانون مین بھی مجازاً اور تشبیہ کے طور پر وحشی انسانون کو جن سے تعبیر کرتے ہین، خود اردو مین لیکن اس مجاز اور تشبیہ کو حقیقت پر تو کوئی محمول نہین کرتا، اگر کسی بہادر انسان کو شیر یا احمق آدمی کو گدہا کہا جائے، تو کیا اس سے حقیقۃً انسان شیر اور گدہا بن جائے گا، پھر یہ تو ہر زبان کا ایک کھلا ہوا اصول ہے، کہ کسی زبان کے کسی لفظ کے حقیقی معنیٰ کو چھوڑ کر بغیر کسی قرینہ کے مجازی معنی مراد نہین لئے جا سکتے، اس لئے وحشی انسانون کی جن سے تعبیر کے لئے کوئی قرینہ چاہئے،

مصنف نے یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ سے یہ استدلال کیا ہے، کہ انھون نے پہلے یہ فرض کر لیا ہے کہ جنون کے پاس رسول نہین بھیجے گئے، کیونکہ قرآن مین ان کا کوئی ذکر نہین ہے، اس لئے ان سے خطاب بے معنی ہوگا، اس لئے جن سے مراد بدوی یا جنگلی انسان ہین، لیکن یہ استدلال سراسر لغو ہے، مصنف نے جس خود ساختہ مقدمہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے، وہی غلط ہے، اس لئے نتیجہ بھی غلط ہے، اجنہ مین انبیاء کی بعثت خود اسی آیۃ سے ثابت ہے، یہ ضروری نہین کہ قرآن مین اس کی پوری تفصیلات ہون، دنیا مین سیکڑون اقوام کے پاس صدہا انبیاء و رسل آئے، لیکن ان مین سے کلام مجید مین کتنون کا تذکرہ ہے، اجنہ مین بعثت انبیاء کا ذکر گو تفصیلی نہ سہی، مگر اجمالی ایک سے زیادہ مقامون پر موجود ہے، خود اسی آیۃ مین ہے،

پوری آیت یہ ہے،

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ	اے جماعت جنات کی اور انسان کی کیا
رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ	تمھارے پاس تم ہی مین سے پیغمبر نہین آتے تھے

وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا — اور جو تم سے میرے احکام بیان کیا کرتے تھے، اور
قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ — تم کو اس آج کے دن کی خبر دیا کرتے تھے، وہ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا — سب عرض کریں گے کہ ہم اپنے اوپر جرم کا اقرار
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ — کرتے ہیں، اور ان کو دنیوی زندگی نے بھول
(انعام - ۱۶) — میں ڈال رکھا ہے، اور یہ لوگ مقر ہوں گے کہ

یہ آیت جنوں میں پیغمبروں کے آنے کا صریح ثبوت ہے،

کیا قیامت میں بدوؤں اور شہریوں اور جنگلی انسانوں اور مہذب انسانوں سے خطاب الگ الگ ہوگا، اگر ایسا ہے تو پھر انسانوں میں محض دو قسم کی تقسیم کیوں ہو، انسانوں کے اور بہت سے طبقات نکل سکتے ہیں، پھر عربی قاعدہ سے بھی جن و انس کو ایک نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ معطوف معطوف علیہ میں مغائرت ضروری ہے، اس لئے اس آیت میں دونوں ایک ہو ہی نہیں سکتے، پوری سورہ رحمان میں جنوں اور انسانوں سے خطاب ہے، ہرچند آیتوں کے بعد فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کا ٹکڑا ہے، اور ربکما اور تکذبان دونوں میں تثنیہ کی ضمیر ہے، جس سے جن و انس دونوں سے خطاب ہے،

اسی طریقہ سے سورۂ نمل کی ان آیات کی تفسیر میں جن میں "منطق الطیر" کا صریح ذکر ہے، ان سے متعلق اسرائیلیات کی تنقید نہیں بلکہ دور جدید کے "مفکر مفسرین" کی غلط تاویلات کی سراسر تقلید کی گئی ہے، چنانچہ ان آیات میں،

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا — اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا فرمایا، اور
وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى — ان دونوں نے کہا تمام تعریف اللہ کے لئے
كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَوَرِثَ — سزاوار ہے، جس نے ہم کو اپنے بہت سے
سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ — ایمان والے بندوں پر فضیلت دی،

عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ
شَيْءٍ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ
وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ،
حَتّٰى اِذَا اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ
نَمْلَةٌ يّٰاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ
لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ
لَا يَشْعُرُوْنَ ...... وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ
فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ
كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا
شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ
بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ، (نمل - ۱)

اور داؤد کے قائم مقام سلیمان ہوئے، اور انھوں
نے کہا کہ اے لوگو ہم کو پرندوں کی بولی کی
تعلیم کی گئی ہے، اور ہم کو ہر قسم کی چیزیں دی
گئی ہیں، یہ واقعی اللہ تعالیٰ کا صاف صاف
فضل ہے، چنانچہ سلیمان کے لئے جو لشکر جمع
کیا گیا تھا، ان میں جن بھی تھے اور انسان
بھی اور پرندے بھی، اور ان کو روکا جاتا تھا،
یہاں تک کہ وہ چیونٹیوں کے ایک میدان
میں آئے تو ایک چیونٹی نے کہا، کہ اے چیونٹیو!
اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو کہیں سلیمان اور ان کا لشکر
بےخبری میں تم کو کچل نہ ڈالیں ..... اور سلیمان نے پرندوں کی حاضری لی
تو فرمایا کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا کیا کہیں غائب
ہو گیا ہے، میں اس کو سخت سزا دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی صاف حجت میرے سامنے لائے،

محض اس بنا پر کہ بقول مصنف چیونٹی کا کلام کرنا جدید مفسرین کے نزدیک قرآن کریم کے طرز کے خلاف ہے (ص ۱۰۷) ہدہد اور نمل میں متعارف ہدہد اور چیونٹی بجائے ان کو انسانی قبیلہ قرار دیا گیا ہے، اور طیر کے معنی لشکر کے لئے ہیں، فرماتے ہیں:

"طیر کے معنی لشکر کے بھی ہیں، اور مولوی چراغ علی کی تحقیق کے مطابق ہداہد جو ہدہد کی جمع ہے ایک قبیلہ کا نام ہے، ..... قدما نے اسکی (نمل) کی تفسیر میں اس نے غلطی کی کہ وہ ہر لفظ کو براہ راست اس کے معنوں میں لیتے تھے، اور قدیم تاریخ اور فن تنقید کا ان میں رواج نہ تھا، چونکہ آیۃ میں نمل کا لفظ ہے، اور اس کے معنی چیونٹی کے ہیں اسلئے یحطمنکم کے معنی بجائے "نقصان پہنچانا" "روندنا"

کئے گئے، ان کی تحقیق کے مطابق نمل ایک قبیلہ کا نام تھا"

لیکن مصنف نے پوری آیۃ پر غور نہین کیا، ورنہ وہ ان دوراز کار تاویلون مین نہ جاتے یہ دونون تاویلین عربی زبان، سیاق کلام اور منشاے قرآنی سب کے خلاف ہین، اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو موضع فضل واحسان مین ذکر فرمایا ہے، کہ ہم نے داؤد وسلیمان کو "علم" عطا فرمایا، اس عطیہ کی احسانمندی مین دونون پیغمبرون نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اور فرمایا "فضّلنا علی کثیر من عبادہ المؤمنین" اس سے معلوم ہوا کہ وہ کوئی خاص امتیازی فضل تھا، جس کی تصریح خود "منطق الطیر" موجود ہے جو واقعی ایک امتیازی علم یا استعداد ہے، اور اگر طیر سے مراد فوج لی جائے تو فوج کی بولی کا سکھانا کونسا فضل ہے، اور اس کی کون سی خاص بولی ہوتی ہے، جس کا اختصاص کے ساتھ ذکر کیا گیا، دوسرے کلام مجید مین "وحشر لسلیمن جنودہ من الجن والانس والطیر" ہے، اگر "طیر" کے معنی فوج کے لئے جائین تو جنودہ بالکل بے کار اور بے معنی ہو جاتا ہے، "اور جنودہ" کے بعد "طیر" کی ضرورت ہی نہیں رہتی، پھر جن وانس کا مقابل "طیر" بمعنی پرندہ ہو سکتا ہے، نہ کہ فوج، دوسرے طیر کے معنی سرے سے لشکر کے ہین ہی نہین، معلوم نہین مصنف نے کس لغت مین دیکھے ہین، ممکن ہے ان کو یا ان کے جیسے دوسرے بالغ نظر محققین کو "اسم جمع" کے لفظ سے دھوکا ہوا ہو، کتب لغات مین طیر کی تشریح کے تحت مین اسم جمع کا لفظ ملتا ہے، جو ایک صرفی اصطلاح ہے، ممکن ہے فاضل محققین کا ذہن اسم جمع کی کثرت کے معنی کی طرف منتقل ہوا ہو، پھر اس سے انھون نے فوج مرتب کر لی ہو، اس لئے جب طیر کے معنی پرندہ کے متعین ہوگئے، تو پھر ہدہد کو قبیلہ ماننے کی ضرورت باقی نہین رہ گئی۔

اسی طرح نمل کی تاویل بنی نمل سے کرنا بھی صحیح نہین، اس سے انکار نہین کہ اگلے زمانہ مین جیوانون کے نامون پر انسانی قبائل کے نام ہوتے تھے، خود عرب مین بنی کلب اور بنی اسد موجود تھے، لیکن اس آیت مین "نملۃ" اور "نمل" سے بنی نمل مراد لینا عربی قاعدہ کے خلاف ہے، ایسے موقعون پر عربی مین قبائل کے افراد کا تذکرہ ہمیشہ نسبت کے ساتھ ہوگا، مثلاً بنی کلب اور بنی اسد کے فرد کے لئے کلبی اور اسدی کہا جائے گا، کلب اور اسد نہ ہوگا اور اس آیت مین "قالت نملۃ من النمل" ہے، یعنی ایک فرد نے اپنی جنس یا قوم سے کہا، اس لئے اگر

بنی نمل مراد ہوتے تو قَالَتْ نَمْلَةٌ کے بجائے قَالَ نَمْلِیٌّ یا مِنْ نَمْلِیٌّ یا مِنْ قومہ ہوتا، تانیث نہ ہوتی اگر کہنے والی عورت ہوتی تو البتہ قالت نملیۃ ہوتا، اس لئے نمل اور نملۃ سے بنی نمل مراد لینا قطع نظر اور باتوں کے عربی قاعدہ کے بھی غلط ہے،

علمائے جغرافیہ نے بھی وادی النمل میں بنی نمل کی نہیں، بلکہ چیونٹی ہی کی نسبت مانی ہے، یورپین مورخین اور جغرافیہ نگار بھی چیونٹی ہی کی نسبت مانتے ہیں، چنانچہ جی لی اسٹرنج جغرافیہ فلسطین وشام میں لکھتے ہیں :-

یہ وادی (وادی النمل) اس چیونٹی کے نام سے موسوم ہے، جس نے حضرت سلیمان بن داؤد سے (موعظت آمیز) گفتگو کی تھی،[1]

مصنف نے اس کتاب میں مختلف موقعوں پر ابن جریر طبری، ابو عبد اللہ قرطبی، شاہ ولی اللہ، شاہ عبد القادر، مولانا قاسم اور شیخ الہند رحمہم اللہ کے ترجموں اور تفسیروں کو معتبر مانا ہے، (ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۴۴، ۱۰۱، ۱۵۱) اگر ان میں سے کسی نے بھی یہ تاویل کی ہوتی، تو ہم کو اس کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا، ان آیات کی تفسیر سلف سے لیکر خلف تک متفق علیہ چلی آتی ہے، ایسی حالت میں مصنف کے لئے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی،

گو حق اور انبیا علیہم السلام کی تائید کے لئے کسی حیوان میں عارضی طور سے انسانی نطق پیدا کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے بعید نہیں، لیکن اگر مصنف کے نزدیک یہ چیز قرآن کریم کے طرز کے خلاف ہے، تو وہ مذکورۂ بالا آیات کی ایسی تاویل کر سکتے تھے، جو کلام مجید کے ظاہری الفاظ و معنی کے بھی خلاف نہ ہو، اور جس سے کوئی عقلی استحالہ بھی لازم نہ آئے، ان آیات میں تین چیزوں کا ذکر ہے، طیور کی بولی سمجھنے کا علم، ایک چیونٹی کا دوسری چیونٹیوں کو سلیمانی فوج کے خطرہ سے آگاہ کرنا، اور تسخیر طیور، ان میں سے کوئی بات بھی خلاف عقل نہیں ہے، حیوانوں میں انسانی نطق عقل کے خلاف ہے، لیکن خود ان کی بولیوں سے ان کے جذبات کو سمجھ لینے میں کوئی عقلی دشواری نہیں ہے، یہ معلوم اور مسلّم ہے، کہ حیوانات مختلف آوازوں اور بولیوں کے ذریعہ بھوک

---

[1] ملاحظہ ہو ترجمہ اردو جغرافیہ بلاد فلسطین وشام جی لی اسٹرنج ص ۴۴، شائع کردہ دار الترجمہ حیدرآباد،

پیاس، خوشی، مسرت، غم و غصہ، لطف و محبت، نفرت و کراہت اور خوف وہراس وغیرہ مختلف قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں جنھیں ایک واقف کار آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا ہے۔ اس لیے منطق الطیر کے علم سے کونسی خلاف عقل بات لازم آتی ہے، اسی طرح ایک حیوان کے دوسرے حیوانوں کو انسانی خطرہ سے آگاہ کرنے میں بھی کوئی عقلی استحالہ نہیں ہے، بلکہ یہ تو روزانہ کا مشاہدہ ہے، اور جدید تحقیقات کے مطابق تو چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کا اجتماعی نظام تو اتنا حیرت انگیز ہے کہ ان کے متعلق محض خطرہ سے آگاہ کرنا ایک معمولی سی بات ہے۔ باقی جانب قول کی نسبت تو کلام مجید میں عمل یا صورت حال کے لئے قول کے استعمال کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں؛ طیور اور حیوانوں کی تسخیر بھی روزانہ کا مشاہدہ ہے، انسان تو وحشی حیوانوں کو ایسا مسخر کر لیتا ہے، کہ وہ انسانوں سے زیادہ مطیع و منقاد ہو جاتے ہیں، رہا یہ امر کہ اس تاویل سے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہ جاتا، تو اس میں شبہہ نہیں کہ معجزانہ امتیاز نہیں رہجاتا، لیکن اس کے امتیاز ہونے سے پھر بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ ہر انسان میں یہ صلاحیت و استعداد نہیں ہوتی اسلئے کسی ایک انسان میں اسکا پایا جانا یقیناً ایک امتیازی کمال ہے، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا، لیکن تاویل یہ مصنف کی تشفی کے لئے ہے، ورنہ خدا تو انبیاء علیہم السلام کی تائید کے لئے شجر و حجر میں نطق پیدا کر سکتا ہے۔

ایک طرف تو مصنف کو فہم قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ تیرہ سو برس کی ساری تفسیروں کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں، دوسری طرف ان کی قرآن فہمی کا یہ حال ہے کہ وہ عربی کے معمولی اور کلام مجید کے نہایت کھلے ہوئے الفاظ کے معنی تک نہیں سمجھتے، ان کی قرآن فہمی کا ایک دلچسپ نمونہ کلام مجید کی اس آیت "مسلمات مومنات قانتات تائبات عابدات سائحات" میں سائحات کا ترجمہ "سیاحت میں سرگرم" ہے اور اس پر یہ طومار کھڑا کیا ہے:

> "قرآن مجید کا انقلاب کس قدر حیرت انگیز تھا کہ وہی عورتیں جو کبھی اپنے مردوں سے زیادہ جاہل تھیں، اب قرآن مجید میں "مومنات قانتات تائبات عابدات سائحات" کے اوصاف سے مزین ہیں، یعنی اللہ کی فرمانبردار، برائیوں سے پرہیز کرنے والیاں عبادت گذار اور سیاحت میں سرگرم

اس ترجمہ کی تصدیق اس سے کی گئی ہو کہ روایت سے ثابت ہے کہ صحابۂ کرام اور خود رسول کریمؐ کی ازواج مطہرات بھی میدان جہاد مین نکلتی تھین، اور مجاہدین کی خدمت کرتی تھین، اس لئے ان کو سائحات کہا گیا ہو۔

گویا مجاہدین کی خدمت اور زخمیون کی مرہم پٹی کے لئے عورتون کا نکلنا اور سیر سپاٹہ دونون ایک چیز ہین، اس ترجمہ کی اور خوبیون سے قطع نظر سائحات کا ترجمہ جس کے معنی روزہ رکھنے والیان ہین سیاحت کرنے والیان غلط کیا گیا ہو، سائح کے معنی روزہ دار کے مفسرین کے طبعزاد نہین ہین، کہ اس مین مصنف کو گفتگو کی گنجایش ہو، بلکہ علماے لغت کا اس پر اتفاق ہے، صاحب لسان العرب لکھتے ہین:

السّائحونَ والسّائحات الصّائمون	یعنی سائحون اور سائحات کے معنی الصائمون
قالَ الزجاج السائحونَ فی قول	ہین، زجاج لغوی کا قول ہے کہ اہل تفسیر اور لغت
اهل التفسیر واللغة جمیعًا الصّائمون[1]	دونون کے نزدیک سائحون کے معنی الصائمون ہین

راغب اصفہانی نے بھی مفردات مین یہی معنی لکھے ہین[2]، ان کے علاوہ خلف سے لیکر سلف تک تمام مترجمین، مفسرین، اور علماے لغت کا اس پر اتفاق ہو،

لیکن مصنف السائحات کا ترجمہ سیاحت کرنے والیان کرنے مین معذور بھی ہین، عربی وہ جانتے نہین، اردو کی مدد سے تفسیر و ترجمہ کرتے ہین، اس لئے اگر اردو کی سیاحت کو انھون نے سائحات پر چسپان کر دیا تو اس مین ان کا زیادہ قصور نہین،

ان مباحث کے بعد کلام مجید کی تاویل کے حدود اور اس کے فہم و تدبر کے بارہ مین بعض اصولی باتین ہین گو یہ مسامحات سے خالی نہین، لیکن بڑی حد تک صحیح ہین، اگر ان اصولون کی وہ خود بھی پابندی کرتے تو ان کو صریح آیات مین قرآن کے مفہوم و منشا سے آنی دور نہ ہٹنا پڑتا، مین نے دور جدید کے مجتہد مفسرین کے اجتہادات کے پیش نظر چند سال ہوئے فہم قرآن کے اصول، شرائط پر معارف مین ایک مفصل مضمون لکھا تھا اس کا مطالعہ

---

[1] لسان العرب ج ۳ ص ۳۲۳ [2] ملاحظہ مفردات راغب اصفہانی ص ۲۴۶،

مفسرین جدید کے لئے مفید ہوگا،

تفسیر کی بحث مین مصنف نے بعض اور تاریخی غلطیان یا غلط بیانیان بھی کی ہین، مثلاً علما، و مورخین اسلام کی تاریخ اور طبیعیات سے ناواقفیت کے ثبوت مین لکھتے ہین :-

"حبشیون کے متعلق مسعودی نے لکھا ہے کہ ان کا رنگ اس لئے سیاہ ہوگیا، کہ حضرت نوح نے اپنے بیٹے کو بددعا دی تھی، اور اہلِ حبش ابنِ نوح کی اولاد سے ہین، اسی بدعا کے اثر سے ان سب کا رنگ کالا ہوگیا"، ابن خلدون نے اس سیاہ رنگی کو طبائع کائنات، ہواؤن اور حرارت کی تاثیرات پر محمول کیا ہے، اور یہی حقیقت ہے"

ہم کو یہ بیان پڑھکر سخت حیرت ہوئی کہ مسعودی جیسے وسیع النظر عالم نے جو تنہا مورخ ہی نہ تھا، بلکہ ہیئت ونجوم اور طبیعیات کا بھی فاضل تھا، کس طرح ایسی لغو بات لکھدی، اس کی کتابون مین تلاش کیا، تو حیرت مصنف کی ناواقفیت اور لاعلمی مین منتقل ہوگئی، مسعودی نے حبشیون کے رنگ کی سیاہی کے بارہ مین وہی لکھا ہے جو ایک مورخ اور ہیئت و طبیعیات کے عالم کو لکھنا چاہئے تھا، چنانچہ کتاب التنبیہ والاشراف مین وہ معمورۂ ارض کی طبعی حالت اور اس کی آبادی پر اس کے اثرات کے سلسلہ مین حبشیون کے متعلق لکھتا ہے :

"ربع جنوبی کے باشندے حبشی، زنگی اور وہ تمام قومیں جو خطِ استوا کے نیچے آفتاب کے مقابل میں بستی ہین، حرارت کی لپٹ، اور رطوبت کی کمی کی وجہ سے ان کا رنگ سیاہ اور ان کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں اور ان میں وحشت آگئی اور گرم ہواؤن کی لپٹ آب وہوا کے اثر، ان کے رحم مین جنین کی پختگی اور گرم وخشک بخارات کی وجہ سے ان کا رنگ جھلس گیا، بال گھونگھر یالے ہوگئے، اس لئے کہ آفتاب کی حرارت سے سیدھے بالون کو جتنی قربت اور دوری ہوگی، اس کے اعتبار سے وہ سکڑین گے، پھر آپس میں مل جائین گے، اور آخر مین گچھا بن جائیں گے"[1]

---

[1] کتاب التنبیہ والاشراف مسعودی ص ۲۴ مطبوعہ پیرس،

یہ ہے مسعودی کا بیان جس کو مصنف نے بالکل بدل دیا، لیکن اس مین بھی وہ بے قصور ہین، اس لئے کہ ان کو براہ راست مسعودی دیکھنے کا اتفاق کہان ہوا ہوگا، محض سُنی سنائی بات لکھدی، ورنہ اتنی صریح غلطی عمداً نہین کرسکتے تھے، ایک اور مقام پر لکھتے ہین :

"تیسری صدی ہجری مین حلولیت کا عقیدہ مسلمانون کے بڑے طبقہ پر حاوی تھا، ان میں بہت درویش خدا کی روح کی حلولیت کے قائل تھے"

حلول کا عقیدہ "مسلمانون کے بڑے طبقہ" کیا چھوٹے سے طبقہ مین بھی نہ تھا، بعض غالی شیعی فرقے اپنے بانی عجمی عقائد کے اثر سے البتہ اپنے ائمہ مین حلول کے قائل تھے، ان کے اثر سے بعض اور فرقون مین بھی اس قسم کے عقائد پھیلے مثلاً رزامیہ مقنعیہ حلمانیہ اور حلاجیہ، ابومسلم خراسانی مقنع ابوحلمان دمشقی، اور منصور حلاج مین حلول کے قائل تھے لیکن یہ محض براے نام فرقے تھے، ان کی جماعت بہت مختصر تھی، اور جلد ہی ختم بھی ہوگئے، اسی لئے صرف تاریخون مین ان کے نام ملتے ہین، امام عبد القاہر بغدادی نے کتاب الفرق بین الفرق مین بعض کے حالات لکھے ہین[1] لیکن یہ فرقے کبھی بھی مسلمان نہین سمجھے گئے، حتی کہ شیعی علماء تک نے حلول کے قائل شیعی فرقون کو خارج از اسلام قرار دیا، نوبختی نے فرق الشیعہ مین ان کی تکفیر کی ہے[2]

ایسی حالت مین حلول کو مسلمانون کے بڑے طبقہ کا عقیدہ کہنا کہان تک صحیح ہوسکتا ہے، (باقی)

---

[1] کتاب الفرق بین الفرق ص ۲۲۹ تا ۲۵۰ [2] ملاحظہ ہو فرق الشیعہ ابومحمد حسن بن موسیٰ نوبختی

حیدرآباد کی ایک تعلیمی جوبلی

از

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب صدیقی استاذ جامعہ عثمانیہ

مملکت آصفیہ کی موجودہ درسگاہون مین سب سے قدیم سرکاری ادارہ دار العلوم ہے جس کے قیام کو ۱۳۶۲ھ مین نوے سال گذر چکے، یہ درس گاہ ملک کے نظام تعلیم کا مرکز رہی ہے، اوراسی کے حصۂ اعلیٰ نے پچیس سال ہوے جامعۂ عثمانیہ کا قالب اختیار کیا، اور دار العلوم کالج کو وہان شعبۂ دینیات قرار دیکر اولاً شعبۂ فنون کا اور پھر رفتہ رفتہ سائنس، انجینیری، تعلیم المعلمین، طب، کلکاری وغیرہ کا اضافہ عمل مین آتا رہا،

شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ جو بجا طور پر اپنے آپ کو جامعۂ عثمانیہ کے سب سے قدیم اور سب سے اہم جزء کا نام لیوا سمجھتے ہین، ہر سال اپنی درسگاہ کا یوم تاسیس مناتے ہین، سال حال کی تعطیلات عید لاضحی مین طلبۂ قدیم وجدید نے اہل ملک کی ہمدردی واشتراک عمل سے اپنی درسگاہ کا نو دسالہ جشن بڑی شان سے منایا، اس کا مختصر تذکرہ ناظرین معارف کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے،

خانوادۂ آصفی کو تعلیم سے جو خصوصی دلچسپی ہے اس کا مظاہرہ اس جشن مین اس طرح ہوا کہ سلطان العلوم آصف جاہ سابع نے اپنے بھائی شہزادہ بسالت جاہ بہادر کو اس امر پر مامور فرمایا کہ جشن دار العلوم کا افتتاح فرمائین، شہزادۂ موصوف نے علوم اسلامیہ اور ثقافت اسلامیہ کی عالمگیر اہمیت اور اس سے اہل زمانہ کی "مجرمانہ غفلت" پر پُرزور الفاظ مین توجہ مبذول کرائی، اور فرمایا کہ حیدرآباد جو ہند مین اسلامی تحریکون کا مرکز ہے اس بارے مین جو بھی اقدام کرے، وہ ضروری و بروقت بھی ہے، اور اس کے شایان شان بھی،

اس جشن کے متعدد اجزاء و شعبے تھے :-

۱- خطبات علیہ اس مین تاریخ تعلیم اسلامی، تاریخ دار العلوم، جامعۂ عثمانیہ کے قیام کی اندرونی سرگذشت، شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ کی پچیس سالہ کوشش جدید طرز سے علوم اسلامیہ کی تحقیق و تعلیم وغیرہ شامل تھے، یہیں وزیر تعلیم کی زبانی حکومت آصفی کے اس ارادے کا نیم سرکاری اعلان ہوا کہ جملہ مسلم طلبہ کے لئے عربی لازم کر دینا حکومت کے پیش نظر ہے،

۲- محفل عربی ایک خصوصی نشست مین صرف عربی تقریرون، مقالون اور نظمون کا انتظام کیا گیا تھا، جو انتہائی کامیاب رہا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ نئی پود مین بھی بحمد اللہ عربی تعلیم کافی پائی جاتی ہے،

۳- مظاہرۂ تجوید کی خصوصی نشست، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانون مین اپنے اس خاص فن کا ذوق روز افزون ہے، فن تجوید پر بعض دلچسپ مقالون کے ضمن مین قرأتون کے مختلف اقسام کے عملی مظاہرے بھی کئے گئے، مثلاً قرأت سبعہ، قرآت عشرہ وغیرہ،

۴- فارسی مشاعرہ اس مین طرحی مصرع یہ تھا،

این چنین دار العلومے کے دکن پیدا کند

سلطان الشعرا حضرت آصفجاہ سابع نے بھی طرحی مصرع پر ایک غزل سرفراز فرمائی تھی،

۵- فانوسی تقریرون مین ایک تقریر مناظر حجاز و بیت المقدس پر تھی، اور دوسری دکن کی اسلامی تہذیب پر، دونون بڑی سبق آموز اور دلچسپ رہین،

۶- نمایش ثقافت اسلامیہ، یہ نمایش پورے جشن کی جان تھی، صرف ایک ہفتہ کھلی رہنے کے باوجود ہزارہا آدمیون نے اس کا معائنہ کیا، جن مین ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے، آخری دنون مین واقعۃً نمایش گاہ مین تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی، پانچ پانچ ہزار اشخاص روزانہ آتے تھے،

حال مین مدراس کی نمایش کے حالات معارف مین چھپ چکے ہین، حیدرآباد کی نمایش بھی انہی کا نمونہ

کے زیرِ انتظام ہوئی، اس لئے اس کی تکرار کے بجاے اس نقشِ ثانی کی صرف بعض خصوصیتون کا ذکر کیا جاتا ہے،

اس نمایش مین فلکیات کا شعبہ زیادہ مکمل اور دلچسپ تھا، قسم قسم کی دھوپ گھڑیان، دیسی ساخت کی قدیم دوربین جس کی سند سے معلوم ہوتا تھا، کہ نواب آصف الدولہ حکمران اودھ نے کسی کو عطا کی تھی، مختلف نمونون کے اسطرلاب، ربع مجیب، فلکیات مین مسلمانون کی تحقیقاتون کے حالات (مثلاً آفتاب کے داغ، قطرِ زمین کی پیمایش، انعطافِ شعاع، مد و جزر کے وجوہ وغیرہ) جلی خط مین نمایان کئے گئے تھے، ایک بہت بڑے نقشے مین کرۂ سماوی اور ستارے بنائے گئے تھے، اور ہر ستارے کا عربی اور انگریزی نام بھی لکھا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا، کہ پچانوے فی صدی نام عربی ہی کے مغربی زبانون میں برقرار ہین صرف تلفظ بگڑ گیا ہے،

جغرافیہ مین ادریسی وغیرہ کے نقشہ ہاے عالم، علم ملاحی مین قسم قسم کے عربی جہازون کے نقشے دلچسپ چیزتھے،

مخطوطات کا شعبہ بہت اہم تھا، نادر کتب مین صحیفۂ ہمام بن منبہ المتوفی ۱۳۱ھ، خاص چیز تھی، اس کے علاوہ انجیل کا عادل شاہی دور کا فارسی ترجمہ جو ایک مسلمان عالم نے کیا تھا، پانچوین صدی ہجری اور اس کے بعد کے لکھے ہوئے نسخے، یاقوت مستعصمی، عماد، میر علی وغیرہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابین اور قرآن مجید، داراشکوہ و عالمگیر کے مخطوط قرآن، حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کے قرآن کا فوٹو جو ترکی حکومت نے شائع کیا تھا، حافظ ابن حجر وغیرہ مشاہیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں، ابن القیم کی نادر روزگار تالیف احکام اہل الذمہ (جلد اول چھ سو صفحون مین تھی، اس کے اجزاے مابعد کا پتہ نہین)

سکون مین بنی امیہ سے لے کر اب تک کے تقریباً ہر اہم اسلامی حکمران خانوادے کی نمایندگی ہوئی تھی، سبکتگین، بلبن، تغلق، شیرشاہ سوری، احمد شاہ ابدالی، بچۂ سقہ، نادر خان و ظاہر خان، نیز مختلف ممالک اسلامی (جاوا، مشرقی افریقہ، زنجبار، مسقط، عمان وغیرہ) وغیرہ وغیرہ کے سکے تھے،

سیرۃ النبی کا شعبہ زیادہ اہم تھا، سوڈیڑھ سو مقامات کے فوٹوون کے ذریعہ ولادت

باسعادت سے وفات تک کے حالات نمایان کئے گئے تھے، اس مین غارِ حرا، غارِ ثور، بدر، وطائف، احد، خندق، مناظرِ حج اور دیارِ حبیب کے فوٹو تھے،

تاریخِ اسلام کے نقشے بھی دلچسپ تھے، عہدِ نبوی وخلافتِ راشدہ کے فتوحات کا پانچ رنگی نقشہ، عالم، تیرہ سو سالہ فتوحاتِ اسلامی کا دس رنگی نقشہ، دنیا کی موجودہ اسلامی آبادیون کا تفصیلی نقشہ تین رنگون مین مع اعداد وشمار،

اسلحہ کا شعبہ بھی اہم تھا، قسم قسم کی تلوارین، اور دیگر اسلحے جن کے کام واستعمال کا کیا ذکر ان کے نام تک سے اب نئی نسل بے خبر ہو گئی ہے، فاروقی سلاطین کی توپین، اورنگ زیب وغیرہ کی تلوارین، حروب صلیبیہ کے زمانے کی تلوار، بہادر شاہ کی تلوار، آہن ربا، جنبیہ وغیرہ،

تصاویر کے ذخیرہ نے قدیم وجدید استادون کا بڑا جمگھٹا پیدا کر دیا تھا، جو خاص کر دکن کی تاریخی شخصیتون کا مکمل مرقع کہا جا سکتا ہے،

دکن کی ڈیڑھ دو صدی پہلے کی امیرانہ زندگی کے سامان، سنہری قالین، چاندی کی جڑاؤ کرسیان، صوفے، میزین وغیرہ،

اس نمایش نے نوجوانون مین ایک لہر دوڑا دی ہے، اور اونھین اپنے گھرون کے سامانون کی اہمیت کی جانب متوجہ کر دیا ہے، کہ وہ کتنے ہی بوسیدہ اور خراب کیون نہ ہون، نہایت قیمتی اور قابلِ تحفظ ہین،

توقع ہے کہ یہ نمایش ان شاء اللہ جلد ایک معرضِ ثقافت اسلامیہ کی صورت مین مستقل میوزیم کی حیثیت اختیار کرے گی، جس مین منظم اور باقاعدہ طور سے سامان تیار اور فراہم کرکے جمع کیا جایا کریگا، جو تاریخ وتمدنِ اسلامی کے لئے ایک درس گاہ بن جائے گا، ابھی تو یہ خانگی کوششین ہین، خدا کرے پروان چڑھین،

خطبات علیہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مقالہ "اصول فقہ" پر رکھا گیا تھا، مگر موصوف کی آمد کی تاریخ میں خانگی وجوہ سے تبدیلی ہوگئی، اس مقالہ کو رُوداد جشن میں شامل کرنے کی کوشش کیجائے گی، جشن کی طرف سے تذکرۂ دارالعلوم کے نام سے ضخیم کتاب شائع ہوچکی ہے، اور سامان نمائش کی مفصل فہرست مشاعرے اور خطبات علیہ کی طباعت کا کام شروع ہوچکا ہے،

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ برطانوی ہند کی قدیم ترین جامعات کلکتہ مدراس وبمبئی کے قیام سے بھی ایک سال قبل دارالعلوم حیدرآباد کا افتتاح ہوا تھا، اور غالباً ہندوستان کے غیر سرکاری اسلامی مدارس میں بھی اب کوئی اتنا قدیم موجود نہیں ہے، وللہ عاقبۃ الامور،

حیات شبلی حصہ اول

حیات شبلی جس کا مدتوں سے شائقین کو انتظار تھا، چھپ کر شائع ہوگئی ہے، یہ کتاب تنہا علامہ شبلی مرحوم کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ اس میں ان کی وفات ۱۹۱۴ء تک اس کے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور دوسری تحریکوں، اور سرگرمیوں کی مفصل تاریخ آگئی ہے، کتاب کے شروع میں جدید علم کلام کی نوعیت، اوس کی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، اور خلجی اور تغلق کے زمانہ سے لے کر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہیں، اس کی ضخامت مع مقدمہ اور دیباچہ وغیرہ کے ۸۰۰ صفحے ہیں، اس کے علاوہ دارالمصنفین ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اور شبلی انٹر کالج کی عمارتوں کے تیرہ ہاف ٹون بلاک فوٹو بھی شامل ہیں، کاغذ اور طباعت اعلیٰ۔

قیمت علاوہ محصول ڈاک صرف آٹھ روپیے،

منیجر

باب المراسلة والمناظرة

ابن منصور حلاج کو پھانسی نہیں سولی دی گئی ہے!

از

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی، استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی

قال الخطيب في تاريخه انبأنا ابن الفتح
انبأنا محمد بن الحسين سمعت عبد الله
بن على سمعت عيسى القصار يقول آخر
كلمة تكلم بها الحسين بن منصور
عند قتله وصلبه ان قال حسب
الواحد افراد الواحد له فما سمع
بهذه الكلمة احد من المشائخ
الا رق واستحسن هذا الكلام منه
وفي تاريخ القزويني في ذكر البيضاء
ما نصه فقال الوزير للقاضي اكتب
انه زنديق فاخذ خط القاضي و

خطیب نے اپنی تاریخ میں کہا کہ ہمیں خبر دی ابن
الفتح نے، اس نے کہا کہ اس سے کہا محمد بن حسین نے
کہ میں نے عبد اللہ بن علی سے سنا کہ وہ کہتا تھا
کہ میں نے عیسی القصار کو کہتے ہوئے سنا کہ آخری
بات جو حسین بن منصور کی زبان سے اس کے قتل
اور سولی کے وقت نکلی ہو وہ یہ کہ واحد کے لئے یکائی
کہ واحد اسی کے لئے مخصوص ہے، مشائخ میں سے
اس جملہ کو جس نے سنا اس پر رقت طاری ہوئی
اور تاریخ قزوینی میں شہر بیضا کے ذکر میں ہے کہ
پھر وزیر نے قاضی سے کہا کہ لکھو کہ یہ زندیق ہے،
پھر اس نے قاضی کی تحریر کو لے لیا، اور اس کو

وبعث الی الخلیفة فامر الخلیفة بصلبه	خلیفہ کے پاس بھیجا، چنانچہ خلیفہ نے اوس کو
وفیه ایضا فلما صلب واحرق اخذ	سولی دینے کا حکم دیا، اور اسی میں ہے جب
الماء فی الزیادة حتی کاد یغرق	سولی دیدی گئی، اور جسم جلا دیا گیا، (تو دریا
بغداد، الخ،	کا) پانی اس قدر بڑھ گیا، کہ قریب تھا کہ بغداد
(تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو القول المنصور ص۱۶۵ و ص۲۰۳)	ڈوب جائے[۱]

پس ستمبر ۴۳ء کے معارف میں جو علمی لطیفہ کے طور پر یہ لکھا گیا ہے کہ ابن منصور کو شعرا نے دار پر چڑھایا، اور دار ورسن کو اس سے جلوہ پہنچایا، یہ لطیفہ درست نہیں، تاریخ سے اُس کا مصلوب ہونا ثابت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ایک ہزار ضرب تازیانہ کی سزا دی گئی، پھر ہاتھ پیر کاٹے گئے، پھر سولی پر چڑھا دیا گیا، جب روح پرواز کر گئی، سر کاٹ کر تشہیر کی گئی، اور بدن کو جلا کر خاک کر کے دریا میں بہا دیا گیا، امید ہے کہ اشاعت آئندہ میں اس امر کو واضح کر دیا جائے گا، شیخ عطار نے بھی تذکرۃ الاولیا میں سولی دیئے جانے کا ذکر کیا ہے، مگر شاید آپ اون کو شعرا میں داخل کر دیں، اسلئے خطیب وقزوینی ہی کے بیان پر اکتفا کیا۔

معارف:۔ افسوس ہے کہ جو روایتیں سطور بالا میں نقل کی گئی ہیں، اُن سے مولانائے موصوف کے اس قیاس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ

"اولاً ایک ہزار تازیانہ کی سزا دی گئی، پھر ہاتھ پیر کاٹے گئے، پھر سولی پر چڑھا دیا گیا، جب روح پرواز کر گئی، سر کاٹ کر تشہیر کی گئی، اور بدن کو جلا کر خاک کر کے دریا میں بہا دیا گیا"

بلکہ یہ قیاس خطیب کی اس تصریحی روایت کے مخالف ہے کہ

ولما بلغ الف سوط قطعت یده ثم	اور جب ہزار کوڑے پورے ہوگئے تو اس کا
رجله ثم یده ثم رجله و	ہاتھ کاٹا گیا، پھر اس کا پاؤں، پھر ہاتھ پھر

---

[۱] ان عربی عبارتوں کے ترجمے کی ذمہ داری مراسلہ نگار پر نہیں ہے،

حز راسه واحرقت جثته، — پاؤں کاٹا گیا، اور اس کا سر کاٹ دیا گیا، اور

(خطیب ج ۸ ص ۱۴۱) — اس کا دھڑ جلا دیا گیا،

سولی دینے کے لئے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر درخت میں لٹکانا چاہئے تھا، لیکن جب دونوں ہاتھ پہلے ہی کاٹے جا چکے تھے، تو سولی کا دیا جانا ممکن کیسے ہو سکتا ہے، کیونکہ پھانسی دینے کا جس کو عربی میں خنق کہتے ہیں، اس زمانہ میں رواج نہ تھا، بلکہ کسی مجرم کو مار ڈالنے کے بالعموم یہی دو طریقے رائج تھے، یعنی یا تو قتل کرتے یا سولی دیتے تھے، لیکن اسلامی عہد کے ابتدائی دور میں سولی دینے کا رواج بھی عموماً نہ تھا، بلکہ بہت ہی اہم موقعوں پر اسی طرح ہاتھ پاؤں کاٹے جاتے تھے، پھر عبرت و سبق آموزی کے لئے سر کو تن سے جدا کر کے کسی شاہراہ عام یا فصیل کی برج یا قلعہ کے پھاٹک پر لٹکا دیتے تھے، اور یہی صورت منصور حلاج کے ساتھ پیش آئی، چنانچہ حجاج نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کو شہید کرنے اور سر کو عبد الملک کے پاس بھیج دینے کے بعد ان کی لاش شارع عام پر لٹکوا دی تھی، ابن اثیر میں ہے:-

وبعث الحجاج براسه ..... الی — اور حجاج نے ان کے سر کو ..... عبد الملک

عبد الملک بن مروان واخذ — بن مروان کے پاس بھیجا، اور ان کے دھڑ کو لیا،

جثته فصلبها، (جلد ۴ ص ۲۹) — اور اس کو لٹکا دیا،

۱؎ مولانائے موصوف نے معارف کے عنوان "کیا منصور حلاج کو پھانسی دی گئی" (مطبوعہ ستمبر ۳۸ء) پر اپنے مراسلہ کا عنوان "پھانسی نہیں سولی دی گئی" قائم فرمایا ہے، لیکن اردو میں پھانسی اور سولی دونوں مترادف و ہم معنی الفاظ ہیں، ملاحظہ ہو نور اللغات (ج ۳ ص ۳۸۰) سولی: پھانسی، سولی چڑھانا: پھانسی دینا، دار پر کھینچنا، سولی چڑھنا: پھانسی پانا، (ج ۲ ص ۱۰۰) پھانسی: پھندا،

(۱) وہ حلقہ جس کے ذریعہ سے آدمی کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتے ہیں،

(۲) وہ ستون اور رسی کا پھندا جس پر چڑھا کر آدمی کو لٹکا دیتے ہیں،

رنہ جب "قتل" اور "صلب" مار ڈالنے کے دو علٰحدہ علٰحدہ طریقے ہیں، تو کسی کو مار ڈالنے کے لئے ان میں سے کسی ایک طریقہ کو اختیار کیا جا سکتا تھا، خصوصاً جب حلاج کے ہاتھ کاٹے جا چکے تھے، تو سولی دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا :-

لأن الرجل اذا صلب مدّ یدہ	کیونکہ جب آدمی کو سولی دی جاتی ہے
وباعہ علی الجذع،	تو اس کے ہاتھ اور بازو (سولی کی) لکڑی
(لسان العرب ج ۷ ص ۱۷)	پر پھیلائے جاتے ہیں،

اس لئے مولانائے موصوف نے جو روایت پیش کی ہے، اس میں "عند قتلہ وصلبہ" کے معنی عند قتلہ وتعلیقہ کے ہیں، کیونکہ

الصلب ھو تعلیق الانسان للقتل	"صلب" کے معنی انسان کو مار ڈالنے کے لئے
(مفردات راغب ص ۲۵۶)	لٹکانے کے ہیں،

اس لئے قتل کے بعد صلب سے مراد اس کے سر کو بغداد کے پل پر لٹکائے جانے سے ہے جیسا کہ معلوم ہے کہ قتل کئے جانے کے بعد دو دن تک اس کا سر بغداد کے پل پر لٹکا رہا، خطیب میں ہے :-

ونصب الراس یومین ببغداد	اور سر دو دن تک بغداد کے پل پر نصب رہا
علی الجسر ثم حمل الی خراسان و	پھر خراسان لیجایا گیا، اور اس کے نواح
طیف بہ فی النواحی (خطیب جلد ۸ ص ۱۴۱، ۱۴۰)	میں گھمایا گیا،

بلکہ انہی لمحوں کے متعلق جب اس کا سر بغداد کے پل پر لٹکا ہوا تھا، ایک دوسری روایت ہے جس میں اس کے سر کے لٹکے ہونے کی وجہ سے "صلب اور مصلوب" کے الفاظ آئے ہیں :-

یقول لما صلب الحسین بن منصور	جب حسین بن منصور کو چڑھایا گیا، تو میں اس
وقفت علیہ وھو مصلوب فقال.... (خطیب جلد ۸ ص ۱۲۸)	کے پاس کھڑا تھا، اس حال میں کہ وہ سولی

دراصل یہاں بھی "مصلوب" سے مقصود وہی معلق سر ہے، اس موقع پر "صلب" کے معنی "تعلیق" یا "نصب راس" مارے ہیں، یہ کسی تاویل یا قیاس پر مبنی نہیں، بلکہ یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کا بدیہی ثبوت حلاج کے رخون کے بیانوں میں موجود ہے، چنانچہ عریب بن سعد قرطبی کی صلہ تاریخ طبری میں حلاج کے پیروون سے حسب ذیل صاف وصریح الفاظ موجود ہیں :-

من الحوادث (فی ۳۱۲ھ) ان نازوک	۳۱۲ھ کے واقعات میں یہ ہے کہ نازوک نے
جلس فی مجلس الشرطة ببغداد	بغداد میں مجلس شرطہ میں حلاج کے پیروون میں سے
فاحضر له ثلثة نفر من اصحاب الحلاج	تین آدمی اس کے سامنے پیش کئے گئے، وہ
وهو حیدرة والشعرانی وابن منصور	حیدرہ، شعرانی اور ابن منصور تھے، ان سے
فطالبهم بالرجوع عن مذهب	حلاج کے مذہب سے لوٹ جانے کا مطالبہ
الحلاج فابوا فضربت اعناقهم	کیا گیا، تو انھوں نے انکار کیا، چنانچہ ان
ثم صلبهم فی الجانب الشرقی	کی گردنیں مار دی گئیں، پھر ان کو بغداد
من بغداد ووضع روسهم علی سور	کے مشرقی جانب سولی پر چڑھا گیا، اور ان
السجن فی الجانب الغربی،	کے سرون کو مغربی جانب قید خانہ کی
(ص ۱۰۷)	فصیل پر لٹکایا گیا،

جو روایت اوپر گذری، اس کے علاوہ اس میں اور دوسری روایتیں بھی ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صلبة سے خلیب کی مراد وہی ہے، جو ہم نے بیان کی ہے، ورنہ یہ روایتیں اس کے خلاف ہوتی ہیں، مثلاً دوسرے موقع پر ہے،

حدثنا عبید الله بن احمد بن	عبید اللہ بن عثمان صیرفی نے ہم سے بیان
عثمان الصیرفی قال قال لنا ابو عمر	کیا، کہ ہم سے ابو عمر بن حیویہ نے کہا کہ جب

بن حیویہ لما اخرج حسین الحلاج
لیقتل مضیت فی جملۃ الناس و
لم ازل ازاحم حتی رایتہ فقال
لاصحابہ: لا یھولنکم ھذا فانی
عائد الیکم بعد ثلاثین یوما ثم
قتل (جلد ۸ ص ۱۳۱)

حسین حلاج قتل کئے جانے کے لئے نکالا تو مین
بھی اور لوگوں کی طرح دیکھنے کے لئے گیا، اور
مجمع مین گھس پل کر اس کو دیکھا، اوس نے اپنے
ساتھیون سے کہا کہ تم اس سے گھبراؤ نہین
مین تیس دن کے بعد پھر تمھارے پاس
لوٹ آؤن گا، اسکے بعد قتل کر دیا گیا،

اسی طرح مذکور ہے کہ کوتوال کو ہدایت کی گئی کہ اس کو کوڑے لگانے کے بعد اس کا سر کاٹ کر علحدہ رکھ لیا جائے، اور پورا دھڑ جلا دیا جائے، (تاریخ خطیب ج ۸ ص ۱۴۰)

علاوہ ازین یہ صرف خطیب پر موقوف نہیں بلکہ اس عہد کے اکثر مورخین نے اس کے قتل ہی کئے جانے کا تذکرہ کیا ہے، اور یہ روایتیں اس حیثیت سے بڑی اہم، مستند اور قابلِ ذکر ہین کہ ان مورخین مین سے بعض حلاج کے معاصر اور بعض اس کے قریب العہد ہین، مثلاً مشہور مورخ مسعودی متوفی ۳۴۶ھ کا معاصرانہ بیان ملاحظہ ہو،

ضرب الف سوط وقطعت یداہ
ورجلاہ وضربت عنقہ واحرقت
جثتہ،
(کتاب التنبیہ والاشراف ص ۳۳۱)

اس کو ایک ہزار کوڑے مارے گئے، اور
اس کے ہاتھ اور پاؤن کاٹے گئے، اور
اس کی گردن ماردی گئی، اور اس کے دھڑ
کو جلا دیا گیا،

عریب بن سعد قرطبی کا دوسرا معاصرانہ بیان ہے :-

فامر بقتلہ واحراقہ بالنار بعد
ضربہ الف سوط وقطع یدیہ

اوس کو ایک ہزار تازیانہ کی سزا دینے، اور
ہاتھ پاؤن کاٹنے کے بعد قتل کرنے اور آگ مین

ورجلیہ ... فوقع الی صاحب	جلانے کا حکم دیا، ..... چنانچہ محمد بن عبدالصمد
شرطتہ محمد بن عبد الصمد بان	کوتوال کے حوالہ کیا گیا، کہ اس کو پل کے میدان
یخرجہ الی رحبتہ الجسر و یضربہ الف	مین لیجائے، اور ایک ہزار کوڑے لگائے اور
سوط و یقطع یدیہ و رجلیہ ففعل	اوس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے، چنانچہ اس کے
ذلک بہ (صلہ تاریخ طبری ص ۸۷ ج ۱۱)	ساتھ ایسا ہی کیا گیا،

اسی طرح ابن ندیم متوفی ۳۸۵ھ حلاج سے قریب العہد مورخ ہے، اوس نے بھی اپنی الفہرست (ص ۲۷۰) ۳۷۷ھ مین تصنیف ہوئی، اس کے متعلق "فقتل و احرق" (چنانچہ قتل کیا گیا اور جلایا گیا) ہی لکھا ہے

پھر اسی طرح ابن مسکویہ متوفی ۴۲۱ھ کی روایت ہے :-

ضُرب الف سوط ثم قطعت یدہ ثم رجلہ	ہزار کوڑے مارے گئے، پھر اس کا ہاتھ کاٹا
ثم ضرب عنقہ و احرقت جثتہ و نصب	گیا، پھر پاؤں کاٹے گئے، پھر اسکی گردن ماری
راسہ علی الجسر (حاشیہ صلہ طبری ص ۹۵)	گئی، اور اوس کا دھڑ جلا دیا گیا، اور اس کے سر کو پل پر نصب کیا گیا

ابن جوزی کا بیان ہے :-

فضرب الف سوط ثم قطعت یدہ ثم	چنانچہ ہزار کوڑے مارے گئے، پھر اس کا ہاتھ
رجلہ و حز راسہ و احرقت جثتہ	کاٹا گیا، پھر اوس کا پاؤں کاٹا گیا، اور اس کے
(حاشیہ بر صلہ تاریخ طبری ص ۱۰۶)	سر کو کاٹا گیا، اور جثہ کو جلایا گیا،

اسی طرح متاخر مورخین نے بھی اس کے سولی دیئے جانے کے بجائے اس کے قتل ہی کیے جانے کا تذکرہ ملاحظہ ہو الکامل ابن اثیر ج ۸ ص ۴۹، مرآۃ الجنان یافعی ج ۲ ص ۲۶۰، شذرات الذہب ابن عماد ج ۲ ص ۲۵۵

ان صاف اور کھلی شہادتوں کی موجودگی مین کسی قیاس کی گنجائش نہین، اس لئے ان تصریحات کو سامنے رکھ کر صحیح طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ حسین بن منصور حلاج کو سولی نہین دی گئی، بلکہ وہ قتل کیا گیا،

وفیات

سفیرِ غیب

(حکیم الامتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ التحیۃ والرضوان کی یاد میں)

از

جناب ابو الاسرار صاحب رمزی اٹاوی

نہ جانے کیا اچانک موج آئی اس کی رحمت کو — اٹھا کر لے گئی آغوش میں جبریل طلعت کو
اسی ماحول میں گم ہو گیا ہنستا ہوا تارہ — سوادِ اعظمِ اسلام کا رخشندہ مہ پارہ
وہ تارا جو رہا ملفوف احرامِ قیادت میں — گذاری جس نے اپنی زندگی اصلاحِ امت میں
بڑھاپے کا تو کیا کہنا مجسم آرزو ہو کر — خدا سے ہو گیا واصل خدا کی جستجو ہو کر

یہ تیری خانقاہِ پاک، نورِ حق کا مینارہ — حقیقت جس میں روشن ہے تجلی جس میں آوارہ
ابلتا دیکھتا ہوں کوثرِ عرفان کا فوارہ — نظر کو بخشتا ہے دولتِ انوار، نظارہ

یہ تیری سروری ہے جس کو طاقِ معرفت کہئے
یقیناً تربیت گاہِ مذاقِ معرفت کہئے

حکیمِ ایشیا کہئے تجھے یا عارفِ مشرق — عجم سے تا حرم ہر سو ہے تیرا شہرۂ ناطق
تری تقریر کیا ہوتی تھی کشفِ سامعہ کہئے — تجھے اسلام کا اک چلتا پھرتا جامعہ کہئے

وہ دولت لیکے اٹھتے تھے جو تیرا وعظ سنتے تھے بغیر ساز و نغمہ وجد مین سر اپنا دھنتے تھے

اجالا اس طرح کرتا تھا پیدا ذہنِ فاسق مین
سپیدہ جیسے اگتا ہو ریاضِ صبحِ صادق مین

اس امت کے قدم نا رفتنی راہون سے روکے ہین کہ جن راہون مین پوشیدہ جہنم زار ہوتے ہین
دماغِ جہل سے خارج کیا بیہودہ رسمون کو کچل ڈالا تمدن کے شرر انگیز جلوون کو
اٹھا دی یک قلم ملت کی وہ رسمِ روا داری سمجھ رکھا تھا دنیا نے جسے رازِ وفاداری
ممیز کر دیا ناموسِ اکبر سے زوائد کو روایاتی عناصر، اجنبی باطل عقائد کو

اجاگر کر دکھایا دینِ فطرت کا پس منظر
مکدر ہو چکا تھا روغنِ اوہام سے یکسر
رخِ اسلام کو حقانیت کی دھوپ مین دیکھا
اسے تیری بدولت آسمانی روپ مین دیکھا

سبق تو نے دیا ہم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کا خلوص آمیزِ عظمت اور سنجیدہ محبت کا
دلِ تاریک روشن کر دیئے تیری نگاہون نے درِ توبہ پہ رکھدی اپنی پیشانی گناہون نے
سکھائے فقر کے آداب تو نے بادشاہی کو جلالِ قیصری بخشا جمالِ خانقاہی کو
سوادِ آذرستان سے اندھیرون کو مٹا ڈالا صنم زارِ دوآبہ کو خلیلستان بنا ڈالا

نئے فتنے اٹھے اور اٹھ کے تفسیرین بدل ڈالین
مگر تو نے مسلمانون کی تقدیرین بدل ڈالین

سیہ کاری نے جب بھی پاؤن پھیلائے بغاوت کے خدا نے غیب سے بھیجے سفیر اپنی ہدایت کے
چنانچہ حجۃ اللہ بن کے آیا تھا زمانے مین پیامِ رشد پوشیدہ تھا تیرے تازیانے مین

ملی تھی تجھ کو مشکوٰۃِ نبوت سے درخشانی سلیقہ تیرا قدوسی، فراست تیری نورانی

تری تہذیب اسلامی، ترا کلچر مسلمانی ڈسپلن سے ترے اغیار کو بے تخت حیرانی

سیاست تیری فاروقی، ہدایت تیری لقمانی ترا کیریکٹر مجموعہ کردارِ روحانی

محقق، مجتہد، عالم، محدث، حافظ و قاری با این اوصاف شہرت سے بری اظہار سے عاری

تواضع، سادگی، مردانگی، زہد و صفا کیشی محمدؐ کے مشن کا ترجمہ تھی تیری پالیسی

نچھاور روح کرتا تھا نشانِ پائے احمدؐ پر تصور اڑتا رہتا تھا ہمیشہ سبز گنبد پر

قدم راہِ نبیؐ میں اور پنجہ نبضِ امت پر
حکیمانہ نظر رہتی تھی بسط و قبضِ امت پر

ترا غیور جذبہ صورتِ فولاد محکم تھا ترے پیکر میں روشن شعلۂ فاروقِ اعظمؓ تھا

نظر چہرہ سے پڑھ لیتی تھی کیفیاتِ پنہانی بصیرت کو نظر آتا تھا مدّ و جزرِ انسانی

کمندیں پھینکتی تھیں اہرمن پہ تیری تدبیریں علاجِ معصیت ثابت ہوئیں اکسیر تحریریں

نہ لالچ دے سکیں ہرگز تجھے سکّوں کی جھنکاریں ترے دستِ توکل میں تھیں استغنا کی تلواریں

کتابِ زندگی کا ہر ورق تصویرِ سنت ہے تری ہر نقل و حرکت نقشۂ تدبیرِ سنت ہے

شرف تجھ کو ملا بزمِ ولا کی باریابی کا
صحابی گو نہیں لیکن نمونہ تھا صحابی کا

ترے پہلو میں نفسِ مطمئنہ کھلکھلاتا تھا یقیں تارِ نفس پر نغمۂ توحید گاتا تھا

دماغ و دل ترے مومن بھی کیا ہر ادا مومن
خدا کے ساتھ تیرا رشتۂ عشق و وفا مومن

تری حاضر جوابی سے ہر اک مسرور ہوتا تھا ترا سادہ سا فقرہ مصرعۂ منثور ہوتا تھا

بفیضِ پرتوِ امدادِ حق ہر فن مین کامل تھا — نہ کیون ہوتا کہ آخر دیدۂ یعقوبؑ کا تِل تھا

تو شاگردِ رشیدؔ ایسا کہ استاذِ زمان نکلا — زمینِ ہند کا ذرہ چراغِ آسمان نکلا

تری تحقیق کے جھنڈے سرِ افلاک لہرائے — جہان سائنس، کا ذہنِ سا جانے سے ٹکرائے

کسے گنجایشِ شک ہے مبارک کامرانی مین — کہ اک دنیاے ھوٗ چھوڑی ہے اس دنیاے فانی مین

ترے انجام برتر کا پتہ آغاز دیتا تھا
ترا مستقبلِ تابان تجھے آواز دیتا تھا

تو میدانِ صحافت مین بھی سبقت لے گیا سب سے — کہ تو سو تک پہنچ جاتا ہے تصنیفات کا نمبر

مقدس اسپرٹ کے بوبہرو جذبات لکھے ہیں — صحیفے تیرے خطبے اور ملفوظات دیکھے ہین

کسی مین فلسفہ منطق، کسی مین نورِ حکمت ہے — ذخیرہ علمِ دین کا، گنجِ اسرارِ نبوت ہے

ترے حکمت بھرے نسخون سے بوئے علم آتی ہے — فضاے روح مین جو نور بنکر پھیل جاتی ہے

جنھین پڑھنے سے عقبیٰ کے چمن کی یاد آتی ہے — اسی دار البقا سچے وطن کی یاد آتی ہے

مطالب جن کے قاری کو غذاے فکر دیتے ہین — تغافل کیش روحون کو پیامِ ذکر دیتے ہین

کہ جن دل کے میلے آئینے خود دھلتے جاتے ہین
حجابات اٹھتے جاتے ہین، دریچے کھلتے جاتے ہین

مرقع ہے حدیثون کا، الٰہیات کا دفتر — ہمارے واسطے چھوڑا ہے کیا پاکیزہ تر تحریر

لکھے گا وقت آبِ زر سے تیرے کارنامون کو — مسلمان حفظ کر لے کاش ان زرین بیانون کو

نفع اندوزیان بامِ فلک پر چڑھتی جاتی ہین — سلامِ شکر احسانون پہ تیرے بڑھتی جاتی ہین

جو سچ پوچھو جہان مین قطبِ ارشاد و ہدایت تھا
ترے تبلیغ کے ہاتھون مین فانوسِ رسالت تھا

ترسٹھ[1] سال تک تو نے ہمیں تبلیغ فرمائی
یہی وہ عمر تھی جو سرورِ کونین نے پائی

یہ رمزی بے بصیرت ہو ترے رتبہ کو کیا جانے — جو ہم رتبہ ہو تیرا، وہ ترے اوصاف پہچانے
یہ خدام شریعت ہیں جو مانند پیمبر ہیں — وہ دریا کیسا ہوگا جس کے یہ قطرے سمندر ہیں
جہان سے نقش مٹ سکتا نہیں ہرگز انکا — یہ تیرا مرثیہ کیا ہے قصیدہ ہے کمالوں کا
تری تعریف سے تعریف ربانی عبارت ہے — کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ سب اسکی امانت ہے
عقیدت نے جسے لکھا ہو قرطاسِ محبت پر — جسے بیتابیاں پڑھتی ہیں خلوت میں بچشم تر

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

آہ! حکیم الامۃ

از جناب فکرؔ ندوی

ہر اشکِ غم میں شورشِ طوفان ہے آجکل — ماتم یہ کس کا دیدۂ گریان ہے آج کل
کس کے ریاضِ عمر پہ یہ آگئی خزان — بدلا ہوا جو رنگِ گلستان ہے آج کل
شمعِ دلِ فسردۂ عاشق بجھی ہوئی — علم و عمل کی شمعِ فروزان ہے آج کل
اب زہد و اتقار کی وہ رونق نہیں رہی — دنیا کمالِ شرع کی ویران ہے آج کل
یہ جلوہ گر ہے کون بہشتِ نعیم میں — نازان جو اپنے بخت پہ رضوان ہے آج کل

---

[1] ممدوح رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ۱۹۰۲ سال میں فارغ التحصیل ہوگئے تھے، اور بعمر ۸۳ سال واصل بحق ہوئے، گویا ترسٹھ سال تک تبلیغِ حق میں مشغول ہوئے جو آنحضرت صلعم کی عمر مبارک ہے،

کتنی خلاف گردشِ دوراں ہے آج کل — ہے ہے! کہ اب نہ دل ہے نہ دل کے وہ ولولے

وہ اٹھ گیا جو پیرِ طریقت نواز تھا
وہ اٹھ گیا کہ جس پہ شریعت کو ناز تھا

اب کس کے آستاں پہ جھکائیں جبینِ شوق — وہ تاجدارِ علمِ شریعت نہیں رہا
کیونکر نہ پاش پاش ہو دل شامِ ہجر میں — وہ آفتابِ زہد و طریقت نہیں رہا
اب کس سے درسِ حکمت و اخلاق لے جہاں — افسوس وہ معلمِ فطرت نہیں رہا
وہ صاحبِ علومِ حقیقی کہاں گیا؟ — وہ وارثِ رموزِ نبوت نہیں رہا
تھانہ بھون کے گلشنِ علمی میں ہے خزاں — وہ باغبانِ باغِ حقیقت نہیں رہا
کیونکر نہ قوم خاک اڑائے فراق میں — وہ خضرِ قوم و ہادیِ ملت نہیں رہا

خالی ہے بزم انجمن آرا نہیں کوئی
اب طالبانِ حق کا سہارا نہیں کوئی

منزل کے اب نشان نظر آتے نہیں ہمیں — گم گشتہ راہ قوم کے رہبر کہاں ہے تو
اے آفتابِ مشرقِ دیں تو کہاں گیا؟ — اے اوجِ علم کے مہِ انور کہاں ہے تو
خانہ خراب ہند میں ہے امتِ رسولؐ — اے ترجمانِ دینِ پیمبر کہاں ہے تو
مضطر ہے دل خدا کی قسم تیری یاد میں — اے وجہِ راحتِ دلِ مضطر کہاں ہے تو
تیری مصنفات پہ پڑتی ہے جب نگاہ — کہتا ہے دل کہ علم کے سرور کہاں ہے تو
علم و عمل کا پوچھنے والا نہیں کوئی — علم و عمل کے حامی و یاور کہاں ہے تو

آن گل کہ در ریاضِ حقیقت شگفتہ شد
رفت از چمن بگوشۂ تربت نہفتہ شد

تھانہ بھون میں اب وہ تجلی نہیں رہی — محروم جلوہ آہ ہماری نظر ہے آج

جو وجہ افتخار جہان تھا کہاں ہے وہ — جس پر کہ ہم کو ناز تھا آنا کدھر ہے آج

دل ہی میں ظلمتِ غم فرقت نہیں فقط — خود بے چراغ محفل شام و سحر ہے آج

کس کے لئے ہے ملتِ اسلام سوگوار — تربت پہ کس کی ایک جہاں نوحہ گر ہے آج

تاریک کائنات ہے اپنی نگاہ میں — یعنی فروغِ شمس نہ نورِ قمر ہے آج

ماتم ہے کس کا انجمنِ علم و فضل میں — دنیائے علم و فضل جو زیر و زبر ہے آج

ماہیم سینہ چاک بمرگِ ولی دریغ!

آمد صدائے غیب کہ اشرف علی دریغ!

ہم دل شکستہ جادۂ ہستی میں کیا کریں — یارب ہمارا قافلہ سالار کیا ہوا

اب کون دستگیر ہوا اپنا جہان میں — ہم جس کے خوشہ چیں تھے وہ گلزار کیا ہوا

تھانہ بھون کی خاک تجھے بھی خبر ہے کچھ؟ — تیرا وہ علم و فضل کا دربار کیا ہوا

تلقین صبر کس کو کرے کون؟ آہ! آہ! — وہ رہنما وہ سید و سردار کیا ہوا

جس کے مصنفات سے دنیا ہے فیض یاب — وہ علم دیں کا محرمِ اسرار کیا ہوا

دردِ فراق سے کسی پہلو نہیں قرار — اے فکر وہ سکونِ دلِ زار کیا ہوا

تاریک شد بہ منزلِ آفاق راہِ ما — دردا! کہ رفت پیرِ طریقت پناہِ ما

تاریخہائے وفات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

از جناب جمیل الرحمٰن صاحب محمودی سیوہارہ

لما توفی اشرف العلماء — بکت علیہ الارض مثل سماء

ارخت هر تجلا وقلت مبادرا | لفظ المجدد "مشعر ببقاء
وعلی الوفات تدل بالعشرات[۱] | ها قد توفی اشرف العلماء

باللہ طیب ثراہ ومثواہ | وفات اہل العلم موت کل العالم
اجل العلماء ثلمۃ فی الدین[۲] | رحلت قد وقاہ الاصفیاء

انّ الموت موتہ والمحیا محیاہ جزاہ اللہ حسن الجزاء

نماند آہ علامہ اشرف علی | مگر ماند ازو ثبت نامِ نکو
ز مرگش بملت زیانے رسید | کہ شانِ سلف بود قائم ازو
بمن گفت ہاتف کہ سالِ وفات | نشانِ سلف آہ گم گشتہ گو

وہ اشرفِ یگانہ اور وقت کے مجدد | غزالیِ زمانہ اور رہنما و مرشد
ہے جن کی زندگی کی تاریخ المجدد | جن کی حیات پر ہے لفظِ امام شاہد
وہ آج ہو چکے ہیں خلدِ بریں میں وارد | سالِ وفات سنئے رخصت ہوئے مجدد

سیدی اشرف علی جب عازمِ عقبیٰ ہوئے | مرحبا کی جنت الفردوس سے آئی نوید
غیب سے ملہم ہوئی مجھ پر یہ تاریخ وفات | شیخ اکبر چل دیئے یا چل دیئے گویا جنید

علامۂ اشرف علی افسوس رخصت ہو گئے | واللہ سب ہی کچھ تھے وہ (بالتشدید) صد آہ سب ہی کچھ تھے وہ
ہاتف نے فرمایا کہ لکھو رحلت کا سالِ عیسوی | علامہ تھے عارف بھی تھے باللہ سب ہی کچھ تھے

آہ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی

---

۱ بحساب عشرات،

۲ حدیث مرفوع موت العالم ثلمۃ فی الدین،

مطبوعات جدیدہ

تطہیر القلوب از جناب سید صالح حسین صاحب شوق علیگ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۸، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ:۔ مبارک لین چھپرا صوبہ بہار،

شیعہ اور سنی اختلاف کے نتائج محتاج بیان نہیں، اس کا سب سے افسوسناک پہلو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر جو اسلام کے اساطین اعظم ہیں، طعن و طنز ہے، لائق مصنف کا آبائی مذہب شیعہ تھا، لیکن انھوں نے اپنے مطالعہ اور تحقیق سے سنی مذہب اختیار کر لیا ہے، مشاجرات صحابہ حضرت علی، حضرات شیخین اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کے باہمی تعلقات، جنگ جمل و جنگ صفین، اور حضرت امیر معاویہ رضؓ کے متعلق شیعوں کی جانب سے جو اعتراضات اور شکوک و شبہات پیش کئے جاتے ہیں، مذکورۂ بالا کتاب میں مصنف نے شیعہ اور سنیوں کی معتبر کتابوں سے ان کے تشفی بخش جوابات دیئے ہیں، یہ جوابات زیادہ تر دار المصنفین کی سیرت عائشہ اور سیر الصحابہ سے ماخوذ ہیں، لیکن جا بجا مصنف نے خود بھی مفید اضافے کئے ہیں اختلافی مسائل کی بحث میں عموماً غیر سنجیدہ مناظرانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے، لیکن اس کتاب کا لب و لہجہ متین اور شایستہ ہے، کاش شیعہ اور سنی اختلافی مسائل کو چھوڑ کر متحد ہو سکتے، اور ان کی قوتیں ایک دوسرے کے خلاف اور غیر ضروری مباحث میں صرف ہونے کے بجائے اسلامی مفاد میں صرف ہوتیں،

اسٹالن ترجمہ جناب آصف علی صاحب بیرسٹر دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴۴ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ:۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی اور اسکی شاخیں لاہور، لکھنؤ، بمبئی نمبر۳

موجودہ دور کے تمام ڈکٹیٹروں کی سوانحعمریاں اردو میں موجود ہیں، اسٹالن کے سوانح پر اب تک

کوئی مستقل کتاب نہ تھی، موجودہ جنگ میں اسٹالن کے حیرت انگیز کارناموں کی وجہ سے اس کی اور بھی ضرورت محسوس ہورہی تھی، لائق مترجم نے مشہور انگریز مصنف سٹیفن گریہم کی کتاب اسٹالن کا اردو ترجمہ کرکے اس کمی کو پورا کیا ہے، اسٹالن کے سوانح حیات اور اس کے کارنامے تمامتر انقلابِ روس سے وابستہ ہیں، اس لئے اس کتاب میں ۱۹۱۷ء سے لیکر ۱۹۳۹ء تک انقلاب روس سویٹ حکومت کی تاسیس، اور اس کے مختلف مراحل کی مختصر تاریخ، اور اس انقلاب وتعمیر میں اسٹالن کا جو حصہ رہا ہے، اور لینن کے بعد اوس نے جس طرح اپنی مخالف قوتوں کا خاتمہ کرکے ڈکٹیٹری حاصل کی ہے، اور سویٹ حکومت نے جو نئے اقتصادی اور صنعتی تجربات کئے ہیں ان سب کی پوری سرگذشت آگئی ہے، اس کتاب میں اخلاقی نقطۂ نظر سے اسٹالن کی کوئی اچھی تصویر نہیں پیش کی گئی ہے اور اسے پڑھکر اس کی عظمت کا کوئی اثر دل پر نہیں پڑتا، شاید اس کی وجہ "قلم درکفِ دشمن است" ہو، تاہم اس سے اسٹالن کے کارناموں کا اندازہ ہو جاتا ہے، لائق مترجم کا مقدمہ بجائے خود ایک مستقل چیز ہے، اس میں روس کی قدیم تاریخ کے مختلف دوروں، یورپ میں حکومت کے مختلف نظاموں اور ان کے متعلق عہد بعہد کے مختلف اصلاحی وسیاسی نظریوں اور ان کے ماتحت ان کے تغیرات وانقلابات اور انقلابِ روس کے عوامل واسباب کی پوری تفصیل ہے،

تنویر صبر، حصۂ اول، مؤلفہ جناب مولوی سکندر بخت صاحب فاضل دیوبند تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ:۔ غلام دستگیر تاجر کتب حیدرآباد دکن،

ہونہار مصنف نے اس کتاب میں لغاتِ عرب آیاتِ قرآنی، احادیث نبوی اور اقوالِ صوفیہ کی روشنی میں صبر کے معنی ومفہوم کی تشریح کی ہے، اس کی عظمت واہمیت بتائی ہے اور اسکے مختلف اقسام بیان کئے ہیں، یہ کتاب غالباً انکی پہلی تصنیفی کوشش ہے اسلئے خامیوں کا رہ جانا تعجب کی بات نہیں ہے، چنانچہ صبر کی بعض تشریحیں بھی محلِ نظر ہیں، زبان، عبارت اور طرزِ تحریر بہت اصلاح کی محتاج ہیں، ایسی تصانیف کے لئے بڑی مشق ومہارت اور پختگی کی ضرورت ہے لیکن ان خامیوں کے باوجود مصنف کی محنت اور تلاش قابلِ قدر ہے انھوں نے صبر کے متعلق اس کتاب میں بہت سے مفید معلومات جمع کر دیئے ہیں،

نور ہدیٰ مؤلفہ جناب مولوی سید ابوالمحفوظ محمد محمود احسن صاحب شمسی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۲ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ر پتہ شاد بک ڈپو، پیر بہوڑ پٹنہ،

مولوی سید نور الہدیٰ صاحب مرحوم بیرسٹر ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج پٹنہ، بہار کے ایک دیندار مخلص اور درد مند مسلمان تھے، ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے بقیہ عمر مسلمانوں کی خدمت مین بسر کی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ ہے، یہ مدرسہ انھوں نے اپنے والد مرحوم سید شمس الہدیٰ کے نام پر اپنے ذاتی صرف سے قائم کیا تھا، اور اس کے اخراجات کے لئے ایک بڑی جائداد وقف کر گئے، اب یہ مدرسہ گورنمنٹ بہار کے شعبۂ تعلیم کی نگرانی مین ہے، اور صوبۂ بہار مین عربی تعلیم کا ایک بڑا مرکز ہے، مصنف نے جو اسی مدرسہ کے فارغ شدہ ہین، مذکورۂ بالا کتاب مین بانی مدرسہ کے حالات اور مدرسہ کی تاسیس سے لیکر ۱۹۴۱ء تک اسکی پوری سرگذشت بیان کی ہے، اور کتاب کے آخر مین مدرسہ کے منتظمین اور اساتذہ کے مختصر حالات لکھدیئے ہین، کتاب سبق آموز اور دلچسپ ہے، لیکن زبان نہایت خام ہے، جو غالباً مصنف کی نوآموزی کا نتیجہ ہے،

سچی کہانیان از جناب عندلیب شادانی پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۶۲ صفحے

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے ر، پتہ، کتب خانہ علم و ادب دہلی،

عرصہ ہوا رسالہ ساقی دہلی مین پریم پجاری کے قلم سے سچی کہانیون کا ایک دلچسپ سلسلہ نکلا تھا، جو بہت مقبول ہوا، ہم نے بھی اس کو بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا، افسانون کی دلکشی غمازی کرتی تھی کہ پریم پجاری کے پردہ مین کوئی صاحبِ مذاق پنہان ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ اس پردہ مین عندلیب کا نغمہ نکلے گا، مذکورہ بالا کتاب انہی پندرہ کہانیون کا مجموعہ ہے، مصنف کے تعارف کی ضرورت نہین، وہ ایک کہنہ مشق ادیب ہین، ان کا بیان ہے کہ یہ کہانیان سچی ہین اور اصل واقعات مین بہت کم اضافہ کیا گیا ہے، اگر ان کا یہ بیان صحیح ہے، اور غلط ہونے کی کوئی وجہ نہین، تو ان افسانون کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ کبھی سچی سرگذشت بھی افسانے سے کم دلچسپ نہین ہوتی، لیکن حقیقت مین فرضی افسانون سے زیادہ لطف و دلآویزی پیدا کرنا

مصنف کے حُسنِ انشا کا کمال ہے، یہ تمام افسانے دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہین،

رنگ بست از جناب نواب مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:- اردو اکیڈمی لاہور

اردو مین دوسری زبانون کی مشہور اور بلند پایہ نظمون کے منظوم ترجمے کرنا مختلف حیثیتون سے اردو شاعری کے لئے مفید ہے، لیکن یہ بڑا کٹھن کام ہے، ہر شخص کے بس کی بات نہین اس کے لئے قادرالکلامی کے ساتھ بڑے سلیقہ اور حسن مذاق کی ضرورت ہے، ورنہ منظوم تراجم کی کوشش عموماً نہایت مضحک بن جاتی ہے، جس کی مثالین اردو مین کمیاب نہین، جناب اثر لکھنوی کی قادرالکلامی اور حسن مذاق مسلم ہے، انھون نے اس مجموعے مین یونانی، اطالوی، فرانسیسی، انگریزی، سنسکرت، بنگالی، اور عربی زبانون کی ٹھائیس مشہور نظمون کے منظوم ترجمے کئے ہین، الفاظ کی پابندی کے ساتھ منظوم ترجمہ کرنا تقریباً ناممکن ہے، اس لئے کہ ہر زبان کا انداز بیان اور طریقہ تعبیر جداگانہ ہوتا ہے، اسلئے الفاظ کی پابندی سے زبان کی سلاست مین فرق آجائے گا، اگر مفہوم کا بھی پورا ترجمہ ہوجائے تو بھی بڑی کامیابی ہے، اس لحاظ سے یہ ترجمے جناب اثر کی قادرالکلامی کا نمونہ ہین، انھون نے ان کو اس طرح اردو کے قالب مین ڈھال دیا ہے، کہ اگر کہین کہین خیالات غیر زبان کی غمازی نہ کرین تو ترجمہ کا گمان بھی نہیں ہوتا، بیشتر نظموں میں لطف زبان مین بھی فرق نہین آنے پایا ہے، اور بعض ترجمون مین تو ادبی اور شاعرانہ نزاکتین بھی موجود ہین، یہ ترجمے بیشتر انگریزی کے ترجمون سے کئے گئے ہین، اس لئے ممکن ہے، ترجمہ در ترجمہ مین اصل سے کچھ فرق پیدا ہوگیا ہو، لیکن اس کا کوئی ظاہری اثر ان نظمون مین نظر نہین آتا، ان نظمون سے اردو شاعری مین اچھا اضافہ ہوا،

نمود زندگی از جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ہے عہ، پتہ:- سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدرآباد دکن،

مصنف حیدرآباد کے مشہور شاعر ہین، اردو کے اکثر ادبی رسالون مین ان کا کلام نکلتا رہتا
نمود زندگی اون کے کلام کا مجموعہ ہے، اس مین مذہب و اخلاق، سیاست و قومیات، عرفان و تصو
حسن و عشق وغیرہ مختلف موضوعون اور جذبات و خیالات پر نظمین ہین، کلام مین تخیل آرائی، اور رنگ
کے بجائے واقعیت اور سادگی بیان زیادہ نمایان ہے، بلکہ یہ دونون اوصاف اون کے کلام کا ا
وصف ہین، بعض نظمون مین سادگی اور واقعیت اتنی غالب ہے کہ وہ شاعری کی بہ نسبت
واقعہ نگاری سے زیادہ قریب ہو گئی ہین، غزلون کا بھی عموماً یہی رنگ ہے، لیکن کلام
پختگی ہے،

حالی محب وطن، از جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴ صفحے،
کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت چھ آنے، پتہ :- اردو گھر احمد منزل کلان محل دہلی،

مولانا حالی کی پیدایش کی صد سالہ یادگار کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریر فرمائی تھ
جسے کتابی صورت مین شائع کر دیا گیا ہے، آج کل کے انقلابی رجحانات اور ان کی تنگ نظری نے
وطن کی محبت اور خدمت کے معنی و مفہوم کو بہت محدود کر دیا ہے، اس تحدید کی بنا پر ہمارے بعض وہ پرانے خا
جنھون نے سب سے پہلے حب وطن اور حب قوم کا سبق دیا، اس زمرہ سے خارج تصور کئے ا
ہین، فاضل مقرر نے اس تقریر مین اس غلط فہمی کو دور کیا ہے، اور بتایا ہے کہ قوم اور وطن کی
محض انقلاب کا نعرہ لگا دینے کا نام نہین ہے، اور اوس کے مختلف پہلوؤن اور مختلف حیثیتو
وضاحت کرکے مولانا کی خدمت وطن کی نوعیت اور اس کی قدر و قیمت دکھائی ہے، اور ان کے کلام سے
حب وطن اور حب قوم کا ثبوت دیا ہے، بعض ایسی مثالین بھی پیش کی ہیں، جو خدمت وطن کے موجود
پر بھی پوری اترتی ہین، فاضل مقرر کی دوسری تقریرون کی طرح یہ تقریر بھی خیالات کے اعتدال و تو
نکتہ وری کا نمونہ ہے، "م"

بلد ۵۳ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۴ء عدد ۴

مضامین

زمانہ کے عام اقتصادی حالات اور بعض مستقل آمدنیوں کے رُک جانے کی وجہ سے ادھر کچھ دنوں سے دار العلوم ندوہ کی مالی حالت بہت ناقابل اطمینان ہوگئی تھی، بڑی مشکل سے اخراجات چلتے تھے، ندوہ کے دوسرے صیغوں کی مد سے کئی ہزار کا قرض دار العلوم پر ہوگیا تھا، ان حالات میں اس کی دستگیری کے لئے کارکنوں کی نگاہ اسی اسلامی ریاست کی طرف اٹھی جو ہندوستان کے تمام اسلامی اداروں کا ملجا و ماوی ہے، اور جیسا کہ اس سرکار کی علم نوازی سے توقع تھی، بارگاہِ سلطانی سے ندوہ کی سابق تین سو ماہانہ امداد میں مزید تین سو ماہوار کا اضافہ منظور ہوا، اور متفرق قرضوں کی ادائیگی کے لئے پندرہ ہزار نقد کی اُمید دلائی گئی، یقین ہے کہ عام مسلمان اور تمام وابستگانِ ندوہ اعلیحضرت سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کی اس دین پروری اور علم نوازی کے منت پذیر و سپاس گذار ہوں گے، اس شاہانہ امداد کے علاوہ حیدر آباد کے اصحاب خیر سے آٹھ ہزار نقد چندہ وصول ہوا، اور ابھی کچھ وعدے ہیں، جن کے انشاء اللہ جلد پورے ہونے کی توقع ہے، اللہ تعالیٰ ان محسنین کو اس کار خیر کا صلہ عطا فرمائے، اس گرانقدر امداد سے ندوہ کو فی الجملہ بڑی تقویت حاصل ہوگئی۔

چند دن ہوئے علی گڈھ میں "اسلامی جماعت" کے نام سے ایک نئی مجلس کا قیام عمل میں آیا ہے، جس کا تذکرہ ان صفحات میں آچکا ہے، اس مجلس کا مقصد مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح اور اسلامی شعائر کی پابندی کی تبلیغ اور اسلامی تعلیمات کا احیاء ہے، حال میں مجلس کے کارکنوں کی جانب سے اس کے اغراض و مقاصد اور اس کا نظامِ عمل شائع ہوا ہے، اس سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اب کارکنوں نے عملی قدم اٹھایا ہے اور وہ ہر صوبہ میں مجلس کی شاخیں قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ ارادہ نہایت

مبارک ہے، لیکن اس قسم کی تحریکیں عموماً آل انڈیا بننے کے بعد بے نتیجہ ہو جاتی ہیں، ایسا نہ ہو کہ اس تحریک کا بھی یہی انجام ہو، اس لئے اگر مجلس مذکور اس وسیع دائرۂ عمل میں اپنی زیادہ توجہ مسلم یونیورسٹی پر صرف کرے تو یہ سارے ہندوستان میں تبلیغ و اشاعت سے کم مفید نہ ہوگا، یونیورسٹی مسلمانوں کا مرکزی تعلیمی ادارہ ہے جس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے نوجوان طلبہ، اہل علم و صاحب دماغ فضلاء کا اجتماع ہے، اگر اس کے اساتذہ اور طلبہ میں صحیح اسلامی روح پیدا ہو جائے اور وہ یہاں سے مذہبی اثرات لیکر نکلیں تو ان کے ذریعہ خود بخود یہ چیز سارے ہندوستان میں پھیل جائے گی، لیکن اصلی سوال عملی کوشش کا ہے، اس قسم کی مجالس کے قیام سے اتنا تو بہرحال اندازہ ہوتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ بدل گیا ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مسلمانوں کی اصلی اور صحیح اصلاح کا احساس پیدا ہو گیا ہے جو امید ہے کہ آیندہ چل کر کوئی مفید صورت بھی اختیار کرلے،

آل انڈیا مسلم ہسٹری کانگریس کا پہلا اجلاس گذشتہ سال لاہور میں منعقد ہوا تھا، دوسرا اجلاس ۷-۸-۹- اپریل کو اسلامیہ کالج پشاور میں منعقد ہو رہا ہے، امید ہے کہ یہ اجلاس کامیاب ہوگا اور ہندوستان کے اہل علم اور فضلا، اسلامی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پڑھیں گے، اس اجلاس میں ترکوں کی تاریخ کی ترتیب کے مسئلہ پر بھی غور ہوگا، گو اس کانفرنس کا دائرۂ عمل وسیع ہے اور اس میں ہندوستان کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں کی بھی تاریخ آجاتی ہے لیکن سب سے مقدم کام ہندوستان کی تاریخ کی تدوین کا ہے، ترکوں کی تاریخ کی تدوین کا فرض کفایہ ایک حد تک دارالمصنفین نے ادا کر دیا ہے اور دولت عثمانیہ کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں ترکی کی تاریخ یہاں سے شائع ہو چکی ہے، جدید ترکی پر تیسری جلد زیر ترتیب ہے،

حال میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے حدیث کی دو اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں، ایک

حافظ یعقوب بن اسحاق المعروف بہ ابی عوانہ المتوفی ۳۱۶ھ کی مشہور مسند کا پہلا حصہ، دوسری حافظ ابو بکر محمد بن حسن المعروف بہ ابن فورک المتوفی ۴۰۶ھ کی کتاب مشکل الحدیث و بیانہ۔ مسند کا یہ حصہ کتاب الصلوٰۃ تک ہے، حافظ ابن فورک بہ یک واسطہ امام ابو الحسن اشعری کے شاگرد اور چوتھی صدی کے نامور اصولی فقیہ اور اشعری متکلم تھے، اس کتاب میں اشعری نقطۂ نظر سے ان احادیث کی تاویل و تشریح کی گئی ہے جن کے ظاہری الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق تشبیہ و تجسم کا گمان ہو سکتا ہے، اس پہلو سے یہ کتاب اہم ہے،

اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر مسرت ہوئی کہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد جو حیدرآباد میں زیر ترتیب تھی، پریس میں چلی گئی، اس اہم کام کی توقع حیدرآباد ہی سے ہو سکتی تھی، حیدرآباد کے اہل علم نے اردو بولنے والوں کی جانب سے یہ بڑا فرض ادا کیا، لیکن اصل چیز انسائیکلوپیڈیا کی معنوی حیثیت ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وہ علمی معیار پر کہاں تک پوری اترتی ہے، اس کے فاضل مرتبوں سے توقع اسی کی ہے کہ معلومات اور تحقیق دونوں کا معیار بلند ہوگا،

مشہور انگریز مستشرق پروفیسر فلپ کے ہٹی کی قابل قدر تالیف "ہسٹری آف دی عربز" تاریخ اسلام پر جامع اور محققانہ کتاب ہے، عام یورپین مورخین کے برعکس مصنف نے اس کتاب میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو بڑی حد تک صحیح نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کے علمی و تمدنی کارناموں پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے، یہ کتاب اپنی جامعیت اور وسعت معلومات کے لحاظ سے اردو میں ترجمہ کے لائق تھی، ہم کو خواجہ عبد الوحید صاحب سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور کے خط سے معلوم ہوا کہ انسٹی ٹیوٹ مذکور نے یہ کام انجام دیا ہے، ترجمہ پورا ہو چکا ہے، امید ہے کہ جلد ہی شائع ہوگا، اس کی اشاعت سے تاریخ اسلام کے متعلق اردو میں ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوگا،

مقالات

اسلامی معاشیات
کے
چند فقہی اور قانونی ابواب

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ

"مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کے مفید اور پُر از معلومات مضمون اسلامی معاشیات کا جو سلسلہ معارف میں نکلا تھا، اوس کے بعض ضروری اجزاء باقی رہ گئے تھے،

یہ مضمون رسالہ سیاست حیدرآباد میں شائع ہو چکا ہے لیکن یہ اس سلسلہ کی ایک ضروری کڑی ہے نیز اس کی افادی حیثیت اس کی متقاضی ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کیجائے، اس لئے اس کو رسالہ سیاست سے نقل کیا جاتا ہے"۔

"م"

مجلہ تحقیقات علمیہ ۱۹۳۰ء میں "حکومت کی آمدنی" کے عنوان سے خاکسار کا جو مقالہ شائع ہو چکا ہے، میری جس کتاب کا وہ ایک حصہ تھا، اسی کے بعض دوسرے حصص کو اب "سیاست" میں ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ کی فرمایش پر شائع ہونے کے لئے دے رہا ہوں، مجلہ میں جو حصہ شائع ہوا ہے، اس کے متعلق

یہی مین نے لکھا تھا اور پھر اسی کو دہرانا چاہتا ہون کہ دراصل میری چند یادداشتون کا یہ مجموعہ ہے، کامل استیعاب اور احاطہ کی کوشش نہین کی گئی ہی، مقصود صرف یہ ہو کہ "اسلامی معاشیات" کے متعلق جو حضرات کام کرنا چاہتے ہین ان کے سامنے فقہ کی کتابون مین جو مواد پایا جاتا ہے، وہ پیش کر دیا جائے، جیسے جیسے موقع ملتا چلا جائے گا، اور فرصت ہمدست ہو گی، بتدریج دوسری چیزین بھی آپکے سامنے آتی رہین گی،

اس موقع پر یہ بھی بتا دینا چاہتا ہون کہ "اسلامی معاشیات" اور مسلمانون کے معاشیات میں جو فرق ہو، کام کرنے والون کو چاہئے کہ اس فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھین، اس قسم کی قومین جن کے پاس اپنے مذہبی وثائق کا کوئی مکمل اور غیر مشتبہ ذخیرہ نہین ہے، وہ تو مجبور ہین کہ اپنے ہم مذہب مفکرین کے خیالات وآراء کو بھی اپنے مذہب ہی کی طرف منسوب کرکے پیش کرین، لیکن مسلمانون کو اسمین فرق کرنا چاہئے' اسلام نے جو نظام زندگی پیش کیا ہو اس کا سرچشمہ کتاب وسنت واجماع ہے فقہی مسائل اسلام کے ان ہی اساسی مستندات سے ماخوذ ہین، باقی تیرہ سو سال میں دنیا کے مختلف حصون مین بجاے خود مسلمان مفکرین نے زندگی کے مختلف پہلوؤن کے متعلق جو کچھ سوچا سمجھا، یا اپنی کتابون مین انھین درج کیا ہے، وہ مسلمانون کی چیز تو کہلا سکتی ہے لیکن غلط بیانی ہو گی اگر ان کو اسلام کی طرف منسوب کیا جائے، اس وقت جو چیز آپکے سامنے پیش ہو رہی ہے، اس کا براہ راست تعلق اسلام سے ہے، مسلمان مفکرین کے آراء و نظریات کو مین نے الگ جمع کیا ہے جو اس سے بالکل جداگانہ چیز ہے،

(مناظر احسن گیلانی)

صحاح کی مشہور حدیث ہے کہ بندے قیامت کے دن اُس وقت تک اپنی ٹانگون پر کھڑے رہین گے جب تک کہ چار باتون کے جواب سے فارغ نہ ہولین، ان ہی چار گانہ سوالات مین ایک بڑا اہم سوال یہ بھی ہوگا کہ

عن مالہ من این اکتسبہ وفیم انفقہ، (ترجمہ) آدمی سے پوچھا جائے گا اپنے مال کو یعنی اس مال کو کن ذرائع سے اُس نے حاصل کیا اور کن راہون میں

سچ پوچھئے تو معاشیات کے قانونی یا فقہی مسائل کا تعلق ان ہی دو باتون سے ہے، دوسرے لفظون مین یون خیال کیجئے کہ دولت کے دخل و خرچ کے متعلق اسلام نے مسلمانون کو جو عملی ضابطہ دیا ہے، اب آپ کے سامنے اسی کی تفصیل پیش ہوگی، دولت عباسیہ کے پہلے قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسف نے بھی اپنی مشہور سیاسی و معاشی کتاب "الخراج" جو خلیفہ ہارون الرشید کی فرمایش سے لکھی گئی ہے، اس مین بھی قاضی صاحب نے تمہید کلام مین اسی حدیث کو اسلامی معاشیات کی بُنیاد قرار دیا ہے،

اس معاشی ضابطہ کے اساسی قوانین کو پیش نظر رکھ کر فقہائے اسلام رحمہم اللہ اجمعین نے جزئیات کے متعلق دفتر کے دفتر جو تیار کر دیئے ہین، ظاہر ہے کہ اس مختصر سی کتاب مین ان سب کا احاطہ ناممکن ہے تاہم مین کوشش کرونگا کہ ایک خاص ترتیب سے اس سلسلہ کے اہم مسائل کو اپنی اپنی جگہ پر درج کر دون، ہو سکتا ہے کہ راہ بن جانے کے بعد آئندہ کام کرنے والے اس پر اور اضافہ کرین،

معاشیات کے دو اسکول

پہلا اسکول واقعہ یہ ہے کہ مشاہدہ اور تجربہ کے سوا خود قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے بنی آدم مین ایک طبقہ ان لوگون کا پایا گیا ہے، جو مالیات یا تحصیل دولت و صرف دولت دونون کو ہر قسم کی اخلاقی و مذہبی پابندیون سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے، کمانا چاہئے "خواہ کسی ذریعہ سے ہو" اڑانا چاہئے "خواہ خرچ کی جو راہین بھی ہون"،

اس سلسلہ مین یہان تک دیکھا گیا ہے اور اب بھی دیکھا جاتا ہے کہ جن کی زندگی بظاہر دینی اور شرعی ہوتی ہے یعنی نماز، روزہ، درود و وظائف، حج و قربانی، ان تمام امور کے وہ پابند ہوتے ہین، لیکن یہی لوگ جو اس قسم کی مذہبی پابندیون کو اپنے لئے لازم سمجھتے ہین، مالیات کے مسئلہ مین ہر قسم کی بے قیدیون کا دیدہ دلیری سے ارتکاب کرتے ہین، اس مکتب خیال یا مسلک عمل کا تذکرہ قرآن نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے ذکر مین کیا ہے یعنی حضرت شعیب نے جب ان پر معاشی قوانین کی پابندیون کو عائد کرنا چاہا تو ان کو جواب دیا گیا کہ

قالوا یا شعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک مایعبد آباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاءُ،

اونھون نے کہا شعیب! کیا تمھاری نمازین یہ بھی حکم کرتی ہین کہ جن معبودون کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے، انھین ہم چھوڑ بیٹھین اور یہ کہ ہم اپنے اموال (دولت) کے متعلق جو چاہین کرین (اس مین رکاوٹ پیدا ہو)

صرف یہی نہین بلکہ قوم شعیب کے معاشی ماہرین نے ان کے طرز عمل پر اظہار تعجب کیا، اوران کی عقل وفہم جس کا انھیں ایک مدت سے تجربہ تھا، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان روشن خیالون نے طنز کے لہجہ مین کہا کہ

انک انت الحلیم الرشید تم تو بڑے بھاری بھرکم باوقار سوجھ بوجھ کے آدمی ہو،

بہرحال معاشیات کا یہ تو ایک آزاد مکتب خیال ہے تحصیل دولت کے ذرائع پر بظاہر ان کے نزدیک کسی قسم کی قید عائد کرنا سوجھ بوجھ عقل ودانائی کے خلاف ہے، بلکہ جس کو جس وقت جس ذریعہ سے بھی حصول دولت کا موقع ملے، بدعقلی ہوگی کہ اوس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے، یا روپیہ رہتے ہوئے اپنی خواہش خواہ جس بات کی ہو، آدمی پوری نہ کرے، قرآن نے جن الفاظ مین ان کے اس معاشی نظریہ کا ذکر کیا ہے، اوس سے ضمنا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب جو عموماً لوگون کے خیال مین پوجا پاٹ یا صلوٰۃ مین منحصر ہے، معاشی کاروبار مین اس کی دخل اندازیون کو وہ ناپسند کرتے تھے، اسی لئے اونھون نے کہا کہ تمھاری نمازین کیا اسے بھی روکتی ہین کہ ہم اپنے اموال کے متعلق جو چاہین کرین

دوسرا مکتب خیال اسی کے مقابلہ مین معاشیات ہی کا ایک دوسرا اسکول بھی ہے، جو دوسرے پہلوؤن کی طرح انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو بھی چند خاص حدود مین رکھنا چاہتا ہے، یعنی وہی بات جو حدیث مین آئی ہے کہ

من این اکتسبہ وفیما انفقہ کہان سے کمایا اور کس راہ مین خرچ کیا،

دونون پر نگرانی قائم کرنا چاہتا ہے، تقریباً ہر زمانے مین اس طبقہ کی بھی کمی نہیں رہی ہے، عملی طور پر خواہ اس اصول کے ماننے والون کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو لیکن نظری حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اکثریت کم از کم زبان سے اس

نگرانی کی ہمیشہ حامی رہی ہے، اسی لئے چوری، ڈاکہ، رشوت، خیانت، دھوکا وغیرہ ذرائع کسب کو اچھی سوسائیٹیون مین ہمیشہ بُری نظرون سے دیکھا گیا ہے، غالبًا اسی بنا پر دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک مین حد بندی عائد کرنے والے معاشی قوانین پائے جاتے ہین، اسلام کا تعلق بھی ثانی الذکر طبقہ سے ہے، اور اس وقت مین انہی پابندیون کی کلی حیثیت سے تفصیل کرنا چاہتا ہون، جو ان دونون امور یعنی "من این اکتسبہ" یا دوسرے لفظون مین "دخل" اور "فیم انفقہ" یا "خرچ" پر اسلام نے عائد کئے ہین، دونون سوالون پر دو مستقل عنوانون کے نیچے بحث کی جائے گی،

دخل

دخل یعنی مال و دولت کے کمانے اور ان سے استفادہ کے ذرائع پر اسلام نے جو قیود عاید کئے ہین اسکی تفصیل کے سمجھنے کے لئے چاہئے کہ اجمالًا پہلے دنیا کی چیزون کی اس تقسیم کو سمجھ لیا جائے جو معاشی حیثیت سے اسلام مین اختیار کیگئی ہے،

اسلام مین اشیاء کی معاشی تقسیم

واقعہ یہ ہے کہ فقہ کی کتابون مین اگرچہ مالی مسائل کو مختلف ابواب کے ذیل مین منتشر کرکے بیان کیا گیا ہے لیکن تمام ابواب کے مسائل کو پیش نظر رکھکر منطقی طریقہ سے چاہین تو ہم اُن کو یون تقسیم کر سکتے ہین یعنی ان چیزون کا بنی آدم مین کوئی مالک ہے یا نہین، اگر مالک نہیں ہے، تو قبضہ کرنے کے بعد بھی آدمی اون کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں، اسی طرح جن چیزون کا کوئی مالک ہے، ان کی بھی دو صورتین ہین، مالک کی مرضی کے بغیر اسلام ان پر دوسرون کو قبضہ کرنے کی اجازت دیتا ہے یا نہین، اگر دیتا ہے تو اس کی کتنی صورتین ہین، اور نہین دیتا ہے، تو پھر ان چیزون کے مالک ہونے کے قانونی ذرائع کیا ہین، اور اسلام ان قانونی پابندیون کو ان چیزون کے مالک ہونے کے لئے کیون ضروری قرار دیتا ہے، چونکہ ان تمام منطقی شقون کے نیچے کچھ نہ کچھ چیزین داخل ہین، اس لئے مین ہر ایک پر الگ الگ بحث کرتا ہون،

ایسی چیزین جن کا اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی مالک نہین، ہدایہ مین ہے :-

الانتفاع بماء البحر کالانتفاع بالشمس والقمر والھواء،	سمندر و دریا کے پانی سے استفادہ کی نوعیت وہی ہے جو آفتاب، ماہتاب اور ہوا سے استفادہ کا حکم ہے،

(کتاب الشرب، ج ۴) (یعنی ہر شخص کو ان سے استفادہ کا عام حق حاصل ہو)

جس سے معلوم ہوا کہ سمندر، دریا وغیرہ اور ان کا پانی اور آفتاب ماہتاب وغیرہ اور ان کی روشنی اسی طرح ہوا اور فضا کا کوئی مالک نہیں ہے، اسی طرح ہوا کے پرندے، جنگل کے جانور اور سمندر کے حیوانات ان سب کا بھی کوئی مالک نہیں ہے، اور یہی حال جنگل، پہاڑ وغیرہ کے درختوں اور دیگر نباتات کا ہے کہ نہ ان کا کوئی مالک ہو، اور نہ ان کے پھلوں کا، بلکہ ہر شخص کے لئے وہ شرعًا مباح اور جائز ہیں، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں اخروٹ، بادام وغیرہ کے خودرو جنگلی درختوں اور شہد وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

اذا کان فی المفاوز والجبال علی الاشجار	جب یہ چیزیں صحرا اور پہاڑوں میں درختوں
او فی الکھوف فلا شی فیہ وھو	میں یا پہاڑ کے غار میں ہوں تو اُن پر کچھ نہیں،
بمنزلۃ اثمار تکون فی الجبال والاودیۃ	(یعنی حکومت کوئی محصول عائد نہیں کرسکتی) اُن
(کتاب الخراج ص ۵۶)	ان کا حال ان پھلوں کا ہے جو پہاڑوں اور

باقی اراضی یعنی زمین کی بھی اسلام میں چند قسمیں ہیں، صاحب بدائع نے ان اقسام کو اس طرح بیان کیا ہو،

والارض فی الاصل نوعان مملوکۃ و	زمین کی دراصل دو قسمیں ہیں زمین جو کسی کی ملک ہو
الارض مباحۃ غیر مملوکۃ والمملوکۃ	ایک قسم دوسری قسم مباح یعنی کسی کی ملکیت میں نہ ہو
نوعان عامرۃ وخراب والمباحۃ	پھر جو زمین کسی کی ملک ہی اس کی بھی دو قسمیں ہیں
ایضًا نوعان نوع ھو من مرافق	آباد اور غیر آباد، اسی طرح غیر مملوکہ مباح زمین
البلدۃ محتطبا لھم ومرعی لمواشیھم	کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا شمار بلد (آبادی)
ونوع لیس من مرافقھا وھو المسمی	کی سہولت آفرینیوں سے ہو، مثلاً لکڑی حاصل
بالموات، (بدائع ۶ ص ۱۹۲)	کرنے کی جگہ ہے، مویشیوں کی چراگاہ ہو، اور دوسری
	وہ جس کا شمار مرافق سہولت آفرین خطے نہ ہو

جس سے معلوم ہوا کہ زمین کی بعض قسمیں غیر مملوک بھی ہوتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ان پر کسی کا قبضہ نہیں تو
کے مملوک ہونے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، سوال اس کے بعد ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی تملیک کی کیا شکل ہے عام طور
ان چیزوں کے مالک ہونے کا طریقہ اسلام نے بھی وہی اختیار کیا ہے، جو عموماً دنیا میں مروج ہے ابو داؤد میں
ور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

من سبق الی مالم یسبق الیہ مسلم فھو احق بہ،	جس پر کسی مسلمان کا پہلے قبضہ ہو چکا ہو پہلی دفعہ قبضہ کرے گا وہی اس کا زیادہ حقدار ہے،

فقہا نے اس حدیث کی بنا پر یہ قانون پیدا کیا، جیسا کہ ہدایہ میں ہے،

مَنْ سَبَقَتْ یَدُہٗ اِلَیْہِ فِی مِلکہ،	یعنی پہلی دفعہ جس کا قبضہ اس پر ہوگا وہی اس کا مالک ہو جاتا ہے:

مثلاً کہتے ہیں کہ

مَنْ احتطب فی مفازۃ فھو لہ ومن اصطاد صیداً فھو لہ	جنگل میں جو لکڑی کاٹ لے اور شکار کو جو شکار کرے وہ اسی کا ہوگا،

لیکن باوجود اس عام قانون کے چند چیزیں ایسی ہیں جن کو اسلام میں بعض خاص شرائط کے ساتھ اس
قانون سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزیں جن پر کسی کا قبضہ ہی نہیں ہو سکتا، اور ان کو وہ اپنی
حفاظت میں نہیں لے سکتا، مثلاً آفتاب و ماہتاب ہوا وغیرہ ان کا تو ظاہر ہی ہے کہ آدمی مالک نہیں ہو سکتا،
ہدایہ میں ہے کہ

الانتفاع بالشمس والقمر والھواء فلا یمنع من الانتفاع بہ علی ای وجہ شاء،	آفتاب ماہتاب ہوا سے فائدہ اٹھانے سے کوئی روکا نہیں جا سکتا جس طرح چاہے ان سے استفادہ کر سکتا ہے،

اسی بنا پر فقہاء کا یہ مسئلہ ہے کہ دو منزلہ مکان کی نچلی منزل کا کوئی اگر مالک ہو اور اوپر والی منزل کا کوئی اور، پھر اوپر والی منزل گر جائے تو اس فضا یا ہوا کو جس میں یہ اوپر والی منزل تھی، اس کو کوئی بیچ نہیں سکتا، ابن ہمام نے اس کی وجہ فتح القدیر میں یہ لکھی ہو کہ مکان کو بلند کرنے کا جو حق اس کو حاصل تھا وہ

حق متعلق بالھواء ولیس الھواء	ایک ایسا حق ہے جو ہوا کے ساتھ قائم ہے اور
مالاً یباع (۲۰۰۴ مطبوعہ مصر ج ۵)	ہوا کوئی مال نہیں ہے، جسے بیچا جائے،

اشتراکی سرمایہ پانی، آگ، گھاس

لیکن علاوہ ان چیزوں کے اور بھی چند امور ہیں جن پر خواہ کسی کا قبضہ ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن عام مفاد کے لئے اسلام نے یہ قرار دیا ہے کہ انفرادی طور پر قانوناً کوئی ان کا مالک نہیں ہو سکتا، بلکہ انھیں عام پبلک پراپرٹی قرار دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں عموماً کتابوں میں اگرچہ تین ہی چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہی یعنی مشہور حدیث ہی،

الناس شرکاء فی الماء والکلاء	لوگ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے ساتھی
والنار،	اور شریک ہیں یعنی الماء (پانی) الکلاء (گھاس)
(صحاح)	النار (آگ) ہیں،

اسی حدیث کی بنا پر پانی، گھاس، آگ میں الناس یعنی عام پبلک شریک سمجھی جاتی ہے،

اشتراکی سرمایہ کے ملحقات

لیکن صرف انہی تین چیزوں تک اشتراک کے قانون کو محدود سمجھنا صحیح نہیں ہی بلکہ اس ذیل میں اور بھی ایسی چیزیں ہیں جن کو انفرادی ملک قرار دینے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ

ان ملکہ احد بالاحتجاز ملك منعه	اگر احاطہ بندی کرکے کوئی اس کا مالک ہو جائیگا
فضاق علی الناس فان اخذ العوض	تو لوگوں کو اس سے روکے گا اور عوام ضیق تنگی
عنه اغلاہ لا تخرج عن الموضع	میں مبتلا ہو جائیں گے، اور اگر اس کا معاوضہ
الذی وضعه الله من تعمیم ذوی الحوائج	لے گا تو اسے گران کردیگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

من غیر کلفة المغنی۔ حق تعالیٰ نے جس غرض کے لئے اس چیز کو جو
(ص ۱۵۱۔ ج ۶) مقام عطا کیا تھا، وہاں سے وہ چیز ہٹ جائیگی
یعنی عام حاجتمندوں کی ضرورت بغیر کسی کلفت
ومشقت کے پوری ہو یہ بات جاتی رہے گی؛

اسی لئے علامہ ابن خدامہ نے اس سلسلہ میں حسب ذیل چیزوں کا اضافہ کیا ہے؛

المعادن الظاهرة وهي اللتی یوصل	ظاہری معادن ان کو کہتے ہیں جن تک بغیر کسی
ما فیها من غیر مؤنة ینتابها الناس	محنت ومشقت کے رسائی حاصل ہو سکے لوگوں
وینتفعون بها کالسلح والماء و	کی اس پر آمد ورفت جاری ہو، اور لوگ اس
الکبریت والقیر والمومیاء و نفط	سے نفع اٹھاتے ہوں مثلاً نمک گندھک پچ
والکحل والیاقوت ومقاطع الطین	(ڈامر) مومیا، نفط (مٹی کا تیل) سرمہ یاقوت
واشباه ذٰلك،	یا مٹی نکالنے کی جگہ ہو،

علامہ لکھتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ چیزیں

لا تملك بالاحياء ولا یجوز اقطاعها	نہ آباد کرنے اور حکومت سے جاگیر ملنے کی وجہ سے
لاحد من الناس ولا احتجازها دون	ان امور کا کوئی مالک ہوتا ہے، اور نہ یہ جائز ہے
المسلمین لان فیه ضرر بالمسلمین	کہ عام مسلمانوں پر اس سے استفادہ کی راہ بند
وتضییقا علیهم،	کی جائے، کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان
	پہونچے گا، اور ان پر تنگی ہوگی،

فقہاء نے اس قانون کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث سے مستنبط کیا ہے، جو ابو داؤد و ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ابیض بن حمال نامی صحابی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست پر مآرب

(یمن) کے ایک کھاری چشمہ کو بطور جاگیر کے عطا فرما دیا، لیکن سند کے کر جب وہ روانہ ہوئے تو لوگوں نے عرض کیا کہ حضورؐ نے خیال نہیں فرمایا کہ اس شخص کو جاگیر میں کیا چیز عطا فرما دی گئی، وہ تو ایک نہ ختم ہونے والا جاری چشمہ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر ارشاد فرمایا "فلا اذن" یعنی جب وہ ایسا چشمہ ہے تو پھر وہ جاگیر میں نہیں دیا جا سکتا۔

اسی لئے فقہانے یہ طے کر دیا، ہو کہ حکومت اس قسم کی چیزیں کسی کو جاگیر میں بھی دے، جب بھی وہ کسی کی جاگیر نہیں بنے گی، اور وہ بہر حال میں پبلک جائداد ہی رہے گی،

علاوہ ان معادن کے فقہاء نے انھیں مصالح کی بنا پر لکھا ہے کہ

لیس للامام ان یقطع مالا غنی للمسلمین عنہ یعنی اذا کانت اجمۃ او غیضۃ او بحر یشربون منہ او مملحۃ لاھل بلدۃ فلیس للامام ان یقطع ذلک لاحد،

ایسی چیزیں جن سے عموماً مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتا، یعنی ان کی عام ضرورت کی چیزیں ہوں تو حکومت کو حق نہیں ہے کہ کسی خاص آدمی کی جاگیر میں ان کو دے دے مثلاً کوئی اجمہ (آبی نیستان) ہو یا جنگل ہو، یا دریا ہو جس سے پانی پیتے ہوں یا نمک بنانے کی جگہ کسی خاص آبادی کی ہو، جائز نہ ہوگا کہ امام کسی کو یہ چیزیں جاگیر میں دے [illegible]

(عنایہ برحاشیہ ہدایہ ج ۴ ص ۳۰۲)

اسی طرح آبادی کی چراگاہیں یا ارد گرد کی جھاڑیاں جن سے لوگ ایندھن کا کام لیتے ہیں یا آبادی کے اطراف کی ایسی زمینیں جن پر کھلیان وغیرہ لگاتے ہیں، اور ان کا کوئی مالک نہ ہو تو فقہانے لکھا ہے،

ماکان خارج البلدۃ من مرافقھا ومحتطبا لاھلھا او مرعی لھم لا یکون مواتا حتی لا یملک الامام اقطاعھا،

آبادی سے باہر جو سہولت کی چیزیں ہوں اور باشندوں کو لکڑی حاصل کرنے کی جگہ ہو تو یہ ساری چیزیں نہ موات (یعنی ایسی زمین نہیں ہو سکتی ہیں جنھیں آباد کر کے کوئی ان کو ذاتی ملک بنا سکتا ہو) اور نہ امام (حکومت) [illegible]

زیلعی نے اس دفعہ کو نقل کرتے ہوئے یہ لکھا ہے :-

فناء العامر فينتفعون به لا نهو	آبادی کے اطراف واکناف کی زمین کا بھی یہی
محتاجون اليه لرعی مواشيهم و	حکم ہے، کہ عام لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں
طرح حصائدهم فلم يكن انتفاعهم	لوگ اپنی مواشیوں کے چرانے کے لئے اور کھلیان
منقطعا عنه ظاهراً فلا يكون مواتاً	لگانے کے لئے اس کے محتاج ہیں، اور اس قسم
	سے استفادہ کا جو حق ہے، وہ اس قسم کی زمینوں
	سے منقطع نہیں ہوسکتا، اس لئے اس کا
	الموات (آباد کرکے آدمی جس کا مالک ہوسکتا ہو)
(زیلعی برہدایہ ج ۴ ص ۲۰۰)	اس میں شمار نہیں ہوسکتا،

اسلام نے جب ان چیزوں میں انفرادی ملک کو ناجائز ٹھہرایا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ شاہراہ عام یا عام بہائشی کے ذرائع جنھیں یوں بھی پبلک کی ملک خیال کیا جاتا ہے، ان میں انفرادی ملک کو کس طرح جائز قرار دیا جاسکتا ہے، فقہ کی کتابوں میں اس کی صراحت کردی گئی ہے کہ جس طرح مندرجہ بالا امور کو حکومت کسی کی انفرادی ملک نہیں قرار دے سکتی، اسی طرح

لا اقطاعه كشارع الماء وطرقات	جائز نہ ہوگا کہ پانی کے خزانوں اور مسلمانوں
المسلمين،	کی عام شاہراہوں کو حکومت کسی کی جاگیر
(ابن قدامہ ج ۶ ص ۱۵۸)	میں دیدے،

نہ حکومت دے سکتی ہے، اور نہ آبادی کے باشندے ان پر قبضہ کرکے اپنی ملک بنا سکتے ہیں، کفایہ شرح ہدایہ میں ہے :-

ولكن لا يجوز احياء ما تعلق به حق	یوں ہی آباد کرکے قبضہ کرنے کی اجازت ان

العامة کما فی النهر والطریق،	چیزون کے متعلق بھی نہین دیجا سکتی جن کے ساتھ عوام کا حق متعلق ہو، مثلاً نہر اور راستہ کا جو حکم ہے،

(ج ۴ ص ۳۸۲)

خلاصہ یہ ہے کہ پانی، آگ، گھاس، اور ایسے معادن جن کی پیداوار کے حاصل کرنے مین کسی محنت و مشقت، جدّ وجہد اور مصارف کی ضرورت نہین ہوتی، اور عام لوگون کی ضرورت کی چیزین ان سے برآمد ہوتی ہون، آبادی کی چراگاہین جنگل جھاڑ، جن کا کوئی مالک نہ ہو، آبادی کے اطراف کی وہ زمین جس میں آباد کار اپنے زرعی کاروبا کرتے ہون، مثلاً کھلیان وغیرہ لگاتے ہون، یا شوارع عام (عام راستے) یا آبپاشی کے عام خزانے وغیرہ ایسی چیزین نہ حکومت کسی کو انفرادی طور پر ان کا مالک بنا سکتی ہے، اور نہ قبضہ کرکے خود کوئی ان کو اپنی انفرادی ملک بنا سکتا ہے، اگر کوئی قبضہ بھی کرے گا تو قانوناً غلط ہوگا، اور ہمیشہ یہ پبلک جائداد ہی سمجھی جائے گی، گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام ان امور کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اشتراکی رکھتا ہے اجمالی طور پر توان امور کا یہی حال ہے لیکن فقہاء نے ان کی مختلف قسمون پر غور کیا ہے، اور بعض چیزوں کو اشتراک کے اس حکم سے مستثنیٰ بھی کیا ہے، مثلاً پانی کی انھون نے چار قسمین قرار دی ہین، صاحب بدائع لکھتے ہین،

پانی کی مختلف قسمین اور ان کے مختلف احکام | صاحب بدائع لکھتے ہین :-

المیاہ اربعۃ انواع الاول	پانی کی چار قسمیں ہین، پہلی قسم پانی کی وہ ہے
الماء الذی یکون فی الاوانی	جو برتنون اور ظروف میں ہو، دوسری قسم وہ
والظروف والثانی الذی یکون	ہے جو کوئن اور حوضون اور چشمون مین ہو،
فی الآبار والحیاض والعیون	تیسری قسم وہ ہے جو ان چھوٹے دریاؤن اور
الثالث ماء الانهار الصغار التی	ندیون مین ہو جن کا تعلق خاص خاص قومون
تکون لاقوام مخصوصین والرابع ماء الانهار	سے ہو، چوتھی قسم وہ ہے جو بڑے بڑے دریا، جیسے

العظام کجیحون وسیحون ودجلہ والفرات — جیحون اور سیحون، دجلہ و فرات وغیرہ میں ہو،

بڑے دریا کا پانی | پانی کے ان چار اقسام کے متعلق بالاتفاق سب کا یہ مذہب ہے، کہ جو پانی بڑے بڑے دریا جیحون، سیحون یا ہندوستان میں گنگا جمنا، کرشنا گوداوری کا ہے، یہ ملک کے تمام باشندون کا پانی ہے، ہر شخص کو اس سے خود پینے کا، جانورون کو پلانے کا اور کھیتون باغون کے سینچنے کا قانونی حق ہے، صاحب بدائع لکھتے ہین

الانہار العظام کسیحون وجیحون ودجلۃ والفرات ونحوھا فلا ملک لاحد فیھا ولا فی رقبتہ النھر ولا لاحد حق خاص فیھا ولا فی الشرب بل ھو حق عامۃ المسلمین. فلکل احد ان ینتفع بھذہ الانھار بالشفۃ والسقی،	بڑے بڑے دریا مثلاً سیحون اور جیحون دجلہ و فرات اور اسی قسم کے جو دریا ہین، یہ کسی کی ذاتی ملک نہین بن سکتے نہ ان کے پانی کا کوئی ذاتی مالک ہوسکتا ہے، اور نہ اس رقبہ زمین کا جس میں ان دریاؤن کا پانی بہتا ہے، اور نہ کسی خاص شخص کا ان کے ساتھ کوئی ذاتی حق متعلق ہوسکتا ہے، نہ آبپاشی کا ذاتی حق ان دریاؤن کے متعلق کسی خاص شخص کو حاصل ہوسکتا ہے، بلکہ یہ عام مسلمانون کا حق ہے، اسی لئے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ ان دریاؤن سے وہ نوشیدنی اور سیرابی دونون قسم کے منافع اٹھا سکتا ہے،

دریاؤن سے نہر نکالنا | صرف یہی نہین بلکہ ان دریاؤن سے نہر کاٹ کر اگر کوئی اپنی زمین مین لائے، اور کسی دوسرے کی زمین اس کے اس فعل سے برباد نہ ہوتی ہو یا باشندگان ملک کو اور کسی قسم کا نقصان نہ پہونچتا ہو تو کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ نہر کھودنے سے اس کو روکے حتی کہ حکومت بھی یہ نہین کرسکتی،

بدائع مین ہے :-

له ان يشق اليها نهرا من هذه الانهار وليس للامام ولا لاحد منعه عنه يضرها ولم يضر،

اس کا بھی ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنی زمین تک ان دریاؤن سے نہر کاٹ کر لیجائے، اور نہ امام (حکومت) ہی کو اس کا حق ہے، اور نہ کسی اور کو کہ اس فعل سے اس کو روکے بشرطیکہ اس نہر کی وجہ سے کسی کو ضرر نہ پہونچے،

ان دریاؤن کے پانی کی قوت سے چکی وغیرہ چلانا یا موٹ چرس ان پر قائم کرنا

اسی طرح ہر باشندۂ ملک کو اس کا بھی حق ہے کہ اس قسم [illegible] اور ندیون پر،

ان ينصب عليه رحى ودالية وسانية (ہدایہ)

کہ ان پر پن چکی اور رہٹ موٹ وغیرہ قائم کرے،

البتہ حکومت اور پبلک دونون کو اس کا حق ہے کہ اس کے ان افعال سے خود نہر یا دریا کو کوئی ز[illegible] اس کی نگرانی کرین، ہدایہ ہی مین ہے :-

فكان لكل واحد بسبيل من الانتفاع لكن بشريطة عدم الضرر بالنهر كالانتفاع بطريق العامة وان اضر بالنهر فلكل واحد من المسلمين منعه،

اگرچہ ہر شخص کو نفع گیری کا حق حاصل ہے بشرطیکہ اس کی نہر کی وجہ سے کسی کا کچھ نقصان نہ ہو، وہی حکم اس کا بھی ہے جو عام شاہراہون کا، لیکن اگر اس کی نہر سے نقصان پہنچتا ہو تو مسلمان کو حق ہے کہ اس فعل سے اس کو روک دے

دریاؤن کے سوا پانی کے اقسام

اسی طرح پانی کی دوسری اور تیسری قسم یعنی مخصوص افراد کی زمین مین جو ہین، یا مملوکہ زمینون کے تالاب اور کنوؤن کا پانی اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ

حق الشفعة ثابت،

نوشیدنی کا حق پبلک کے ہر فرد کو اس مین حاصل

یعنی خود پینے یا اپنے جانوروں کو پانی پلانے کا حق تو اب بھی عام پبلک کو حاصل ہے، البتہ چونکہ مملوکہ زمینوں سے اس پانی کو تعلق ہے، اس لئے زمین کے مالکوں کی اجازت کے بغیر دوسروں کو اس پانی سے باغوں یا کھیتوں کے سینچنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، ہدایہ میں ہے،

فان اراد رجل ان یسقی بذالک	اگر کوئی اپنی آباد کردہ زمین کو اس قسم کے پانی
ارضا احیاھا کان لاھل النھر ان	سے سینچنا چاہے، تو نہر والوں کو حق ہے کہ اس
یمنعوہ عنہ اضربھم اولم یضر (ہدایہ جلد ۴ ص ۳)	کو روک دیں، خواہ نقصان ہو یا نہ ہو،

نہروں کنوؤں تالابوں اور پانی کے فروخت کا حکم | مگر باین ہمہ اس قسم کے پانی کے بیچنے یا اجارہ کی بھی اجازت نہیں ہے، فقہا اس باب میں ایک حدیث بھی نقل کرتے ہیں کہ

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کنوؤں
عن بیع نقع البیر،	کے سوت کے پانی کو کوئی فروخت کرے،

"نقع البیر" کا ترجمہ صاحب بدائع نے "فضل مائھا" یعنی کنوؤں کا زائد از ضرورت پانی کیا ہے، بہرحال اس حدیث کی وجہ سے پینے پلانے سے تو کسی کو کوئی روک نہیں سکتا، لیکن اگر ہر شخص کو ایسی نہروں یا تالابوں یا باولیوں سے آبپاشی کی عام اجازت دے دی جائے گی، تو جیسا کہ صاحب بدائع لکھتے ہیں،

کل احد یتبادر الیہ فیسقی منہ	ہر شخص پیش قدمی کرکے اس پانی سے نفع اٹھانا
زرعہ واشجارہ فیبطل حقہ	چاہے گا، اور اس سے اپنے کھیت اور باغ کو
اصلا،	سیراب کرے گا، بس نہر والوں کا حق مارا جائیگا

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے پانی میں اشتراکیت کا نظریہ صرف "حق الشفۃ" یعنی نوشیدنی تک محدود ہے پھر فقہا نے اس کی مختلف شکلوں کے احکام بھی لکھے ہیں، مثلاً اگر کنواں یا تالاب کا مالک پبلک کو اپنی زمین سے آنے سے روکے، اور کہے کہ تو نہ پانی پر تمہارا حق ہے، لیکن میری مملوکہ زمین کے احاطہ میں داخل ہونے کی تو اجازت نہیں

تو ایسی صورت مین دیکھا جائے گا اگر تو شیدنی کی ضرورت پبلک کسی اور ذریعہ سے پوری کر سکتی ہے، تو جھگڑنے کی حاجت نہین
لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر کنوؤن کے مالک کو مجبور کیا جائے گا، کہ یا تو وہ لوگون کو اپنے کنوئین سے پانی لینے دے
ورنہ کوئی نظم کرے کہ لوگون تک ان کا قانونی حق پہنچ جائے یعنی ادن کے اور ان کے جانورون تک پانی پہونچ جائے
اس حق پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ دونون باتون مین سے کسی پر راضی نہ ہو تو پبلک کو حق ہے کہ باضابطہ مسلح ہو کر اس سے
جنگ کرے، اور اپنا حق حاصل کرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے مین اسی قسم کی ایک صورت پیش آئی تو آپ نے فرمایا،

هلا وضعتم فيهم السلاح (بدائع) — تم نے لوگون کے درمیان ہتھیار کو کیون نہ ڈالا

پانی کی وہ قسم جو بک سکتی ہے | یعنی پانی کی چوتھی قسم یعنی جب برتنون یا مشکون مین پانی بھر لیا گیا ہو تو اس قسم کے پانی
مین انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے، صاحب بدائع لکھتے ہین کہ اب اس پانی کی حیثیت ایسی ہو گئی کہ

كما استولى على الحطب والحشيش والصيد، — کوئی (جنگل) کی لکڑیون اور گھانس اور شکار پر قابو پائے (تو وہ اس کی ملک بن جاتا ہے)

کہ ان چیزون سے استفادہ کا حق اگرچہ پبلک کے ہر فرد کو حاصل ہے لیکن جب ان پر کسی کا قبضہ ہو گیا تو
قبضہ کرنے والے کی وہ ملک ہو جاتی ہین، اسی طرح برتن اور مشک کا پانی بھی مملوک ہو جاتا ہے،

فيجوز بيعه، — اور ایسی صورت مین (مشک و برتن وغیرہ) کے پانی کا فروخت کرنا بھی جائز ہے)

اس قسم کے پانی کی بیع و فروخت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ

السقاؤن يبيعون المياء المحرزة في الظروف بجرت العادة في الامصار في سائر الاعصار من غير نكير، (بدائع)

برتنون میں جس پانی کو محفوظ کر لیا گیا ہو، اس کو بہشتیون کی جماعت ہمیشہ بیچتی رہی ہے، تمام شہرون اور ملکون میں اس کا عام رواج ہے اور کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا،

اس لئے اس پانی کے متعلق حکم ہے کہ

فلم یحل لاحد ان یاخذ منه شیئاً بغیر اذنه، — جائز نہ ہوگا کہ پانی کے مالک کی اجازت کے بغیر کوئی اوس کو لے اور پیئے،

البتہ ایسی صورت مین کہ پیاس سے کسی کی جان پر بن آئے، اور دوسرے کے برتن مین زائد از ضرورت پانی ہو تو غیر مسلح لڑائی کرکے پانی زبردستی چھین کر پی سکتا ہے،

شدید ضرورتوں کی چیزوں مین اشتراکیت کا نقطۂ نظر

اور یہ حکم کچھ پانی کے ساتھ مخصوص نہین ہے، بلکہ ہلاکت کے اندیشہ کی صورت مین زائد از ضرورت چیز دوسرے سے آدمی زبردستی چھین کر استعمال کرسکتا ہے، خواہ کھانا ہو یا اسی قسم کی دوسری چیز، ہدایہ مین ہے کہ

وکذا الطعام عند اصابة المخمصة (جلد ۴ ص ۳۸۴) — یعنی یہی حکم کھانے کا بھی ہے شدت بھوک مین

مملوکہ پانی مین بھی اشتراکیت کا اثر

لیکن پانی برتن ہی والا کیون نہ ہو، حدیث مین چونکہ (الماء) مطلق پانی مین عام لوگون کو شریک قرار دیا گیا ہے، اس لئے فقہاے اسلام نے یہ فیصلہ کیا ہے، کہ بلا ضرورت اگر کسی کی مشک یا برتن سے آدمی پانی چرالے تو چوری کی شرعی سزا قطع ید کا حکم اس پر نہ لگایا جائے گا، خواہ اس پانی کی قیمت اسی قدر کیون نہ ہو، جس کے چرانے پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے، ہدایہ مین ہے،

لو سرقه انسان موضع یعز وجوده وهو یساوی نصاباً لم تقطع یده (کتاب الشرب جلد ۴ صفحہ ۳۸۶)

اگر کسی ایسے مقام مین جہان پانی مشکل سے میسر آتا ہو، اور اگر کوئی (برتن کا) پانی چرائے تو چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا، خواہ پانی کی قیمت اسی قدر کیون نہ ہو جس پر ہاتھ کٹتا ہو،

کیونکہ بہرحال ایک گونہ شرکت کا شبہہ اس مین پیدا ہوگیا ہے، اور شبہہ سے اس قسم کی سزائین ٹل جاتی ہین،

مچھلیون کا حکم پانی ہی کی ذیل مین مچھلیون کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ جس طرح ہوا کے پرندو
کا کوئی مالک نہین ہے، اور جو ان پر قبضہ کرے گا، وہی مالک ہو جاتا ہے محض اس لئے کہ کسی کے تالاب یا باغ یا کھ
مین یہ پرندے چرتے چگتے ہین، یا رہتے ہین، یا آتے جاتے ہین، کوئی اُن کو فروخت نہین کر سکتا، حتی کہ حکومت کو بھ
اس کا اختیار نہین ہے، کہ اس قسم کی خشکی یا تری کے جانورون کو کسی کی انفرادی ملکیت قرار دے عنا
شرح ہدایہ مین ہے،

الامام لا یملك ان یخص واحداً	امام (حکومت) کو اس کا اختیار حاصل نہین
دون واحد بذلك حتی لو امر احداً	ہے، کہ کسی خاص شخص کو ان جانورون کی خصوصی ملکیت
ان یاخذ شیئاً............	عطا کرے تا آنکہ اگر کسی کو امام حکم دے کہ فلان
...........صید البلد	خاص شکار کو پکڑے خواہ خشکی کا ہو یا دریا کا،
من بر او بحر لا یملك المامور قبل	تو جسے حکم دیا گیا ہے وہ شکار پکڑنے سے پہلے
الاخذ الاصطیاد (ہدایہ ج جلد ۹ ص ۳۰)	اس شکار کا مالک نہین ہوسکتا،

سوال ہوتا ہے کہ جب ہوا کے جانورون کا یہ حکم ہے تو مچھلیان جن کی حیثیت پانی مین وہی ہے جو ا
وحشی پرندون کی ہوا مین ہے، ان کو بھی کوئی بیچ سکتا ہے یا نہین، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج مین
خاص باب اس مسئلہ مین باندھا ہے، خود ان کا اور امام ابو حنیفہ وغیرہ کا خیال یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز
لیکن اس کی وجہ یہ نہین ہے، کہ یہ غیر مملوک شئ کی بیع ہے، بلکہ ممانعت کا سبب یہ بتایا گیا ہے، کہ خریدار
دھوکہ کھا جانے کا اندیشہ ہے کہ پانی کے اندر کا حال اس کو کیا معلوم ہو سکتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تع
سے یہ فتوی قاضی صاحب نے نقل کیا ہے کہ

لا تبایعوا السمك فی الماء فانه	مچھلی کو پانی کے اندر نہ بیچا کرو کہ اس میں
غرر،	دھوکہ ہے،

اسی قسم کے الفاظ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہیں لیکن اسی کے مقابلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اسی کتاب الخراج میں یہ بھی مروی ہے کہ رس نامی مقام میں جو مین میں واقع ہے،

انہ وضع علی اجمۃ برس اربعۃ آلاف درھم وکتب لھم کتابا فی قطعۃ ادم	رس نامی مقام کے اجمہ (آبی نیستان) پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چار ہزار درہم مشخص فرمایا اور چمڑے کے ایک ٹکڑے پر ان کو اس کا پٹہ لکھ کر دیا، (اجمہ کے لفظ کی تحقیق آگے آرہی ہے)

(کتاب الخراج ص۹۵)

صرف یہی نہیں کہ حکومت نے اس خزانہ آب کو چار ہزار درہم میں بندوبست کیا، بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے بھی اسی کتاب میں یہ مروی ہے کہ عبد الحمید بن عبد الرحمن نے جو ان کے صوبہ دار تھے انھوں نے

یسئلہ عن بیع صید الآجام	آجام (آبی نیستانوں) کے شکار کے متعلق دریافت کیا کہ کیا ان کو فروخت کیا جائے،

جواب میں عمر بن عبد العزیز نے فرمان بھیجا،

ان لاباس بہ وسماہ الحبس	اس کے فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اس کا نام انھوں نے حبس رکھا،

(کتاب الخراج ص۱۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالاب کی مچھلیوں کے متعلق ابتدا سے کچھ اختلاف چلا آتا ہے، خود قاضی ابو یوسف نے بھی لکھا ہے، کہ اگر کسی ایسے گڑھے میں مچھلی ہو جو بغیر شکاری تدبیروں کے ہاتھ آجائے تو اوس کے بیچنے میں حرج نہیں بلکہ آگے بڑھ کر ان کے الفاظ یہ بھی ہیں،

ومثلہ اذا کان یوخذ بغیر صید کمثل سمک فی الجب۔	اور یہی حال ان مچھلیوں کا ہے، جو بغیر شکاری تدبیروں کے پکڑی جاتی ہوں، جیسا کہ ان مچھلیوں کا بیچنا جائز ہے، جو کنوئیں میں ہوں

(کتاب الخراج ص ۵۰)

ان تمام اقوال کے دیکھنے سے فیصلہ کی صورت یہی معلوم ہوتی ہے، کہ سمندروں، دریاؤں، ندیوں وغیرہ کی مچھلیاں جو بند اور محدود پانی میں نہیں رہتی ہیں، ان کو نہ حکومت بیچ سکتی ہے، اور نہ شکار کرنے سے پہلے کوئی اور بیچ سکتا ہے، بلکہ وہ عام پبلک کی چیز ہے، ملک کے ہر باشندہ کو ان کے شکار اور ان سے استفادہ کا حق ہے،

البتہ اگر محدود اور بند پانی مثلاً تالابوں وغیرہ میں ہوں تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کے مطابق ان کے فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں، خصوصاً ایسی مچھلیاں جنھیں اس زمانہ میں لوگ اپنے مخصوص تالابوں میں خرید کر پالتے ہیں یعنی ان کے بچے جنھیں زیرہ کہتے ہیں، خرید کر تالابوں میں چھوڑ دیتے ہیں، چونکہ قبضہ کرنے اور مملوک بنانے کے بعد ان کو تالابوں میں چھوڑا جاتا ہے، بظاہر ان کے فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آبادیوں کے اطراف و جوانب کے تالابوں یا جوہڑوں میں جو قدرتی خود زائیدہ مچھلیاں پائی جاتی ہیں، اگر زمیندار اور جاگیرداران کو گاؤں کے عام باشندوں کو شکار کر لینے کے بغیر کسی معاوضہ کی اجازت دیدیا کریں تو کم از کم حنفی مذہب کے رو سے اسلام نے عوام کا جو معاشی حق قائم کیا ہے، اس سے محروم کرنے کے وہ مجرم نہ ہوں گے۔

مچھلیوں کے سوا دوسری آبی پیداواروں کا حکم

مچھلیوں کے ساتھ سمندر، دریا، ندی وغیرہ کی دوسری پیداواروں کا بھی سوال اسلامی فقہ میں اوٹھایا گیا ہے، ہمارے امام ابو حنیفہ کا تو کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ خواہ جس قسم کی چیز بھی ہو اس کی کتنی ہی قیمت ہو مثلاً عنبر ہو یا موتی ہو، یا اس کے سوا کوئی اور چیز ہو، سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے، یعنی ملک کے عام باشندوں کا وہ مشترک سرمایہ ہے جس کا جی چاہے انھیں نکال سکتا ہے اور فائدہ اوٹھا سکتا ہے حکومت تک کو اس سے کسی قسم کے محصول لینے کا حق نہیں ہے، قاضی ابو یوسف نے اس کا بھی کتاب الخراج میں ایک مستقل باب باندھا ہے، اور لکھا ہے کہ

قد کان ابو حنیفۃ و ابن ابی لیلیٰ	ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں کا خیال تھا
یقولان لیس فی شیءٍ من	کہ سمندری پیداواروں (مثلاً عنبر موتی وغیرہ)
ذالک شیءٌ لانہ بمنزلۃ	میں سے کسی پر کوئی محصول یا ان کی قیمت نہیں

(المستملک، وصول کیا سکتی ان سب کا وہی حکم ہوجو مچھلیوں کا ہو،

لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک فرمان کی بنا پر قاضی ابویوسف نے

خود یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ دریا کی وہ چیزین جو بطور زیور یا خوشبو کے استعمال ہوتی ہین، (مثلاً موتی مرجان

عنبر وغیرہ) اس حکم سے مستثنیٰ ہین، ان کا خیال ہے کہ

فی ذالک خمس واربعۃ اخماسہ لمن — حکومت ان پیداوارون سے خمس (پانچواں حصہ)

اخرجہ، — وصول کرے گی، اور باقی چار خمس (پنج) اس

شخص کے ہون گے جس نے اسے نکالا۔

لیکن ان کے سوا اور تمام چیزون کے متعلق ان کا بھی وہی خیال ہے جو امام کا ہے خود فرماتے ہین:۔

امّا فی غیرھا فلا شیء فیہ، — جو چیزین بطور زیور (حلیہ) اور خوشبو کے

استعمال ہوتی ہین، ان کے سوا سمندر کی اور

چیزون پر کچھ نہین ہے

حضرت عمرؓ کے جس فرمان سے اونھون نے حلیہ اور عنبر کو مستثنیٰ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ یعلیٰ بن امیہ کو

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحر (سمندر) کے علاقون یا بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ یعلیٰ نے بارگاہ خلافت

میں یہ لکھ کر پوچھا،

عنبرۃ وجدھا رجل یسئلہ — عنبر (مچھلی جس سے عنبر نکلتا ہے) ایک شخص کو ملی ہو

عنھا وعما فیھا — وہ اس مچھلی اور جو کچھ اس کے اندر سے برآمد ہوگا

اس کے متعلق پوچھتا ہے،

جواب مین یہ فرمان گیا کہ

فیما اخرج اللہ جلّ شانہ منَ — سمندر سے اللہ تعالیٰ جن چیزون کو برآمد کرتے ہین

الخمس (کتاب الخراج)	ان میں خمس (پانچواں حصہ) حکومت کا حق ہے،

اس فرمان کے راوی ابن عباسؓ ہیں، خود بھی فرماتے ہیں:-

وذالک رائی،	اور میری بھی یہی رائے ہے،

بہرحال یہ سارے مباحث تو الماء (یعنی پانی) کے تھے، جس میں آنحضرت ﷺ نے ملک کے عام باشندوں کو شریک قرار دیا ہے، گزشتہ بالا مسائل گویا اسی اشتراکی نظریہ کی تفصیل تھی،

سیال معدنیات کے احکام پانی اور پانی کے خزانوں اور چشموں کے ذیل میں چونکہ بعض سیال "معادن" کو فقہائے اسلام نے اسی ذیل میں شمار کیا ہے، حتی کہ قاضی ابو یوسف نے تو کتاب الخراج میں صاف طور پر لکھدیا ہے کہ

لیس فی النفط والقیر والزئبق و	جہاں تک میں جانتا ہوں مٹی کے تیل (نفط)
المومیا ان کان لشیئ من ذالک	اور قیر (تارکول) مومیائی میں کچھ نہیں ہے
عین فی الارض شیئ نعلمہ کان	بشرطیکہ زمین سے ان کا کوئی چشمہ ابلتا ہو
فی ارض عشرٍ او فی ارض خراج	خواہ یہ چشمے عشری زمین میں ہوں یا
(کتاب الخراج ص ۹۲)	خراجی زمین میں،

لیکن یہ ایک اجمالی بیان ہے ورنہ جیسے پانی کے مختلف اقسام کے مختلف احکام تھے، ان معدنی چیزوں کا بھی یہی حال ہے گنجایش کی حد تک ضروری مسائل درج کئے جاتے ہیں، اس مسئلہ کا پہلے بھی کچھ ذکر آچکا ہے لیکن اس وقت ہم اس کو شرح الکبیر للمقنع الحنبلی سے نقل کرتے ہیں، اس میں ہے:-

لا تملک المعادن الظاهرة	ایسے معادن جنھیں معادن ظاہرہ کہتے ہیں،
کالملح والقار والکحل والجص	مثلاً نمک اور قار (تارکول) سرمہ، گچ نفط (مٹی
والنفط بالاحیاء ولیس للامام	کا تیل) وغیرہ کے بعد معدنوں کا کوئی شخص
اقطاعه (ج ۶)	ذاتی طور پر مالک نہیں ہو سکتا، نہ احیاء اور آباد

ترجمہ: کرکے ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے اور نہ حکومت
کو حق ہے، کہ کسی خاص شخص کی شخصی جاگیر میں دے۔

یہ تو متن کی عبارت ہے شرح اس کی یہ کی گئی ہے کہ

المعادن الظاهرة وهي التي
يوصل الى ما فيها من غير
مؤنة ينتابها الناس وينتفعون
بها كالملح والكبريت والقير
والمومياء والنفط والكحل والياقوت
ومقاطع الطين واشباه ذالك
لا يملك بالاحياء ولا يجوز
لاحد من الناس ولا احتجازه
دون المسلمين لان فيه ضرر
المسلمين وتضييقا عليهم،

ایسے معادن جو ظاہری معادن کہلاتے ہیں
جن کی تعریف یہ ہے کہ ان تک بغیر کسی
محنت و مشقت کے رسائی ہوتی ہو، لوگوں
کی اس پر آمد و رفت جاری ہو، اور اس سے
عام لوگ نفع اٹھاتے ہوں، مثلاً نمک گندھک
قیر، (تارکول) مومیائی نفط (مٹی کا تیل)
سُرمہ، یاقوت، مٹی نکالنے کی جگہ (سنگودر) اد
اسی قسم کی چیزیں آباد کرکے بھی کوئی ان کا مالک
نہیں ہو سکتا، اور نہ کسی کے لئے ایسا کرنا جائز
ہے، اور نہ یہ درست ہے کہ عام مسلمانوں
کو ان سے استفادہ سے روکا جائے کیونکہ
مسلمانوں کا نقصان ہے، اور ان پر تنگی و
ضیق عائد کرنا ہے، (باقی)

(المغنی لابن قدامہ ج ۶ ص ۱۵۷)

کلام اقبال کی دقیتن

اور

ان کی تشریح کی ضرورت

از

جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ لکچرار یونیورسٹی، اورنٹیل کالج، لاہور

(۲)

اقبال کے اہم علمی مسائل کی تشریح — مطالعۂ اقبال سے پہلے بطور تمہید، مقدمے یا دیباچے کی صورت مین ان اہم علمی مسائل کا مختصر اور سادہ تجزیہ ہونا چاہئے، جن سے پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ بلکہ سب کتابین لبریز ہین حکماے مشرق کی طرح اقبال نے حکماے مغرب سے بھی بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، اس لئے کلام اقبال مین جابجا مشرقی اور مغربی حکمت کے بعض مسائل کی طرف اشارات ہین، بعض اشعار مین کسی اسلامی یا مغربی حکیم کی پوری حکمت کا خلاصہ بیان ہوا ہے، کہیں کہیں خاص خاص علمی اصطلاحات ہیں، عام مطالعہ کرنے والے عموماً صرف لطف زبان سے لذت گیر ہوکر آگے چل دیتے ہین، اور شعر کے اصلی مفہوم سے ناواقف رہتے ہین، اس لئے اس قسم کی علمی اصطلاحون اور فلسفہ وحکمت کے مسائل ونکات کی آسان تشریح ابتدائی لوازم مین سے ہے، اس کی تشریح کے لئے دو مثالین پیش کیجاتی ہین، اقبال نے پیام مشرق کے باب "نقش فرنگ" مین "صحبت رفتگان" کے عنوان سے ایک مکالمہ لکھا ہے جس میں بعض حکماے جدید وقدیم نے اپنے اپنے مسائل کا تذکرہ ایک ایک دو دو شعرون مین کیا ہے، ان میں سب سے پہلے ٹالسٹائے، پھر کارل مارکس، پھر ہیگل، پھر مزدک، اور اس کے بعد کوہکن لب کشا ہوکر اپنا

اپنا فلسفہ بیان کرتے ہین ہیگل کہتا ہے :-

جلوہ دہد باغ و زاغ معنی مستور را — ببین حقیقت نگر حنظل و انگور را

فطرت اضداد خیز لذت پیکار داد — خواجۂ و مزدور را آمر و مامور را

ان اشعار کے ساتھ ہیگل کے مخصوص فلسفۂ جدل و پیکار کی شرح کس قدر ضروری ہو جاتی ہے، اسی طرح ذیل کے اشعار مین برگسان کی حکمت کا جو خلاصہ موجود ہے، اس کو نمایان اور متعین کرنے کی ضرورت ہے،

پیغام برگسان کے عنوان سے یہ اشعار پیام مشرق مین ہین،

تا بر تو آشکار شود راز زندگی — خود را جدا ز شعلہ مثال شرر مکن

بہر نظارہ جز نگہِ آشنا میار — در مرز و بوم خود چو غریبان گذر مکن

نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است

عقلے بہم رسان کہ ادب خوردۂ دل است

آخری مصرع مین برگسان کا فلسفۂ الہام و تجلی بیان ہوا ہے، اس کے سمجھنے کے لئے برگسان کے خیالات کا ایک خلاصہ کتاب میں ہونا ضروری ہے، پیام مشرق مین ایک دوسرے مقام پر حکماے مغرب کی حکمت کا بیان ایک ایک شعر میں ہوا ہے :-

لاک	ساغرش را سحر از بادۂ خورشید فروخت — ورنہ در محفل گل لالہ تہی جام آمد
کانٹ	فطرتش ذوق مئے آئینہ فامے آورد — از شبستان ازل کوکب جامے آورد
برگسان	نہ مئے از ازل آورد، نہ فامے آورد — لالہ از داغ جگر سوز دوامے آورد

اس کے بعد بعض شعراء کے پیغام کی خصوصیت ان اشعار مین بیان ہوئی ہے :-

براؤننگ	بے پشت بود بادۂ سرجوش زندگی — آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم
بائرن	از منت خضر نتوان کرد سینہ داغ — آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب | تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر   بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

رومی | آمیزشے کجا گہر پاک را و کجا   از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

ان اشعار میں ہر شاعر کی شاعری کا لب لباب موجود ہے جس کو مبتدی رہنمائی کے بغیر سمجھنے سے قاصر رہینگے۔ اس کے علاوہ حکمت، فلسفہ، فقر، سیاسیات، اجتماعیات، مذہب اور روحانیت سے متعلق بیسیوں اشارے کلام اقبال میں اس انداز سے آجاتے ہیں کہ ان کی ماہیت معلوم کئے بغیر، مطالعہ کرنے والا آگے نہیں بڑھ سکتا، مثلاً خودی کا سرسری مفہوم، جہاد اور کش مکش کا ابتدائی تصور، فقر اور اس کی عارفانہ تشریح، عشق، جمال اور جلال کی تعبیر، تقدیر اور توحید کے معانی، جمہوریت، آمریت اور اشتراکیت کی مجمل تعریف، فلاسفہ یورپ کے خیالات کا خلاصہ، ان تمام امور مسائل کے تمہیدی پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے، ورنہ اصحاب علم و نظر کے علاوہ، عام مطالعہ کرنے والوں کے بیشتر طبقات کلام اقبال کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ فکر اقبال درحقیقت خواص اور علماء کے غور و فکر کے لئے ہے، عوام تشریح و تعبیر کے بغیر اس سے متمتع نہیں ہو سکتے،

میں اس سلسلے میں ناظرین کرام کو خودی کے تصور کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، تصوف نے ہمیشہ "خود" کو مٹانے اور خودی کو فنا کرنے کی تلقین کی ہے، حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر فرماتے ہیں،

با یار بسے نشین و با خود منشین

لسان الغیب حافظ فرماتے ہیں :۔

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

ہمام تبریزی بھی اس قسم کا خیال ظاہر کرتے ہیں :۔

درمیان من و محبوب حجاب است ہمام   باشد آن روز کہ آن ہم ز میان برخیزد

نفی خودی تصوف کا بنیادی عقیدہ ہے، کیونکہ خودی کا احساس صوفیہ کے نزدیک ایک گناہ ہے:

وَجُودُكَ ذَنبٌ لَا يُقَاسُ بِهٖ ذَنبٌ

اس عقیدے کی بنیاد اس خیال پر قائم ہے کہ انسان دراصل گلشنِ قدس کا ایک پھول تھا، اور ذاتِ باری کا جزء، خداوند تعالیٰ کے شوقِ ظہور نے دنیا کو پیدا کیا، اور انسان کو اس نئی بستی کا حاکم اور مالک بنایا، گویا کُل نے جزو کو عارضی طور پر اپنے آپ سے الگ کر دیا، اب یہ جزو کل سے ملنے کے لئے بیقرار ہے، جب تک حجابِ جسمانی موجود ہے، یہ جزو کل سے ہم کنار نہیں ہو سکتا، لہٰذا صوفیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خود کو مٹانا ہی تمام مسرتوں کا سرچشمہ اور راحتوں کا منتہا ہے، اس خیال کو تمام صوفی شعراء بڑی قوت اور بڑے جوش کے ساتھ ظاہر کرتے آئے ہین،

خواجہ حافظؔ فرماتے ہین :-

من ملک بودم و فردوس برین جایم بُو　　　آدم آورد درین دیرِ خراب آبادم

نظیریؔ کی پہلی غزل بھی اسی مضمون کی حامل ہے۔

درآن گلشن ہوا بودم کہ مستی زاد از نرگس　　　دراں مجلس صفا بودم کہ عشق از حسن شد پیدا

بزحمت اتصال افتد چو پیوندے برید از ہم　　　کہ بفرصت قطرہ دریا می شود چون قطرہ شد دریا

رومیؔ کی مثنوی کے ابتدائی اشعار کا مضمون بھی یہی ہے،

از نیستان تا مرا ببریدہ اند　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ دارم شرحہ شرحہ از فراق　　　من چہ گویم شرح دردِ اشتیاق

تصوف کے اس عقیدے کا اثر اس قدر گہرا اور ہمہ گیر ہے کہ خود علامہ اقبالؔ نے اپنی ابتدائی نظمون مین یہ رنگ قبول کیا، اور یہی صوفیانہ لَے نکالی، چنانچہ ایک نظم میں فرماتے ہین،

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی　　　شامِ فراق صبح تھی میری نمود کی

وہ دن گئے کہ قید سے مین آشنا نہ تھا ۔۔۔ زیب درخت طور میرا آشیانہ تھا ۔۔۔ وغیرہ

اس سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ خود کو جو کل وجز دین تفریق کا سبب ہو مٹانا تصوف کے مسائل مہمہ مین سے ہے، اس کے برعکس اقبال نے خودی اور بیخودی کا ایک نیا تصور ہمارے سامنے رکھا ہے، جس کا مفہوم معاشیاتی، نفسیاتی، سیاسی یا عمرانی ہے، اسرار خودی سے لیکر ارمغان حجاز تک سب کتابون مین یہ تصور روح روان کا درجہ رکھتا ہے، جس طرح گوشت کو ناخن سے جدا نہین کیا جا سکتا، اسی طرح تصور خودی کو اقبال کے نظام فکر سے الگ نہین کیا جا سکتا، خودی کا یہ تصور بظاہر تصوف کے عقیدہ خودی کے بالکل ضد ہے، اگر صوفی خود کو مٹا کر کمال کی معراج پر پہنچنے اور پہنچانے کا مدعی ہے، تو اقبال خودی کی تربیت کے ذریعے شرف انسانیت کو اعلیٰ مدارج سے روشناس کرانے کا دعوے دار، ایک کے نزدیک خودی کی موت میں حیات ہے اور دوسرے کے نزدیک خودی کی تربیت مین زندگی اور اس کی موت مین ممات ہے، یہ ایک تضاد ہے، اور بہت بڑا تضاد ہے جس کو رفع اور دونون مسائل کا ابتدائی تجزیہ کرنا مطالعہ اقبال کی تسہیل کے لئے ضروری مبادی میں سے ہے،

مندرجہ بالا تصریحات سے ایک اور ضروری سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اقبال تصوف کو کس نظر سے دیکھتے ہین، کلام اقبال کے ناقص مطالعہ کی وجہ سے ایک خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ اقبال تصوف کے مخالف تھے، لیکن کیا یہ خیال صحیح ہے ؟ مین سمجھتا ہون کہ مروجہ تصوف کے بعض بیمار اور ناقص پہلوؤن سے قطع نظر ہماری تہذیب اور ہمارے علوم بہت بڑی حد تک صوفیون کے اثرات حسنہ کے رہین منت ہین یہان تک کہ علمائے ظاہر نے مذہب اور دین کی جتنی خدمت کی ہو صوفیائے کرام نے کسی طرح اس سے کم خدمت انجام نہین دی، اونھون نے لوگون کو ایمان وایقان کی دولت سے بہرہ ور کیا ہے، یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ امام ابن تیمیہ جو تصوف کے بڑے مخالف خیال کئے جاتے ہین وہ بھی علامہ ابن قیم کے بقول تصوف کی روح کے منکر نہ تھے، (ملاحظہ ہو اغاثۃ اللھفان اور مدارج السالکین)

پھر کیا علامہ اقبالؔ اس تصوف کے مخالف ہو سکتے ہیں ؟ میرے خیال میں اقبالؔ کے متعلق یہ راے قائم کر لینا کسی طرح بھی درست نہیں، لیکن مسائل اقبالؔ کی تنقیدی تشریح کے بغیر اس قسم کی بیسیوں غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے،

علامہ اقبالؔ تمام برگزیدہ صوفیوں کے مداح تھے، اور ان میں بعضوں کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے جو ان کے کلام میں موجود ہے، لیکن آخری عمر میں منصور حلاجؔ کی نسبت اُن کا جذبہ تحسین بہت بڑھ گیا تھا، اس کی کتاب کتاب الطواسین اقبالؔ کی محبوب کتابوں میں سے تھی، یہ امر بھی دوسرے بہت سے مسائل کی طرح قابلِ تشریح ہے، کہ اقبالؔ اپنی شخصیتوں میں منصور کو اتنا اہم درجہ کیوں دیتے ہیں ؟

میں نے اقبالؔ کے مسائل مہمہ کی تشریح کے سوال کو اس لیے زیادہ اہمیت دی ہے کہ ان کے صحیح اور معین تصور کے بغیر فکر اقبالؔ مبہم ہو کر رہ جاتا ہے، اور مطالعہ کرنے والے سب کچھ پڑھ چکنے کے بعد بھی کہتے ہیں

ع حیرت اندر حیرت است و مشکل اندر مشکل است

اقبال کے سرچشمہ ہاے فیض | علامہ اقبالؔ نے جن مآخذ سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کی فہرست طویل ہے، ان مآخذ میں کلام اللہ اور سنت رسول اللہ کے علاوہ بہت سے قدیم و جدید اسلامی و مغربی مفکرین کی کتابیں بھی شامل ہیں، مگر اس وسیع استفادے کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا، کہ اقبالؔ نے اپنی حکمت کی اساس اسلام کے عقائد اصولیہ اور حکماے اسلام کی حکمتِ عالیہ پر رکھی ہے، Humphry Trevelyan نے اپنی کتاب "Popular Background to Goethe's Hellenism" میں گوئٹے کے متعلق لکھا ہے:-

"For good or ill, Goethe could not get away from the Greeks" (Introduction, ix)

حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے کو حکماے یونان سے جو وابستگی تھی، اس سے ہزاروں درجہ زیادہ وابستگی اقبالؔ کو

فکرِ اسلامی سے تھی، انھون نے ۱۹۲۶ء میں علوم اسلامیہ کے نصاب کے متعلق صاحبزادہ آفتاب احمدخان مرحوم کے نام جو خط لکھا تھا، اوس سے ایک طرف ان کی اس محبت اور شیفتگی کا پتہ چلتا ہے، جو انہین علوم اسلامیہ سے تھی، اور دوسری طرف اس ذہنی اور مذہبی نصب العین کی تعیین ہوتی ہے، جو علامہ کے پیش نظر تھا، وہ چاہتے تھے کہ اسلامی تمدن اور موجودہ علوم کے درمیان حیاتِ دماغی کے تسلسل کو قائم رکھا جائے، اور دماغی اور ذہنی کاوشس کو ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے، اور ایک نئے دینیات وکلام اور حکمت کی تعمیر و تشکیل مین اس کو بروئے کار لایا جائے، اس غرض کے لئے اونھون نے جن جن شعبون کے قیام کی تجویز پیش کی ہے اور جن جن کتابون کے نام گنائے ہین، ان سے علامہ کی پسند و ناپسند کا بخوبی پتہ چلتا ہے، علامہ کے خیال مین ان علوم کے بغیر نہ ملت کی روحانی ضرورتین پوری ہوسکتی ہین، نہ نئی نسلون کا ذہنی اور روحانی مطمح نظر ہی معین ہوسکتا ہے، اور نہ کسی خالص اسلامی تہذیب اور نظامِ فکر کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، علامہ نے اپنی زندگی مین اس نصب العین کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کی، ان کے افکار اور کلام مین علوم اسلامیہ کا بہترین خلاصہ موجود ہے، جو شاعرانہ زبان مین ہونے کی وجہ سے اگرچہ تلمیحی اور ایمائی حیثیت رکھتا ہے لیکن اربابِ فکر ان اشارات و کنایات کو کسی قدر کوشش کے ساتھ پوری طرح پھیلا سکتے ہین، میری رائے میں ان علوم سے ابتدائی واقفیت کے علاوہ ہمارے لئے ان حکمائے اسلام اور صوفیائے کرام کے عقائد کا جاننا بھی ضروری ہے، جن کے سرچشمۂ فیض سے فکرِ اقبال سیراب ہوتا رہا،

رومی | ان مین سب سے پہلا نام مولانائے روم کا ہے، فکرِ اقبال کے مآخذ مین رومی کو سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے، اقبال رومی کو اپنا ہادی اور پیشوا خیال کرتے ہیں، اور بار بار اعلان کرتے ہین، کہ میرے میکدے کی شراب دراصل پیرِ روم کے خمستان کی حاصل کردہ ہے، اقبال زندگی کے اسرار کی نقاب کشائی کرتے ہین، مگر اس انکشاف کا سہرا اپنے مرشد رومی کے سر باندھتے ہین، یہی رومی جاوید نامہ کے زندہ رود کے لئے خضرِ راہ بنتے اور اُسے آسمانی دنیا کی طلسماتی فضا کی سیر کراتے ہین، اور جب حکیم مشرق زندگی کے کام کی تکمیل کر چکنے کے بعد اقوام شرق کو آخری

پیغام دیتا ہے تو اس وقت اسی حکیم کی روح ندائے سروش بن کر مژدۂ انقلاب لاتی ہے، یہ مولانا جلال الدین رومی ہی ہیں، جو اقبال کی نظر میں کلیم بھی ہیں اور حکیم بھی، مجدد بھی ہیں اور مصلح بھی، شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی، ولی بھی ہیں اور مجذوب بھی، طریقت کے دشوار گذار راستوں کے راہبر بھی ہیں، اور حقیقت کے مرحلوں کے ہادی بھی، شریعت کے غوامض کے عقدہ کشا بھی ہیں، اور حکمت کے دقائق کے شارح بھی، غرض اقبال کے نزدیک ہماری موجودہ "کرم خوردہ" ملت کے تمام روحانی اور ذہنی امراض کو شفا بخشنے والا رومی ہے جس کی تعلیمات کو اقبال نے اپنے افکار میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ استغراق اس درجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو "مثیل رومی" قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک عہد قدیم میں رومی ملت کے لئے پیغام حیات لائے تھے، اور اس پرآشوب دور حاضر میں وہ خود اس کے مبلغ اور داعی ہیں،

اقبال کے نزدیک رومی کی زندگی اور ان کی حکمت کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کے پیش نظر فکر رومی کی تدوین اور تشریح کرنا ہمارے لئے حد درجہ ضروری ہے تاکہ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کو رومی کی صحیح عظمت کا احساس ہو سکے، رومی کے فلسفے کی ممتاز خصوصیات سے دنیا کو روشناس کرائیں، ان کے امتیازات اور جدید دور پر اوس کے اثرات دکھانے کی کوشش کریں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے رومی کے ان اشعار کی تشریح کی ضرورت ہے جو علامہ کی تصنیفات میں بڑی کثرت کے ساتھ آئے ہیں تاکہ علامہ کے خیال کا سیاق و سباق سمجھ میں آسکے، مبتدیوں کے لئے اگرچہ اتنا ہی کافی ہے، لیکن اہل علم کا کام اس پر ختم نہیں ہو جاتا، اس سے رومی کے عمیق مطالعہ کی وسیع شاہراہیں ہمارے سامنے کھلتی ہیں، جو مطالعۂ اقبال کی نہایات میں سے ہے، خود علامہ نے بار بار ہمیں فکر رومی کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کی ترغیب دی ہے :-

گسستہ تار ہے تری خودی کا ساز ابتک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز ابتک

ابتک جس قدر مضامین لکھے جا چکے ہیں، ان میں اقبال اور رومی کے مشترکہ خیالات پر بہت کم روشنی

ڈالی گئی ہے، جہان تک مجھے معلوم ہے، شاید ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ہی ایک ایسے شخص ہین، جنھون نے اپنے مضمو
فلسفۂ اقبال" مین واضح طور پر ان خاص تصورات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، جو اقبال نے رومی سے ا
اسی طرح چند اور بزرگون نے بھی اشارۃً اور ضمناً اس بنیادی مسئلے کی طرف توجہ کی ہے، لیکن اس اہم با
کے متعلق یہ اختصار بالکل ناکافی ہے، کیونکہ فکرِ رومی کی تجدید و ترویج ہی علامہ اقبال کے مقاصد زند
ایسی حالت مین کیا شارحین اقبال کا سب سے ضروری فریضہ نہیں کہ وہ فکرِ اقبال کے طالبین کو حکمتِ رومی
سے روشناس کرین، تاکہ وہ اس کی روشنی مین علامہ اقبال کے افکار سے پوری طرح سے آگاہ ہو سکیں،
مولانائے روم کی مثنوی کو ابتدا سے اس قدر تقدس حاصل رہا ہے کہ عقیدت مندون نے اُسے
زبانِ پہلوی کا خطاب دے کر آنکھون اور دلون مین جگہ دی، ایران، ترکی، عرب، اور ہندوستا
مثنوی کی بیسیون شرحین لکھی گئین، علی الخصوص ہندوستان مین مطالعۂ رومی کی طرف جتنی توجہ ہوئی
مقابلہ مین شاید ہی کسی اور کتاب کو پیش کیا جا سکے، عبداللطیف عباسی کی لطائف المعنوی، نواب ش
خاکسار کی شرح، ملا ایوب پارسا لاہوری، ملا سعید، محمد عابد اور مولانا محمد افضل الہ آبادی کی ش
بالآخر ملا بحر العلوم کی تفسیر مثنوی اُن چند ممتاز شرحون میں سے ہین، جو مثنوی رومی کے مطالعہ کے سا
مین آئین، مثنوی رومی کے مطالعہ کی طرف سب سے زیادہ توجہ ہندوستان مین اورنگ زیب عالمگیر نے
ہوئی، نواب عاقل خان رازی میر عسکری کو اسرارِ مثنوی کے حل کرنے مین خاص مہارت حاصل تھی
کے زیرِ اثر مطالعہ رومی کے شوق و ذوق کو بڑی ترقی ہوئی، عہدِ عالمگیری جیسا کہ باخبر حضرات
نہین، شدید سیاسی کشمکش کا زمانہ تھا، جس میں ہندوستانیون کے طبائع شورش اور روحانی ا
مخالفتون سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسی نوشدارو کی جستجو مین تھے، ہیجان و اضطراب کے ان ایام میو
رومی ہی وہ نوشدارو تھا، جس کے استعمال سے عہدِ عالمگیری کے لوگ اطمینان قلب حاصل کرتے
پس علامہ اقبال نے ارشاد و ہدایت کے لئے جس برگزیدہ ہستی کو منتخب کیا ہے، وہ

استحقاق رکھتی ہے، کہ عالم انسانیت، آفات وفتن کے اس نئے دور مین بھی اس کے تجویز کردہ نسخۂ شفا سے اپنے روحانی عوارض کا علاج کرے، موجودہ دور اپنے نتائج کے اعتبار سے ملت اسلامی اور مسلمانون کے حق مین تاریکی دور سے کسی طرح کم نہین، جس کی دشواریون اور پرپیچ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے علامہ اقبال نے مرشد رومی کے دامن سے تمسک کرنے کی ضرورت محسوس کی، رومی کی حکمت "عقلیت" کی دشمن ہے، اور دبستان دل کی طرف رہنمائی کرتی ہے، مانا کہ ہم کو رومی کے صفحات مین تجاذب اجسام اور تجدد امثال جیسے دقیق سائنٹفک مسائل بھی ملتے ہین، لیکن اہل کشف وشہود کی بارگاہ مین ان ادنیٰ حقیقتون کا علم کوئی خاص پایہ نہین رکھتا، رومی کا سب سے بڑا امتیاز عشق کا جذب وسرور پیدا کرنا ہے، اور دور حاضر کے لئے سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے،

رومی کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا اس سے زیادہ اس بحث کو طول دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، آخر مین پھر اسی کا اعادہ کرون گا کہ اقبال کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے رومی کو نہ صرف سمجھنا چاہئے، بلکہ اس کو مقبول عام بنانا چاہئے، اور حکمت رومی کے ایسے دبستان قائم کرنے چاہئیں، جن مین اسلامی حکمت وتصوف کے ماہرین فکر رومی کے قلزم زخار کی غواصی کرین اور جو کچھ اس تلاش وجستجو سے حاصل ہو اسے دنیا کے سامنے پیش کرین،

سنائی اور عطار اقبال نے عطار اور سنائی سے بھی استفادہ کیا ہے، سنائی سے زیادہ اور عطار سے کم، بال جبریل مین وہ قطعہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا، جو حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر لکھا گیا تھا، اور جو حکیم علیہ الرحمۃ کے ایک قصیدہ کے تتبع مین ہے، اس قطعے مین کتنا جوش، کتنا سرور اور کتنا سوز ہے، ہر ہر شعر سے جذبات کے طوفان امنڈتے ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مشرق جب حکیم سنائی کے مزار پر پہنچتا ہے تو سنائی کی عظمت اس کے پہنائے قلب پر چھا جاتی ہے اور رومی کا یہ مصرع بیساختہ اسکی زبان پر جاری ہو جاتا ہے، کہ

ع ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

مسافر مین بھی وہ نظم موجود ہے، جس مین حکیم موصوف سے استصواب کرتے ہین :-

حکیم سنائی سے علامہ اقبال کی عقیدت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ حکیم علیہ الرحمۃ بھی سلسلۂ رومی

سے تعلق رکھتے ہیں، یہ وہ بزرگ ہیں جن سے کسب فیض کا رومی کو خود اعتراف ہے، بلکہ ان کے ہم سلسلہ ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے، حکیم سنائی کی زندگی کے واقعات نفحات الانس وغیرہ میں بہ تفصیل موجود ہیں، جن سے حکیم علیہ الرحمہ کے صاحب عرفان ہونے کا پورا پورا پتہ چلتا ہے، ان کی کتابیں حدیقۃ الحقیقۃ اور طریقۃ الحقیقۃ فارسی کی صوفیانہ شاعری کے لئے Classics اور بنیادی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں، خود شیخ عطار اور مولانا روم ان سے بے حد متاثر ہوئے، مجھے یونیورسٹی لائبریری کی سابق ملازمت کے سلسلہ میں اس کا پورا علم ہے کہ علامہ اقبال اکثر حدیقہ اور اس کی شرحوں سے استفادہ کیا کرتے تھے، بلکہ ان کا ارشاد تھا کہ حدیقہ کی تعلیم کو ہمارے نظام تربیت میں خاص جگہ ملنی چاہئے،

حدیقہ کیا ہے؟ اس میں کیا خاص اہم علمی و حکمی مسائل زیر بحث آئے ہیں؟ اور وہ کون سے نکات ہیں، جو جدید علوم کی توسیع کے بعد حدیقہ کے ذریعہ زیادہ روشن اور واضح ہو سکتے ہیں؟ علامہ اقبال کو سنائی سے کیوں اس قدر دلچسپی تھی؟ یہ وہ باتیں ہیں جن کا جاننا ہر محب اقبال کے لئے ضروری ہے،

سنائی کی طرح علامہ کو عطار سے بھی دلچسپی ہے لیکن بہت زیادہ نہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عطار کی تصانیف بے شمار ہیں، اور کسی حد تک غیر دلچسپ، یونیورسٹی لائبریری میں مثنویات عطار کا جو قدیم نسخہ ہے، اس میں ان کی کم و بیش چوبیس تصانیف نظم موجود ہیں، اس نسخے کی ضخامت سات سو صفحات کے قریب ہے، مزید یہ کہ بہت سی مثنویاں عطار کیطرف غلط طور پر منسوب ہیں، اس کے علاوہ یہ سبب بھی ہے کہ سنائی اور عطار دونوں رومی کے سلسلۂ اساتذہ میں ہیں، اور ان کے خیالات کا بیشتر حصہ رومی نے اپنی مثنوی میں لے لیا ہے،

تاہم عطار چونکہ اقبال کے اساتذۂ روحانی میں سے ہیں، اس لئے ان کی سوانح حیات، تصانیف اور افکار سے واقف ہونا خالی از فائدہ نہیں،

سعد الدین محمود شبستری | زبور عجم کا "گلشن راز جدید" شبستری کے گلشن راز کے جواب میں لکھا گیا ہے،

شیخ شبستری تاتاری انقلاب کے زمانہ کے بزرگ ہیں، اس دور میں خاکِ ایران نے جو بلند پایہ ہستیاں پیدا کیں، ان میں سے ایک صاحبِ گلشنِ راز بھی ہیں، گلشنِ راز تصوف کی دقیق کتابوں میں سے ہے، علامہ نے اس کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے، پھر اس کے پیغام کو نئے لباس میں ملبوس کرتے ہوئے گلشنِ راز جدید کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا،

اقبال اور شبستری کے فکر کے مقاماتِ اتصال کیا ہیں؟ اور وجوہ اختلاف کون سے ہیں؟ اقبال اور شبستری دونوں کا مطمح نظر کیا ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کس نئے انقلاب کا مدعی ہے؟ ان سب سوالات کا جواب مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں ضروری ہے، میں نے اپنے ایک مضمون "اقبال اور شعراے فارسی" میں ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں گلشنِ راز کے بہت سے مسائل سمجھنے سے قاصر رہا،

میں نے اس مضمون میں اختصار کے ساتھ اقبال کے اسلامی ماخذ کا ذکر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بحث اس درجہ دقیق اور پر از مسائل ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اس کے مبادی تک کا بھی تذکرہ نہیں ہو سکتا، تاہم اس سے اتنا واضح ہو گیا ہوگا کہ حکمتِ اقبال کے اجزاے ترکیبی میں مسلمان صوفیوں اور حکما کی حکمت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دور کے حکیم اور عارف اقبال کی حکمت کا صحیح تجزیہ کر سکیں تو ہمیں علوم اسلامیہ اور خاص کر اس چمنِ فکر کی سیر کرنی چاہئے، جس کے گلہاے رنگارنگ سے گلشنِ اقبال کو یہ رونق حاصل ہوئی،

حکماے مشرق کی طرح اقبال نے حکماے مغرب سے بھی بے حد استفادہ کیا ہے، مطالعۂ اقبال کے اس پہلو کے متعلق کچھ کام ہو چکا ہے، لیکن ابھی وہ ناکافی ہے، اس کے لئے فلسفۂ جدید سے عمومی واقفیت اور بعض بڑے بڑے فلسفیوں کے خصوصی اور نمایاں پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً نطشے، برگساں، ولیم بلیک، کانٹ، الیگزینڈر، میک ٹیگرٹ وغیرہ،

امید ہے کہ اقبال کے شیدائی، مطالعۂ اقبال کی تسہیل و تشریح کے لئے کوئی موثر اقدام کریں گے،

اسلامی اور غزنوی علم

از

جناب غلام مصطفےٰ خان صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)

(۲)

اس تفصیل کے بعد غزنوی علم کے متعلق کچھ نئی چیزیں پیش کیجاتی ہیں، اس سلسلہ میں اس عہد سے پہلے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے مختلف اعلام کا تذکرہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، اور ہیسٹنگز کی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (جلد دوازدہم، صفحہ ۱۴۵) میں سے کچھ مفید معلومات کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے :-

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمان حکمرانوں نے اپنے لیے مختلف نشان اور علم مقرر کئے، خلفاے بنی امیہ نے سفید علم اور بنی عباس نے سیاہ علم اختیار کیا، موخر الذکر نے شققہ علم پر سفید حرفوں میں کلمۂ طیبہ بھی لکھوایا، علاویوں نے سبز عَلَم اختیار کیا، اور زنگی (۵۵۲ھ / ۱۱۶۹ء) نے ریشمی پھریرے پر قرآن پاک کی کوئی آیت سُرخ اور سبز حرفوں میں لکھوائی، مصر کے فاطمی خلفار (۲۹۶ھ / ۹۰۹ء تا ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء) نے اپنے علم میں ہلال لگایا، اور سرخ و زرد حریر کا ایک شیر بھی اُس میں بنوایا، اندلس کے الموحدین (۱۱۵۹ء) نے بھی اپنے علم میں ہلال لگایا، لیکن ہلال مسلمانوں نے سب سے پہلے اختیار نہیں کیا، بلکہ ان سے پہلے روم کے عیسائی حکمرانوں کے یہاں ہلال موجود تھا، اور عموماً زیبایش کے لئے مستعمل تھا، اس کے ساتھ پانچ ستارے بھی زیب وزینت کے لئے بنائے جاتے تھے، مشہور یہ ہے کہ چاند دیوی کی ایک لڑکی (Keroessa) تھی جس نے ہلال اختیار کیا تھا، اوسی نے رومی سلطنت کی

بنیاد ڈالی تھی، لیکن اوہام پرستی کی ان خیالی داستانوں سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو آنا ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ہلال زیبایش کے لئے بھی اختیار کیا جاتا تھا، صنعاء (یمن) کی ایک مسجد کے مینار پر ۱۲۷۰ء میں ہلال نصب کیا ہوا دیکھا گیا، ترکون نے جو اپنے علم کے لئے ہلال اختیار کیا ہے، اس کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (طبع یازدہم، جلد دہم ص ۴۶۲) مین یہ بیان ملتا ہے :-

"ترکی ہلال اور ستارہ، غالباً سلطان محمد دوم نے ۱۴۵۳ء قسطنطنیہ کی فتح پر بطور یادگار کے اختیار کیا تھا کیونکہ یہ نشان وہان پہلے بھی تھا، بلکہ وہان کی رومی حکومت کے اثر سے تو روسی گرجاؤن مین اب تک صلیب کے ساتھ ہلال دیکھا جاتا ہے، اس کی ابتدا یون ہوئی، کہ سکندر اعظم کے والد فلپ (دازیگزدوم) نے ایک شب قسطنطنیہ کے قلعہ کی دیوارین گرانی چاہین، تو چاند نمودار ہوگیا، اور محصورین کو پتہ چل گیا، چنانچہ اونھون نے اسے نیک فال سمجھ کر اپنی ملکہ ڈائنا (Diana) کے لئے شاہی نشان بنالیا، اور پورے چاند کے بجائے ہلال کو اختیار کیا جو غالباً اس غرض سے ہے کہ وہ بڑھنے اوبھرنے پر دلالت کرتا ہے، بہرحال ترکون نے اُسے بطور یادگار کے قائم کرلیا اور اُن کا شاہی علم سُرخ رنگ کا ہے جس میں خلیفہ وقت کی تصویر بھی ہوتی تھی"۔

ہیسٹنگز کی انسائیکلوپیڈیا (بحوالہ مذکورہ بالا) مین ترکون کے علم کے متعلق اس خیال کی تردید کی گئی ہے، اور کہا گیا ہے کہ سلطان مراد اوّل (م ۷۹۱ھ، ۱۳۸۹ء) کے زمانہ میں جان نثار جماعت نے سُرخ علم اختیار کیا تھا، اور اس میں ہلال (بغیر ستارہ کے) بھی بنا ہوا تھا، یہی علم سلجوقی ترکون نے بھی اختیار کرلیا، اور اُس زمانے سے ترکی سلطنت میں قائم رہی۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانون سے پہلے ہلال ضرور شاہی نشان مین جگہ پائے ہوئے تھا، ایران میں اسلام سے پہلے یزدجرد اور خسرو پرویز وغیرہ کے سکون میں بھی ہلال اور ستارے منقوش تھے، اور وہان جب

لے عرصہ ہوا مین نے کسی تاریخ میں پڑھا تھا کہ قسطنطنیہ کی فتح کے وقت قلعہ مین ایک ٹوپی پڑی ہوئی ملی تھی، جس کو بطور یادگار کے ترکون نے اختیار کیا، اور وہ ترکی ٹوپی کہلائی، روم کی اس شاندار فتح کی خوشی ترکون کو کیون نہ ہوتی جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بشارت دی تھی، ملاحظہ ہو، مشکوٰۃ، باب آلات الجہاد فصل اول حدیث نمبر ۱۰۴۶،

عرب عمال ۱۳۱ھ سے اسلامی حکومت کے علمبردار ہوئے تو انھون نے بھی اپنے سکون مین دوسرے رائج نقوش کے ساتھ یہ نقوش قائم رکھے، اس تاریخ سے ہلال اور ستارے ہمارے یہان بھی رائج ہوگئے،

ایران کے نشان کے متعلق ایک مفید مضمون تاریخچۂ تیر و خورشید (کسروی) طہران کے رسالہ ارمغان (ستمبر اکتوبر ۱۹۲۳ء) میں ملتا ہے، جس کا ضروری خلاصہ یہان پیش کیا جاتا ہے،

فاضل مضمون نگار نے پہلے شیر اور خورشید کی اہمیت بتائی ہے، کہ یہ زمین اور آسمان کی بہت نمایان شکلین ہین اور شیر کا مترادف لوئی (Lion) فرانس، روم اور آرمینیہ کے متعدد حکمرانون کا نام تھا، اور اس نام کے بادشاہون نے اور بالخصوص آرمینیہ کے لوئی دوم نے اپنے سکون اور علم پر شیر کی تصویر بنوائی تھی، اسی لوئی دوم نے تیسری صلیبی جنگ مین عیسائیون کی مدد کی تھی، اُس کے صلے مین جرمنی کے بادشاہ فریڈرک باربروسا نے اُسے تاج شاہی دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن وہ ۱۱۹۰ء میں مرگیا تو اُس کے لڑکے نے روما کے پوپ سے سفارش کرکے اُسے ایک شاہی علم دلوا دیا، جس مین شیر کی تصویر تھی، لوئی ششم نے خصوصیت کے ساتھ شیر کو اپنے خاندان کا شاہی نشان قرار دیا، اسی طرح خراسان کے مغلون نے اور مازندران کے صفوی حکمرانون نے بھی اپنے سکون مین شیر کندہ کرایا،

بعض شعراء نے بھی علم کے شیر کے متعلق اشارہ کیا ہے، مولوی معنوی (م ۶۷۲ھ/۱۲۰۳ء) کا ایک شعر ہے :-

ما ہمہ شیریم و شیران علم — حملہ مان از باد باشد دمبدم

فخر الدین اسعد گرگانی نے پہلوی سے فارسی مین ویس و رامین کا ترجمہ پانچوین صدی ہجری کے آخر[3]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۰۱ بعد [2] مکرمی پرنسپل محمد شفیع صاحب نے اس کی اطلاع مجھے دی تھی، اور میرے بزرگ استاذ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی مدظلہ نے اس کی نقل مجھے بھجوائی تھی [3] حافظ محمود خان صاحب شیرانی نے اس ترجمے کی تاریخ ۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء دی ہے، ملاحظہ ہو رسالہ اردو دہلی، جنوری ۱۹۴۳ء صفحہ ۴،

ن اور ملک شاہ سلجوقی (م ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) کے عہد میں کیا تھا، اُس کے چند اشعار یہ ہیں، جو ساسانی عہد کے اعلام کی ضروری

طلاع دیتے ہیں :-

چو مردستان شدہ دست از درفشان   چو دیبائے درفشان مہ درخشان

فراز ہر یکے زرّیں یکے مرغ   عقاب و باز یا طاؤس و سیمرغ

بزیرِ ماہ در شیر آبگون رنگ   تو گفتی شیر دارد ماہ در چنگ

ہخا منشی عہد (۵۵۰-۳۳۰ ق-م) میں "خروس و مرغ زرّین" کی تصویر عَلَم پر تھی لیکن ساسانی عہد

۲۲۶ء-۶۳۲ء) میں ضرور شیر اور ماہ رہے ہوں گے، یہ نہیں ہوسکتا کہ شاعر نے ان اشعار میں اپنے

ہد کے اعلام دیکھ کر اُس زمانے کے اعلام کا تخیل باندھا ہو، کیونکہ اُس کے ہم عصر سلجوقیوں نے تو ہلال اختیار کر لیا تھا،

اسی طرح نظامی گنجوی کی مثنوی لیلیٰ و مجنون جو ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں لکھی گئی اور اخستان بن منوچہر کے نام معنون

ی گئی، اِن مفید اشعار کی حامل ہے جو نوفل اور قبیلۂ لیلیٰ کی جنگ کے متعلق ہیں:-

خورشید درفش دہ زبانہ   چون صبح دمیدہ دم نشانہ

گشتہ زمی از درم چو دریا   سنگ ابلہ رو تر از ثریا (؟)

ہر شیر سیاہ کا یستادہ   چون مارِ سپید دہان کشادہ

شیرانِ سیاہ در دریدن   دیوانِ سپید در دویدن

ان اشعار میں شیر والے عَلَم کے متعلق اشارہ ضرور ملتا ہے، اور یہ یقین ہے کہ یہ اشارہ اُس خیالی جنگ کے

متعلق نہیں ہوگا بلکہ خود شاعر کے سامنے اپنے زمانہ کے علم کی تصویر ہو گی ۔

آگے چل کر مضمون نگار کہتا ہے کہ شیر کا تعلق آفتاب سے بھی ہے، کیونکہ وہ برجِ اسد میں ہے، اس لئے

ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی گئی ہے، اور یہ اُسی طرح ہے جس طرح کہ شاہ طہماسپ صفوی نے اپنے سکوں میں

شیر و شمس کو محض اس لئے ساتھ کندہ کرایا تھا کہ اس کی پیدائش کے وقت (چہار شنبہ ۲۶ ذی الحجہ ۹۱۹ھ)

(۲۸ جنوری ۱۹۴۰ء) آفتاب برج حمل میں تھا، پھر وہ "مختصر تاریخ دول" کا تذکرہ کرتا ہے جس کا مصنف ایشائے کوچک کے سلجوقی حکمران غیاث الدین کیخسرو (بن عز الدین کیکاؤس) کے بعد ہی ساتوین صدی ہجری (تیرہوین صدی عیسوی) میں گذرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ حکمران گرجستان کی ایک عیسائی حسینہ پر عاشق ہوا، اور اس کے ساتھ شادی بھی کر لی، لیکن اُس کی شیفتگی بہت بڑھی ہوئی تھی، اور وہ چاہتا تھا کہ اُس کی تصویر اپنے سکوں میں بنوائے لیکن امراء نے اس کی موافقت نہ کی، اُس وقت اوس نے مجبور ہو کر اپنی محبوبہ کے آفتابی رخسار کی مناسبت سے مروج شیر کے ساتھ آفتاب کا اضافہ کر دیا، چنانچہ اوس وقت سے یہ دونون شکلین ساتھ ساتھ سکون مین کندہ ہونے لگین، اور اس قسم کا کوئی سکہ ایسا نہین ملا، جو اس سے زیادہ قدیم زمانے کا ہو،

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "ایران کی جدید شاعری اور طباعت" میں سب سے قدیم روزنامہ "خلاصۃ الحوادث" مرتبہ آقا محمد باقر خان کے پہلے صفحے کا عکس دیا ہے، جس مین ایک شیر کی تصویر ہے، جس کے داہنے ہاتھ میں تلوار ہے شیر کے اوپر سورج اور اس کے اوپر تاج ہے، یہ روزنامہ ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء سے ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء تک جاری رہا،

غزنوی علم

ہیننگز کی کتاب (بحوالۂ مذکور صفحہ ۱۴۶) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء) نے ہندوستان مین غلبہ ظاہر کرنے کے لئے ہلال اختیار کیا تھا، جو یہان کے علم مین بھی ضرور قائم کیا ہوگا، چونکہ محمود اور اس کے جانشینون کو عباسی خلفاء سے خاص عقیدت تھی، اس لئے ظاہر ہے، کہ یہ علم بھی ان کے علم کی طرح سیاہ ہی ہوگا، اس کے متعلق ثبوت پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہون، کہ بغداد سے علم بھی ملتے تھے، چنانچہ سومنات کی فتح پر خلیفہ القادر باللہ (م ۴۲۲ھ ۱۰۳۱ء) نے محمود کو القاب کے ساتھ علم بھی روانہ کیا جس سے یہ مراد تھی، کہ اُس علم کے متعلق جو ممالک ہین، اُن مین محمود کی حکمرانی خلیفہ کو منظور ہے، فرشتہ لکھتا ہے:

"...... درین سال کہ سلطان از سفر سومنات برگشت خلیفہ القادر باللہ عباسی القاب نامہ بسلطان محمود

---

[۵] خلاصۃ الاخبار (خواندمیر) ورق ۲۰۴ (الف) حبیب گنج، شاہ طہماسپ صفوی کا انتقال ۹۸۴ھ ۱۵۷۶ء میں ہوا،

نوشتہ بوائے خراسان و ہندوستان و نیمروز و خوارزم فرستاد، و سلطان و فرزندان و برادران

او را در نامہ لقبہا نہادہ، سلطان را کہف الدولہ والاسلام و امیر مسعود را شہاب الدولہ و جمال الملۃ

و امیر محمد را جلال الدولہ و جلال الملۃ و امیر یوسف را عضد الدولہ و مؤید الملۃ خواند، دیگر نوشت کہ

ہر کرا ولی عہد گردانی ما نیز آن کس را قبول داریم۔۔۔"[1]

ظاہر ہے کہ جب خلیفہ کا علم سیاہ ہوگا، تو اسکا بخشا ہوا عَلَم بھی اُسی رنگ کا ہوگا،[2]

محمود غزنوی کے درباری شاعر فرخی (م ۴۲۹ھ/۱۰۳۸ء) نے اوس کے بھائی یوسف (سپہ سالار ہند) کی

مدح کے ایک قصیدہ مین کہا ہے :۔

چتر سیہ و رایت تو سایہ فگندہ ست — در ہند بہر جائے کہ حصنے و حصاریست[3]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمودی چتر سیاہ تھا،[4] اور سیاہ کی صفت اغلب ہے کہ "رایت" کے

ساتھ بھی ہو، کیونکہ محمود یقیناً عباسی خلیفہ کے زیر اثر تھا جس کا علم سیاہ تھا،

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ محمود کے نبیرہ سلطان ابراہیم (م ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء) کے علم مین شیر کی تصویر تھی،

اس سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے، عنصری (م ۴۳۱ھ/۱۰۴۰ء) نے اسی شیر کے متعلق محمود کی مدح کے ان اشعار

---

[1] تاریخ فرشتہ، طبع لکھنؤ ص ۳۵ [2] عباسی خلفا سیاہ خلعت روانہ کرتے تھے، جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "خلافت اور ہندوستان" کے صفحہ ۲۱، ۲۲ وغیرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے، عباسی خلیفہ کا ہودج بھی سیاہ ہوتا تھا، جیسا کہ خاقانی کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے : وان ہودج خلیفہ متوج بماہ زد ÷ چون شب کز آفتاب نہی تاج بر سرش [3] انتخاب فرخی لاہور ۱۳۵۳ھ ص ۲۵ [4] سنجر سلجوقی کا چتر بھی سیاہ تھا، جیسا کہ اس شعر میں ہے: چون چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد۔ با فقر گر بود ہوس ملک سنجرم [5] اس شعر کو بیل نے مفتاح التواریخ (آگرہ ۱۸۴۹ء ص ۶۹) میں لکھا ہے کہ یہ شعر شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء) کا ہے اور یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ سنجر (م ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء) اُن کا ہم عصر تھا لیکن حمیدیہ لائبریری بھوپال کے "انتخاب شعرائے متقدمین" (نمبر ۳۔ ورق ۳۴۲ ب) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر عراقی (م ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء) کا تھا،

مین اشارہ کیا ہو :-

بردن بردِ علمِ تو زمغز شیران ہوش　　بردن بردِ کرم تو زر دوے پیران چین

بدیع نقطِ تو دُر راست وافتخارِ صدف　　بزرگ باسِ تو شیراست روزگار عرین[1]

لیکن مجھے کوئی ایسا ثبوت نہین مل سکا جس سے یقینی طور پر یہ کہا جائے کہ محمود کے علم مین بھی شیر کی تصویر تھی، بلکہ اوس کے درباری شعرا بالخصوص فرخی، عنصری اور منوچہری نے کئی جگہ اس کی "شیر شکاری" کا تذکرہ کیا ہے لیکن جہان تک مجھے معلوم ہے کہیں ان شاعرون نے محمودی علم کے شیر کے متعلق کوئی صاف تشبیہ یا استعارہ تک پیش نہیں کیا[2]۔

اب اوس کے پوتے ابراہیم کے علم کے متعلق ابو الفرج رونی کے یہان وضاحت دیکھئے، جو اُس کی مدح میں کہتا ہے :-

چو شیرِ رایت شیر دلیرا و بیدل　　چو شاخِ آہو شاخِ درختِ او بے بر[3]

اُس کے بیٹے مسعود سوم (م ۵۰۸ھ / ۱۱۱۵ء) کے متعلق بھی یہی بات ملتی ہے، اور وہی شاعر کہتا ہے :-

اگر اندر شود بہ شیر فلک　　در جہدِ پاسِ او بہ شیر علم[4]

یہی شاعر مسعود سوم کے بھائی سیف الدولہ محمود کے متعلق بھی اسی طرح کہتا ہے :-

چندان علمِ شیر برافراشت کہ بفزود　　زایشان بفلک برجِ اسد بے عدد اشکال[5]

مسعود سوم کے بیٹے شیرزاد (م ۵۰۹ھ / ۱۱۱۶ء) کا علم بھی ایسا ہی تھا، مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء) نے

---

[1] دیوانِ عنصری، لکھنؤ ۱۹۲۲ء ص ۸۹-۹۰ [2] اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مصر کے فاطمی خلفاء کے علم مین شیر تھا، اگر محمود کو اس بات کا علم رہا ہوگا، اور یقیناً ہوگا، تو اوس نے ہرگز اپنے علم میں شیر کو جگہ نہ دی ہوگی [3] دیوانِ رونی، چاپ کین ایڈیشن ص ۱۶۱، رونی کی تاریخ وفات ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء کے بعد قرار دی ہے، ملاحظہ ہو اورنٹیل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۳۰ء ص ۵۵ [4] دیوانِ رونی ایضاً صفحہ ۹۰ [5] ایضاً ص ۱۱۱

ی مدح مین کہا ہے:-

خشتِ او بس کہ کرد شیران کم — شیر گردون بماند و شیرِ علم[۱]

مسعود سوم کے دوسرے بیٹے بہرام شاہ کے علم مین بھی شیر تھا، سنائی (م ۵۴۵ھ / ۱۱۵۰ء) کہتے ہین:-

ہر کجا شاہ ما بتافت عنان — شیر رایاتِ او شود ہمہ جان

رایِ رایان بہ تیغ کردہ قلم — نیزہ را شیر کردہ شیرِ علم[۲]

بہرام شاہ کے درباری شاعر سید حسن غزنوی (م ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء) نے بھی اُس کے علم کے متعلق یہی کہا ہے:-

آن چنان شیرِ علم سر بفراز د مثل — گوئی از چشمۂ خورشید کند آب خوری

زندہ از باد شو بہیدہ چون شیرِ علم — تکیہ بر خاک مکن خیرہ چون نقش اوان[۳]

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ محمود نے ہلال اختیار کیا تھا، جو یقین ہے کہ اُس کے اخلاف نے بھی قائم رکھا ہوگا،
طرح کہ بہرام شاہ کے متعلق وہی شاعر کہتا ہے،

ماہ اگر گشتے ز ماہِ رایتِ او بہرہ ور — مہر اگر بودے ز ماہِ رایتِ او مایہ دار

عی:- بگذشت ہلالِ رایتِ شاہ از ماہ — من پائے بگل دو دست کوتاہ از جاہ

دور افتادم بقصد بدخواہ از راہ — اے شاہ ز بندہ دور کن کاہ از کاہ[۴]

---

۱ دیوانِ مسعود سعد سلمان، طہران ایڈیشن، ۱۳۱۰ھ، صفحہ ۵۶۳ ۲ بہرام شاہ کی تاریخ وفات ۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء ہی صحیح ہے،
نے اس بادشاہ کی مکمل تاریخ لکھی ہے، جو انشاء اللہ جلد شائع ہو گی ۳ حدیقہ، بمبئی ایڈیشن، صفحہ ۷۰۳، ورلکھنو
ن صفحہ ۶۵۹، مترتباً ۴ انڈیا آفس، مخطوطہ نمبر ۹۳۱، ورق ۴۴ (الف) اور ۱۲۸ (ب) مترتباً ۵ ایضاً ورق ۲۱
۱ اور ۱۰۲ (ب) مترتباً، بہرام شاہ کے پوتے خسرو ملک (م ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء) کے سکون میں ہلال اور ایک ستارہ تھا، دو جرمن
اب (Coins of The Indian Museum) جلد چہارم (کلکتہ ۱۸۹۶ء) صفحہ ۱۶۱ ملاحظہ ہو، اسی کتاب کے
۱۶۰ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ بہرام شاہ اور اس کے بھائی ملک ارسلان وغیرہ کے (ہندوستانی) سکون مین

اور جس طرح کہ محمود کا علم سیاہ تھا، بہرام شاہ کا علم بھی سیاہ تھا، چنانچہ وہی شاعر کہتا ہے:۔

اے رفتہ زمین رایت او دیدہ بحمایت سیاہی

بہرام شاہ ای شاہ کہ از رایت شبرنگ در کوکبہ چون لعبتان ماہ گرفتی[۱]

فرخی کے کلام سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ محمود کا چتر سیاہ تھا، سید حسن غزنوی کے ذیل کے اشعار بتاتے ہیں

کہ بہرام شاہ کا چتر بھی سیاہ تھا، اور اس کا تاج سفید تھا:۔

گر ز چتر تو شام سیاہ گردون خواست چو فر تاج تو صبح سپید کار گرفت

رتبت چتر سیاہت چیست مرغ روز کو لاجرم تا شد ہمہ چشمش سپید از انتظار

روزے کہ بر نہی تو تاج سپید دم گیرد کنار سایۂ چتر سیاہ را

ملک دگر وار امید زان کہ بداد نوید صبح ز تاج سپید، شام ز چتر سیاہ

از تاج تست عکسے صبح سفید پوش وز چتر تست خالے شام سیاہ وار[۲]

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۷) گائے کی تصویر اور اس کے اوپر ہندی خط میں "شری سمنت دیو" کندہ تھا، میں نے تانبے کے یہ سکے حافظ محمود شیرانی صاحب کے یہاں لاہور میں دیکھے ہیں، یہ سلاطین کی رواداری کی شاندار مثال ہے [۱] انڈیا آفس مخطوطہ ۹۳۱، ورق ۱۱۰ (ب) تقریباً سبھی غزنوی سلاطین کے سکوں میں (خصوصاً وہ جو غزنین وغیرہ میں رائج تھے) خلیفۂ وقت کا نام بھی کندہ ہوتا تھا [۲] مخطوطہ مذکورہ۔ ورق ۲۰ (ب) ۲۲ (الف) ۱۱۳ (ب)۔ ۱۱۴ (الف) اور پیرس کا مخطوطہ سپلیمنٹ نمبر ۷۹۵، ورق ۱۰ (ب)۔ مترتباً بہرام شاہ کے بھائی ملک ارسلان کی تاریخ معارف (نومبر، دسمبر ۱۹۴۱ء) میں پیش کر چکا ہوں، اس کا چتر بھی سیاہ تھا، جیسا کہ مسعود سعد سلمان (دیوان صفحہ ۴۶۴۔ ۴۹۰) نے کہا ہے،

گو یہ سپہر باشد و دولت سپید روے تا ہست چتر ملک ملک ارسلان سیاہ

روے دولت سپید و قصر سپید روز دشمن سیاہ و چتر سیاہ

سفید تاج کے متعلق بھی اشارہ ملتا ہے،

آداب الحرب (لاہور، مئی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۹) سے معلوم ہوتا ہے، کہ بہرام شاہ کے والد مسعود سوم کے چتر پر باز تھا

مسعود سعد سلمان نے بھی بہرام شاہ کے سیاہ چتر کا تذکرہ کیا ہے :-

آن خنجر زود وش دولت فزائے گشت روے عدوے او شدہ چون چتر او سیاہ [۵۱]

یہ ہے غزنوی چتر اور علم وغیرہ کی تفصیل، اگر دوسرے مسلمان حکمرانون کے شاہی لوازمات کی تفصیل دیکھنی ہو تو ذیل کے حاشیے [۵۲] کی کتابین بھی بہت کچھ معلومات بہم پہنچائین گی،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۸) ہم پچھلے حاشیہ پر دیکھ چکے ہین، کہ سنجر کا چتر سیاہ تھا، انوری (کلیات، لکھنو ۱۸۸۰ء صفحہ ۱۰۳) نے سنجر کے چتر کے باز کا تذکرہ کیا ہے۔

سلطان سلاطین کہ باز چترش در معرکہ سلطان شکار باشد

لیکن حمیدیہ لائبریری کے انتخاب شعرائے متقدمین نمبر ۲ ورق ۲۵۵ (ب) میں اس شعر میں "باز چترش" کے بجائے "شیر چترش" ہو۔

[۵۱] بدایونی کلکتہ ۱۸۶۸ء جلد اول صفحہ ۴۳ [۵۲] مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی کے کرم سے اور معارف کی علم نوازی کی بدولت مختلف مسلمان حکمرانون کے تخت، چتر، تاج، علم وغیرہ کے متعلق معلومات صبح الاعشیٰ ج ۳ (ص ۴۲۲، ۴۹۰، ۵۲۲) ج ۴ (ص ۶-۸) ج ۵ (ص ۲۰۶، ۳۲۲) میں سے اور مقدمہ ابن خلدون (ص ۲۰۴-۲۰۵) اور خطط مصر مقریزی جلد ۳ (ص ۳۴۰-۳۴۲) وغیرہ سے معلوم ہون گی، صبح الاعشیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق کے سر پر سیاہ علم ہوتے تھے جن کے درمیان ایک سنہری اژدہا بنا ہوتا تھا، اور اس کے میسرہ میں سرخ علم ہوتے تھے، جن میں دو سنہری اژدہے بنے ہوتے تھے، جنگ مین سلطان پر سات چتر ہوتے تھے، امیر خسرو کی مثنوی مفتاح الفتوح (اورنٹیل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۶ء ص ۱۲، ۲۶ وغیرہ) سے معلوم ہوتا ہے، کہ جلال الدین فیروز شاہ کا چتر سیاہ تھا، اور علم مین ہلال تھا،

از

جناب میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

"اس مختصر مقالہ سے میرا مقصود فکر کی اہمیت کو واضح کرنا ہے، جو فلسفہ کا آلہ ہے، بتایا گیا ہے کہ افکار ہی سے اعمال وافکار کا تعین ہوتا ہے، اور افکار ہی اعمال کے ذریعہ ہماری قسمتوں کا تعین کرتے ہین، فلسفہ جو تصحیح فکر کا دوسرا نام ہے قسمتوں کے ڈھالنے کا ایک زبردست آلہ ہے، ایسے اہم اور مفید مضمون کا مطالعہ ہر اس شخص کیلئے ضروری ہے جو اپنی فکر کو پختہ کرکے اپنی قسمت کا آپ معمار بننا چاہتا ہے، اور اپنی فکر کو خام رکھکر انسان سے حیوان بننا نہین چاہتا، جیسا کہ اقبال نے کہا تھا ؎

آزادیِ افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہین جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ"

اے برادر تو ہمین اندیشۂ — مابقی استخوان و ریشۂ
گر گل است اندیشۂ تو گلشنی — ور بود خارے تو ہمہ گلخنی (رومیؒ)

افکار و خیالات ہی سے مقاصد و غایات کا تعین ہوتا ہے، مقاصد کردار، افعال و اعمال مین ظہور پذیر ہوتے ہین، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت تشکیل پاتی ہے، اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے جیسی سیرت ویسی قسمت۔ لہذا جیسے خیالات ویسی کائنات انا عند ظن عبدی بی

---

[1] یہ مقالہ "بزم فلسفہ" کی کرسی نشینی کے موقع پر پڑھا گیا جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبۂ فلسفہ کی بزم مباحثہ ہے،

یہ قانون ذہن کے دائرہ مین وہی صداقت واہمیت رکھتا ہے جو قانونِ تجاذب دائرۂ فطرت مین قطعی ویقینی!
جب سیرت اور قسمت کی تشکیل وتعیین مین افکار وخیالات ہی کی کارفرمائی ہے، تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے افکار
وخیالات کی اصلاح اس کا اپنا نہایت اہم فریضہ ہے، قوم سازی اور فرد کی روح کی تکمیل اصلاحِ خیال پر منحصر ہے؛

ع یک تنقیہ دماغ می باید کرد

مقاصد وغایات کا دائرہ ذہنِ انسانی ہے، انسان کا کوئی فعل مصلحت وغایت سے خالی نہین ہوتا، اب
مقاصد کا تعین غور وفکر سوچ اور بچار پر منحصر ہے فکر ہی کائنات کی سب سے زیادہ عظیم الشان قوت ہے، اور یہی ان دونون
انسان مین سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ قوت ہے، اس کی تربیت ہی کے متعلق مجھے یہان کچھ کہنا ہے،

فرض کیجئے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے، اس کے لئے آپ کو چند قواعد پر عمل کرنا ہوگا، جن کو باغبانی کے
قواعد سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگایا کہان جائے، پھر اس جگہ کو مسطح
اور خس وخاشاک سے پاک کرنا ہوگا، یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، پھر ہمیں پھولون یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب
کرنا چاہئے، اور اس عمدگی سے تیار کی ہوئی زمین مین انھین بونا چاہئے، ہمین اس امر کا بھی خیال رہے کہ بیج عمدہ ہین
ناقص نہیں، پھر موسم گرما میں ان بیجون کو پانی دینا پڑتا ہے تاکہ شدت تمازت انھیں جلانہ ڈالے، اب ہمین انتظار
کرنا پڑتا ہے، کہ وقتِ مقررہ گذر جائے اور بالآخر گل ترو نمائی کرے، اگر بے صبری سے ہم بیجون کو کھود کر دیکھنا
چاہین، کہ یہ جل تو نہیں گئے، تو پھر ان بیجون کو نشو ونما کا موقع نہین ملے گا، بعض دفعہ ہمین کچھ زیادہ دن انتظار
کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم نے زمین کو خس وخاشاک سے اچھی طرح پاک کیا ہے، بیجون کے انتخاب مین غلطی نہیں کی،
آبیاری کی ہے، تو ہمین یقین ہے کہ ایک دن زندگی دامن زمین چیر کر پودوں کی شکل مین جلوہ افروز ہوگی، اسی زمانہ
مین ہمین یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ باد وباران، آفتاب وحرارت بیجون کے نشو ونما کے لئے ضروری ہے، طوفان
تک انھین نقصان نہین پہنچا سکتے، عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتین ان کے
ساتھ اشتراک عمل کر رہی ہین؛!

فرض کرو کہ انتظار کی مدت بحمد اللہ گزر گئی، باریک بیجون نے خوش رنگ و دلفریب لالہ و یاسمن کی شکل اختیار کی، فطرت کا زبردست لیکن مانوس معجزہ ہماری آنکھون کے سامنے پیش ہوا، شروع ہی سے ہم جانتے ہین، اور یہ علم مرتبہ یقین تک پہنچا ہے کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے، وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے، اور ہزارون باریکیون کے ساتھ اپنے اندر ان تمام چیزون کا اعادہ کرتا ہے، جو اس پودے میں پائی جاتی ہین جس کا یہ بیج ہے، کیا اس بیج کو اصلی پھول کی "پھوٹنے والی صورت یاد" رہتی ہے؟!

پھول کی غایت تخلیق سے تو ہم واقف نہین، لیکن اتنا ضرور جانتے ہین کہ یہ ہمارے دل کا سرور آنکھون کا نور ہے، کسی کے پاکیزہ الفاظ مین ہم اس کو "ربیع قلبی، نور بصری، جلاء حزنی، ذہاب ہمی" کہہ سکتے ہین!

باغبانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہی ہین، کوئی بات نئی نہین، لیکن میری دانست مین نئی بات جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہون، وہ یہ ہے کہ بالکل انہی قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دنیا کی تمام حسین و خوشگوار چیزون کو حاصل کر سکتے ہین، جو زندگی کے بیج مین مستور ہے وہی ہم میں سے ہر ایک مین موجود ہے، ان چیزون کے حصول کے لئے ہمین زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھولون کے بیجون کی ہم نے کی تھی،

دلفریب پھولون کے لئے آپ نے خارج (عالم اکبر) میں باغ لگایا تھا، شادمانی و مسرت کے حصول کے لئے آپ کو باطن (عالم اصغر) میں باغ کے لئے زمین تیار کرنی ہے، شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا محل و قوع ٹھیک کہان ہے؟ یہ باغ آپ کو اپنے "میدان فکر" میں لگانا ہے، کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم مین سے ہر ایک کے ہان ایک عظیم الشان میدانِ فکر موجود ہے، جس کی وسعت کو ارض و سما نہیں پا سکتے، صرف ہمارا دل ہی اسکو سما سکتا ہے!! افسوس ہے کہ یہ میدان خس و خاشاک سے پٹا پڑا ہے! جانتے ہو کہ یہ خس و خاشاک ہے کیا؟ وہی سلبی افکار و خیالات جن کو مختصر طور پر شر انگیز، بد غلط خیالات کہنا کافی ہوگا، واقفانِ راز کا اصرار ہے کہ یہی ہمارے تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہین! ان سے ذہن و قلب کو پاک و صاف کرنا چاہئے! اس راز کو سمجھنے کے لئے اس نفسیاتی قانون

رکر جس کا ہم نے ابتدا ہی مین ذکر کیا ہے، افکار و خیالات ہی سے ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہین، ات
ہ ہی محرک بن کر ہمین عمل پر آمادہ کرتے ہین، اعمال کی تکرار عادات راسخہ کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اور
ن سوائے ان عادات راسخہ کے منظم مجموعہ کے کوئی اور چیز نہین اور ہماری سیرت ہی ہماری قسمت کا دوسرا
ہے! سلبی خیالات فاسد مقاصد کا تعین کرتے ہین، ان ہی سے تو شر کا صدور ہوتا ہے، شر کا ارتکاب عادت بنکر
ت بد کی تشکیل کرتا ہے، اب میکانکی طور پر بغیر غور و فکر کے شر ہی کا صدور ہونے لگتا ہے، اور شر کے نتائج و ثمرات
ہم سب واقف ہین: درد و رنج، غم و الم، حزن و یاس!

میدانِ فکر کا سلبی خیالات کے خس و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے، اور نیک خیالات کی تخم ریزی
ی سلبی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہین، ان کا زور مردافگن ہوتا ہے، جب ہم اُن سے
ہ کرتے ہین، تو ظاہر ہے کہ ہماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے، اب حیات (یا "چشمۂ حیات") کا
ز توجہ کی طرف ہوتا ہے، بالفاظِ دیگر، اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کرین، اس کے استیصال کی خاطر
، تو زندگی کی تمام قوتین اس کی جانب رُخ کرتی ہین، اس طرح اس کی طاقت مین اور اضافہ ہوتا ہے مثلاً
ہمین بے خوابی کا مرض ہے تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کرین گے، اور اوس کو دور کرنا چاہین گے، بالفاظِ دیگر
ں کا مقابلہ کرین گے اسی قدر یہ تکلیف زیادہ ہوتی جائے گی، اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بالکل بھول جائین
ہم ٹھنڈی نیند سو جائین گے اسی طرح شر کے مقابلہ سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی
ت مین اضافہ ہوتا ہے،

شر کا مقابلہ خیر سے کرنا چاہئے، ظلمت کا مقابلہ نور سے، ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہئے ظلمت کا
قابلہ ظلمت سے کرنا "ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے، اگر تمھین نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو

۵؎ احادیث مین خطرات و وساوس کو دور کرنے کے لئے بعض اذکار یا مطلق ذکر کی ترغیب دی گئی ہے، اوپر جو علاج پیش
ر رہے ہین، اس کا استنباط ان ہی احادیث سے کیا گیا ہے، جو عجیب الاثر نفسیاتی طریقہ ہے،

خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت و ہمت پر نظر جماؤ، خود غرضی کے بجائے ایثار نفس کا خیال رکھو، اسی طرح تمھیں غصہ کے بجائے علم، بیماری کی بجائے صحت، کج خلقی کی بجائے خوش خلقی، شکایت کی بجائے صبر و شکر، خلق کی جبہ سائی کے بجائے رازق مطلق کا خیال اپنے ذہن مین جمانا چاہیئے، تمھارا معروض فکر جو ہوگا، رفتہ رفتہ وہی تم بھی بن جاؤگے، یہی معنی ہین جامی سائیؒ کے اس قول بلیغ کے ؎

گر در دل تو گل گزرد گل باشی　　　　در بلبل بے قرار بلبل باشی!

تو جزوی و حق کل است گر روزی چند　　　　اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی!

اسی فکر کے ایک دوسرے اعتبار پر غور کرو، دنیا مین وہی چیز بُری ہے جس کو ہم بُرا سمجھتے ہین، اگر ہم اس کو بُرا نہ سمجھین تو ممکن ہے کہ وہ ہمارے جسم کو آزار پہنچائے، لیکن وہ ہمارے قلب کو چھو نہین سکتی، یاد رکھو دنیا مین ہر چیز کی قیمت راے پر منحصر ہے، اور راے تمھارے اختیار مین ہے، جب چاہو اسے کو ترک کر دو، پھر اس ملاح کی طرح جس نے اپنے جہاز کو سمندری پہاڑیون سے بچا نکالا ہو تمھیں ہر طرف سکون نظر آئے گا، اگر تم اپنی راے کو ترک کر دو تو پھر یہ شکایت باقی نہ رہے گی، کہ ہاے مجھے نقصان پہنچا، اس شکایت کو ترک کر دو کہ ہاے مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہے گا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ "عقلمند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہین"۔

خیالات کا ماحول پر اثر ناقابلِ انکار ہے، خیالات کی پختگی اور قوت انسان کی روح کو سخت جسمانی تکلیف مین بھی مطمئن اور قوی رکھ سکتی ہے، ارادہ نتیجہ ہے توجہ کا یعنی خیال و فکر کا، جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے، ان ہی پر توجہ کو مرکوز کرتا ہے، انہی کو ذہن میں دہراتا ہے، الٹتا ہے پلٹتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا مملو ہوتی ہے، اور یہی خیالات عالم آثار مین عمل کی صورت اختیار کرتے ہین، خیال حقیقت ہے، عمل اس کا ظہور ہے، ولیم جیمس نے سچ کہا ہے" زندگی کا سارا ڈرامہ ایک ذہنی ڈرامہ ہے ساری شکل ذہنی شکل ہے"۔

میدان فکر کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو، باغبانی کے بیجون کی طرح خیالات کے انتخاب مین بھی حزم و احتیاط ضروری ہے، اور جس طرح بیج کو پودے کی شکل مین نمایان ہوتے کچھ عرصہ لگتا ہے

اور تمھین انتظار کرنا پڑا تھا اسی طرح خیالات کو قلب مین تغیر پیدا کرنے اور ہر نیک عمل مین ظاہر ہوتے دیر لگتی ہے، تمھین پست ہمت نہ ہونا چاہئے اور نہ رنجیدہ، اگر تم نے اپنا کام قاعدے کے موافق کیا ہے خس وخاشاک کو صاف کیا ہے، نیک خیالات کے بونے مین احتیاط برتی ہے، تو شادمانی ومسرت، طمانیت وبردقلبی سرور وکیف وہ گلہائے شاداب ہین جو نتیجہ کے طور پر تمھین حاصل ہون گے،

ان حقائق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلمند جانتا ہے کہ دنیا میں اوس کا کوئی دشمن نہیں، اگر اوس کا کوئی دشمن ہے تو خود اس کا نفس ہے، اَعْدَیٰ عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِی بَیْنَ جَنْبَیْكَ (البیہقی مین حدیث ابن عباسؓ) اس لئے نہ وہ کسی پر ملامت کرتا ہے، اور نہ کسی کی مذمت، بردقلبی کے ساتھ محاسبۂ نفس کرتا ہے، صبر وسکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے، صرف یہی نہین کرتا بلکہ کسی مزید قرض میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے، قلب کا دربان بن جاتا ہے، بد یا سلبی خیال کو داخل ہونے نہین دیتا، داخل ہو جائے تو فوراً نیک یا ایجابی خیال کو اس کی جگہ لے آتا ہے، اپنے افعال کو بے عیب بناتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حال نتیجہ ہے ماضی کا قسمت نتیجہ ہے خیالات کا !

کامل گوید جہان تمام داہل است ناقص گوید کہ کوتہ است وسہل است

شطرنج ہمان عرصہ ہمان رخت ہمان این بردن وباختن زعلم وجہل است

(سحابی استرآبادی)

اسلامی قانون فوجداری

عہدِ مغلیہ کے دو پروانے

از

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدر آباد

رسالۂ معارف ماہ دسمبر ۱۹۳۳ء مین عنوان مندرجۂ بالا کے تحت جو جواب معارف کی جانب سے شائع ہوا ہے، سطور ذیل مین اس کے متعلق بعض امور واضح کئے جاتے ہین،

واضح ہو کہ سلطنتِ آصفیہ مین گذشتہ ڈیڑھ صدی تک جو آئین ریاست اور نظم و نسق رائج تھا، وہ مغلیہ اصول کے مطابق تھا، معاشون کی عطا اون کی بحالی اور ضبطی اور طریقہ کارروائی سب کے سب بالکلیہ مغلیہ اصول کے پابند تھے، اس لئے انہی امور کی روشنی مین زیر بحث پروانون پر مزید غور کیا جائے تو نامناسب نہین ہوگا،

اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ دورِ مغلیہ مین معاشون کی عطا بذریعۂ "فرمان" یا پروانہ ہوتی تھی، سند یا تصدیق نامہ کے ذریعہ معاش عطا نہیں کی جاتی تھی، "پروانچہ" کے نام سے بھی مغلیہ عہد کے کاغذات موجود ہین، پروانچہ، پروانہ کی تصغیر ہے، اور بلحاظ وجاہت شخصی پروانہ اور پروانچہ کا اجراء ہوتا تھا[1]

جو عطا یا بادشاہ یا دیوان کے حکم سے ہوتی تھی، وہ عطیۂ سلطانی سے موسوم ہوتی، اور زیادہ موثر اور دیرپا تصور کیجاتی، جاگیردار یا بعض صوبہ دار جو معاش اپنی جاگیر یا اپنے علاقہ مین عطا کرتے تھے، تو اس کی سند خود دیتے تھے، لیکن بعد مین اکثر اس کی توثیق شاہی بھی ہوجاتی تھی، اور اب یہ عطیۂ سلطانی

---

[1] دفتر دیوانی حیدرآباد مین مغلیہ عہد کے کاغذات بھی موجود ہین،

ہو جاتی، جو وثیقہ اس عطا کا جاری ہوتا، اس کی عبارت میں اس امر کا بھی اظہار کر دیا جاتا کہ معاش اوّلاً کن کی عطا کردہ تھی،

اگر عطا کے وثیقہ (فرمان، پروانہ، سند) میں نسلاً بعد نسلٍ یا دوام کے الفاظ درج نہ ہوتے تو عموماً معطیٰ لہ کے مرنے کے بعد معاش ضبط ہو جاتی تھی، اور اس کے بعد دوبارہ اس کے فرزند اکبر یا وارث کے نام تجدید ہوتی اور یہ تجدید پھر ذریعہ فرمان، پروانہ یا سند ہوتی تھی، گویا معاش کی تحقیقات ہو کر دوبارہ بحالی ہوتی،

اراضی معاش کے لئے ایک مرتبہ عطا ہو جانا کافی ہوتا تھا، لیکن نقدی معاش یعنی یومیہ، سالیانہ اور معمول کے لئے ہر سال دفتر دیوان سے جدید احکام کی ضرورت ہوا کرتی تھی، ہر سال اس قسم کی معاش کے لئے سرکاری حکم نافذ ہوتا تھا،

اس وضاحت کے بعد اب اگر فرمانِ نصرت جنگ کے متعلق غور کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ قاضی شیخ بدرالدین کو کارطلب خان اور محمد شفیع خان نے جو معاش عطا کی تھی، اس کی توثیق عطیۂ سلطانی کی حیثیت سے ہوتی گو اس فرمان کے باعث ان کی عطا شاہی عطا ہو جاتی ہے، یہ تصدیق نامہ نہیں، بلکہ دراصل فرمان یا پروانہ ہی ہے، اسی طرح دوسرا پروانہ ایک احکام یا سرکاری مراسلہ کی حیثیت رکھتا ہے، چار فلوس یومیہ مسجد کے تیل کے اخراجات کے لئے جاری ہوا ہے،

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے پروانے یا احکام ایک اصولی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے معارف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ

"ان تصدیق ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلقہ کے عمال حکومت قاضی صاحب موصوف کو بار بار پریشان کرتے رہتے تھے، اس لئے قدیم عطایا کی تصدیق دوبارہ کرائی گئی، چنانچہ اسی تصدیق کے لئے عہدِ عالمگیری میں دو پروانہ صادر ہوا، پھر امتدادِ زمانہ سے جب عمال نے دوبارہ چھیڑ چھاڑ کی تو عہدِ محمد شاہی میں جدید تصدیق نامہ جاری ہوا"

چنانچہ خود اس امر سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ہر سال سند مجدد نہ طلب کرنے کا تذکرہ آخری پروانہ مین کر دیا گیا ہے یعنی اس پروانہ کے بعد دوبارہ اوس کی تجدید کی ضرورت نہین رہی،

معارف: لفظ تصدیق نامہ بطور اصطلاح استعمال نہین کیا گیا تھا، بلکہ بطور مفہوم تھا کہ اس فرمان یا پروانہ شاہی سے سابق عطا کردہ پروانہ کی توثیق و تصدیق ہی مقصود تھی، انہین "فرمان" کے بجائے "تصدیق نامہ" سے خاص طور پر اس لیے تعبیر کیا گیا کہ مستفسر کی خدمت مین یہ اشارہ کیا جا سکے، کہ ان کے ان مراسلہ فرامین کے ذریعہ قاضی بدر الدین کو اراضی معاش پہلی مرتبہ عطا نہیں کی گئی تھی، بلکہ وہ فرامین جوان سے پہلے کے ہین، اور جنھین مستفسر نے ارسال نہین کیا تھا، در اصل ابتداءً انہی کے ذریعہ اراضی عطا ہوئی تھی، اس لئے آخر مین کہا گیا تھا کہ

"اب اگر اصل پروانہ آپ ارسال کرین تو اس کی صحیح تاریخ متعین کیجا سکتی ہے"۔

ورنہ ظاہر ہے کہ عطیات کے لئے فرامین ہی جاری ہوتے تھے، اور وہ اصطلاحاً فرمان ہی کہے جائین گے،

"س"

عرب کی موجودہ حکومتین

جزیرۃ العرب کے ساتھ مذہبی تعلق و عقیدت کے باوجود ہندوستان کے مسلمانون کو نجد و حجاز کے علاوہ عرب کے دوسرے حصون اور حکومتون کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے، اس لئے اس کتاب مین عرب کا تفصیلی جغرافیہ اور تمام قابلِ ذکر حکومتون نجد و حجاز، عسیر و یمن، لحج، نواحی تسعہ، بحرین، کویت اور فلسطین و شام کے مختصر حالات جمع کر دیے گئے ہین،

ضخامت ۱۰۰ صفحے، قیمت: ۱۲ھ

منیجر دار المصنفین

استفسار و جواب

فنِ تصوّف

اور

محدثین و صوفیہ مین تطبیق کی راہ!

جناب عبدالرحمٰن صاحب متعلم
پرنس آف ویلز کالج جموّن (کشمیر)

محترمی جناب سید صاحب مدفیوضہٗ
السّلام علیکم

جب سے آپ کی ذاتِ گرامی سے غائبانہ تعارف ہوا ہے اُسی وقت سے یہ شوق دامنگیر رہا ہے کہ خط وکتابت ہی کے ذریعہ آپ سے کچھ استفادہ کیا جائے،

اپنے دینی شعور کی ابتدا ہی سے مین نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر مسئلہ مین کتاب و سنت ہی کو معیارِ حق اور دلیلِ راہ بنایا ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ فقہی مسائل مین مسلمانون مین جو اختلاف پایا جاتا ہو اس کی نوعیت کو کسی حد تک سمجھ سکتا ہون، اور ان مسائل مین "اہلِ ظاہر" اور "اصحاب رائے" کے بین بین کی راہ یعنی فقہار محدثین" یا "اصحاب حدیث" کے مسلک کی ترجیح کا قائل ہون، لیکن جو اختلاف محدثین اور صوفیاے کرام مین پایا جاتا ہے، اس کی حقیقت کے سمجھنے مین ابھی تک پریشان ہون، اور اس الجھن سے نکلنے کے لئے سیرت نگار رسول ہی کی راہ نمائی کی ضرورت ہو، اور وہ سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باطنی اور روحانی زندگی کے حالات و کیفیات کے بیان کرنے مین محدثین عظام اور

صوفیاے کرام میں کس کی ترجمانی زیادہ صحیح ہے، اور آپؐ کی پاک زندگی کے اس شعبہ کے علم و عمل کے جاننے میں کون سا گروہ حقیقت کے زیادہ قریب پہنچ سکا ہے، اور ان میں سے کس جماعت کا راستہ حق کا راستہ ہے؟ اور اگر یہ دونوں گروہ ہی افراط و تفریط سے نہیں بچ سکے، تو اہلِ حق کون ہیں، "اصحاب اتقا" کا طریق کیا ہے اور اس مسلک کے ائمہ کون کون بزرگ ہیں؟ اسی سوال سے متعلق چند ایک سوالات ہیں جنھیں نمبروار درج کرتا ہوں!

۱- الاحسان (الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ الخ الحدیث) کی غایت کیا ہے؟

۲- کتاب اللہ کی تعلیم اور اُسوۂ حسنہ رسول اللہ میں الاحسان کے حصول کا طریق کیا ہے؟

۳- کیا الاحسان کے حصول کے لئے بیعت کرنا لازم ہے، اور اس کے بغیر الاحسان کا حصول ممکن نہیں؟

۴- زمانہ نزولِ قرآن کی عربی زبان قرآن مجید اور احادیثِ رسول اللہ میں بیعت کا مفہوم کیا ہے؟ عہدِ جاہلیت میں اس کی غرض و غایت کیا تھی، اور پھر اسلام میں کیا ہوئی؟

۵- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افرادِ صحابہ سے الگ الگ مختلف اوقات میں جو بیعت لی، اُس کا اقرار اور غرض و غایت کیا تھی؟ اور جو پوری جماعتِ صحابہ سے مختلف اوقات میں لی اُسکے اقرار کے الفاظ اور غرض و غایت کیا تھی؟ کتبِ حدیث میں انکے نام اور اقرار کے جو الفاظ ہیں وہ کیا ہیں؟ عہدِ خلفاے راشدین میں اس انفرادی اور جماعتی بیعت کا کیا حال رہا؟

۶- صوفیاے کرام جو بیعت لیتے ہیں، کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟ کیا اس کی نظیر سُنّت میں ملتی ہے، اور کیا یہ عہدِ رسالت میں عہدِ خلافتِ راشدہ سے ہی رائج چلی آتی ہے؟ رسالت کے بعد کے دوروں میں اس کی کیا حالت رہی؟

میں اگرچہ "اصحاب الحدیث" کے مسلک کو راجح سمجھتا ہوں، لیکن "اہلِ حدیث" کے نام سے ملک میں جو جماعت پائی جاتی ہے، وہ ایک طرف تو الاسلام کی بنیادی اور مرکزی دعوت کی علم بردار نظر نہیں آتی، اور صرف فقہ کے چند اختلافی مسائل ہی اس کی دعوت کا مرکز ہیں، جن کی طرف وہ سب کو

ملاتی ہے، اور دوسری طرف یہ کہ جن بزرگوں کی طرف اپنی نسبت کرتی ہے، جہاں ان کی زندگی کا حقیقی مقصد اور ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ اس کی نظر سے اوجھل ہوگیا ہے، وہاں ان بزرگوں کی زندگی کا ایک خاص پہلو تو خاص طور پر نظرانداز کردیا گیا ہے اور وہ ان کی زندگی کا روحانی حصہ اور نبوت کی وراثت کا باطنی پہلو ہے، اور یہ شاید اس لئے لکھ گیا ہوں کہ میرے سامنے ہمیشہ اسی کی نقاب کشائی کی جاتی رہی ہے، کیونکہ میں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، اس میں فقہ کے اختلافی مسائل کا آنا چرچا تو نہ تھا، البتہ سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی سے لیکر مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میاں سنگھ ضلع گوجرانوالا پنجاب) اور العارف باللہ مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے صالحین فرزندوں تک کی کرامات، تزکیۂ نفس، روحانی بلندی، اور انابت الی اللہ کی حکایات، ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر جاری تھیں،

اگرچہ میں نے اپنے بچپن میں اپنے ہی خاندان کے وہ بزرگ جوان بزرگوں سے مستفیض تھے دیکھے، مگر میرے ہوش سنبھالنے تک وہ ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے، اور اب صرف ان کی زبانی حکایتیں سنانے والے ہی باقی رہ گئے تھے، جو مزے لے لے کر بزرگوں کی کہانیاں سناتے تھے، تاہم اس کا اثر یہ ہوا کہ بچپن ہی میں مجھے حضرت امیر المومنین سید احمد شہید اور مولانا شہید سے عقیدت ہوگئی، اور پھر انہی کی عقیدت نے میرے دل میں مولانا عبداللہ غزنوی اور ان کے خاندان سے محبت کا ایک خاص جذبہ پیدا کردیا،

میں نے عربی اس لئے پڑھنی شروع کی تھی کہ مجھے قرآن مجید کا فہم نصیب ہو، لیکن افسوس کہ جب انٹرمیڈیٹ تک پڑھکر بھی قرآن کی زبان نہ آئی، تو قرآن مجید کیونکر سمجھ میں آئے، قرآن مجید سے مجھے جو دلچسپی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن فہمی اور مطالب قرآن کو حاصل کرنے کے لئے بھی آپ سے ہدایت اور مشورہ حاصل کروں،

قرآن فہمی کے لئے سامان پیدا کرنے کی ذمہ داری سب سے پہلے "دار المصنفین" پر عائد ہوتی ہے بلکہ جہاں تک جلد ممکن ہو عملی طور پر ندوۃ العلماء میں اس طریق پر قرآن مجید پڑھانے کا انتظام کیا جائے کہ قرآن فہمی کی راہ آسان ہوجائے

معارف :

مکرم زادکم اللہ علماً وعملاً

السلام علیکم، آپ کا خط پا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ ایک مدت کے بعد مجھے ایسے کسی خوش خیال نوجوان سے مکاتبت کا اتفاق ہوا آپ جس راہ پر ہین، وہ بالکل ٹھیک ہے، بشرطیکہ اس راہ اور راے کے مطابق آپ کو عقیدہ اور عمل کی سعادت بھی حاصل ہو، اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا، بحمد اللہ کہ آپنے فقہاء اور محدثین کے درمیان تطبیق کی راہ پالی ہے، تو اب محدثین اور صوفیہ کے درمیان راہ پانا بھی مشکل نہ ہوگا،

محدثین مین بھی صوفیہ گذرے ہین، امام ابن حنبل، عبد اللہ بن مبارک، امام بخاری و مسلم ترمذی سب ہی صوفی حقیقی تھے، اور اصطلاحاً محدثین مین امام قشیری صاحب رسالۂ قشیریہ، ابونعیم اصفہانی صاحب حلیۃ الاولیاء، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی طریق قادریہ کے بانی حنبلی المشرب اور ٹھیٹھ محدث تھے، اون کی کتاب غنیۃ الطالبین چھپی ہوئی ہے، اور آپ پڑھ سکتے ہین، حافظ ابن قیم کی صوفیت پر ان کی کتاب منازل السائرین و مدارج السالکین گواہ ہے، اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ہیں، ان کے مکتوبات کا مطالعہ آپ کر سکتے ہین، حضرت شاہ ولی اللہ، اور ان کے اخلاف صدق محدثین دہلی بھی صوفی تھے، اور ان کی تصانیف موجود ہین، مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سلوک کو صراط مستقیم نام کتاب مین مرتب کیا ہے، جو طبع ہو کر بار بار شائع ہوئی ہے، اُس کو بھی آپ پڑھ سکتے ہین،

لیکن بات یہ ہے کہ حضرات محدثین رحمہم اللہ بحیثیت محدث ہونے کے صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے حالات و کمالات کے جاننے، اور دوسرون کو سنانے کا فرض عائد ہے یعنی ان کا یہ فرض نہین کہ وہ بتائین کہ ان حالات و کمالات کی حقیقت کیا ہے، اور ان کے حصول کی تدابیر کیا ہین، کیونکہ یہ بھی ایک فن ہوگیا ہے جس طرح فقہ اور کلام اور فرائض و تفسیر و حدیث ایک ایک مستقل فن ہین، اور ان مین سے ہر ایک کی اصطلاحین ہین، اور ان کی عملی و نظری مشکلات ہین، جن کے سمجھانے کے لئے فقہاء مفسرین، محدثین، اور متکلمین کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح

فن سلوک کے لئے سالکین کاملین کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس فن کی علمی و عملی دقتوں کو رفع کریں،

یہ فن نظری سے زیادہ عملی ہے، اس کے لئے ایسے کاملین کی ضرورت ہے جو اپنے حسن اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اسوۂ نبوی ہوں، جو اپنے اعمال، آداب، اخلاق، عادات اور اتباع اوامر و نواہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہوں جن کی صحبت میں پرتو نبوی کا اثر ہو، اور جن کا سلسلۂ صحبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک صحبت تک منتہی ہو جس کا اصطلاحی نام شجرہ ہے، جس طرح فن روایت میں اس کا نام سلسلہ ہے،

اسی مفہوم کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ علم حدیث جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کا سلسلہ ہے، یہ سلوک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا سلسلہ ہے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا سارا فیض صحبت نبوی کی تاثیر کا نتیجہ تھا، ان کے بعد صحابہ کے فیض سے تابعین اور تابعین کے فیض صحبت سے تبع تابعین کا ظہور ہوا، یہ تین دور ایسے ہیں، جن میں پچھلی جماعت اگلی جماعت سے بحیثیت جماعت کے متاثر ہوئی مگر ہر دور میں جماعت کم اور کیف یعنی تعداد اور حالت میں کم ہوتی گئی، تبع تابعین کے بعد جب فتنوں کا ظہور ہوا، تو تعداد اور بھی کم ہوگئی، اب جماعت کی صحبت جماعت سے جاتی رہی، اب اشخاص کاملین کی صحبت سے اشخاص باستعداد کے پیدا ہونے کا سلسلہ ہوا، جس کا نام متاخرین نے ارادت یا پیری و مریدی رکھدیا ہے، ورنہ قدماً اور سلف صالحین کی اصطلاح صحبت ہی کی تھی، مرید کو صاحب یعنی صحبت یافتہ کہتے تھے، جیسے امام محمد اور قاضی ابو یوسف کو صاحب امام ابو حنیفہ کہتے ہیں، اسی طرح حضرت شبلی و جنید کے مرید بھی صحبت یافتہ کہلاتے تھے، جیسے یوں کہتے تھے کہ فلاں شخص نے شبلی کی صحبت اوٹھائی ہے، یا جنید کی صحبت اوٹھائی ہے، یہ رسمی بیعت جو ایک مدت سے رواج پذیر ہے، یہ محض رسم و عرف ہے، اور جس کا مقصد یہ ہے کہ پیر و مرید کا باہمی معاہدہ ہے، کہ پیر اپنے علم کے مطابق تعلیم و تربیت اور خیر خواہی میں کمی نہ کرے گا، اور مرید اسکی تعمیل میں کوتاہی نہ کرے گا، اور اسکی اصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں ہے، کہ آپ کبھی خاص خاص صحابہ سے اور کبھی حاضر مجلس صحابہ سے امور خیر پر بیعت لیتے تھے، تاکہ جن سے بیعت لیجائے، ان میں اس معاہدہ کی اہمیت ہو اور وہ اس کی تعمیل میں پوری ہمت صرف کریں،

اور اُن کو یہ خیال رہے کہ مین نے اس بات کا معاہدہ کیا ہے، اس کے خلاف کرنے مین ہچکچاہٹ محسوس ہو، اور چونکہ جس کے ہاتھ پر یہ معاہدہ کیا جاتا ہے، اوس سے عقیدت اور محبت ہوتی ہے، اور یہی عقیدت و محبت اس کے ہاتھ پر معاہدہ کئے ہوے امور کی تعمیل پر آمادہ کرتی رہتی ہے، یہی اس بیعت کا حاصل ہے کہ شیخ اپنے سلسلہ کے ارادتمندون کو امور خیر کی تعلیم دیتا ہے، ان کے حقائق سے باخبر کرتا ہے، اُن کی تعمیل کا طریقہ بتاتا ہے، اور سالک کے ذہنی اور عملی مشکلات کو حل کرتا رہتا ہے، مثلاً غرور بری چیز ہے، اب یہ امر کہ غرور کی حقیقت کیا ہے، اور غرور کہتے کس کو ہین اور اوس سے بچنے کی تدبیر کیا ہے، اور ایا ہمارا فلان کام غرور کی حد مین داخل ہے کہ نہین، اس کا جواب نہ خالص محدث دے سکتا ہے، اور نہ خشک فقیہ ان کو حل کرسکتا ہے، نہ مفسر بتا سکتا ہے، اور نہ متکلم ان کی عقدہ کشائی کرسکتا ہے، اب ان سوالات کا جواب جو بھی دے سکتا ہے، وہ شیخ طریقت ہے، جو ممکن ہے کہ محدث بھی ہو فقیہ بھی ہو مفسر بھی ہو یا نہ ہو، ہو تو بہتر ہے، نہ ہو تو حرج نہیں مگر متبع ضرور ہو، جس نے اپنے بزرگون سے اون کو سیکھا اور جانا ہے، یا اوس نے خود کتاب وسنت سے ان امور کی واقفیت پیدا کی ہے، اور عمل کرکے اس رتبہ پر پہنچا ہو کہ غرور و تکبر سے اپنی استعداد کے مطابق پاک وصاف ہوگیا ہے، اور دوسرون کو بھی اپنی تعلیم و صحبت سے ایسا ہی بنا سکتا ہے،

اسی تقریر کو ایک اور نہج سے ذہن نشین کرتا ہون حضور انور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ مبارک مین دو صفتین تھین، یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ (یعنی آپ لوگون کو کتابِ الٰہی اور سُنّتِ نبوی کی تعلیم دیتے ہین) وَیُزَکِّیْھِمْ (یعنی آپ لوگون کو عملاً بھی پاک صاف بنا دیتے ہین، انکے رذائل کو دور کرکے ان کو فضائل سے آراستہ کرتے ہین) ذات پاک مین یہ دونون صفتین یکجا تھین، صحابہ مین بھی عموماً یہ دونون صفتین یکجا رہین، تابعین مین کچھ کمی رہی تاہم ان مین بھی خاصی یکجائی رہی، تبع تابعین مین اکثر یہ یکجائی ایک محدود حلقہ مین رہ گئی، اس کے بعد سے یہ یکجائی صرف اشخاص مین ہونے لگی، ورنہ عام طور پر حال یہ ہوگیا، کہ یُعَلِّمُھُمْ یعنی زبانی تعلیم کی صفت تو علما اور فقہا نے اختیار کرلی، اور یُزَکِّیْھِمْ یعنی تزکیہ کو صوفیہ نے اپنا کام بنالیا، پہلی چیز مدرسہ مین چلی گئی، اور دوسری خانقاہون مین، مگر ہر دور مین بحمد اللّٰہ تعالیٰ ایسے کاملین ضرور

ہوتے گئے، جو ان دونون صفتون کے جامع اور حامل تھے، اور وہی درحقیقت وارثِ نبوت تھے، مثلاً ہندوستان مین حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ان دونون کا جامع تھا، ان کے جانشینون مین بھی یہی جامعیت تھی

آج کل یہ ہوگیا ہے کہ یُعَلِّمُھُمْ یعنی تعلیم نبوی کی خدمت علماء کا شغل ہے، اور یُزَکِّیْھِمْ یعنی تزکیہ کا شغل صوفیہ کا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ یہ دونون صفتین یکجا ہون،

ہمارے اس بیان مین صوفیہ سے مقصود رسمی صوفی نہین جو درحقیقت دکاندار ہین، بلکہ وہ متبعین سنت مراد ہین جنھون نے علماً و عملاً اس راہ کا کمال حاصل کیا ہے، اور منزلِ مقصود تک پہونچتے ہین، صوفی اور تصوف کے لفظ سے بھی بعض لوگون کو بھڑک ہوتی ہے، سو یہ اصطلاحی نام ہے، جو لفظی بدعت ہے، جس طرح تفسیر او مفسر حدیث اور محدث، فقہ و فقیہ کی اصطلاحین ان کے خاص جدید معنون مین صحابہ کے عہد مین مروج نہین یہ لفظ اوس زمانہ مین اگرچہ بولے گئے ہین، اور یہ عربی زبان کے لفظ بھی ہین، مگر ان کے اصطلاحی معنی اون سے مختلف ہین، یہی حال تصوف اور صوفی کا ہے، خواہ یہ لفظ صوف سے نکلا ہو یعنی پشمینہ پوشی سے جو زہد کی علامت تھی، یا فلسفہ کے لفظ کی طرح یہ یونانی تھیا سوفی سے آیا ہو، لفظ کی بحث نہین تاہم یہ لفظ بےشبہہ بدعت ہے، یعنی بنا ہے اور باہر سے آیا ہے، مگر اوس کی حقیقت بدعت نہین ہے، قرآن پاک کی اصطلاح مین اوس کو اخلاص کہئے، حدیث کی رو سے اوس کو احسان کا نام دیجئے، اور کام کے لحاظ سے اس کو اخلاص فی الدین اور تقوی کے حصول کا فن کہئے،

وَلَا مُشَاحَۃَ فِی الاصطلاح،

یہ امر بے شبہہ صحیح ہے کہ جس طرح دوسرے فنون مین غیر جگہوں سے چیزین آکر شامل ہوئی ہین، مثلاً فقہ کے لئے اصول فقہ تیار ہوگیا، اور قیاس نے ایک فنی صورت اختیار کرلی، علم کلام و عقائد مین فلسفہ داخل ہوگیا، اور منطقی و فلسفی دلائل و بحج و براہین کا شیوع ہوا، اسی طرح اس علم احسان و اخلاص مین بھی بعض باتین باہر سے آگئی ہین، جن کو خواہ تدابیر کے درجہ مین لاکر مان لیا جائے، یا اُن سے بھی احتیاطاً پرہیز برتا جائے، دونون پہلو ہوسکتے ہین، مگر اس سے اصل فن پر کچھ اثر نہین پڑسکتا، اس فن کی جو اصطلاحین نئی ہین وہ افہام و تفہیم کی سہولت کی

خاطر اختیار کی گئی ہین، اون سے بھڑکنا حماقت ہے، جب کوئی چیز فن بن جاتی ہے، تو اصطلاحات سے چارہ نہین ہو سکتا

اب اس فن کے مسائل پر آئیے، مسائل اولین یہ ہین :-

رذائل کیا کیا ہین، ان رذائل کی حقیقت ازروے قرآن وحدیث کیا ہے، اوران رذائل کی بیخکنی کیونکر ہو،

ان کے بالمقابل فضائل کیا ہین، ان کی حقیقت کیا ہے، اوران کے حصول کی تدابیر کیا ہین، ہم غیبت سے کیونکر بچین، ریا سے کیونکر محفوظ رہین، جھوٹ بولنا کیونکر ہم سے چھوٹ جائے، اوراوس کے بالمقابل صدق مقال اوراخلاص عمل کیسے پیدا ہو، توکل، صبر وشکر، استقامت کیسے حاصل ہو، ہمارے قلب سے دنیا کی محبت کیسے نکلے، اوراللہ تعالیٰ کی محبت اوس مین کیسے بیٹھے،

وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (خدا کی طرف سب سے کٹ جا) اور رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ (ایسے لوگ جن کو بیع وفروخت وغیرہ دنیا کے اشتغال خدا کی یاد سے غافل نہین کرتے) یہ حالت ہم کو کیسے حاصل ہو اوران فرائض قلبی کے ادا کرنے کا طریق کیا ہے، نماز مین قنوت یعنی خوف وخشوع کیونکر پیدا ہو، اکلِ حلال کیا ہے، تقویٰ کیسے ہو، ایمان باللہ تعالیٰ کیونکر قوی ہو، دوام ذکر کیسے حاصل ہو وغیرہ،

یہان تک تو مین نے نفسِ فن کی حقیقت کا ذکر کیا ہے، اوران غلطیون کو دور کرنا چاہا ہے، جو اس کے متعلق عام لوگون مین شائع ہین، اب آپ کا سوال یہ ہے کہ اب یہ کہان ہے، سو اوس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ہر علم وعمل کے ماہر عہد بعہد کم ہوتے جاتے ہین، اسی طرح اس کے بھی بہت کم ہین، علماے غزنویہ امرتسر کی تعریف مین نے بھی سُنی ہے، جو محدّث اورصوفی ایک ساتھ تھے، پہلے علماے اہلِ حدیث مین بھی ایسے لوگ تھے، اوراب بھی ہونگے، میرے علم مین سیالکوٹ کے مولانا ابراہیم صاحب کو ضروران امور سے مناسبت ہے، گو مدت سے اُن سے ملاقات نہین ہوئی، علماے احناف مین بھی بحمداللہ لوگ ہین،

قرآن پاک کے متعلق جو کچھ آپنے کہا ہے وہ صحیح ہے، دارالعلوم ندوہ اوردارالمصنفین دونون مین اسکے سلسلے ہین

" س "

عہدِ اسلامی میں تعلیم نسوان کی درسگاہیں

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی.
ممتاز پنشنر، خیرت آباد، حیدر آباد دکن

۱۔ تاریخوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں دنیاے اسلام کے مساجد میں مدرسے قائم ہو گئے تھے، اور ان میں ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی، پانچویں صدی ہجری سے علٰحدہ درسگاہیں اور جامعات تعمیر ہونے لگے، چنانچہ علامہ شبلی اور مولوی ابو الحسنات صاحب ندوی کے مقالہ سے اسلامی ممالک و ہندوستان کے مدرسوں کا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے، لیکن ان میں کسی نسوانی مدرسے کا نام شریک نہیں ہے، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ نسوانی مدارس موجود ہوں، اور ان کا تذکرہ تاریخ اسلام کی کتابوں میں نہ ہو، لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہو گا، کہ دنیاے اسلام میں علٰحدہ مدارسِ نسوان نہیں تھے،

۲۔ جب مدارس نسوان قائم نہیں تھے، تو دنیاے اسلام میں تعلیم نسوان کا کیا طریقہ تھا، ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کس طرح ہوتی تھی، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام میں عورتوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی کیونکہ تاریخ اسلام میں بیسیوں خواتین کے نام ملتے ہیں، جنھوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پائی، اور حتیٰ کہ بعض شیوخ وقت کے اساتذہ میں خواتین کے نام شامل ہیں،

۳۔ شیخ سعدی کی گلستان کے ساتویں باب کی چوتھی حکایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مدرسوں میں لڑکے اور لڑکیاں (جن میں بالغ بھی شامل تھے) ایک ساتھ درس لیا کرتے تھے، نیز الف لیلہ کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ

اس وقت لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم لیا کرتی تھیں تو کیا یہ صحیح ہو سکتا ہے، کہ ابتدائی تعلیم جو موجودہ ثانوی تعلیم قرار دیجا سکتی ہے، اسلامی مدارس میں مخلوط ہوتی تھی،

۴۔ غالباً ہندوستان مین شروع سے اس طرح کی مخلوط تعلیم نہین تھی، بلکہ اکثر محلون مین شرفا کے مکانون مین مدرسۂ نسوان قائم ہوتے تھے،

غالباً ان کا نہج تقریباً وہی تھا جس کو مولانا نذیر احمد نے اپنی کتاب مین اصغری خانم کے مدرسے کا حال لکھا ہے، فقط،

معارف: جواباً عرض ہے:۔

جہان تک میری نظر ہے چھوٹی لڑکیون کی تعلیم کے لئے گھر سے باہر کوئی چہاردیواری مسلمانون نے نہیں بنائی، اور نہ مساجد مین اور نہ کتّاب یعنی مکاتب مین لڑکون کے ساتھ وہ نظر آئین، صرف سواحل ہند مین ایک ساحلی شہر تھا، جہان ابن بطوطہ کو لڑکیون کے مکاتب نظر آئے، اس کا بیان ہو کہ سواحل ہند مین ہنور کے مقام مین ۱۳ مکتب لڑکیون کے تھے (جلد ۳ ص ۱۳۳، مصر)

عملی تواتر سے جو واقعہ ثابت ہوتا ہے، وہ وہی ہے جو اصغری خانم کے مدرسے کا ہے، یا یہ کہ امراء اپنی لڑکیون کے لئے کوئی معلمہ یا مستند وثقہ و معمر معلّم بپابندی پردہ مقرر کرتے تھے، جیسا کہ سلاطین مغل کی خواتین زیب النسأ وغیرہ کے احوال مین ہے،

بے شبہہ اعلیٰ تعلیم جیسے علم حدیث وغیرہ مین یہ طریقہ بھی مذکور ہے، کہ مساجد و محافل مین کسی استاد یا محدث کے املا مین عورتین بھی حاضر ہو کر سنتی تھین، اور روایت کرتی تھین، بلکہ وہ بھی مجلس مین بیٹھکر املائے حدیث کرتی تھین، اور مرد تلامذہ و سامعین ان کو سنتے تھے، لیکن پہلی صورت مین عورتون کا انتظام نشست الگ تھا، اختلاط نہ ہوتا تھا، جیسا کہ احادیث مین ہے، کہ عورتون کے لئے الگ انتظام ہوتا تھا، اور دوسری صورت مین بیچ مین پردہ حائل ہوتا تھا، جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے احوال مین ہے، یا اگر وہ بہت بوڑھی ہوتی تھین تو کشف وجہ بھی کرتی ہون گی، مگر تصریح میری نظر مین نہین ہے،

یہ بھی تھا کہ باپ اور بھائی اپنی عزیز بیٹیون اور بہنون کو خود اعلیٰ تعلیم دیتے تھے، اور اس کی مثالین

بکثرت ہندوستان مین پہلے بھی تھین، اور اب بھی ہین، اور بعض فقیہات اسلام کے تذکرون مین بھی ہے بعض اپنے شوہرون سے حاصل کرتی تھین،

"س"

رجب علی سرور اور اس کی ایک عرضداشت

جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی ایم اے
قائم مقام پرنسپل اسلامیہ کالج بریلی

۱۔ رجب علی سرور کے مفصل حالات کہان ملین گے؟

۲۔ "انشاے سرور" مین ایک عرضداشت ہے جس کی نقل درج ذیل ہے:۔

"عرضداشت حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ، عرصہ ہوا خانہ زاد نے نسخۂ فسانۂ عجائب پیشکش کیا تھا، گو ہدیۂ مور نا توان پیش سلیمان زمان اور نظر گدا آگے سلطان جہان کچھ حقیقت نہیں رکھتی مگر نگاہ پرورش شاہنشاہ زمان مثل خورشید درخشان گل و خار پر یکسان ہوتی ہے، اس امید پہ ہمہ تن چشم و گوش عتبۂ بوسی کا رہا، لیکن ناسازی بخت نے محروم رکھا، اب جمعیت پریشانی اور سامان بے سامانی سے گھبرا کر عرض رسا ہون کہ اگر سلک کفش برداروں اور زمرہ جان نثارون مین آ بر دیا ؤن تو سر خاک فتادہ سے کمر خمیدہ فلک پیر چھو آؤن، بقدر لیاقت خانہ زاد کو جو کچھ فرمان خدایگان دارا دربان بجا آوری اس کو فخر و سعادت جان کر جان تک دریغ نہین، الٰہی کو س جود و سخا و غلغلہ کشورستانی و شہرہ جہانبانی بلند آوازہ و گلشن سلطنت شاداب و تر و تازہ باد، ع

الٰہی در جہان باشی باقبال   جوان بخت و جوان دولت جوان سال   (ص۳)

خیال ہے کہ یہ عرضداشت ۱۸۲۴ء اور ۱۸۲۷ء کے درمیان لکھی گئی، اس مین کسی شبہہ کی گنجایش نہین ۱۸۲۴ء مین فسانۂ عجائب ختم ہوئی،

اس عرضداشت کے مخاطب غالباً واجد علی شاہ نہیں، اس لئے کہ وہ ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے، اور ۱۸۴۷ء ہی میں سرور کا تقرر ہو گیا "عرصہ ہوا خانہ زاد نے نسخۂ فسانۂ عجائب پیش کش کیا تھا" اس جملہ سے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے، اگر اس عرضداشت کو واجد علی شاہ کی طرف منسوب کیا جائے، تو مذکورۂ بالا فقرہ مہمل ہو جاتا ہے، اس لئے قیاس ہے کہ یہ عرضداشت نصیر الدین حیدر کو لکھی گئی، لیکن پھر محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کو کیوں چھوڑا جائے ؟ ان دونوں کو ادب سے خاص لگاؤ تھا ؟ کیا یہ قیاسات صحیح ہیں؟

۳۔ تذکرۂ خندۂ گل میں رقعات جعفر زٹلی کا ذکر ہے، یہ رقعات تمثیلی اور فرضی ہیں یا اصلی اور حقیقی؟

معارف : محترمی زاد لطفکم

السلام علیکم :۔ آپکے دونوں گرامی نامے موصول ہوئے، جواباً گذارش ہے :۔

۱۔ رجب علی سرور کے حالات محض جستہ جستہ حسب ذیل مآخذ میں ملتے ہیں تذکرۂ ذکا (اسپرنگر) گلشن بیخار شیفتہ (ص ۱۴۵) سخن شعرا، نساخ (ص ۲۱۳) گلستان سخن قادر بخش (ص ۲۹۵) موجودہ دور کی تصنیف میں سیر المصنفین تنہا حصہ اول (ص ۱۴۹) مقدمۂ انتخاب فسانہ عجائب مخمور اکبرآبادی، جواہر سخن (ہندستانی اکاڈیمی) تاریخ ادب اردو سکسینہ، وغیرہ میں ذکر آیا ہے،

۲۔ فسانۂ عجائب کی تاریخ اختتام تصنیف آپنے ۱۸۲۵ء کہاں سے متعین کی ہے ؟ اس کی تاریخ تو خود مصنف نے خاتمۂ تصنیف میں لکھی ہے،

جس نے کہ سنا اوس کو جی میں یہ لگا کہنے — یارب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا

تاریخ سرورؔ اس کی منظوم ہوئی جس دم — بے ساختہ جی بولا نشتر ہے رگ دل کا

۱۲۴۰ھ

۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء

رجب علی سرور کے سوانح میں آپ کی نظر سے گذرا ہوگا، کہ غازی الدین حیدر کی شان میں اوس نے ایک قصیدہ اس امید میں لکھا کہ شاید وطن کی واپسی کی اجازت مل جائے، پھر نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں

وہ فسانۂ عجائب کا مسودہ اور قصیدہ لیکر لکھنؤ واپس آیا،

اس واقعہ سے آپ کی اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے، کہ انشاء و سرور سے جو عرضداشت آپ نے نقل کی ہے، وہ واجد علی شاہ کے بجائے نصیر الدین حیدر ہی کے نام ہو، غالباً جو قصیدہ وہ لکھکر لایا تھا، اوس کو اور فسانۂ عجائب کو اوس نے اس کے سامنے پیش کیا ہو، اور کوئی پذیرائی نہ ہونے پر یہ عریضہ بطور یاد دہانی پیش کیا ہو، اور عرصہ ہوا سے اشارہ اسی پہلی درخواست کی طرف ہو،

نصیر الدین کے نام اس عرضداشت کے ہونے مین یہ قیاس بھی کام آسکتا ہے، کہ تصنیف کے خاتمہ کے بعد ہی مصنف نے اس سے فائدہ اٹھانے اور اس کو اپنی زندگی خوشگوار بنانے کا ایک ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہو، محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کا زمانہ اس کے بعد آتا ہے، اور وہ کتاب کے عہد تصنیف سے دور پڑجاتا ہے،

۲- تذکرۂ خندۂ گل ہمارے یہان موجود نہین، کہ آپ کے اس سوال کا مقصود سمجھ سکون، اگر مدعا جعفر زٹلی کے رسالہ "اخبار دربار معلّی" سے ہے، تو اس مین فرضی و تمثیلی وقائع بیان کئے گئے ہین، شیرانی کی کتاب "پنجاب مین اردو" مین اس کا مفصل ذکر آیا ہے، نیز اردو شہ پارے مین بھی تذکرہ ہے، مراجعہ فرمائین،

"س"

دولتِ عثمانیہ جلد اول

(مرتبہ مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے رفیق دارالمصنفین)

یہ مسلمانون کی زندہ حکومت ترکی کے عروج و زوال اور جمہوریہ ترکی کی مفصل تاریخ ہے، پہلے حصہ مین عثمان اوّل سے مصطفے رابع تک پانچ صدیون کے مفصل حالات ہین، اردو مین اب تک ترکی حکومت کی اس سے زیادہ مبسوط اور مستند تاریخ نہین لکھی گئی، حجم ۴۹۰ صفحے، قیمت ۔۔ ؎

منیجر

وفیات

وَفاتِ عیسیٰ

حضرت مولانا سید محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی نے جو حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اوّلین خلفا میں تھے، ۲۵ ربیع الاوّل ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۹۴۲ء کی سہ پہر کو جونپور میں جہان وہ بغرض علاج آئے تھے ۱۳ برس کی عمر مین داعی اجل کو لبیک کہا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، خیال تھا کہ مرشد کے بعد ان کی ذات مرجع انام ہو گی، مگر اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتون کو آپ جانتا ہے، اون کا وطن محی الدین پور ضلع الہ آباد تھا، نسبًا سادات کرام میں سے اور گھر کے خوشحال زمیندار تھے، غالبًا ۱۳۰۱ھ کی پیدایش ہو گی، بچپن ہی سے وہ زاہد و متقی تھے، باپ کے حکم سے انگریزی شروع کی، اور بی اے تک پڑھ کر چھوڑ دیا، اور ایک اسکول میں انگریزی کے ماسٹر، اور آخر میں گورنمنٹ کالج الہ آباد میں عربی کے پروفیسر ہو گئے،

نوجوان ہی تھے کہ الہ آباد و کانپور مین حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ سننے کا اتفاق ہوا، جو بات سُنی وہ دل مین گھر کرتی چلی گئی، اور روز بروز یہ نشہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا، یہانتک کہ بیعت و ارادت سے مشرف ہو کر مجاہدہ و ریاضت مین مصروف ہوئے، آخر تکمیل طریق کے بعد خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے،

اللہ تعالیٰ کی شان بندہ نوازی نظر آتی ہو کہ ایک انڈر گریجوایٹ مین جس نے صرف انگریزی ہی کی تعلیم پائی تھی چند روز مین یہ انقلاب پیدا ہوا کہ اوس نے اس عمر مین آکر سرکاری ملازمت کے ساتھ عربی تعلیم پوری کی، اور قرآن و حدیث کا علم حاصل کیا، اور ساتھ ہی قرآن پاک حفظ کیا، اور سیرت و صورت مین یہ رنگ پیدا کیا، کہ کوئی دیکھ کر یہ بھی نہین کہہ سکتا تھا کہ

وہ انگریزی کا ایک حرف بھی جانتا ہے،

سلوک وطریقت، مسلک ومشرب، صورت وسیرت حتی کہ نشست وبرخاست اور خط وکتابت اور گفتگو مین

اپنے مرشد کامل سے اس درجہ مشابہت حاصل کر لی تھی، کہ ان کو دیکھکر یہ کہنا پڑتا تھا ع

تاکس نہ گوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری

وہ نہایت ہی زاہد، عابد، متبع سنت، اور مرشد کے اصولون کے سختی سے پابند تھے، اطراف مین حلقۂ ارشاد بھی قائم تھا، اپنے مرشد کی متعدد کتابون کے خلاصے اور شروح شائع کئے، جن مین سب سے اہم انفاس عیسیٰ ہے، جو سلوک اشرفی کی معتبر ترین کتابون مین ہے، مردون کے لئے بہشتی زیور کا خلاصہ بہشتی ثمر کے نام سے کیا، جو مکاتب مین رائج ہوئی، تفسیر بیان القرآن کا خلاصہ مترجم قرآن کے حواشی کے طور پر کیا، جو الہ آباد مین زیر طبع تھا، حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کمالات امدادیہ کے طرز پر انھون نے کمالات اشرفیہ لکھی جو فن سلوک ومعرفت کے متعلق ان کی استعداد وصلاحیت کی آئینہ دار ہے،

صاحب مقامات، مستجاب الدعوات، اور واردات صحیحہ سے سرفراز تھے، کالج سے پنشن لینے کے بعد اپنے گاؤن مین مقیم ہوگئے تھے، اور طالبین کو اپنے رشد وہدایت سے سیراب کرتے تھے، اسی عالم مین دو برس ہوئے کہ ایک شب تہجد کیلئے اٹھے، تو فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد امسال دوسرا حملہ ہوا جس کے بعد علاج کے لئے جونپور آئے، جہان ۱۱ر مارچ کو تیسرا حملہ زبان پر ہوا، اور زبان بند ہوگئی، وفات کے آخری لمحہ مین آخری بار زبان کھلی، اور تین دفعہ بلند آواز سے اللہ اللہ کہا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی،

عجیب بات یہ ہے کہ جونپور مین وہ بالکل مسافرانہ وارد تھے لیکن حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے متعدد خلفاء مجازین اور صحبت یافتہ بغیر کسی ظاہری داعیہ کے عین وقت پر پہنچ گئے، اونہی مین سے ایک نے یٰسین پڑھی، ایک نے غسل دیا، ایک نے نماز جنازہ پڑھائی اور سب نے پڑھی، اور دو نے قبر مین اتارا، جونپور ہی مین محلہ رضوی خان کی ایک اکبری مسجد کے عقب مین ۲ بجے رات کو تدفین عمل مین آئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

"س"

ادبیات

ساحل وطوفان

از جناب روشؔ صدیقی

بوئے گل وفا کو پریشان نہ کرسکے — معذور تھے کہ چاک گریبان نہ کرسکے

دشوار اس قدر تو نہ تھی منزل حیات — یہ اور بات ہے کہ ہم آسان نہ کرسکے

وہ راز اوس نے میرے جنون کو عطا کیا — تمکین ناز بھی جسے پنہان نہ کرسکے

ہر انقلاب مین غم ہستی کی تھی نمود — ہم اعتبار گردش دوران نہ کرسکے

اس درجہ ہم کو غم کی نزاکت کا پاس تھا — درمان تو کیا تصور درمان نہ کرسکے

ایسی ہی ایک لہر کو کہتے ہین زندگی — جو امتیاز ساحل و طوفان نہ کرسکے

شبنم ہے لالۂ چمن عشق کے لئے — وہ آرزو جو تجھ کو پشیمان نہ کرسکے

ممنون یک خیال رہی زندگی روشؔ!

کیا خواب تھا کہ جس کو پریشان نہ کرسکے

حشر جذبات

از جناب مولوی سید ابو محمد صاحب ثاقبؔ کانپوری

بیتاب سی اک زندگی عشق بسر کی — اللہ ری اشارت تری دزدیدہ نظر کی

ہر جلوۂ رنگین مین تجھے دیکھا ہے مین نے — کھاتا ہون قسم دلکشی شام و سحر کی

میں اپنی تمنّاؤں کا حاصل اسے سمجھوں | وہ شرم اگر رکھ لے مرے دیدۂ تر کی
جس سجدے سے روشن تھا کبھی خانۂ ہستی | پھر مجھ کو تمنا ہے اُسی سجدۂ در کی
بوسے لیے اُس حُسنِ مکمل کے نظر سے | کرنی نہ تھی جرأت مجھے محفل میں مگر کی
سینے پہ مرے رکھ دیا کیا ہاتھ کسی نے | اب دل کی خبر ہے نہ مجھے درد جگر کی
میں اپنی ہی تخئیل میں کر لیتا ہوں سجدے | تصویر ہے آنکھوں میں تری راہ گذر کی
اُٹھی نہ مری سمت کبھی بزم طرب میں | ہاں مجھ کو شکایت ہے ترے حُسنِ نظر کی
اب کیا کہوں وہ قصۂ فرسودۂ بے کیف | جس طرح قفس میں ترے اک عمر بسر کی
بے بہرہ ہے تو آگہیٔ کیفِ اجل سے | تقلید تو کر زندگیٔ برق و شرر کی
تھی عشق میں ثاقب غم کونین کا حاصل | وہ رات جو فرقت میں کبھی میں نے بسر کی

غزل

از جناب شیدا کاشمیری

چمن میں جب بھی نظر منظرِ بہار آیا | نہ جانے کون تصور میں بار بار آیا
نہ وہ زمانہ، نہ وہ موسم بہار آیا | جو ابتدائے محبت میں ایک بار آیا
فضائے وادیٔ غربت میں ای بہار وطن | "تیرے بغیر تجھے کس طرح قرار آیا"
بیان کروں تو بیاں ہو سکے نہ محشر تک | وہ لطف جو مجھے ہنگام انتظار آیا
ہم اس کی یاد کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں | وہ جس کو بھولے سے ہم پر نہ اعتبار آیا
ادائے سجدہ کو جھک جھک گئی جبین نیاز | جو چلتے چلتے کہیں نقشِ پائے یار آیا
وہ گل ہوں میں جو خزاں آشنا ہوا نہ کبھی | چمن چمن سے مجھے مژدۂ بہار آیا
کبھی جو تیرے تصور میں کھو گیا شیدا | تو اُس کے لب پہ ترا نام بار بار آیا

مطبوعات جدیدہ

ادبیاتِ فارسی مین ہندوؤن کا حصہ | از جناب ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ لکچرار پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ رغیر مجلد سعہ، پتہ انجمن ترقی اردو نمبرا، دریا گنج دہلی،

مسلمانون کی بے تعصبی اور علم دوستی کا یہ ناقابلِ تردید کارنامہ ہو کہ اپنے دورِ حکومت مین انھون نے بلا تفریق قوم و مذہب، ہندوستان مین تعلیم کی عام اشاعت کی، اور اپنی کل محکوم قومون کو ترقی کے یکسان مواقع عطا کئے، یہ انہی کی علم دوستی کا نتیجہ تھا، کہ یہان علم ایک خاص محدود طبقہ کی میراث سے نکل کر کل باشندون کی مشترک ملک بنا، اور مختلف طبقون مین اربابِ کمال پیدا ہوئے، جو علم کی مسند سے لیکر ایوانِ حکومت تک مسلمانون کے شریک وسہیم رہے اس موضوع پر سب سے اول حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف مین "ہندوؤن کی علمی وتعلیمی ترقی مین مسلمانون کی کوشش" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا، جو آج تک اس موضوع پر لکھنے والون کے لئے رہنمائی کا کام دیتا ہے، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی موضوع پر ایک مفید اور قابلِ قدر اضافہ ہے، لائق مؤلف نے ڈی لٹ کی ڈگری کیلئے انگریزی مین یہ مقالہ لکھا تھا، اسی کا انھون نے ملخص ترجمہ کر دیا ہے، مسلمانون کے دورِ حکومت مین حکومت کی زبان فارسی تھی، اور اہلِ علم واصحابِ قلم اسی زبان مین اپنے کمالات کا اظہار کرتے تھے' لائق مؤلف نے فارسی زبان مین ہندوؤن کی علمی وادبی خدمات کو دکھایا ہے، کتاب پانچ ابواب مین تقسیم ہے، پہلا باب مغلوں سے قبل کے حالات میں ہے لیکن یہ محض فارسی سے ہندوؤن کے تعلق کے آغاز پر مشتمل ہو، ان کی اصلی علمی تعلیمی تاریخ مغلون کے عہد سے شروع ہوتی ہے، چنانچہ دوسرے باب مین عہد اکبری، تیسرے مین جہانگیر سے

فرخ سیر تک چوتھے میں شاہ عالم اول سے شاہ عالم ثانی تک مغلون کے دور انحطاط کے پانچوین مین ان کے آخری دور سے لیکر موجودہ زمانہ تک ہندوؤن کی فارسی تعلیم، ہندو ادبا و شعرا، مصنفین و مترجمین اور ان کی تصانیف و تراجم کا تذکرہ اور بعض اہم مصنفات پر تبصرہ ہے، ان کی خطاطی کے بھی چند نمونے دئیے ہین، چھٹے باب مین گذشتہ پانچون ابواب پر جامع تبصرہ ہے، کتاب کے آخر مین مولوی محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور کے تین مضامین "گورونانک کی فارسی تعلیم"، "مثنوی بیغم بیراگی" اور "بدائع وقائع آنند رام مخلص" جو اورنٹیل کالج میگزین مین نکل چکے ہین، بطور ضمیمہ کے شامل کر دیئے گئے ہین، ماخذون کی فہرست اور اشخاص و کتب کا انڈکس بھی دیدیا ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا کامل استیعاب بہت مشکل ہے تاہم مصنف نے جہانتک ممکن تھا محنت و تلاش سے کافی مواد کو جمع کر دیا ہے، اور ان کی کامیابی مبارکباد کے لائق ہے۔

مُردون کی مسیحائی از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی تقطیع اوسط ضخامت ۳۰۴ صفحے، کاغذ کتابت، وطباعت بہتر، قیمت مجلد درجہ اول للعہ روپے درجہ دوم ہے، ادارۂ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

مذکورۂ بالا کتاب سیرۃ نبوی اور اس کے متعلقات پر مولانا عبد الماجد صاحب کے سترہ مضامین کا مجموعہ ہے' مردون کی مسیحائی، یتیم کا راج، یتیم کی جیت، دوراستے، ذکر رسول کی بلندی، سیرت نبوی اور علماے فرنگ، محبوب سے خطاب، فقر محمدی، صابر رسول، خطبۂ نکاح، مسئلۂ طلاق، عتاب محبوب، میلادی روایات، ناک کا داغ، اعداے رسول کی ہجو، اسوۂ حسنہ، تقدیس رسول، ان مین سے بیشتر مضامین مستقل اور بعض کسی شبہہ یا استفسار کا جواب ہین، خطبۂ نکاح اور مسئلۂ طلاق کا تعلق گو براہ راست سیرت نبوی سے نہین ہے لیکن ان دونون امور پر اسوۂ رسول اور سنت رسول کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے اس لئے بے تعلق بھی نہین ہین، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کثرت سے مضامین بلکہ مستقل کتابین لکھی جا چکی ہین، کہ اگر کسی دوسرے موضوع پر اس کا عشر عشیر بھی لکھا جاتا، تو اس مین کوئی نیا پہلو پیش کرنا مشکل تھا، لیکن ع

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایان

اس لئے آج بھی اس موضوع کی تازگی کا وہی عالم ہے، اور عقیدت مندون کو سیرت پاک مین ہدایت و رہنمائی کے نئے نئے گوشے ملتے جاتے ہین، چنانچہ مذکورۂ بالا کتاب مین مصنف کی شان امتیاز قائم ہے، اس مین عرب جاہلی کی ظلمت و ضلالت، عربون کی بداخلاقیون اور بدکرداریون، ان کے تمرد و سرکشی کے واقعات ظہور اسلام، اور تبلیغی تشدد کے حالات اور اسلامی تعلیمات کے انقلاب انگیز اثرات اور اس کے نتائج اور خلق نبوی و اسوۂ نبوی کے مختلف سبق آموز پہلوؤن کو اس موثر اور دلنشین انداز مین پیش کیا گیا ہے، کہ سیرت نبوی کی روح نبوت کی عظمت و جلالت اسلام کی حقانیت و صداقت حق و باطل کی کشمکش، اور حق کی فتحمندی و سربلندی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، یون تو پورا مجموعہ پڑھنے کے لائق ہے، لیکن ذکر رسول کی سربلندی، سیرت نبوی اور علمائے فرنگ، اور صابر رسول خاص طور سے مفید مضامین ہین، یہ مضامین نہ صرف مسلمانون کے بلکہ درس اخلاق، اور تشکیل سیرت کی حیثیت سے غیر مسلمون کے بھی پڑھنے کے لائق ہین، مولانا کی انشار کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے، ان کی انشا پردازی سادے خطوط مین رنگ بھر دیتی ہے، اور یہ تو موضوع ایسا دلآویز ہے کہ قلم مین خود کیف و تواجد پیدا ہو جاتا ہے، البتہ اس کتاب کا نام کچھ موزون نہین معلوم ہوتا ہے،

نقش حق از جناب پروفیسر محمد اکبر صاحب منیر تقطیع بڑی ضخامت ۹۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ؏ پتہ:- مدرستہ البنات جالندھر،

اسلام کی بنیاد تمامتر خدا اور اس کے رسول کی محبت پر ہے، اور اس کی آخری منزل تصوف تو سراسر عشق و محبت ہے، اور اکثر صوفیائے کرام نے اس محبت کو عشق سے تعبیر کیا ہے، لیکن بعض محتاط بزرگ باری تعالی کے ساتھ عشق کی اصطلاح کا انتساب اسکی عظمت و تقدیس کے منافی تصور کرتے ہین، لائق مولف نے اس کتاب مین اسی عشق و محبت کی تشریح کی ہے، اور کلام مجید احادیث نبوی ائمۂ اسلام اور اکابر صوفیہ کے اقوال و صاحب دل شعراء کے کلام کی روشنی مین عشق و ایمان کی حقیقت، اس کے عناصر اور لوازم و شرائط، اسلام و ایمان اور نفاق کی تعریف مومنون اور منافقون کے اوصاف و خصوصیات پر بحث کرکے دکھایا ہے کہ ایمان نام ہے یقین و اذعان اور محبت خدا

ورسول کا اسی کو صوفیائے کرام نے عشق سے تعبیر کیا ہے، اور عشق یا محبت کا یہ درجہ صرف احکام الٰہی کی پابندی
اور سنتِ رسول کی پیروی سے حاصل ہو سکتا ہے، یہ بحث نہایت لطیف و دلنشین ہے، اور موضوع کی نزاکت کے
باوجود قلم جادہ مستقیم سے نہیں ہٹنے پایا ہے، اس مقالہ مین اسلام کی اصلی روح بیان کر دی گئی ہے جو اصحابِ
ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

چند جواہر ریزے از جناب خواجہ عبد الحمید صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور تقطیع
چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت طباعت بہتر، پتہ اقبال اکیڈمی تاجپورہ ظفر منزل لاہور،

خواجہ عبد الحمید صاحب سر اقبال مرحوم کے حلقہ نشینون مین ہین، ان کو اکثر ان کی خدمت مین حاضری کا
اتفاق ہوتا تھا، اونھون نے مختلف صحبتون مین علامہ مرحوم کی زبان سے جو علمی نکات و لطائف، ان کے سفر اور
قیام یورپ کے متفرق حالات اور مختلف قسم کے جو مفید و دلچسپ واقعات سُنے تھے، ان کو کئی سال ہوئے معارف میں
"چند جواہر ریزے" کے نام سے مضمون کی شکل مین شائع کیا تھا، اب اقبال اکیڈمی نے اس کو کتابی صورت مین شائع
کر دیا ہے، یہ مختصر جواہر ریزے اقبال مرحوم کے عقیدتمندون کے لئے تبرک کی حیثیت رکھتے ہین،

میلادِ شمسی، از شمسی عبا د الرحمٰن صاحبہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر
قیمت ۴ر پتہ :- مکتبہ جامعہ دہلی،

عام طور سے جو پرانے طرز کے میلاد نامے رائج ہین ان مین عموماً غیر معتبر روایتین زیادہ ہوتی ہین، جس سے
ذکرِ رسول کا صحیح فائدہ حاصل نہین ہوتا، اس لئے زنانہ مجلسون مین پڑھنے کے لئے مصنفہ نے یہ میلاد نامہ لکھا ہے،
گو یہ میلاد نامہ بہت مختصر ہے، لیکن اس میں روایات کی صحت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، زبان صاف اور شُستہ
ہے، زنانہ مجلسون مین پڑھنے کے لئے اچھی کتاب ہے،

پودون کی کہانی از جناب سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات عثمانیہ یونیورسٹی، تقطیع چھوٹی،
ضخامت ۴۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۰ر پتہ سب رس کتاب گھر نعمت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن،

یہ مختصر رسالہ فنِ نباتات پر ہے، اس میں نباتات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر علمی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور نباتات کی عام خصوصیات، غذا اور توانائی حاصل کرنے کے طریقوں، ماشروجن کے قدرتی مخزنوں، اور اس کے حصول اور نباتات کی افزایشِ نسل کے قدرتی نظام کو عام فہم اور سادہ طریقہ سے بیان کیا گیا ہے،

اخلاصِ مشرق از جناب شفیق جونپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۴ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت ۱۲؍، پتہ :۔ مصنف دفتر نظامِ ادب جونپور،

جناب شفیق جونپوری نواحِ مشرق کے مشہور شاعر ہیں، ان کے کلام کے بعض مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں، اخلاصِ مشرق ان کے قصائد حمد و نعت و منقبت اور دوسری مذہبی نظموں کا مجموعہ ہے، مصنف گو نئے دور کے شاعر ہیں، لیکن فن سے باخبر اور شعر و ادب کے صحیح ذوق شناس ہیں، اس لئے ان کی شاعری قدیم و جدید کے امتزاج کا لطیف نمونہ ہے، زبان کی صحت و صفائی اور حلاوت و شیرینی ان کے کلام کا نمایاں وصف ہے، یہ تمام نظمیں خیالات کی بلندی و پاکیزگی، اور لطفِ زبان کے اعتبار سے پڑھنے کے لائق ہیں، کاغذ اور کتابت وطباعت اتنی خراب ہے کہ اس لطیف شراب کے جام سفالین سے نگاہ کو تکلیف پہنچتی ہے، تعجب ہے کہ مصنف کی شعریت نے اس کو کیونکر گوارا کیا،

کلامِ حرمان از جناب حرمان خیرآبادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ :۔ دفترِ مجلس اردو نمبر ۴، جی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور،

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب مصنف کے کلام کا مجموعہ ہے، اس کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے، چند نظمیں اور رباعیاں ہیں، شاعر کو اس سرزمین سے نسبت ہے جس نے ریاض اور مضطر کو پیدا کیا، اس نسبت کا اثر ان کے کلام میں ظاہر ہے، مصنف میں شاعری کی پوری صلاحیت ہے، اور جذبات و خیالات اور زبان و طرزِ ادا کے لحاظ سے کلام خاصہ ہے، لیکن ابھی نو مشقی کی وجہ سے جا بجا خامیاں نظر آتی ہیں جن کا ہونا تعجب انگیز نہیں، اور جو امید ہے کہ مشق و مہارت سے دور ہو جائینگی،

"م"
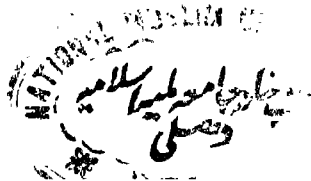
جلد ۵۳ ماہ جمادی الاول ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۴ء عدد ۵

مضامین

مسلمان طلبہ کی امداد کے لئے ڈاکٹر حامد علی صاحب حیدرآبادی کے گرانقدر عطیہ کی خبر جس کی مقدار تیرہ لاکھ ہے، اخبارات میں شائع ہوچکی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایسی اولو العزمی اور ایسی عظیم الشان فیاضی کی یہ پہلی مثال ہے جس کی شکرگذاری ساری قوم پر فرض ہے، محیر معطی کے حالات اور اس عطیہ کی تاریخ معلوم ہونے کے بعد اس کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، وہ کوئی موروثی دولتمند اور بڑے سرمایہ دار نہیں بلکہ اپنی قوت بازو سے ترقی کرکے انھوں نے یہ دولت پیدا کی، موصوف ڈاکٹر ہیں اور حیدرآباد میں معمولی تنخواہ سے پندرہ سو ماہانہ تک ترقی کی، لیکن اتنے بڑے عطیہ کے لئے پندرہ سو ماہانہ کی کوئی بساط نہیں، موصوف کے دل میں شروع سے ہونہار اور حاجتمند مسلمان طلبہ کی امداد کے انتظام کی لگن تھی، اس مقصد کے لئے وہ طالب علمی کے زمانہ سے انتہائی سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی بسر کرکے روپیہ بچاتے، اور اس کو بڑھانے کے لئے مختلف کاروبار میں لگاتے رہے، انکی نیت کی برکت سے اسکی تعداد تیرہ لاکھ تک پہنچ گئی اور عمر بھر کی یہ ساری کمائی انھوں نے اک مشت قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کے لئے وقف کردی،
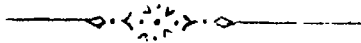
کسی موروثی امیر کبیر کا قومی کام کے لئے اپنے معمور خزانہ کا کوئی حقیر حصہ دیدینا کوئی بڑی قیمت نہیں رکھتا، لیکن اپنی قوت بازو سے حاصل کیا ہوا ساری عمر کا سرمایہ جو تکلیف اٹھا کر جمع کیا گیا ہو اس طرح قوم کی نذر کردینا ایثار و قربانی کا وہ نمونہ ہے جس کی نظیر مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل سے ملیگی،

قومی فیاضی کا یہ نمونہ ہماری پوری قوم خصوصاً صاحب ثروت طبقہ کے لئے سبق آموز ہی اللہ تعالیٰ اسکو اس کی تقلید کی توفیق اور مجیر محسن قوم کو اس کار خیر کا صلہ عطا فرمائے،

ترقی پسند ادب کی عریاں نویسی اور فحش نگاری کے متعلق معارف میں بھی لکھا جا چکا ہی اور ہندوستان کے بہت سے سنجیدہ اصحاب علم اور اہل قلم حضرات نے بھی اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں لیکن یہ وبا برابر پھیلتی جاتی ہے، اس پست اور مخرب اخلاق لٹریچر کی اشاعت مین پنجاب کے بعض ادبی رسالوں کا قدم سب سے آگے ہی اور انھوں نے ادب لطیف کے پردہ میں ادب کثیف کی اشاعت کو مستقل مقصد بنایا ہے، جس کو کوئی سنجیدہ انسان پڑھ نہین سکتا،

پنجاب خصوصاً لاہور ہندوستان میں اردو ادب کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے لیکن افسوس وہاں کے برعکس نام نہند "ترقی پسند" ادیب، اپنی نافہمی سے اُسکے اس امتیاز کو داغدار بنا رہے ہیں، ناصاف آبادی کے اژدحام میں جہاں وبا کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے، حفظان صحت کے اہتمام کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے، اس لئے پنجاب کی ادبی پیداوار کی نگرانی کی بڑی ضرورت ہی اور یہ فرض سب سے زیادہ وہاں کے سنجیدہ اصحاب قلم پر عائد ہوتا ہی جن کی لاہور میں کمی نہیں وہان زمین شعر و ادب کے زمیندار بھی ہیں، آسمانِ صحافت کے مہر بھی ہیں، راہِ ادب کے سالک بھی ہیں، کثافتون کی تطہیر کے لئے زمزم و کوثر بھی موجود ہیں، ان کی موجودگی میں یہ ادبی گمراہی حیرت انگیز ہے، ان کی نوک قلم میں تو بڑے بڑے فاسد مادوں کو خارج کر دینے کی قوت ہے، یہ ادبی فساد تو ان کی ادنیٰ توجہ سے دور ہو سکتا ہے،

گذشتہ مہینہ اسلامک ہسٹری کانفرنس کا دوسرا اجلاس اسلامیہ کالج پشاور میں منعقد ہوا، اس کے

قائم مقام سکریٹری جناب ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب نے اس کی روداد ہمارے پاس اشاعت کے لئے بھیجی ہے، جو اسی پرچہ میں شائع کیجارہی ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلامی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر عربی، انگریزی اور اردو میں مقالات پڑھے گئے اور اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون اور عربی فارسی اور ترکی زبانوں کی اشاعت و ترقی، نادر قلمی کتابوں کی فہرست سازی اور اسلامی آثار قدیمہ کے تحفظ کے متعلق بہت سی مفید تجویزیں منظور ہوئیں، ابھی کانفرنس کی عمر دو تین سال سے زیادہ نہیں ہے، اس لئے پابندی کے ساتھ اس کے اجلاس ہوتے رہنا بھی غنیمت ہے، لیکن آیندہ ہم کو اس کے فاضل کارکنوں سے اس سے زیادہ ٹھوس کام کی توقع ہے، اگر کانفرنس کی جانب سے اس کا مجوزہ رسالہ نکل جائے تو یہ ایک مستقل اور مفید کام ہوگا، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون کے سنجیدہ علمی رسالوں کی تعداد انگریزی اور اردو ملاکر دو چار سے زیادہ نہیں ہے، اس لئے ایسے رسائل کی بڑی ضرورت ہے۔

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کی صحت کچھ عرصہ سے برابر خراب رہتی ہے، گذشتہ مہینہ مزاج زیادہ ناساز ہوگیا تھا، اب بفضلہ تعالیٰ افاقہ ہے، لیکن ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق کچھ دنوں تک مکمل آرام کی ضرورت ہے، اور زیادہ خط وکتابت کی بھی اجازت نہیں، گرمی کی شدت کی وجہ سے مئی، جون دو مہینے دار المصنفین میں قیام بھی نہ رہے گا، اس لئے ناظرین معارف اور دوسرے تعلق رکھنے والے اصحاب سے گذارش ہے کہ وہ موصوف کی صحت کے خیال سے کچھ دنوں تک غیر ضروری خط وکتابت خصوصاً ایسے خطوط سے احتراز فرمائیں جن کے جواب میں دماغی بار پڑنے کا احتمال ہو، باقی ضروری خطوط کا جواب ملتا رہے گا۔

مقالات

خطبۂ صدارت مجوزہ اردو کانفرنس بنگال

"اواخر ۱۹۳۹ء یا شروع ۱۹۴۰ء مین بنگال مین اردو کانفرنس بڑے پیمانہ پر منعقد ہونے والی تھی اوس کی صدارت کی خدمت حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے سپرد ہوئی تھی، مگر کسی وقتی مجبوری سے یہ مجوزہ کانفرنس منعقد نہ ہوسکی، اس کانفرنس کے لئے جو خطبۂ صدارت لکھا گیا تھا اس مین اردو ہندی کے مسئلہ کے بعض پہلوؤن اور بعض ایسے نظریون اور دلیلوں پر غور کیا گیا تھا جو آج کل بھی ہندی کے بعض ممتاز حامیون کے قلم و زبان پر ہیں، اتفاق سے اس وقت کاغذات میں اس خطبہ کا مسودہ مل گیا جس کو ذیل مین شائع کیا جاتا ہو کہ ان مسائل پر صحیح نقطۂ نظر بھی سامنے آجائے، اسی طرح خطبہ کے آخر میں بنگال کے مسلمانون سے جو کچھ خطاب کیا گیا تھا، وہ آج بھی اُن توجہ کا طالب ہو" "م"

ہمزبانو! ممنون ہون کہ آپنے اپنی محفل کی صدارت کی عزت دیکر اپنی زبان کی خدمت کا ایک اہم موقع عنایت فرمایا، آج کل نہ صرف دنیا ایک نازک دور سے گذر رہی ہے، بلکہ خود ہمارا ملک بھی ایک ایسے پرخطر دور سے گذر رہا ہے کہ اگر مسلمانون نے تھوڑی سی غفلت برتی تو پھر اس نقصان کی تلافی صدیوں میں بھی نہیں ہوسکتی، ہم آپس میں سیاسیات میں کتنے ہی مختلف ہون، مگر اس بارہ مین ہم مین سے ایک کو بھی اختلاف نہین کہ ہم کو اس ہندوستان مین مسلمان ہی ہوکر جینا اور مسلمان ہی ہوکر مرنا ہے، البتہ یہ خیال ہمارے ساتھ ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان ہین، اس لئے ہم کو

جس طرح بحیثیت مسلمان ہونے کے فرائض ہین، بحیثیت ہندوستانی ہونے کے بھی ہم پر کچھ حقوق ہین، اور جہانتک ہو سکے ان فرائض اور حقوق کے دوہرے بوجھ کو اٹھا کر ہی آگے کو چلنا ہے، اور ایسی کوشش کرنا ہو کہ ان دونون مین تصادم اور ایسی ٹکر نہ ہو جو دونون کو پاش پاش کر دے،

ہم نے اس مشکل کو اسی دن سمجھ لیا تھا جس دن اس سرزمین پر پہلی مرتبہ پاؤن رکھا تھا، یہ اسی رواداری اور صلح جوئی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان اس ملک مین خواہ عرب سے آئے، ترکستان اور خراسان سے آئے، ایران سے آئے، افغانستان سے آئے، مگر یہان آکر نہ وہ عرب رہے، نہ ترک رہے، نہ ایرانی رہے، اور نہ افغانی، خالص ہندوستانی ہوگئے، عربون نے عربی، ترکون نے ترکی، ایرانیون نے فارسی اور افغانون نے پشتو چھوڑ کر اسی دیس کی بولی، اپنی بولی بنائی، اور ایسی بنائی کہ وہ اس زبان مین شاعری اور انشا پردازی کرنے لگے، اردو تذکرہ کی کتابون مین سیکڑون ایسے شاعر ملین گے، جن کے حال مین لکھا ہوگا کہ ان کے باپ دادا، عرب، ایران اور ترکستان سے آئے مگر وہ خود اسی ملک کی زبان بولنے اور اوس مین دادِ سخن دینے لگے،

آج ہمارے دیس کی جو بولی ہے، اور جس کو آج سب ہندو مسلمان بول رہے ہین، وہ اسی دیس کی پیداوار ہے، وہ عرب، ایران، ترکستان سے نہیں آئی، فرق اتنا ہے کہ مسلمانون نے اپنی زبانون کے کچھ لفظ بھی اس مین ملا دیئے اور ایسا ہونا ضروری تھا، زبان بولنے والون کی ضرورتون کا آئینہ ہوتی ہے، اس لئے مختلف قومون کے درمیان قومون کی مختلف ضرورتون کی بنا پر اختلاف ہونا ضروری ہے، ایسے اختلاف سے ایک زبان دو نہین بنجاتی، مسلمانون کا ایمان ایمان ہی ہے، اور ہندوؤن کا دھرم، دھرم ہی رہے گا، ہمارا مذہبی فاقہ روزہ کہلائے گا، اور ان کا برت، ہم حج اور زیارت کرتے ہین، اور وہ تیرتھ، ہمارا مردہ جنازہ ہوتا ہے، اور ان کا ارتھی، ہم مرکر جنت جاتے ہیں، اور وہ بیکنٹھ، لیکن اس اختلاف کو اتنا بڑھانا کہ ہم پانی پئین، اور وہ جل، ہم اور کہین، اور وہ تتھا، اور ایسے ہی اختلافون کو اور بڑھا بڑھا کر ایک بولی کو دو بنانے کی کوشش کرنا ہمارے نزدیک مسلمانون کا جرم عظیم اور ہندوؤن کا مہاپاپ ہے،

یہ زبان جس کو ہم ہندو مسلمان آج بول رہے ہیں یہ آج نہین ایک ہزار برس میں بنی ہے، اس کے بنانے مین ہندو مسلمان بزرگون کی ایک ہزار برس کی عمر بیتی ہے، یہ ہندوستان مین ہندو مسلمان سمجھوتہ کی سب سے بڑی یادگار ہے، جو لوگ اس زبان کو مٹانا چاہتے ہیں، وہ ہندو مسلمانون کے تعلقات کو نئے سرے سے پھر الجھانا چاہتے ہین، اور ایک ہی ملک بلکہ ایک ہی صوبہ، بلکہ ایک ہی شہر، بلکہ ایک ہی گاؤن مین ایسی برابر کی قومین پیدا کرنا ہے جو ایک دوسرے کی نہ سمجھ سکین، اور جب ایک دوسرے کی زبان نہ ملے گی، تو دل کیا ملے گا،

ہندو بھائیون کے ایک طبقہ مین اس زبان کے خلاف جو جذبہ کام کر رہا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ بدیسی ہے اور قومیت پرودری کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اپنے دیس کی بولی بولین، اور بدیسی بولی کو چھوڑ دین، حالانکہ ہندوستان کی کوئی زبان چند بدیسی عربی اور فارسی لفظون کے مل جانے سے عربی اور فارسی نہین بن جائیگی، جیسے چند انگریزی لفظون کے ملنے سے انگریزی نہین بن جاتی، اگر ہم کو بدیسی سے ایسی ہی چڑ ہے تو پہلے یہان سے مسلمانون، عیسائیو اور پارسیون کو نکالنا چاہئے، انگریزی علوم اور تمام یورپین ایجادات اور وہان کی مصنوعات سے ملک کو خالی کر دینا چاہئے، بلکہ خود سنسکرت کو یہان سے خارج کیجئے، کہ وہ بھی سنٹرل ایشیا سے آئی ہے، اور برہمنون کو بھی نکالئے کہ وہ بھی باہر سے آئے ہین،

صاحبو! راہین دو ہین، ایک یہ کہ ہم یہ سمجھین کہ ہندوستان خالص ہندوون کا ملک ہے، اس میں جو کچھ ہو وہ خالص ہندوانی ہو، زبان وہی ہو، لباس وہی ہو، تعمیر وہی ہو، مذاق وہی ہو، علم و فن وہی ہون، اور جو بھی اس ملک کی چہار دیواری کے اندر رہے، وہ اسی کا محکوم ہو کر رہے، یہ راہ بعید خطرناک اور مشکلون سے بھری ہوئی ہے اور اس راہ کی کامیابی مین بہت کچھ شک کیا جا سکتا ہے، دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ ہندوستان ایک گلدستہ ہے جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہین، ع

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

لیکن رنگ و بو کے اس اختلاف کے باوجود وطن خواہی کے دھاگہ نے ان سب کو ایک جگہ باندھ کر ایک

بنا دیا ہے، یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی قوم زندہ رہ سکتی ہے، اور کل کا جز بنکر کل کی طاقت کا باعث ہو سکتی ہے،

میرے نزدیک کسی ہندو طبقہ کا قومیت و وطنیت کے مفہوم کو اتنا تنگ سمجھنا کہ خود اس ملک کے مختلف رہنے والے بھی وہان کے اصلی رہنے والے ثابت نہو سکین، ان کی وہی موروثی اور پرانی تنگ خیالی ہے جس نے تاریخ میں ان کو ہمالیہ اور سمندر کی چہار دیواریون مین بند اور چھوت اور اچھوت کی پرانی لڑائی ہزارون برس سے کھڑی کر رکھی ہے، اور جس نے تاریخ کے ہر دور مین ان کے اندر نفاق پیدا کیا ہے، اور انہی کے اندر کے مظلوم فرقون کو مجبور کیا ہے، کہ وہ باہر کا سہارا ڈھونڈین، اور باہر والون کو اپنی مدد کے لئے اپنے گھر بلائین، اور نتیجہ مین اپنے ساتھ دوسرون کو بھی غلامی کی زنجیرون میں اسیر کرائین، یہ ایک تاریخی نکتہ ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہین لیکن جسکو کسی موقع پر کبھی بھولنا نہیں چاہئے،

اس زبان کو جو اس وقت ملک کے بڑے حصہ مین بولی اور سمجھی جاتی ہے، خالص اسلامی بولی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے، یہ ہندو مسلمانون دونون کی محنتون اور کوششون سے بنی اور پروان چڑھی ہے، یہ حقیقت ہے، لیکن اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش برابر جاری ہے لیکن حقیقت کی سچائی چھپائے نہین چھپ سکتی، ہم خود بھی اس غلطی مین تھے کہ شاید تیس چالیس برس کی لگاتار کوششیں اس حقیقت پر پردہ ڈال چکی ہین، مگر پچھلے سال اردو دن منانے کی جو تحریک ہوئی، اور اس مین پنجاب سے لیکر بہار تک کے مسلمانون کے ساتھ ہندو دوستون نے بھی جو دلچسپی لی، اور جو تقریرین کیں، اُن سے یہ پتہ چلا کہ یہ زبان ملک کی زبان ہی پر نہین بلکہ دل مین بھی اتر چکی ہے، اور حقیقت کے پہچاننے والے ہندو دوست بھی اس کی سچائی کو دل سے مانتے ہین، اور اسی کو اپنی مادری زبان مانتے ہین، خصوصیت کے ساتھ سر تیج بہادر کی وہ فاضلانہ تقریرین جو الٰہ آباد، لکھنؤ، پٹنہ، حیدرآباد اور ابھی کشمیر مین ہوئین، ان سے ہم کو پوری طرح یقین ہوتا ہے، ملک مین بہت سے ایسے سمجھدار ہندو ہین جو سچائی کے ساتھ اس حقیقت کو مانتے ہین، اور ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہین کہ سنسکرتی

ہندی کے خواہشمند در اصل ملک کے باشندون کے درمیان تفریق اور عناد کا بیج بو رہے ہین،

الہ آباد یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر پروفیسر جھا نے بھی جنیو پہنے ہوئے گویا رمین ایک تقریر فرمائی ہے جس مین یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سنسکرتی ہی ہندی ہندوستان کی عالمگیر زبان بن سکتی ہے، یہ خیال واقعات اور ملکی سیاسیات سے قطع نظر کرکے ظاہر کیا گیا ہے، اور یہ سمجھ کر ظاہر کیا گیا ہے، کہ گویا ہندوستان مین آریہ برہمنون کے سوا کوئی اور قوم نہیں بس رہی ہے، یہ خیال مدراس اور دکن مین ظاہر کیا جاتا، تو پروفیسر صاحب کو معلوم ہو جاتا، کہ یہ واقعات کی منطق سے کس قدر دور ہے. وہان کی ڈراویڈی قومین جو تامل تلگو اور کنڑی بولتی ہین، وہ ہندی پرچار کی اس لئے مخالف ہیں کہ وہ سمجھتی ہین کہ ہمارے دشمن آریہ برہمن اس بہانہ سے ہماری زبانون کو اور کلچر کو مٹانا چاہتے ہین جب یہ خیال ایک ایسے طبقہ کا ہے جو مذہب کے روسے گویا ہندو ہی ہے، تو ملک کے اس طبقہ کا یہ خیال کیون نہ ہو جو اتحاد وطن کے علاوہ ہر حیثیت سے ان سے الگ ہے

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ زبان اسلامی زبان ہے، تب بھی یہ کوئی کہہ نہیں سکتا، کہ اقلیت والی زبان کے چل جانے سے اکثریت والی قوم کے رواج و تمدن و تہذیب مٹ جائیگی، وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیشہ قائم رہے گی، جیسا کہ اب تک قائم رہی ہے لیکن اقلیت کی اوس زبان کے مٹ جانے سے جس کے مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے تو اقلیت کے خاتمہ مین کوئی شک ہی نہیں رہتا، کیونکہ اوس کی عمارت تو اسی قسم کے ستونون پر کھڑی رہ سکتی ہے،

پنجاب کے ایک ہندو پروفیسر نے یہ بات خوب کہی ہے کہ اردو مادری زبان کی حیثیت سے تو اُسی ملک مین بولی جاتی ہے جہان ہندو آبادی کی اکثریت ہے یعنی انبالہ سے لیکر بھاگلپور تک، اور جہان مسلمانون کی اکثریت ہے، جیسے کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ، پنجاب اور بنگال، وہان کے ہر ایک صوبہ مین اوسی صوبہ کی زبان ان کی مادری زبان ہے، کشمیر کے مسلمان کشمیری، سندھ کے سندھی، سرحد کے پشتو، پنجاب کے پنجابی، اور بنگال کے بنگالی بولتے ہین، اس لئے اس زبان کو اسلامی کہنے کے بجائے ہم ہندوہی کہہ سکتے ہین لیکن باوجود اس کے مسلمانون نے اس زبان

قومی اور ملکی یکرنگی کی خاطر اپنی قومی اور ملکی زبان بنایا ہے، اور چونکہ صدیون سے اس کو اپنی عمومی زبان بنا چکے ہین اس لئے کوئی وجہ نہین ہے کہ اب اس کی جگہ کسی دوسری زبان کو دی جائے،

یہان پر اس غلطی کو بھی دور کر دینا چاہئے، جو اکثر لوگون کی زبانون سے نکل جاتی ہے، کہ ان صوبون مین جہان اُن کی الگ الگ بولیان ہین، مسلمان اور ہندو ایک ہی بولی بولتے ہین، صوبۂ بنگال مین بنگالی مسلمان اور بنگالی ہندو ایک ہی زبان رکھتے ہین، ایسے ہی گجرات میں گجراتی، اور مرہٹہ مین مرہٹی، اور مدراس میں کنڑی، اور تلگو وغیرہ، مگر یہ سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی، سچ تو یہ ہے کہ بے شبہہ ان زبانون کے فعل اور حرف تو وہان کے ہندو اور مسلمان ایک ہی بولتے ہیں، مگر اسما مین ان دونون قومون مین اتنا ہی فرق ہے جتنا ان کے تمدنون اور ضرورتون یا پچھلی روایتون میں، ایک مسلمان بنگالی پروفیسر نے مجھے بتایا کہ مسلمان بنگالی پانی بولے گا، اور ہندو بنگالی جل، مسلمان بنگالی خالہ کو کھالا کہے گا، اور ہندو بنگالی موسی وغیرہ، اور گجراتی اور مرہٹی کا تو مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ مسلمان گجراتی، پارسی گجراتی، اور ہندو گجراتی مین اتنا ہی فرق ہے، جتنا ان کی قوموں میں، یہی حال مرہٹی کا ہے، کہ مسلمانی مرہٹی، ہندو مرہٹی، سے امتیاز رکھتی ہے، یہی بات مدراس کی ہندو مسلمان بولیون کا ہے، اور ایسا ہونا قدرتی بات ہے، ہمارے نزدیک اردو اور ہندی مین بھی اتنا ہی فرق ہونا چاہئے اس سے زیادہ نہین، لیکن اس سے آگے بڑھکر یہ کہنا اور سمجھنا کہ سنسکرتی ہی ہندی ہماری اصلی بولی ہونی چاہئے، دیس کے اتحاد اور ایکتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے،

ابھی پہلی اکتوبر ۳۹ء کے پائنیر میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے سنسکرت ریڈر پروفیسر سکسینہ کا جو مضمون ہندوستانی زبان پر نکلا ہے، وہ ان کے طبقہ کے خیال کا پورا آئینہ ہے، صوبہ یوپی کے ایک وزیر تعلیم نے اسمبلی کی ایک تقریر مین بہت خوب کہا کہ نہ ہندو تمدن، نہ مسلمان تمدن، بلکہ ہندوستانی تمدن، میری عرض ہے کہ اس فلسفہ کو اور آگے بڑھائیے اور کہئے کہ نہ ہندو بولی نہ مسلمان بولی، بلکہ ہندوستانی بولی، لیکن کیا وفاداری کے ساتھ ہم سب اس کے ساتھ ہین؟ ہمارے وزیر تعلیم نے ابھی بنارس مین ہندی کے ایک جلسہ مین فرمایا ہے کہ اردو ہندی جھگڑے کا فیصلہ قسمت نے خود کر دیا یعنی یہ کہ اب نوے فیصدی لڑکے ہندی لے رہے ہین، جہان تک کاغذ اور امتحان کے پرچون کا

تعلق ہے، ہمارے وزیر صاحب کا سرکاری بیان بالکل صحیح ہے لیکن جہانتک واقعیت کا تعلق ہے یہ بیان ابھی صداقت سے بہت دور ہے، اگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے ہم وطنوں میں جھوٹی قومیت پرستی کا یہی جذبہ ہے تو یہ بیان آگے چل کر واقعی صداقت نہ بن جائے گا،

صوبہ بہار میں جو ہندوستانی کمیٹی دو سال سے بنی ہے، اس میں اسی کی کوشش کی جا رہی ہے، کہ اونچی اردو اور کڑی ہندی سے اتر کر بیچ کی ہندوستانی کو ادب اور تعلیم کی زبان بنا کر پھیلایا جائے، چنانچہ اسی اصول پر ڈاکٹر تاراچند اور مولوی عبدالحق صاحب ہندوستانی لغت اور ہندوستانی اصطلاحوں کا کام کر رہے ہیں، اور ہم لوگ ہندوستانی ریڈروں کی زبان درست کرنے کا کام اپنے ذمہ لے رہے ہیں لیکن ہم کو معلوم ہے کہ اس تحریک کے دبانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جا رہا ہے، اور اس کی کھلی مثال پروفیسر سکسینہ کی وہ تحریر ہے جس کو اونھوں نے بہار کی ہندوستانی کمیٹی سے استعفا دیتے ہوے لکھا ہے،

یوپی کی کانگریسی حکومت کے صیغۂ تعلیم کا غالبًا یہ منشا تھا کہ اردو اور ہندی کو ابھی ایک ساتھ چلنے دیا جائے لیکن قومی کوششوں کے علاوہ سکاری امدادی ذریعوں سے بھی ایسی کوشش کی جائے، کہ سنسکرتی ہندی کا پلہ دن پر دن بھاری ہوتا چلا جائے، یہان تک کہ اردو کس مپرسی سے اپنی موت آپ مرجائے، اور سنسکرتی ہندی ہر جگہ چھا جائے، پھر اس وقت کا وزیر تعلیم بے جھجک یہ کہہ سکے گا کہ اردو ہندی کا فیصلہ خود بخود ہو گیا، کیونکہ اب سو فیصدی لڑکے ہندی پڑھ رہے ہیں،

پہلے تو کہیں میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکولوں میں لڑکوں کو ہندی پڑھانے پر زور دیا جاتا تھا، اور اردو کے استاد نہ ہونے یا نہ رکھنے کے سبب وہاں لڑکوں کو ہندی سیکھنے پر مجبور کیا جاتا تھا یا وہ مجبور ہوتے تھے اب آج کل کی روشنی میں یہ اندھیر ہو رہا ہے کہ ہندی کی کوششوں میں اوپر سے نیچے تک سرکاری عہدہ دار اس کام میں لگے ہوئے ہیں، جگہ جگہ دورے کرتے ہیں، جلسوں میں اپنی رُخ کی حیثیت سے جاتے ہیں، اور ہندی کی ترقی کے لئے پورا زور دکھاتے ہیں، حالانکہ ان کو یا تو دونوں کے ساتھ ایک طرح کا برتاؤ کرنا یا دونوں سے ناطہ الگ

ہو جانا چاہئے، میرے خیال میں یہ کانگریس کے ساتھ ہمدردی نہیں بلکہ کھلی دشمنی ہے، اور مسلمانون کے ذہن مین یہ غلطی بٹھانی ہے کہ جب ہم آدھے اختیار پاکر یہ کر رہے ہین تو پورا اختیار پا کر کیا کچھ نہ کرین گے، ملک کی پالیٹکس پر اس غلطی کا جو بڑا اثر اب پڑ رہا ہے، اور جو آگے پڑے گا، وہ چھپا نہیں، مین نے اس وقت صفائی سے جو کچھ کہا ہے امید ہے کہ ہمارے دوست اوس کو نیک نیتی سے سنین گے، اور کہنے والے کی بھی نیک نیتی سمجھین گے،

زبان کے مسئلہ میں ہماری پالیسی کھلی ہوئی یہ ہونی چاہئے، کہ زبان وہ ہے جو بازارون مین بولی، اور عدالتون اور اسٹیشنون میں سمجھی جاتی ہے، اور جو ہندو مسلمان دونون کے بیچ مین سمجھنے اور سمجھانے کے کام مین آتی ہو وہ نہیں جو شبد ساگروں اور قاموسون مین لکھی ہوئی ہے، اس بولی کے لفظ بازار کے چلتے ہوے سکے ہین، نہ کہ کونون اور گوشون مین پڑے ہوئے زنگ کھائے ہوے غزنوی اور بکرماجیت کے زمانہ کے سکے، جن سے پرانی یادگارون کے ماہر اور پرانی تاریخ کے شائق تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں، مگر ان سے بازار کے چلن کا کام نہیں لیا جا سکتا،

مسلمان اس مسئلہ مین بھی وہی کوتاہی کر رہے ہیں جو ان کے ہر قومی کام مین ہے، یعنی یہ زبان اور قلم کے شیر بنے ہوے، صرف بول رہے ہین، اور لکھ رہے ہین، کچھ کر نہین رہے ہین، ان کو یقین کرنا چاہئے کہ زبان اور قلم کے یہ بند اس سیلاب کے دھارے کو نہین روک سکتے، جو پورے زور سے بہ رہا ہے، ضرورت ہے کہ ہم ہاتھ پاؤن ہلائین اپنی گاڑھی کمائی کے کچھ ٹکڑے مانگنے والون کی جھولی مین ڈالین،

ان پڑھون کو پڑھانے کی جو تحریک دو برسون سے چل رہی ہے، ہمارے نوجوان اس کے لئے ابھی تک کچھ نہین کر سکے ہین، کچھ برسون کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اردو اور ہندی پڑھے لکھون مین تعداد کا کتنا بڑا فرق ہو گیا اور اس فرق کی وجہ سے اگر کوئی نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلے، تو اس کی ذمہ داری ہمارے ہی سر ہوگی،

پورے ملک مین انجمن ترقی اردو کے علاوہ اردو کی دیکھ بھال اور ترقی کے لئے کوئی دوسری انجمن نہین ہے، اور اس کی شاخین بھی صرف بڑے بڑے صوبون تک ہین، شہر بشہر اس کی شاخین اور اون شاخون مین کام کرنے والے

لوگ نہین، جب تک ہم پوری سرگرمی اور جوش وخروش سے کسی کام کو نہین کرین گے، اوس کا ہونا معلوم،

بڑی بڑی کتابون اور تصنیفون کو چھوڑ کر جن کے پڑھنے والے کم ہین، ہم کو عوام کی خاطر چھوٹی چھوٹی عام پسند کتابین اور رسالے سیکڑون اور ہزارون کی تعداد مین چھپوا کر پھیلانا چاہئے، بلکہ اگر ہو سکے تو ہندی خط مین صاف ستھری بولی کی کتابین بھی لکھوائی اور چلائی جائین، اور بتایا جائے کہ ہم اس ہندی کے خلاف نہین، جو ہندو مسلمان دونون کی زبان ہے،

ملک کی زبان کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے صحیح راستہ یہ ہو کہ ہندوستانی اردو یا اوس کو آسان ہندی کہ لیجئے ہندو مسلمانون کی مشترک زبان ہے، اور خالص ہندی کی حیثیت وہ ہے، جو مسلمانون کی فارسی کی ہے، اور سنسکرت کا درجہ عربی کا ہے، اگر ہم اس تصفیہ پر ایک ہو جائین تو ہماری سب مشکلین دور ہو جائین، مگر افسوس ہو کہ ملک مین ایک طبقہ ایسا ہے جو نہ صرف ہندی، بلکہ سنسکرتی ہندی کو ہندوستان کی زبان بنانے پر تلا ہے، اور وہ ایک ایسی غلطی کر رہا ہے جس سے قومی تنگدلی کے سوا کوئی دوسرا فائدہ نہین پہنچ سکتا، اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا، کہ ملک دو حصوں مین بٹ جائے،

ابھی تک گو کہ چالیس برس سے یہ طبقہ یہ سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا ہے، کہ اردو مسلمانون کی اور ہندی ہندوؤن کی زبان ہے، پھر بھی واقعہ یہ ہے کہ اردو ہندو مسلمانون کی مشترکہ زبان باقی ہے، ہندو اخبار اور رسالے اس زبان مین نکل رہے ہین، ہندو مصنف اس زبان مین کتابین لکھ رہے ہین، ابھی ستمبر کے اخیر مین یو پی سرکار کے صیغۂ توسیع تعلیم مین دیہاتی لائبریریون کے لئے کتابین مانگی گئی تھین، اس سلسلہ مین ۱۸۳ اردو کتابین اور ۱، اردو کے مسودے اس صیغہ کو موصول ہوئے، ان چھپی ہوئی کتابون مین آدھی سے کچھ کم کتابین ہندو مصنفون کی تھیں، اور مسودون مین ۱، مین سے ۳۷ مسودے ہندو مصنفون نے بھیجے تھے، ہم اس واقعہ سے اس نتیجہ پر پہونچتے ہین، کہ سمجھدار ہندو طبقہ جس نے تنگ خیالی سے اپنے کو اونچا رکھا ہے، ابھی تک ہمارے بزرگون کے اس فیصلہ کو کہ "یہ زبان دونون قومون کی مشترکہ میراث ہے" مان رہا ہے، اور اس

پختگی کے ساتھ یقین رکھتا ہے،

بعض مسلمان مصنفوں نے جنھوں نے اردو زبان کی تاریخ لکھی ہے، یہ بڑی غلطی کی ہے کہ انھوں نے اس زبان کی تاریخ لکھتے وقت مسلمانوں کی کوششوں کا ذکر تو پورا کیا ہے، لیکن ہندو شعراء اور اہلِ زبان و اہلِ قلم کی کوششوں کو نظر انداز کر دیا ہے، ضرورت ہے کہ اب اس زبان کی ایک ایسی تاریخ لکھی جائے، جس میں دونوں کی محنتوں اور کوششوں کی پوری تفصیل ہو، آج یہ واقعہ کس کو معلوم ہے کہ لکھنؤ میں اردو شاعری کا سب سے بڑا استاد رائے سرب سنگھ دیوانہ تھا، جس کی تربیت کی گود میں لکھنؤ کے اچھے اچھے شاعر مرزا جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیران پلے تھے، لالہ کانجی لال حیا، بندرابن راقم، پنڈت دیا شنکر نسیم، تفتہ، پنڈت رتن ناتھ سرشار، چکبست، برق، ہترودر شاد، نوبت رائے نظر، ساحر دہلوی، دیا نرائن نگم، پریم چند، کشن پرشاد کول، پنڈت برجموہن دتاتریہ وغیرہ کی کوششوں کا پایہ کم نہیں ہے، یہ چند نام یوں ہی زبان پر آگئے ہیں، ورنہ اگر ان کے ناموں اور کاموں کو جمع کیا جائے تو ایک دفتر ہو جائے،

غرض یہ ہے کہ جس راستہ پر ہمارے بزرگ اب تک چلتے آئے ہیں، وہی راستہ ہمارے اتحاد اور آگے کے کام کی ضمانت ہے، اس کو چھوڑ کر جو دوسرا راستہ اختیار کیا جا رہا ہے، وہ ہم سب کو گمراہ کر دے گا،

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ چونکہ ہم کو بنگال، مہاراشٹر اور مدراس کے لوگوں کو ملا کر چلنا ہے جن کی صوبہ وار زبانیں سنسکرت ماخذ سے ملتی ہیں، اس لئے سنسکرتی ہندی ہی ان سب کو ایک کر سکتی ہے، یہ دلیل ایک آنکھ بند کرکے پیش کی جاتی ہے، اگر ہم دونوں آنکھیں کھول کر دیکھیں تو معلوم ہوگا، کہ ہم نے یہ دلیل دیتے وقت واقعی ایک آنکھ بند کر لی تھی، اس لئے ہم نے آدھے ہندوستان کو دیکھا اور آدھے کو نہیں دیکھا، کیا ہندوستان میں کشمیر، سرحد، سندھ، بلوچستان اور پنجاب نہیں، ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ان لوگوں کی زبانوں کے اصلی ماخذوں سے کیوں آنکھیں بند کی جائیں، اس کے علاوہ ڈراویڈی زبانوں سے کیوں غفلت برتی جائے، جن کو نہ اردو سے لگاؤ ہے، اور نہ ٹھیٹھ ہندی سے، اس پر بھی اسلامی مدراس کے ہر حصہ میں اردو بولی اور اس سے

زیادہ سمجھی جاتی ہے، اور ملیبار تک اوس کا نشان پایا جاتا ہے،

الہ آباد یونیورسٹی کے لائق پروفیسر جھا نے اپنی ستمبر ۱۹۳۹ء کی گوالیار والی تقریر مین فرمایا ہو :-

"اردو ڈیڑھ سو برس سے اتر ہندوستان کے اون شہرون کی زبان ہے جو اسلامی تہذیب کے مرکز تھے

اور مسلمان دربارون کی اور اُن کی جو اُون دربارون سے لگاؤ رکھتے تھے، مشترک زبان تھی اور جس کی

شاعری کا وزن، محاورہ اور تشبیہیں کوئی چیز ہندوستانی نہین ؂"

اردو کا لفظ گو بہت پیچھے کا ہے، اسی لئے مین اس نام کو صحیح نہین سمجھتا، لیکن اس سے مقصود تو وہ زبان ہے

جو مسلمانون کے یہان آنے سے پہلے سندھ یا پنجاب یا ہریانہ اور دہلی کے آس پاس بولی جاتی تھی، اور جس مین

مسلمانون کے آنے سے کچھ ان کی ضرورت کے عربی فارسی یا ترکی لفظ ایسے گھل مل گئے کہ اب وہ اپنے اصلی معنون

مین بہت کم رہ گئے ہین کیا اس زبان کی تاریخ ڈیڑھ سو برس کی ہے، اور کیا وہ مسلمان دربارون مین بنی ہے

اور کیا اس کے خیالات، محاورون اور مثلون مین کوئی چیز ہندوستانی نہین، ہندوستانی اکاڈیمی کے کسی

پچھلے نمبر مین شاہ معین الدین ندوی کا وہ مفصل مضمون چھپ چکا ہے جس مین دکھایا گیا ہو کہ اس زبان مین ہندی

تمدن اور تہذیب کا کتنا بڑا حصہ ہی،

اردو مین جو تاریخی اور فرضی نام اس کے ادب کا جزء ہین، ان مین اسلامی اور غیر اسلامی سب ہی

قسم کے نام ہین، رستم، سہراب، حاتم، سکندر، دارا، افلاطون، ارسطو، جمشید، فرعون، نمرود، ان مین کوئی بھی

مسلمان نہین، یہ اسلام سے پہلے کے عربی یا اسلام سے پہلے کے ایرانی مصری اور یونانی نام ہین، یہ نام پچھلی دنیا

مین وہی حیثیت رکھتے تھے، جو آج نپولین، قیصر، سالسبری، بسمارک، جارج واشنگٹن، ہٹلر، مسولینی وغیرہ

کے ہین جن کا تعلق قومون سے نہیں بلکہ دنیا سے ہے، انہی مین وہ نام بھی ہین جن کو ہمارے ہندوستان نے پیدا

کیا ہے، جیسے بھیم، ارجن، کرشن، رام، سیتا، گوتم بدھ، بھگت وغیرہ یا جو الہ طلب قصے ہین، جیسے مہابھارت، رامائن،

بھرت ملاپ، گوپیاں، یا تہوار ہین، جیسے ہولی، بسنت وغیرہ یہ سب ہماری زبان کی مثلون اور مثالون مین

وقت پر آتے ہین، اور زبان مین مزہ دیتے ہین، جو قوم رستم اور سہراب اور سکندر اور دارا کے نامون اور کامون سے خوش ہو، وہ بکرماجیت اور رام چندر کے نامون اور کامون سے کیون خوش نہ ہوگی، جو مذہبی حیثیت اون کی ہے، وہی ان کی ہے، پھر ایک سے محبت اور دوسرے سے نفرت کی کوئی وجہ نہین،

ہندوستان کی وہ میٹھی اور پیاری بولی جس کا نام اصل مین ہندی ہے وہ ہمارے بزرگون مین پہلے بھی مقبول تھی، اور اب بھی ہے، بڑے بڑے صوفی بزرگون کی محفلون مین حضرت سید حسین گیسو دراز اور سعد اللہ فراز لکھنوی کے زمانہ سے وہ گائی جاتی تھی، اور اب بھی ہماری خانقاہون مین گائی جاتی ہے، اور اوس مین کبت اور گیت کہے جاتے اور سُنے جاتے تھے، اور ایسے مسلمان جو پریم اور محبت کی اس پیاری بولی مین شاعری کرتے تھے، سیکڑون سے زیادہ ہین،

لیکن جو ہندی آج پھیلائی جارہی ہے، فورٹ ولیم کالج سے پہلے وہ موجود نہ تھی، اوس کا پتلا انگریزون کی سیاسی جادوگری سے بنا ہے، اور اسی سے اوس مین جان پڑی ہے، اور اسی جادو کا کھیل ہے، جو آج ہندی اردو جھگڑے کی شکل مین دونون قومون کو اب تک لڑا رہا ہے، یہ حقیقت ہے، اور اس حقیقت کو کوئی جھٹلا نہین سکتا،

اگر کسی زبان کا کسی اسلامی زبان سے لگاؤ رکھنا کوئی پاپ ہے، جو معاف نہین ہوسکتا، تو مین کہتا ہون، کہ آج صوبون کی اکثر بولیان جو زبان کے درجہ کو پہنچی ہین، اون مین سے اکثر اسلامی دربارون کی سرپرستی مین پھلی اور پھولی ہین، جیسے بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ، کیونکہ سنسکرت کے سوا ایسی چھوٹی چھوٹی زبانین مسلمانون سے پہلے پڑھنے لکھنے مین کام نہین آتی تھیں، تو پھر کیا یہ زبانین اس لئے آج بھارت ورش سے نکال دیجائینگی کہ انھیں اسلامی دربارون سے لگاؤ رکھنے والون نے پھیلائی ہین، اور انہی دربارون کے سایہ مین وہ پھلی پھولی ہین، ان ساری زبانون مین بڑی بہتات سے عربی فارسی کے ضروری لفظ بھی ملے ہین، لیکن اس پر بھی وہ ناپاک نہین ہوئین،

یہ کہنا بھی سچ نہین کہ ہندی دیہاتون کی زبان ہے اور اردو شہر کی، دیہات اور شہر دونون کی بولی ایک ہی ہے، فرق ان مین وہی ہے جو دیہات اور شہر کی زندگی مین ہے، جو ہندی اخبارون اور رسالوں میں لکھی جاتی ہو، وہ دیہات تو دیہات شہرون میں بھی نہ بولی جاتی ہے، اور نہ سمجھی جاتی ہے، اور اس کا تجربہ ہر روز اور ہر وقت کیا جا سکتا ہے، اور اُسی وقت اس دعوی کی سچائی کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

میں پھر ہندو مسلمان دونون سے اپیل کرتا ہون کہ وہ تنگ دلی اور چھوٹی قومیت کی غلط پاسداری کرکے اپنے ملک کو تباہ نہ کرین، اور اس کشتی مین وہ سوراخ نہ کرین جس سے وہ پھر کبھی نہ بن سکے گی، اور جس کا نتیجہ سب کے لئے ایک ہے، مین اپنے اس بیان کو سر تیج بہادر کے اُس مخلصانہ اور بہادرانہ بیان پر ختم کرتا ہون جو انھون نے ۲۶ اگست ۳۹ء کو کشمیر میں ایک مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

"اردو زبان ہندو مسلمان دونون کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے"۔

آخر مین مجھے اس صوبہ کے اہلِ فکر کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے، اس مین شبہہ نہیں کہ بنگال مین بنگالی کی اہمیت صوبہ کی مقامی بولی کی حیثیت سے زیادہ ہے، پھر بھی یہ بھولنا نہ چاہئے، کہ اردو کی پرورش مین اور ملک کو ایک مشترکہ زبان کے بخشنے میں بنگال کا حصہ کم نہیں ہے، مرشد آباد اور ڈھاکہ اردو ادب کی آخری سرحدین تھین، اور جہان اردو کے بڑے بڑے شاعرون نے جنم لیا ہے، اور شہرت کے بال و پر پیدا کئے ہین اُ شعرائے لکھنو کے مقابلہ میں میدان مارے ہین، اور ان کے دیوانون پر نسخ کا قلم پھیرا ہے، محمد صادق اختر، عبد الغفور نساخ اور نواب سید محمد آزاد کے نام اردو ادب مین یادگار رہین، اور آج بھی وحشت کی شاعری سے لکھنؤ اور دہلی کی ادبی محفلین مانوس ہین، موجودہ اردو ادب کا مافوق انشا پرداز جس کے قلم مین سحر حلال ہے اسی خاک سے اٹھا، فورٹ ولیم کالج جس نے اردو کے الجھے ہوئے بالون مین بھی کنگھی کی، اسی سرزمین کے ایک گوشہ مین تھا، میرامن کا باغ یہین پر بہار ہوا، اور حاتم طائی کی محفل نے یہین آرایش پائی، اور اخوان الصفا نے انسانون کو حیوانون کا فلسفہ یہین پڑھایا، پھر کتنی عجیب بات ہے، کہ جب انگریزون کی تعلیمی رائے بدلی تو اس سرزمین کو

اپنے اُس بچہ سے جس کو اس نے گودون مین پالا تھا، ایسی بیگانگی ہوگئی کہ اب بنگال اور اردو دو متضاد چیزین ہیں۔ بنگال کو اس زبان سے اوتنی بیگانگی کسی طرح نہیں جتنی مدراس کو ہندی یا ہندوستانی سے ہے، مگر یہ کس کو معلوم نہین کہ مدراس کی سابق گورنمنٹ نے جب وہان ہندی یا ہندوستانی کی اشاعت کی ضرورت سمجھی تو دراوڈی قومون کی ہر قسم کی مخالفت کے باوجود اس کی تعلیم کو ضروری قرار دیدیا، اور احاطہ مدراس مین اسکی اشاعت پر ہزارون روپئے خرچ کئے، اگر اسی نظیر کو بنگال مین سامنے رکھا جاتا، تو ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوتی، اور ہندوستانی صوبون کی برادری میں بنگال کی اس کوشش کی بڑی تعریف کیجاتی،

کہاجاتا ہو کہ بنگال مین مسلمانون کا سب سے بڑا حصہ آباد ہے، اگر یہ سچ ہو تو بنگال کے کندھون پر بھی اسلامی ضرورتون کا سب سے بڑا بوجھ ہو، ہندوستان کی ساری اسلامی برادری نے اردو کو اپنی مشترک زبان مانا ہو اور اوس کے پھیلانے اور بڑھانے مین صدیان گنوائی ہین، بڑا افسوس ہوگا اگر ہندوستان کا سب سے بڑا اسلامی صوبہ اس زبان سے اپنی بے التفاتی کا ثبوت دے،

آج سارے ہندوستان مین جو اسلامی تحریکیں پھیلی ہیں، اور اسلامی ہندوستان نے جو بڑے بڑے نامور مصنف اور اہل قلم پیدا کئے ہین، بنگال کا بڑا حصہ اس لئے اون سے ناآشنا ہے کہ وہ اوس زبان سے جس مین وہ خیالات امانت ہیں، بیگانہ ہے، اور اس طرح ہندوستان کا سب سے بڑا اسلامی صوبہ، اسلامی تحریکات اور خیالات سے سراسر غیر متاثر ہے، اور اوس سے جو نقصان اسلام کو اس ملک میں پہنچ رہا ہو وہ بیان کا محتاج نہین،

ہم کو معلوم ہے کہ بنگال کے اندرونی حصون تک میں ہزارون مسلمان اس زبان کو بولتے اور سمجھتے ہین، لیکن اردو قواعد کی بعض مشکلون اور تذکیر و تانیث کے جھگڑون کے سبب سے ان کو الجھن ہوتی ہے، لیکن اگر اہل بنگال جرأت کرتے تو اپنی ضرورت کے مطابق وہ لاہور اور پٹنہ کی طرح اپنی اردو آپ بنالیتے اور دلی اور لکھنؤ والون کو اس کے ماننے پر مجبور کر دیتے،

وقت اب بھی نہین گیا ہے، اور آج سے زیادہ اوس کے لئے کوئی دوسرا مناسب وقت مشکل سے مل سکتا ہو،

ع اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

بنگال کی سرکار کو چاہئے کہ ہندوستانی اردو کو اس صوبہ کے اسکولون کی تعلیم مین مناسب حصہ دے، اور شہرون مین اس زبان کی لائبریریان قائم کرے، اور سرکاری حیثیت سے ہٹ کر خود بنگال والون کی ایک طاقتور جمعیت نجی کے طور پر یہ کام اپنے ہاتھ مین لے، اس کے ممبر شہرون سے گاؤن تک پھیل جائین، اردو پرچارک سبھائین بنائین، اور لوگون کو یہ زبان سکھائین، اگر اردو رسم خط کی مشکل ہو تو شروع میں اس رسم خط کو بھی چھوڑین، اور بنگالی یا لاطینی خط مین اس زبان کے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھیں اور پھیلائین، بنگالی ہندوستانی اردو ڈکشنری لکھین، ادبی اخلاقی اور مذہبی قصے لکھ لکھ کر لوگون کے ہاتھون مین دین، آپ دیکھیں گے کہ چند سال کے اندر بنگال ہندوستان کا جزء ہو جائے گا، اور بنگال کی یہ قربانی ایک طاقتور ہندوستان کے بنانے مین بڑی مدد دے گی، آج پنجابی بولنے والے پنجاب کا اردو ہندوستانی پریس سارے ہندوستان پر راج کر رہا ہے، پھر کیون بنگالی بولنے والے بنگال میں ایسا ہندوستانی پریس نہ ہو، جو ان مقبوضات کو اسی طرح اپنے قبضہ میں نہ لے آئے، ہمت شرط ہے، اور ایثار و قربانی کی تھوڑی ضرورت، آج زبان کے مسئلہ کی کنجی مدراس کے ہاتھ مین نہین، بنگال کے ہاتھ مین ہے، کیا اہل بنگال اس مشکل کے قفل کو کھولنے کو تیار ہین،

سلسلۂ شاہ ولی اللہ کی خدمتِ حدیث

از

جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی

"یہ مقالہ جس کا موضوع امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے تلامذہ کی خدمتِ حدیث ہے

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے اورنٹیل کانفرنس بنارس کے شعبۂ اسلامیات میں پڑھکر سنایا تھا"

خدمتِ حدیث میں ممالکِ اسلامیہ کا حصّہ

عالمِ اسلامی یکے بعد دیگرے باری باری خدمتِ حدیث کے فریضہ کو ادا کرتا رہا ہے اگر ایک وقت میں کسی ایک ملک نے کوتاہی کی تو دوسرے ملک نے قدم آگے بڑھایا اور خدمتِ حدیث کا حق ادا کرنے میں مشغول ہوگیا، اوّلاً سب سے زیادہ حصّہ ممالکِ عراقیہ نے خلافتِ عباسیہ کے ایام عروج میں لیا، ان ممالک نے جملہ علومِ شرعیہ وعقلیہ وادبیہ میں ترقی کی اور علومِ حدیث وفقہ کی سب سے زیادہ خدمت کی، علمائے عراق کے آثارِ باقیہ جواب تک چمک رہے ہیں، اس پر شاہد عدل ہیں، خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد خدمتِ علومِ شرعیہ بالخصوص علمِ حدیث کی خدمت کا سہرا مصر کے سر رہا، مصر میں اسلامی سلطنت کے دونوں دور اس خدمت میں کامیاب رہے، سلاطین وخلفائے مصر نے جو عالیشان مدارس قائم کئے اور انھوں نے جس فراخدلی سے اس پر روپیہ خرچ کیا وہ تاریخ میں ہمارے سامنے ہے، یہی نہیں بلکہ سلاطین وامرائے مصر نے علماء کے دوش بدوش خود بھی تحصیلِ علوم میں حصّہ لیا، ملک ظاہر برقوق نے امام اکمل الدین بابرتی سے فقہ حاصل کی اور صحیحین کی روایت کے لئے زمرۂ محدثین میں شامل ہوئے، ابن ابی المجد جیسے بڑے بڑے عالی الاسناد محدثین کو دور دراز سے مصر بلایا تاکہ محدثین مصر کو اپنی سند عالی کرنے کا موقع ملے، سلطان المؤید صحیح بخاری کو سراج بلقینی سے

خود بلا واسطہ روایت کرتا ہے، حافظ ابن حجر نے الملک المؤید سے حدیث سُنی، اور اوس کو المعجم المفہرس مین اپنے شیوخ مین شمار کیا ہے، المؤید نے علامہ شمس الدین دیری کو جو المسائل الشریفہ فی ادلۃ الامام ابی حنیفہ کے مصنف مین مصر بلایا، اور اہل مصر کو اُن سے استفادہ کا موقع دیا، ملک ظاہر جقمق نے ابن الجزری سے صحیح بخاری سنی، اور بڑے بڑے صاحب اسناد و محدثین کو مصر مین جمع کیا تاکہ اہل مصر ان کی روایات کو سنین اون سے صحاح و مسانید کو حاصل کرین، مصر کا قلعہ ان علما و محدثین کی تیامگاہ تھا، اسی مین طلبہ ان حضرات سے حدیث پڑھتے تھے، شاہی قلعہ کو دار الحدیث بنا دینے سے شان علم کی جس قدر عظمت و وقعت عام لوگوں کے قلوب مین پیدا ہوئی ہو گی، اس کو خود ہی سمجھ لیا جائے، سلاطین و امرائے مصر کی اس توجہ اور رغبت علمی کی وجہ سے ساتوین آٹھوین نوین صدی مین مصر برابر حدیث و فقہ و ادب کا مرکز بنا رہا، تاریخ علما و محدثین مصر کے کارنامون کو ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے، مصر مین بکثرت علما پیدا ہوئے، اونھون نے تمام علوم بالخصوص علم حدیث مین بڑا درجہ حاصل کیا، اور اس کثرت سے کتابین لکھین کہ نہ صرف مصر بلکہ تمام عالم اسلامی کو اُن پر ناز ہے، مصر مین یہ علمی ترقی دسوین صدی کے اوائل تک رہی، پھر سلطنت برجیہ کے زوال کے ساتھ یہ علمی نشاط روبہ تنزل ہونے لگا، بلکہ یون کہنا چاہئے کہ علمی تحقیقات کی بلند عمارت مین زلزلہ آگیا، دسوین صدی اور اوس کے بعد کے علمار کا موازنہ گذشتہ صدیون سے کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ اس وقت مصر مین علمی نشاط کس قدر پھیکا پڑ گیا تھا،

خدمت حدیث مین سرزمین ہند کا اقدام

سنۃ اللہ کے موافق اب دوسرے ممالک نے قدم آگے بڑھایا، اور سرزمین ہند نے خدمت علم اور تحقیق حدیث مین نشاط کا ثبوت دینا شروع کیا، اس سے پہلے ہندوستان نے خدمت فقہ مین کافی حصہ لیا ہے، فتاوی تاتارخانیہ اور لباب المناسک وغیرہ اس کی شاہد ہین، خدمت علوم حدیث مین بھی ہندوستان برابر حصہ لیتا رہا، امام صغانی لاہوری (ف ۶۵۰ھ)[1] کی مشارق الانوار ہمارے سامنے ہے، مگر

---

[1] ھو حسن بن محمد الصغانی لاھوری فقیہ محدث اخذ من صاحب الھدایۃ بواسطۃ و لد ۱۲ عمر المرغینانی توجع اسانید اکابر ائمۃ الطریق مثل الشیخ فرید الدین الاجودنی والسلطان نظام الدین الدھلوی واکابر فقھاء الھند الیہ توفی ۶۵۰ھ ۱۲ ظ

دور نشاۃ قرن عاشر سے شروع ہوتا ہے، جس میں علامہ محمد طاہر پٹنی (ف ۹۸۶ھ) کی مجمع البحار اور المغنی اور شیخ علی متقی (ف ۹۷۵ھ) کی کنز العمال آسمان علم حدیث پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکی ہیں،

مجدد الف ثانی (ف ۱۰۳۴ھ) رحمۃ اللہ علیہ — گیارہویں صدی میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے اشاعت حدیث و سنت اور تحقیق و حفظ علوم حدیث کا جذبہ اسلامیان ہند میں پیدا فرمایا، جس پر آپ کے مکاتیب شاہد عدل ہیں، اسی کا یہ نتیجہ تھا جو ہم نے اپنے مشائخ سے سنا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو بارہ ہزار احادیث حفظ تھیں، سلاطین ہند میں علم حدیث کا یہ شوق و شغف اس سے پہلے نہیں دیکھا گیا، فتاوی عالمگیریہ سلطان عالمگیر کے شغف علمی کی زندہ یادگار اب بھی ہمارے سامنے ہے جس کی نظیر ممالک اسلامیہ نے بھی گیارہویں صدی سے اب تک پیش نہیں کی، ہم اس کو حضرت مجدد صاحب کے برکات میں شمار کرتے ہیں، مکاتیب مجددیہ کی عظمت شان کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ علامہ محمود آلوسی بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی میں ان سے استفاضہ کرتے اور جا بجا تفسیر آیات اور شرح احادیث میں ان سے مدد لیتے ہیں، تفسیر روح المعانی کا درجہ اہل علم کی نظر سے مخفی نہیں ہے، ہمارے سامنے علمائے عراق کا یہ آخری شاندار کارنامہ ہے جس پر وہ جس قدر بھی ناز کریں بجا ہے،

شیخ عبد الحق محدث دہلوی ف ۱۰۵۲ھ — دسویں صدی ہجری کے آخر میں محدث ہند شاہ عبد الحق حجاز سے علم حدیث حاصل کر کے دہلی تشریف لائے اور نشر و اشاعت حدیث پر توجہ فرمائی، مشکوٰۃ کا مقدمہ عربی میں لکھا، جو باوجود اختصار کے اصول حدیث میں بے نظیر ہے، مشکوٰۃ کی شرح عربی میں بنام لمعات اور اشعۃ اللمعات فارسی میں لکھی جو آج تک محدثین کی آنکھیں روشن کر رہی ہے، سفر السعادۃ کی شرح لکھی،

ما ثبت بالسنۃ فی احکام الشہور والسنۃ تحریر فرمائی، جو اپنے باب میں سب سے پہلی اور آخری کتاب ہو، آپ کے صاحبزادے مولانا نور الحق (ف ۱۰۷۳ھ) نے شرح بخاری اور شرح مسلم لکھی ہے، جو بہت مشہور ہیں، زبدۃ التواریخ بھی آپ ہی کی تصنیف ہے جس میں عہد اکبری کے حالات بڑے منصفانہ انداز سے بیان کئے ہیں (آپ کو شم

مولانا سلام اللہ حنفی نے جو شیخ ہی کی اولاد میں ہیں، موطا امام مالک اور شمائل ترمذی کی شرح لکھی، (مقدمۃ التعلیق الممجد)

امام الہند شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۱۷۶ھ) بارھوین صدی کے شروع میں دارالعلوم والحکمۃ یعنی شہر دہلی میں حجۃ اللہ فی الارض امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پیدا ہوئے، جن کی شان تحدیث و تجدید دین کا غلغلہ ہندوستان اور بیرونِ ہند عرب و عجم میں بلند ہوا جیسا کہ آپکے شاگردون کے سلاسل اور آپ کی تصانیفِ حدیث سے ثابت ہے، آپ نے ترویجِ حدیث کے لئے وہ راہین اختیار کین، جن پر آپ سے پہلے ہندوستانی علماء کی توجہ نہ ہو سکی تھی،

علم حدیث کی سب سے قدیم کتاب موطا امام مالک کی آپ نے دو شرحین عربی و فارسی مین المسوی والمصفی کے نام سے لکھین، یہ شرحین اگرچہ زیادہ مفصل نہیں، مگر نہایت وزن دار اور پُرمغز ہین، جو یقیناً موطا امام مالک کے سمجھنے کے لئے ایک سلیم العقل صحیح الاستعداد کے لئے کافی ہین، شاہ ولی اللہ کی اوّلیات مین سے یہ ہے کہ آپ نے درسِ قرآن کریم کے بعد درسِ موطا کو بقیہ کتب احادیث پر مقدم فرمایا، کیونکہ وہ اوّل تو ان سب سے پہلی ہے، و الفضل للمتقدم، دوسرے یہ کتاب مکہ و مدینہ و عراق و شام و یمن و مصر و افریقیہ و اندلس وغیرہ جملہ بلادِ اسلام مین مقبول و مشہور اور متفق علیہ ہے، ہر زمانہ مین علما نے بکثرت اس پر کام کیا ہے، کسی نے موطا پر تخریج لکھی، کسی نے اوس کی احادیث کے متابعات و شواہد جمع کئے، کسی نے اس کے لغات کو حل کیا، مشکلات کو ضبط کیا، کسی نے اوس کے رجال کی تاریخ لکھی، کسی نے اوس کی بلاغات و موقوفات و مراسیل و مقاطیع کو متصل کیا، غرض موطا پر اس قدر کام ہو چکا ہے، کہ اوس سے زیادہ متصور نہین، صحیح بخاری و صحیح مسلم اگرچہ اوس سے زیادہ ضخیم اور مبسوط ہین، لیکن روایات حدیث کا طریقہ، رجال کی تمیز و تنقید کا راستہ، استدلال و استنباط کا طرز سب نے موطا ہی سے سیکھا ہے، تیسرے موطا میں وہ احادیث مشکلہ نہین ہین جن کے سمجھنے مین کسی مبتدی یا نو مسلم کو دشواری پیش آئے، پس قرآن کے حصۂ احکام کو سمجھنے کے لئے موطا امام مالک کافی ہے،

موطا امام مالک کی یہ بھی خصوصیت ہو کہ اس پر فقہا رمجتہدین نے بھی کام کیا ہے، امام شافعیؒ نے موطا کو امام مالکؒ سے حاصل کیا اپنی کتابوں مین اس کی احادیث کی تحقیق کی، امام محمد نے بھی تین سال مدینہ منورہ رہکر موطا کو امام مالک سے سنا پھر موطای محمد اور کتاب الحجج میں اُس پر تحقیق و تنقید کی یہ بات موطا امام مالک کے سوا کسی کتاب کو نصیب نہین ہوئی،

پس شاہ ولی اللہ کی راے یہ ہو کہ موطا امام مالک کتب حدیث کا متن ہے، بقیہ جملہ کتب اوسی کی شرح ہین، اور یہ ایسی بات ہے جس کا کوئی صاحبِ انصاف انکار نہین کر سکتا،

شاہ ولی اللہ نے اپنی دوسری کتاب الانصاف فی بیان سبب الاختلاف مین ان اسباب کو اچھی طرح واضح کیا ہے جس کی وجہ سے فقہا کے درمیان بعض مسائل اجتہادیہ مین اختلاف نظر آرہا ہے، اس کتاب کو سمجھ لینے کے بعد کسی کو یہ کہنے کی جرأت باقی نہین رہتی، کہ فلان مسئلہ مین فلان امام نے حدیث صحیح کی مخالفت کی ہے، اس کتاب سے تمام فقہا کی عظمت قلوب میں پیدا ہوتی ہے اور باہمی نزاع کا شائبہ بھی باقی نہین رہتا،

حجۃ اللہ البالغہ وہ کتاب ہے، جس کی وجہ سے شاہ ولی اللہ کا درجۂ امامت و تجدید عرب و عجم نے تسلیم کیا، یہ کتاب اپنے طرز مین بالکل جدید اور بے نظیر ہے، اس سے پہلے ایسی کتاب کسی مصنف نے نہین لکھی، اس کتاب کو صحاح ستہ کی شرح، فقہ اسلامی کا خلاصۂ مقاصد و اسرارِ شریعت کا لب لباب حکمت و سیاست اسلامیہ کی تصویر کہنا چاہئے، اس کتاب سے ہندوستانی مسلمانون کی علمی تحقیقات کا سکہ تمام عالمِ اسلامی پر بیٹھ گیا، اور بارہوین صدی مین خدمتِ حدیث کا سہرا اون کے سر رہا،

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء مین جس وسعتِ نظر اور تحقیق و تفتیش سے احادیثِ متعلقۂ خلافت کو جمع کیا گیا، اور جس خوبی سے مسئلۂ خلافت پر بحث کی گئی ہے، اس کی نظیر نہین مل سکتی، علم حدیث مین آپ کی ایک چہل حدیث اور مسلسلات اور نوادر الحدیث الدر الثمین، شرح تراجم بخاری بے نظیر کتابین ہین،

حدیث نبوی کی تحریری خدمت کے ساتھ شاہ ولی اللہ نے تعلیمی اور درسی خدمت بھی جس خوبی سے انجام

دی ہے، اوس نے اسلامیانِ ہند میں درسِ حدیث کا نیا دروازہ کھول دیا، طالبانِ حدیث جوق جوق شاہ صاحب کے درس میں شریک ہوئے، اور سندِ حدیث لے کر اطرافِ عالم میں حدیث نبوی کی اشاعت کرنے لگے، اور اوس کا سلسلہ بحمد اللہ اب تک جاری ہے،

سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی ۱۲۰۵ھ

شاہ ولی اللہ کے تلامذہ میں بڑی شخصیت کے عالم ہیں تاج العروس شرح القاموس آپ کے تبحر علمی و ادبی کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر علمائے عراق و مصر نے بھی اب تک پیش نہیں کی، علم حدیث میں آپ کی وسعتِ نظر اور تبحر پر الجواہر المنیفہ فی ادلۃ الامام ابی حنیفہ روشن دلیل ہے۔

بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی ۱۲۲۵ھ

شاہ ولی اللہ کے تلامذہ میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کو اوس زمانہ کے علماء نے بیہقی وقت کا خطاب دیا ہے، حفظ احادیث اور وسعت نظر میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے، جس پر آپ کی تفسیر مظہری شاہد عدل ہے، اس تفسیر میں اس کثرت کے ساتھ احادیث کو جمع کیا گیا ہے کہ دیکھنے والے کو مصنف کی وسعتِ نظر پر حیرت ہوتی ہے، جملہ احادیث پر محدثانہ اصول سے کلام بھی بڑی خوبی سے کیا گیا ہے، جو ان کی شانِ تنقید کو واضح کرتا ہے، افسوس ہے کہ یہ کتاب ابھی تک پوری طبع نہیں ہوئی، چند اجزاء طبع ہوئے ہیں، اگر پوری طبع ہو جاتی، تو جس طرح تفسیر روح المعانی نے اس زمانہ میں اہل عراق کا سرِ افتخار بلند کر دیا ہے، تفسیر مظہری سے اسلامیانِ ہند کی خدمتِ حدیث و تفسیر کا جھنڈا بہت ہی بلند ہو جاتا، خدا کرے مسلمانانِ ہند اس طرف توجہ کریں،

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ۱۲۳۹ھ

آپ اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ کے سچے جانشین فخر المحدثین زین المفسرین تھے، چراغِ ہند آپ کا لقب تھا، ہندوستان میں علم حدیث کی ریاست آپ پر ختم تھی، طالبین اطراف و اکناف سے حدیث پڑھنے آپ کے پاس آتے تھے، اور فیضیاب ہو کر جاتے تھے، جملہ علوم عربیہ ادبیہ، شرعیہ و عقلیہ میں متبحر تھے، بستان المحدثین علم حدیث میں آپ کی وسعتِ نظر پر شاہد عدل ہے، ملفوظاتِ عزیزیہ سے آپ کی شانِ تحقیقِ حدیث واضح ہے، اصولِ حدیث میں عجالۂ نافعہ بھی بہت مفید ہے، تفسیر فتح العزیز بے نظیر تفسیر ہوتی،

اگر تمام طبع ہو جاتی، مگر افسوس کہ نا تمام رہ گئی، اس کو دیکھکر تحقیقات کا ایک سمندر جوش مارتا ہوا نظر آتا ہے،

آپ کے تلامذہ بے شمار ہیں، اور حدیث میں تمام اسانید ہند کا مرجع آپ ہی کی ذات ہے،

شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی ۱۲۶۲ھ
آپ شاہ عبد العزیز صاحب کے نواسے اور علم حدیث میں اون کے سچے جانشین ہیں، شاہ عبد العزیز کے بعد آپ ہی علم حدیث میں مرجع خلائق اور محدثِ اکبر تھے، مشکوٰۃ کا ترجمہ فارسی میں کیا، پھر نواب قطب الدین خان صاحب نے جو آپ کے اجل تلامذہ سے ہیں، مظاہر حق کے نام سے اردو میں مشکوٰۃ کا ترجمہ کیا، جو اہلِ علم کی نظر میں بہت بلند پایہ لکھا ہے، معانی حدیث کی تحقیقات، متعارضات میں تطبیق بہت خوبی سے کی گئی ہے، شاہ محمد اسحاق صاحب کے تلامذہ نے حواشی صحاح ستہ میں جا بجا شاہ صاحب کی تقریریں شرح حدیث کے متعلق نقل کی ہیں، اون سے شاہ صاحب کی شان تحقیق اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے، اسی طبقہ میں شاہ ابو سعید مجددی دہلوی، مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب شہید دہلوی، حضرت مجدد ملت سید احمد صاحب بریلوی، شاہ عبد القادر صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب کی خدمات بھی سلسلۂ ولی اللہی کی خدمتِ حدیث کو درخشان ستارے ہیں، ان سب حضرات نے اپنے درس و عمل سے ترویج حدیث و اشاعتِ سنت میں اتنا شغف ظاہر کیا، جس سے شاہ ولی اللہ کا سلسلۂ حدیث اطرافِ عالم میں پھیل گیا، شاہ عبد الحی محدث دہلوی کو ایسے آدمی مل جاتے، تو ان کا سلسلہ بھی اچھی طرح پھیل جاتا، مگر یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، حضرت سید صاحب بریلوی گو اہل علم کی طرح درس دینے والون میں نہین تھے، مگر ان کا عمل اور اتباعِ سنت سراسر درسِ حدیث تھا، ان کے عمل سے لوگون میں درسِ حدیث کی روح زندہ ہوتی تھی، جس پر تاریخ شاہد ہے،

شاہ اسحاق صاحب کے تلامذہ میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہین، ایک وہ جو اپنے کو اہلِ حدیث کہتے اور تقلید ائمہ کا انکار کرتے ہین، اور خود کو حنفی نہین کہتے، ان کا خیال یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی حنفی نہین تھے مگر یہ ایسی بات ہے جس کو شاہ ولی اللہ کی فیوض تحریرین پر نظر رکھنے والا کبھی تسلیم نہیں کر سکتا، اس سے کسی کو انکار نہیں کہ شاہ ولی اللہ ہندوستان میں علامہ ابن الہمام کی نظیر تھے، یعنی مقلد محقق تھے، وہ بعض مسائل میں

عام حنفیہ سو اختلاف بھی کرتے ہیں، مگر اس کا نام ترک تقلید نہیں بلکہ تحقیق فی التقلید ہے کہ وہ تحقیق کے ساتھ تقلید کرتے ہیں، نواب صدیق حسن خان صاحب امیر جماعت اہل حدیث اپنی کتاب الحطہ میں فرماتے ہیں،

ان الشاہ ولی اللہ المحدث الدھلوی	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنا یہ طریقہ
قد بنی طریقتہ علی عرض المجتھدات	اختیار کیا ہے کہ مسائل اجتہادیہ کو قرآن
علی السنۃ والکتاب وتطبیق الفقھیات	وحدیث پر پیش کرتے ہیں، اور مسائل فقہیہ
بھما فی کل باب، الی قولہ وھذا	کو ہر باب میں قرآن وحدیث سے مطابقت
کلہ مذھب حنفی الخ	دیتے ہیں، .... اور اُن کا یہ تمامتر
	طریقہ مذہب حنفی ہی ہے،

مولانا محمد محسن بہاری تیمی نے الیانع الجنی ص ۶ میں شاہ عبد الغنیؒ شاہ محمد اسحاقؒ، شاہ عبد العزیزؒ، شاہ ولی اللہؒ چاروں کو حنفی المذہب بتایا ہے، شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبد الرحیمؒ ان علماء میں ہیں جو فتاوی عالمگیری کی تدوین پر مامور تھے، شاہ ولی اللہ کے اجل تلامذہ میں سے آپ کے جانشین شاہ عبد العزیزؒ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی سید مرتضی بلگرامی زبیدی جو تبحر حدیث وغیرہ میں اعلیٰ پایہ رکھتے ہیں، سب حنفی تھے، شاہ عبد العزیزؒ شاہ محمد اسحاقؒ اور ان کے جانشین شاہ عبد الغنی مجددی سب حنفی ہیں، پس جس کے اصول و فروع سب حنفی ہوں، اس کے متعلق کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود حنفی نہ تھا، درمیان کلام میں اس خاص نکتہ پر اشارہ کرکے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاہ محمد اسحاق صاحب کے تلامذہ میں اُن لوگوں نے بھی جو اپنے کو حنفی نہیں کہتے، ہندوستان میں علم حدیث کی خدمت بہت کچھ کی ہے، مولانا نذیر حسین صاحب مرحوم کا درس حدیث مشہور و معروف ہے، صدہا علماء آپ سے فیضیاب ہوئے جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، نواب صدیق حسن خان نے مشکوٰۃ پر فصل رابع کا اضافہ فرمایا، بلوغ المرام کی متعدد شرحیں لکھیں، الروضۃ الندیہ کی شرح لکھی، عون الباری کے نام سے ادلہ بخاری کی بھی شرح لکھی، کتاب الحطہ علی الصحاح الستہ اور ابجد العلوم ان کی بے نظیر تالیفات ہیں، انھوں نے کتب نادرہ علم حدیث کی اشاعت بھی خوب

کی ہے، علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے سنن ابی داؤد کی شرح عون المعبود تصنیف کی، ان کے بڑے بھائی علامہ ابو الطیب نے غایۃ المقصود بہت ضخیم کئی جلدوں میں تصنیف کی، جو افسوس ہے پوری طبع نہیں ہوئی، اعلام العصر بھی بہت تحقیق کر لکھی گئی ہے، قریب زمانہ میں مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری نے تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی بڑی قابلیت سے لکھی ہے، یہ بھی سب کی سب سلسلۂ ولی اللہی کی خدمت حدیث میں داخل ہے، سه

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے　　اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ان حضرات کی خدمت حدیث پر اجمالی اشارہ کرکے، میں سلسلۂ ولی اللہی کی دوسری شاخ کی خدمات حدیث بیان کرنا چاہتا ہوں جو اپنے کو حنفی کہتے ہیں، میری نظر میں بعض وہ لوگ بھی ہیں جن کو علم حدیث کی روشنی سلسلۂ ولی اللہی سے پہونچی، مگر وہ اپنے کو اس سلسلہ سے الگ ہی رکھنا پسند کرتے ہیں، اس لئے میں نے بھی ان کا تذکرہ پسند نہیں کیا، ومنھم صاحب صحیح البھاری وتسمیتہ بالصحیح مصداق المثل السائر برعکس نھند نام زنگی کافور فقد جمع فیہ کثیرا من الضعاف بل ومن الموضوعات،

شاہ عبد الغنی محدث مجددی دہلوی م ۱۲۹۶ھ ابو حنیفہ عصر بخاری دہر حجۃ المحدثین شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اپنے والد شاہ ابو سعید سے حدیث و تفسیر پڑھکر شاہ اسحاق صاحب سے حدیث حاصل کی، پھر مہاجر مدنی ہو کر شیخ عابد سندھی رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف پڑھی، اور سند حدیث حاصل کی، سنن ابن ماجہ کی شرح بنام انجاح الحاجۃ آپ کی بہترین تالیف ہے، جو ابن ماجہ کے حاشیہ پر طبع ہو چکی ہے،

مولانا شیخ احمد علی محدث سہارنپوری م ۱۲۹۷ھ آپ شاہ محمد اسحاق صاحب کے اجل تلامذہ سے ہیں، مکہ مکرمہ میں شاہ صاحب سے کتب حدیث پڑھیں، پھر ہندوستان واپس آکر درس حدیث کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی بنیاد ڈالی، جو اب تک قائم اور روز افزوں ترقی پر ہے، صدہا علما اوس سے فیضیاب ہو کر اطراف عالم میں اشاعت حدیث و قرآن کی خدمت بجالا رہے ہیں، جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب پہونچ چکی ہے، پھر ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کو شمار کیا جائے تو ہزاروں تک نوبت پہونچے گی، مولانا احمد علی نے درس حدیث ہی پر کفایت نہیں کی

بلکہ مطبع احمدی قائم کرکے کتب حدیث کو باحسن وجہ طبع کرکے خدمت حدیث کا حق ادا فرمایا، حق بات کو چھپایا نہیں جا سکتا،
مولانا احمد علی نے صحیح بخاری کو جس خوبی اور خوبصورتی اور صحت کاملہ کے ساتھ طبع فرمایا، انصاف یہ ہو کہ آج تک ممالک
اسلامیہ مین سے بھی کسی ملک نے اوس کا جواب نہیں دیا، اور یہ بھی ہندوستان کو فخر ہے کہ صحیح بخاری اور چند کتب حدیث
مصر سے پہلے یہان طبع ہوئی ہین، اور غالباً یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا، کہ جس طرح فتح الباری بخاری شریف کی مفصل شروح
مین بے نظیر ہے، جس پر مصر کو جس قدر بھی ناز ہو بجا ہے، اسی طرح مولانا احمد علی کا حاشیہ بخاری شریف مختصر شروح مین
بے نظیر ہے، جس نے اسلامیان ہند کے سرافتخار کو بہت بلند کر دیا ہے، آج تک اختصار کے ساتھ ایسا جامع وزن دار
پر مغز حاشیہ کسی نے بھی بخاری شریف پر نہیں لکھا، جس کے بعد حل بخاری کے لئے مطولات کی حاجت باقی نہین رہتی،

مسئلۂ قرأت خلف الامام مین آپ کا رسالہ الدلیل القوی بھی مصنف کی وسعت نظر، اور تحقیق علوم حدیث کا آئینہ ہے،

قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی

آپ نے فن تجوید کی ہندوستان مین بڑی خدمت انجام دی ہے، اسی کیساتھ علم حدیث مین بھی آپ کا پایہ بہت بلند تھا، شاہ اسحٰق صاحب سے علم حدیث حاصل کیا، اور بڑے بڑے علماء کو سند حدیث سے سرفراز فرمایا، جن مین حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا حکیم الامۃ تھانوی کا نام لینا کافی ہے، اور بھی بہت علماء آپ سے فیضیاب ہوئے،

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم محدث بانی دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۷ھ

آپ نے شاہ عبدالغنی صاحب[1] مجددی دہلوی سے علم حدیث حاصل کیا، پھر قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی سے سند حدیث حاصل کی، مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے بھی حدیث پڑھی، بخاری شریف کی تصحیح مین زیادہ کام آپ ہی نے کیا، اور مولانا احمد علی صاحب کے حاشیہ بخاری کے پانچ اجزاء کی تکمیل استاد کے ارشاد سے آپ نے ہی کی، بخاری کے یہ آخری پانچ اجزاء بہت مشکل ہین،

---

[1] مولوی امام خان نوشہروی نے مولانا محمد قاسم صاحب کو شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ کا شاگرد حدیث میں لکھا ہے یہ صحیح نہیں، شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ کا انتقال اپنے سب بھائیون سے پہلے ہوا ہے، ان کو مولانا محمد قاسم صاحب کیونکر پا سکتے ہین، جنھون نے شاہ اسحٰق صاحب کو بھی نہین پایا، ۱۲ ظ

کتاب الاعتصام بالسنة کے بعض تراجم ابواب کی مناسبت حدیث سے بالکل معلوم نہین ہوتی، اسی طرح کتاب الرد علی الجہمیہ اور کتاب التوحید بھی آسان نہیں ہیں، انہی اجزا مین امام بخاری نے قال بعض الناس کہکر حنفیہ پر اعتراضات بھی زیادہ کئے ہیں، یہ مولانا محمد قاسم صاحب ہی کا حصہ تھا، کہ ان دشوار گذار گھاٹیون کو ایسا آسان کر دیا ہے کہ اب کسی راہ رو کے لئے کچھ دشواری باقی نہیں رہی،

مولانا نے اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ مین کتب حدیث کے طبقات اور اصول تنقید کو جس خوبی سے بیان فرمایا ہے، اس کو دیکھکر یہ ماننا پڑتا ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کے اصول تنقید و قواعد تطبیق کو آپ سے بہتر کسی نے نہیں سمجھا، مولانا بڑے دعوی کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، کہ اقوال ابی حنیفہ کو حدیث کے موافق ثابت کرنے کا مین ذمہ لیتا ہون لیکن تخریجات کے فقہاء کا مین ذمہ دار نہیں (سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ) جن لوگون نے مولانا کی تقریر درس حدیث مین سنی ہے، وہ اس کے شاہد ہین، کہ واقعی مولینا اقوال ابی حنیفہ کی تقریر ایسی کرتے تھے، جس کے بعد وہ بالکل حدیث کے موافق نظر آتے تھے، حدیث کو قول ابی حنیفہ کے مطابق نہین کرتے تھے کہ اس کا خلاف ادب ہونا ظاہر ہے، بلکہ قول ابی حنیفہ کو حدیث کے مطابق کر دیا کرتے تھے،

چونکہ مولانا کے زمانہ مین بعض لوگ مذہب اسلام پر اعتراض وطعن کے لئے میدان مین اتر آئے تھے، اس لئے مولانا کو اپنا زیادہ وقت ان کی مدافعت مین صرف کرنا پڑا، اور دنیا گواہ ہے کہ مولانا کو اس مین جیسی کامیابی حاصل ہوئی، وہ آپ ہی کا حصہ تھی، جس کو تائید غیبی کہنا اصلاً مبالغہ نہین، مولانا کی کتاب حجۃ الاسلام، مباحثہ شاہجہانپور، قبلہ نما، تقریر دلپذیر وغیرہ اس پر شاہد عدل ہین، اسلئے گو آپ نے خدمت علم حدیث کے لئے تحریری کام زیادہ نہیں کیا، مگر آپ کا بڑا کارنامہ جو تمام سلسلۂ ولی اللہی کے تحریری کارنامون سے زیادہ وزنی ہے یہ ہے کہ آپنے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالدی، جس مین اس وقت سے اب تک ہر سال دورۂ حدیث تمام ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند کا نور برابر چمکتا اور بڑھتا رہا، یہان تک کہ اس کی شعاعین ہندوستان سے گذر کر سماٹرہ، جاوہ اور مشرق اقصی مین چین تک پہونچ گئین، اور جنوبی افریقہ، بلاد افغان و ایران و مصر و شام و عرب تک اوسکی

علمی تحقیقات کا جھنڈا بلند ہو گیا، آج دار العلوم دیوبند کو بجا طور پر ازہر الہند کا لقب دیدیا گیا ہے، جن علمار نے اس درس گاہ سے صرف دورۂ حدیث کی تعلیم حاصل کی، اون کی تعداد دس ہزار سے اوپر ہے، اور جو تمام علوم شرعیہ عقلیہ و نقلیہ میں اس درس گاہ سے کامیاب ہوئے، ان کا شمار پانچ ہزار تک ہے، اور ان میں سے جو صاحب درس و تدریس ہو کر مفتاح العلوم بن گئے، ان کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں، دار العلوم دیوبند کے طلبہ کی تعداد ہر سال ڈیڑھ ہزار سے اوپر ہو جاتی ہے، اگر اسلامیان ہند اس درس گاہ پر ویسی ہی توجہ کرتے جیسی اہل مصر نے جامع ازہر پر کی تو یقیناً اس کا پایہ اس سے بھی بہت زیادہ بلند اور عظیم الشان ہوتا، اس درسگاہ کے فارغین نے جن مدارس کی بنیاد اطراف ہندوستان میں قائم کی ہے ان کا شمار ایک ہزار سے زیادہ ہی ہے،

اور یہ تمامتر خدمت قرآن و حدیث مولینا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے نامۂ اعمال میں داخل ہے اللھم ارفع درجاتہ وتقبل حسناتہ ومتعنا بفیوضہ وبرکاتہ آمین، تاسیس دار العلوم دیوبند میں مولانا محمد قاسم صاحب کے ساتھ حضرت مولینا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولینا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے انفاس قدسیہ کی اعانت بھی شامل حال تھی، اور ابتدار میں یہی تین حضرات اُس کے روح رواں تھے، مگر موسس اول مولینا محمد قاسم صاحب تھے،

مولانا شیخ محمد رح محدث تھانوی مولانا شیخ محمد اپنے زمانہ میں محدث کے لقب سے مشہور تھے، شاہ محمد اسحاق صاحب کے ارشد تلامذہ سے ہیں، جب آپ نے سلطان عالمگیر رح کے حافظ حدیث ہونے کا واقعہ بیان فرمایا، کہ ان کو بارہ ہزار حدیثیں حفظ تھیں، تو آپ کے ایک شاگرد نے پوچھا حضرت آپ کو کتنی حدیثیں حفظ ہیں، فرمایا، اپنی محفوظات پر نظر ثانی کرکے کل جواب دون گا، کیونکہ میں نے اب تک اپنی محفوظات کو شمار نہیں کیا، دوسرے دن فرمایا، کہ الحمد للہ مجھے چار ہزار حدیثیں حفظ ہیں. (سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہ) سنن نسائی پر آپ کا حاشیہ مطبع مجتبائی میں طبع ہو چکا ہے، جس میں زیادہ تر حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی تحقیقات و تقریرات جمع کی گئی ہیں،

مولانا شیخ عبدالقیوم بھوپالی بڈھانوی ۱۲۹۹ھ

آپ بھی شاہ اسحاق صاحب کے اجلۂ تلامذہ سے ہیں، اور ان کے داماد بھی ہیں، ساری عمر درس حدیث میں گذری، بڑے بڑے علما نے آپ سے سندِ حدیث حاصل کی، سلسلات شاہ ولی اللہ کی سند علما کو آپ سے ہی پہونچی، آپ بھوپال سے علیل ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے، تو جماعت طلبہ بھی ساتھ تھی، جو آپ سے بخاری شریف پڑھ رہے تھے، راستہ میں مرض بڑھ گیا، او کچھ دنوں بنارس میں آپ نے قیام فرمایا، اس حالت میں بھی درسِ حدیث جاری رہا، سرزمین بنارس کو یہ شرف حاصل ہے، کہ ایک قدسی صفات محدث نے اوس میں کچھ دنوں درسِ حدیث دیا ہے، یہاں سے وطن کو روانہ ہوئے تو مرض موت کے آثار راستہ میں شروع ہوگئے، جس وقت آپ اپنے مکان کے دروازہ پر پہونچے ہیں، تو بخاری شریف کی آخری حدیث کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان حبیبتان الی الرحمٰن سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم آپ کی زبان پر تھی کہ نزع روح شروع ہوگیا، فوراً مکان کے اندر لیجایا گیا، اور روح قفس عنصری سے آزاد ہوگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون اس ایک واقعہ سے ہی آپ کا شغفِ حدیث ظاہر ہے،

مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ مدرس اول و محدث مظاہر علوم سہارنپور ۱۳۰۲ھ

علم حدیث مولینا شیخ رشید الدین دہلوی اور مفتی صدر الدین دہلوی اور شاہ اسحٰق صاحب سے حاصل کیا، جملہ علوم شرعیہ نقلیہ و عقلیہ کے ماہر تھے، علم فقہ میں مرجع خلائق تھے، مدرسہ مظاہر علوم کے محدثِ اعلیٰ تھے، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے بھی آپ سے بعض کتب ابتدائیہ پڑھی ہیں، انتقال کے وقت بوجہ حدیث نبوی المومن یموت بعرق الجبین بار بار اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے تھے جب پسینہ نمودار ہوا تو خوشی سے چہرہ کھل گیا، اور اس خوشی کے عالم میں انتقال فرمایا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

نادرۃ الزمان مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی ۱۳۰۴ھ

آپ سلسلۂ ولی اللّٰہی کے مایۂ ناز محدث فقیہ، اصولی، معقولی، مؤرخ محشی اور بہترین مصنف تھے، تھوڑی عمر میں اتنا کام کیا ہے، کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوجاتی ہے، تمام علوم و فنون عقلیہ و نقلیہ و آلیہ میں آپ کی تالیفات موجود ہیں، کتب درسیہ پر حواشی بھی

---

[۱] مولوی امام خان صاحب نوشہروی نے آپ کی وفات بھوپال میں لکھی ہے، جو صحیح نہیں، ۱۲ ظ

بکثرت ہیں تالیفات کے ساتھ شغل درس بھی جاری تھا، اور یہ سب خدمات ۳۹ سال کی عمر میں انجام دیکر دارالبقا میں پہونچ گئے، آپ نے علم حدیث اپنے والد صاحب سے حاصل کیا، ان کو حدیث کی اجازت شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی اور مولینا حسین علی محدث ملیح آبادی تلمیذ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے حاصل ہے، پھر مولینا عبدالحی صاحب نے شاہ عبدالغنی صاحب سے خود بھی بذریعہ خط کے اجازت حاصل کی، آپ کی تالیفات حدیث میں التعلیق الممجد علی الموطا محمد بہت لاجواب ہے، جس کے مقدمہ میں تاریخ علم حدیث پر سیر حاصل کلام فرمایا ہے علم رجال میں الفوائد البہیۃ فی طبقات الحنفیہ بے نظیر ہے، امام الکلام فی القرأۃ خلف الامام ظفر الامانی المسمی المشکور تذکرۃ الراشد، تراجم علمائے ہند، سعایہ وغیرہ مصنف کی وسعتِ نظر اور شانِ تحقیق کی روشن دلیلیں ہیں، رحمہ اللہ رحمۃ من عندہ آمین، سعایہ اگر پوری ہو جاتی تو حدیث و فقہ کا بحر زخار ہوتا،

مولانا محمد حسن صاحب اسرائیلی سنبھلی ۱۳۰۵ھ | آپ مولانا عبدالحی لکھنوی کے قابل تلامذہ میں تھے، علم حدیث سے خاص مناسبت تھی، مسند امام ابوحنیفہ کا حاشیہ تنسیق النظام، اور اس کا مقدمہ آپ کی حدیث دانی اور وسعت نظر کا نظر آئینہ ہے، تغمدہ اللہ برحمتہ و رضوانہ شرح معانی الآثار طحاوی کی تصحیح و تحشیہ میں بھی مولانا وصی احمد صاحب کے ساتھ آپ نے کام کیا ہے،

مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ | آپ مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، سنن ابی داؤد پر آپ کا حاشیہ التعلیق المحمود کے نام سے طبع ہو چکا ہے، یہ حاشیہ اسی شان کا ہے، جیسا مولانا احمد علی سہارنپوری کا حاشیہ بخاری پر ہے، آج تک ابی داؤد کا ایسا نفیس اور جامع حاشیہ نہیں دیکھا گیا، یہ بھی سلسلۂ ولی اللّٰہی کی خدمتِ حدیث کا بہت بڑا کارنامہ ہو رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ،

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی | آپ نے علم حدیث شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی سے حاصل کیا، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مدرس اول اور محدث آپ ہی ہیں، صدہا علما نے آپ سے سند حدیث حاصل کی، جن میں سے مولانا حکیم الامۃ تھانوی کا نام لینا کافی ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب کی تحقیقات حدیثیہ کا اندازہ حضرت حکیم الامۃ

کی تصانیف سے بخوبی ہو سکتا ہے، آپ کو علم حدیث کے علاوہ علم تفسیر و ذوق عربیت بھی بدرجۂ کمال حاصل تھا، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کو باوجود کمالِ ادب دانی و تبحر فی العربیۃ کے اعتراف تھا کہ تفسیر بیضاوی جیسی مولانا محمد یعقوب صاحب پڑھاتے ہیں میں نہیں پڑھا سکتا،

قطب زمان مولانا شاہ فضل الرحمن محدث گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۱۵ھ آپ بھی شاہ محمد اسحاق صاحب کے اجل تلامذہ میں سے ہیں، آپ کی ساری عمر درسِ حدیث میں گذری ہے، بڑے بڑے علما نے آپ سے سندِ حدیث حاصل کی ہے، جن میں سے مولانا محمد علی صاحب مونگیری اور حضرت حکیم الامۃ مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی کا نام لینا ہی کافی ہے، آپ سے بھی صدہا علما فیضیاب اور علو اسناد کے ساتھ کامیاب ہوئے، آپ کی اسانید حدیث میں مستقل رسالہ طبع ہو چکا ہے،

محدث بہار مولانا ظہیر حسن شوق نیموی رح ۱۳۲۲ھ آپ مولانا عبد الحی لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں سلسلۂ ولی اللّٰہی کے قابلِ فخر محدث ہیں، آثار السنن کی دو جلدیں مع حاشیۃ التعلیق الحسن آپ کی حدیث دانی تبحر علمی اور وسعتِ نظر اور شانِ تحقیق پر شاہد ہیں، افسوس یہ کتاب پوری نہ ہوئی، ورنہ اپنے باب میں بے نظیر ہوتی، رحمہ اللہ وتغمدہ بغفرانہ،

(باقی)

اسلامی معاشیات

کے

چند فقہی اور قانونی ابواب

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ

(۲)

نمک کا مسئلہ گذشتہ بالا عبارتوں سے جہان اور باتین ثابت ہورہی ہین، وہین یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نمک کی کان بھی پبلک کا مشترک سرمایہ ہے، نہ وہ انفرادی ملکیت بن سکتی ہے، اور نہ حکومت اس پر کوئی محصول عائد کرسکتی ہے، اور اس بنا پر بعض علما رنے ہندوستان مین پچھلے دنون یہ عام فتوی دیدیا تھا کہ اسلامی حیثیت سے نمک سازی پر محصول لگانا یا حکومت کو نمک بنانے سے لوگون کو روکنا جائز نہین ہے، مجھے سیاسی مصالح سے بحث نہین لیکن علما کے متعلق یہ ضرور خیال آتا ہے کہ مسئلہ کو ہمیشہ اس کے تفصیلات کے ساتھ پبلک مین پیش کرنا ان کی دیانت کا اقتضا ہونا چاہئے، نمک کی ایسی کانین جن میں مندرجہ بالا صفات پائے جاتے ہون یعنی (۱) لوگون کی رسائی بلا خرچ نمک تک ہوتی ہو (۲) عام لوگون کی آمد و رفت اس کان تک لگی ہوئی ہو، اور لوگ اوس سے نفع اٹھا رہے ہون، بلاشبہہ نمک کی ایسی کانون کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر وہی ہے لیکن اگر بجائے اس کے صورتِ حال یہ ہو کہ

کان لقرب الساحل موضع اذا — سمندر کے کنارے کوئی ایسی جگہ ہو کہ جب

حصل فیه الماء صار ملحا،

سمندر کا پانی اس میں آکر جمع ہو جائے، تو نمک بن جاتا ہو،

تو اس کے متعلق فقہار کا عام فتویٰ یہ ہے کہ

ملك بالاحياء وللامام اقطاعه،

تو اس کا آدمی مالک ہو جاتا ہے احیا (آبادی) کے ذریعہ سے بھی، اور امام (حکومت) اس کو افراد کی جاگیر میں بھی دے سکتا ہے،

اس قسم کی زمینوں کی احیاء یا زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

تهيئته لما يصلح له من حفر ترابه وتمهيده وفتح قناة اليه تصيب الماء اليه

جس کام کی اس میں صلاحیت ہو، اس کے لئے اس کو تیار کرنا، یعنی اوس کی مٹی کھودنی، اس کو کشادہ کرنا، سمندر سے نالی نکال کر اوس کو گڑھے تک لانا، تاکہ سمندر کا پانی اس میں آکر گرے،

نمک بنانے کے لئے سمندر کی ساحلی زمینوں کو بندوبست کرنے کا حکومت کو اختیار کیوں ہے، اور ان میں انفرادی ملکیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے، اس کی وجہ فقہار نے یہ لکھی ہے کہ

لانه لا يضيق على المسلمين باحداثه بل يحدث نفعه بفعله فلم يمنع منه كبقية الموات،

(المغنی ج۵ ص۱۵۱)

کیونکہ سمندر کے کنارے اس قسم کے کارخانے کے قائم کرنے سے مسلمانوں میں کوئی تنگی نہیں پیدا ہوتی، بلکہ اس زمین کا نفع آباد کرنے والے کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے پس اس کو اس فعل سے نہیں روکا جائیگا، جیسے موات کی دوسری زمینوں کے آباد کرنے

اور غالباً ہندوستان میں نمک سازی کا جو مسئلہ پیدا ہوا تھا، وہ یہی صورت تھی،

عام معدنیات کا حکم اور صرف نمک ہی نہیں، بلکہ اس کے سوا بھی بعض معدنی امور کا ذکر کیا گیا ہے، کہ اسلاف نقطۂ نظر سے ان میں انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہوسکتی، اس حکم کو بھی ہر قسم کی کانون کے لئے عام حکم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ حکم ان ہی معدنی چیزون تک محدود ہے جو خود بخود باہر آگئی ہوں اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہوں ورنہ ایسے معادن جن کو فقہی اصطلاح میں معادن باطنہ کہتے ہیں، اور جن کی تعریف شرح کبیر میں یہ کی گئی ہے،

هی اللتی لا یوصل الیها الا بالعمل والمؤنة، (ص ۱۵۰ جلد ۶)	یہ ان کانون کو کہتے ہیں جن کی پیداوارون تک رسائی بغیر عمل اور مشقت ومحنت کے نہیں ہوسکتی،

پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے

لم تکن ظاهرة فحفرها انسان واظهرها،	یعنی ابتداءً قدرتی طور پر وہ معدن ظاہر نہ تھا پھر کسی نے کھود کر اس کو نکالا اور نمایان کیا،

اس قسم کے معادن کی مثال میں حسب ذیل چیزون کا ذکر کیا جاتا ہے،

کمعادن الذهب والفضة و الرصاص والبلور،	جیسا کہ سونے، چاندی، سیسہ، بلور وغیرہ کی کانون کا حال ہے،

بہرحال ایسے معادن جن سے انتفاع بغیر عملی جد وجہد اور مصارف کے نہیں ہوسکتا، خواہ وہ کسی قسم کے ہون، اگرچہ بعض فقہا ان میں بھی انفرادی ملکیت کے قائل نہیں ہیں، ان کا مذہب ہو کہ حکومت کسی انفرادی شخصیت کے ساتھ ان کو بھی بندوبست نہیں کرسکتی، لیکن صاحب مغنی نے لکھا ہو کہ

والصحیح جواز ذالك،	درست یہی ہو کہ ان کانون کا بندوبست کرنا جائز ہے

یعنی انفرادی ملکیت بن سکتی ہے، اور حکومت کو اس کا اختیار ہے کہ کسی واحد شخص کے ساتھ اس کو بندوبست کر دے "جواز" کے ثبوت مین ابوداؤد کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے،

حصل فیہ الماء صار ملحا، ۔۔۔ سمندر کا پانی اس میں آکر جمع ہو جائے، تو نمک بن جاتا ہو،

تو اس کے متعلق فقہار کا عام فتویٰ یہ ہے کہ

ملك بالاحياء ولاماما قطاعه، ۔۔۔ تو اس کا آدمی مالک ہو جاتا ہے احیا (آبادی) کے ذریعہ سے بھی، اور امام (حکومت) اس کو افراد کی جاگیر میں بھی دے سکتا ہے،

اس قسم کی زمینوں کی "احیا" یا زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

تهيئته لما يصلح له من حفر ترابه وتمهيده وفتح قناة اليه تصيب الماء اليه ۔۔۔ جس کام کی اس میں صلاحیت ہو، اس کے لئے اس کو تیار کرنا، یعنی اس کی مٹی کھودنی، اس کو کشادہ کرنا، سمندر سے نالی نکال کر اس کو گڑھے تک لانا، تاکہ سمندر کا پانی اس میں آکر گرے،

نمک بنانے کے لئے سمندر کی ساحلی زمینوں کو بندوبست کرنے کا حکومت کو اختیار کیوں ہے، اور ان میں انفرادی ملکیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے، اس کی وجہ فقہار نے یہ لکھی ہے کہ

لانه لا يضيق على المسلمين باحداثه بل يحدث نفعه بفعله فلم يمنع منه كبقية الموات، (المغنی ج ۲ ص ۱۵۵) ۔۔۔ کیونکہ سمندر کے کنارے اس قسم کے کارخانے کے قائم کرنے سے مسلمانوں میں کوئی تنگی نہیں پیدا ہوتی، بلکہ اس زمین کا نفع آباد کرنے والے کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے پس اس کو اس فعل سے نہیں روکا جائیگا، جیسے موات کی دوسری زمینوں کے آباد کرنے

اور غالباً ہندوستان مین نمک سازی کا جو مسئلہ پیدا ہوا تھا، وہ یہی صورت تھی،

عام معدنیات کا حکم اور صرف نمک ہی نہین، بلکہ اس کے سوا بھی جن معدنی امور کا ذکر کیا گیا ہے، کہ اسلاف نقطۂ نظر سے ان میں انفرادی ملکیت پیدا نہین ہو سکتی، اس حکم کو بھی ہر قسم کی کانون کے لئے عام حکم نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ حکم ان ہی معدنی چیزون تک محدود ہے جو خود بخود باہر آگئی ہوں اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہون، ورنہ ایسے معادن جن کو فقہی اصطلاح میں معادنِ باطنہ کہتے ہین، اور جن کی تعریف شرح کبیر میں یہ کی گئی ہے،

هی اللتی لا یوصل الیها الا بالعمل والمؤنة، (ص ۱۵۰ جلد ۲)	یہ ان کانون کو کہتے ہین جن کی پیداوارون تک رسائی بغیر عمل اور مشقت و محنت کے نہین ہو سکتی،

پھر اس کی تشریح ان لفاظ میں کی گئی ہے

لم تکن ظاهرة فحفرها انسان واظهرها،	یعنی ابتداءً قدرتی طور پر وہ معدن ظاہر نہ تھا پھر کسی نے کھود کر اس کو نکالا اور نمایان کیا

اس قسم کے معادن کی مثال میں حسب ذیل چیزون کا ذکر کیا جاتا ہے،

کمعادن الذهب والفضة والرصاص والبلور،	جیسا کہ سونے، چاندی، سیسہ، بلور وغیرہ کی کانون کا حال ہے،

بہرحال ایسے معادن جن سے انتفاع بغیر عملی جدوجہد اور مصارف کے نہیں ہو سکتا، خواہ وہ کسی قسم کے ہون، اگرچہ بعض فقہا ان مین بھی انفرادی ملکیت کے قائل نہیں ہیں، ان کا مذہب ہے کہ حکومت کسی انفرادی شخصیت کے ساتھ ان کو بھی بندوبست نہین کر سکتی، لیکن صاحب مغنی نے لکھا ہے کہ

والصحیح جواز ذالك،	درست یہی ہے کہ ان کانون کا بندوبست کرنا جائز ہے

یعنی انفرادی ملکیت بن سکتی ہے، اور حکومت کو اس کا اختیار ہے کہ کسی واحد شخص کے ساتھ اس کو بندوبست کر دے "جواز" کے ثبوت مین ابوداؤد کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے،

انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث
اقطع البلال بن حارث معادن	کو قبلیہ کے معادن خواہ پست علاقوں میں ہوں
القبلیۃ جلیسھا وغوریھا،	یا بلند قطعات میں، بطور جاگیر کے عطا فرمایا،

اس سے ثابت ہوا کہ صرف جامد معادن ہی نہیں بلکہ سیّال معادن مثلاً پارہ، پٹرول تارکول وغیرہ ایسے معادن جن کے کھودنے اور نکالنے میں مصارف اور محنت پڑتی ہے، وہ انفرادی ملکیت بن سکتے ہیں، اور حکومت ان کو بند وبست کر سکتی ہے لیکن حکومت کو ان معدنی پیداواروں پر کسی قسم کے محصول عائد کرنے کا بھی حق ہے ؟ یا بغیر کسی ڈیوٹی کے ملک کے باشندے اُن سے مستفید ہو سکتے ہیں، اس سوال کا تفصیلی جواب تو آیندہ حکومت کی آمدنی کے ذیل میں دیا جائے گا، لیکن اسلامی معاشیات کی وسعت نظری کا سرسری اندازہ کرنے کے لئے غالباً اس مسئلہ کا ذکر بیجا نہ ہوگا، جو فقہ کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے، ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں :-

اعلم ان مایستخرج من المعدن	کانوں سے جو چیز نکلتی ہے، وہ تین قسم کی
ثلاثۃ انواع جامد یذوب	ہوتی ہے، ایسی جامد چیزیں جو پگھل سکتی ہوں، اور
وینطبع کالنقدین والحدید، جامد	چھاپ قبول کر سکتی ہوں، مثلاً سونے چاندی لوہے
لا ینطبع کالجص والنورۃ والکحل	وغیرہ کا جو حال ہے، دوسری قسم وہ ہے جو جامد
والزرنیخ وسائر الاحجار کالیاقوت	اور غیر سیّال تو ہو، لیکن چھاپ قبول نہ کر سکتی ہو،
والملح وما لیس بجامد کالماء	مثلاً گچ، چونے، سُرمہ، ہڑتال، بلکہ ان تمام
والقیر والنفط،	چیزوں کا حال ہے جن کا شمار پتھروں کے ذیل
(فتح القدیر ج ۱)	میں کیا جاتا ہے، مثلاً یاقوت، نمک، تیسری
	قسم وہ ہے جو جامد نہ ہو، بلکہ سیّال ہو مثلاً
	پانی، تارکول، مٹی کا تیل،

ان تین قسمون کو بیان کرنے کے بعد آیندہ جو چیز انھون نے لکھی ہے، دنیا کی حکومتون کی شاید اس سے آنکھین کھل جائین، اور موجودہ حکومتون کی رعایا مین کسی حکومت کے اس نقطۂ نظر کو سُن کر معلوم نہیں کس قسم کے جذبات متلاطم ہونے لگین، ابن ہمام نہایت سادگی کے ساتھ لکھتے ہین، کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک

لا یجب الخمس الا فی الاول، خمس (پیداوار کا پانچوان حصہ) صرف پہلی قسم سے حکومت وصول کر سکتی ہے،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قسم اول کے سوا اور تمام معدنی پیداوار ہر قسم کے محصول سے آزاد ہین، اور یہ تو امام ابو حنیفہ کا خیال ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس سے بھی آگے قدم بڑھایا ہے، کہ

وعند الشافعی لا یجب الا فی النقدین، بجز سونے چاندی کے اور کسی چیز پر خمس واجب نہیں ہے،

اگرچہ اس مسئلہ کے متعلق بعض تفصیلات ہین، جن پر بحث کا یہان موقع نہیں، بالفعل اتنا اجمالی بیان کافی ہو سکتا ہے،

حدیث "الناس شرکاء" مین جن جن چیزون کو پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا گیا ہے، اب تک اس کے پہلے جزء "الماء" اور اس کے متعلقات کی گویا یہ تفصیل تھی، باقی دو جزء اور رہ گئے، یعنی "الکلاء" اور "النار" اب ان کے متعلق مسائل کی تشریح کیجاتی ہے،

الکلاء (گھاس) کے مسائل کی تفصیل

حدیث مین چونکہ "الکلاء" کا لفظ آیا ہے، اس لئے اس کی تحقیق ہونی چاہئے، کہ "الکلاء" کے لغوی معنی کیا ہین، صاحب مغرب نے اپنی کتاب فقہی لغات مین اس لفظ کو لیا ہی، اور اس پر ایک طویل بحث کی ہے، امام محمد کا قول تو یہ نقل کیا ہے، کہ

الکلاء ما لیس لہ ساق وما قام علی ساق لیس بکلاء، "الکلاء" ایسی نباتی چیز کا نام ہے جو تنہ پر قائم نہ ہو، اور جو تنہ پر قائم ہو وہ کلا نہین ہے

ساق" اور تنہ پر جو نباتات کھڑے ہوتے ہیں، ان کی مثال میں "عوسج" اور "غرقد" وغیرہ جنگلی درختوں کو شریک کیا ہے لیکن مطرزی صاحب مغرب نے خود اپنا فیصلہ یہ لکھا ہے:-

والظاھر انہ یقع علی ذا ساق وغیرہ — بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کلاء کا اطلاق تنے والے اور بے تنہ دونوں قسم کے نباتات پر ہوتا ہے۔

وجہ یہ بیان کی ہے کہ فقہاء "الکلاء" کی شرح میں عموماً یہ کہتے ہیں کہ

ما ترعاہ الدواب رطباً کان او یابسا۔ — جنھیں عموماً چوپایے چرتے ہیں خواہ خشک حالت میں یا تر،

مطلب یہ ہے کہ چونکہ جانور عموماً بے تنہ والی گھانسوں کو بھی چرتے ہیں، اور بعض تنہ رکھنے والے جنگلی جھاڑ مثلاً ببول، عوسج، غرقد وغیرہ کی پتیاں بھی چرتے ہیں، اس سے "الکلاء" کو بجاے گھاس کے ہر اس نبات کے لئے عام رکھنا چاہئے۔ جسے جانور چرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ابو عبید کی کتاب الاموال سے بھی اپنی تائید میں بعض چیزیں نقل کی ہیں، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، چاہئے کہ اپنے بھائی کو پانی اور شجر (درخت) میں گنجایش دے، اور اس درخت سے مراد وہی چرے جانے والے درخت ہی ہو سکتے ہیں، البتہ "الکلاء" کے بجائے یہاں الشجر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ حکم گھاس اور ان درختوں کو بھی عام ہے، جنھیں چوپائے اور مویشی چرتے ہیں، نیز ایک مشہور حدیث "حمی" (رکھت) کے باب میں ہے کہ اُمیۃ بن حمال نے اراک (پیلو) کے متعلق دریافت کیا، کہ اس کو حمی (رکھت) یعنی اپنے اونٹوں کے لئے اس کے جنگل کو کوئی مخصوص کر سکتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مالم تنلہ اخفاف الابل، — ہاں، اگر اونٹوں کے قدم اگر وہاں نہ پہنچتے ہوں، تو جائز ہے،

ابو عبید نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حکم پیلو کے ان درختوں سے متعلق ہو سکتا ہے جو کسی کی مملوکہ

اراضی مین ہون یعنی مملوکہ زمین کے بیلو کو بھی محض اپنے مویشیون کے لئے کوئی مخصوص نہیں کرسکتا، کیونکہ غیر مملوکہ زمین کے بیلو کو حمی (رکھت) بنانے کا تو کسی کو کیا اختیار ہے خواہ وہ دور کے ہون یا قریب کے ہون، اونٹون کی دسترس سے باہر ہون یا نہ ہون، پس مطلب یہی ہوسکتا ہے، کہ مملوکہ زمین کے بیلو کو بھی رفاہت عامہ کے خیال سے حمی نہ بنانا چاہیے، اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ "الکلاء" کا لفظ تنہ دار اور غیر تنہ دار ہر قسم کی چری جانے والی روئیدگیون کو عام ہے، اور یہی واقعہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقصود مویشیون کی چرائی میں سہولت پیدا کرنی ہے، شریعت کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی چیزون کو حتی الوسع پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا جائے، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں چراگاہون کی چند مثالین بیان کی ہین

(۱) پہلی شکل تو یہ ہے کہ کسی گاؤن یا آبادی کی کوئی چراگاہ اور جنگلی جھاڑ اور گاؤن کا کوئی خاص باشندہ اس زمین کا مالک نہین ہے بلکہ

قد عرفت انہا لھم فھی لھم علی حالھا،	عموماً یہ مشہور و معروف ہو کہ فلان چراگاہ (یا جنگلی جھاڑیان) فلان گاؤن والون کی ہین، پس وہ انہی لوگون کی اپنے حال پر رہینگی

اور گاؤن والون کی اس زمین مین اجمالی ملک ثابت ہوگی، اب دیکھا جائے گا کہ اس گاؤن کے باشندون کی مویشیون وغیرہ کے لئے کوئی دوسری چراگاہ یا کنجہ، رمنہ وغیرہ ہے، یا نہین اگر ہے تو ایسی صورت مین

لیس لھم ان یمنعوا الکلاء والماء ولا صحاب المواشی ان یرعوا تلک المروج ویستقوا من تلک المیاہ،	گاؤن والون کا اس کا حق نہ ہوگا کہ عام مویشی والون کو اس قسم کی چراگاہون اور رمنون مین چرائی سے روکیں، اسی طرح مویشی والون کو اس کا بھی حق ہے، کہ یہان جو پانی ہو، اس سے استفادہ کرین (خود پئیں، جانورون کو پلائین)

لیکن اگر یہ شکل نہیں ہے بلکہ

لم یکن لاھل ھذہ القریۃ الذین لھم ھذا المروج وفی ملکھم موضع مسرح ومرعی لدوابھم ومواشیھم غیر ھذا المروج،

اس گاؤن والون کے لئے جن کی یہ چراگاہین ہین، ان کیلئے بجز ان کے چرائی کی کوئی دوسری جگہ نہ ہو، اور نہ کوئی دوسری چراگاہ ہو جس مین ان کے جانور اور مویشی چرسکتے ہون [1]

اور اس کے ساتھ صورت حال یہ ہو کہ

متی اذنوا الناس فی رعی تلک المروج والاحتطاب منھا اضر ذالک بھم وبمواشیھم ودوابھم

اگر عام لوگون کو ان زمینون اور چراگاہون مین چرانے اور ہر شخص کو لکڑی کاٹنے کی اجازت دیدین گے، تو یہ بات ان کے لئے اور ان کی مویشیون وچوپایون کے لئے مضر نقصان رسان ہوگی

قاضی ابو یوسف کا ایسی حالت مین یہ فتوی ہے کہ

کان لھم ان یمنعوا کل من اراد ان یرعی فیھا او یحتطب منھا،

اس قسم کے گاؤن کے باشندون کو اس کا حق ہے کہ عوام کو اپنی چراگاہون مین چرانے سے روکین، اور اس سے منع کرین کہ کوئی اسکی جھاڑیون سے لکڑی کاٹے،

بہرحال حدیث نے "الکلاء" کو جب پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا ہے، تو ایسی صورت مین انفرادی ملکیت تو اس پر طاری نہیں ہوسکتی، لیکن "اشتراک" مین کچھ حد بندی اس وقت ہوسکتی ہے، جب دوسرے گاؤن والون کی شرکت سے خود اس گاؤن والون کا نقصان ہو جن کی طرف یہ چراگاہ منسوب ہے، اور یہ حال تو ان چراگاہون کا ہے جن کی زمین کسی شخص کی واحد ملکیت نہین ہے، بلکہ یا تو ان کا کوئی مالک ہی نہین ہے یا سارے گاؤن کی ڈ

ملکیت مشترکہ ہے، لیکن اگر کسی شخصی اور انفرادی ملکیت والی زمین میں "الکلاء" ہو تو باوجود زمین کے مالک ہونے کے الکلاء کا وہ قانوناً مالک نہیں ہے، بدائع میں ہے،

اما الکلاء الذی ینبت فی ارض	"الکلاء" (گھاس) جو کسی مملوکہ زمین میں ہو،
مملوکۃ فھو مباح غیر مملوکۃ،	(تو اس سے استفادہ کا حق ہر شخص کو حاصل ہے)
	یعنی مباح و جائز ہے، اور اس الکلاء کا کوئی
	مالک نہیں ہے،

اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو پانی کا ہے، کہ اگر اس الکلاء کے سوا لوگوں کو اپنی مویشیوں کے لئے چرائی زمیسر آسکتی ہو، تو پبلک کا حق ہے کہ اس کو مجبور کریں کہ ان کے مویشیوں کو اپنی زمین میں آنے دے یا گھاس کٹوا کر لوگوں کے حوالہ کرے، اور دونوں شکلوں پر راضی نہ ہو تو بہ زور اپنے حق کو اس سے لوگ حاصل کریں،

یہ حکم تو الکلاء کا اس وقت تک ہے جب تک زمین میں لگا ہوا ہے لیکن زمین سے الگ کر لینے کے بعد جو اس پر قبضہ کرے گا، وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے، ٹھیک جو حال پانی کا تھا کہ برتن میں محفوظ کر لینے کے بعد انفرادی ملکیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے، بدائع میں ہے،

اذا قطعہ صاحب الارض و	جب اس کا مالک الکلاء کو کٹوائے اور نکالے
اخرج فیملکہ،	تو پھر اس کا وہ مالک ہو جاتا ہے،

صاحب الارض" (مالک زمین) کی قید اتفاقی ہے، بلکہ جو بھی کاٹ کر اس پر قبضہ کرے گا مالک ہو جائے گا اور اب اس کو وہ اسی طرح بیچ سکتا ہے، جیسے برتن اور مشک کے پانی کو فروخت کیا جا سکتا ہے، فقہ کا عام مسئلہ تو یہی ہے لیکن حنفی فقہاء نے بعد کو اس میں کچھ تفصیل بھی کی ہے، یعنی دیکھنا چاہئے کہ "الکلاء" قدرتی طور پر پیدا ہوا ہے، یا مالک زمین نے مصنوعی تدبیروں سے ان کو اگایا ہے، دوسری صورت میں ان کا خیال ہے کہ

اذا سقاہ وقام علیہ	اگر زمیندار (صاحب الارض نے) اس الکلاء

ملکہ، (بدائع) کو پہنچا ہے تو ایسی صورت میں اوس کی
ملکیت قائم ہو جائے گی،

حدیث کے ظاہر معنی پر اصرار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

الصحیح جواب ظاهر الروایۃ	ظاہر روایت میں اس مسئلہ کا جو جواب دیا گیا ہے
لان الاصل فیہ هو الاباحۃ،	وہی درست ہے، کیونکہ "اصل" تو یہی ہے کہ "ابا[illegible]"

([illegible])

اس سلسلہ مین فقہار ایک اور مسئلہ کا ذکر کرتے ہین، بات یہ ہے کہ عربی میں ایک لفظ "مرج" کا ہے جس کی جمع "مروج" ہے، یہ اردو کے "رمنہ" یا کنچہ" کے ہم معنی ہے، غالبًا فارسی کا "مرغزار" "مرجزار" ہی کی کوئی صورت ہے، لیکن ایک اور لفظ "اجمہ" کا ہے، جس کی جمع آجام ہے، علامہ مطرزی مغرب میں اس کی تفسیر یہ کرتے ہین، "الاجمۃ الشجر الملتف" یعنی گھنے درختوں کو کہتے ہین، لیکن یہ لغوی معنی ہوئے پھر فقہار جس محاورہ میں اس کو استعمال کرتے ہین اس کے متعلق کہتے ہین،

وقولھم بیع السمك فی الآجام	مچھلیون کا آجام مین بیچنا، یہ جو فقہا لکھتے ہین
یریدون البطیحۃ التی منبت	تو آجام سے سنگریزہ والی زمین مراد ہے جو
القصب والیراع،	نرسل یا کلک کے اگنے کی جگہ ہے،

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگ ریزون والی ریتیلی زمینون کے گہرے حصّوں مین برساتی پانی جو جمع ہو جاتا تھا، اور اوس کے ارد گرد یا خود اسین نیستان بن جاتا تھا اس کو آجام کہتے ہین، چونکہ پانی بھی اس میں جمع ہو جاتا تھا، اس لئے اس مین مچھلیاں بھی پیدا ہو جاتی تھین، خلاصہ یہ ہے کہ آجام دراصل آبی نیستان کو کہتے ہین، فقہار نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ان کا شمار بھی مروّج اور کنچون کے ذیل مین ہوگا، اور انفرادی ملکیت اس کی درست ہو سکتی ہے، یا نہین، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اسکا کلیہ یہ لکھا ہے کہ اس زمین کو دیکھنا چاہئے، جس مین اجمہ ہے، اگر زمین کسی کی انفرادی ملکیت مین نہیں ہے، تو نیستان (اجمہ) ہی کیا تمام غیر مملوکہ زمینون کا حکم یہی ہے کہ

فان لم تکن فی تلک لاحد ملک	اگر اس زمین میں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہو
فلا باس ان یحتطب منہ جمیع	تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہر قسم کے لوگ
الناس کا ثمار فی الجبال والمروج	اس سے لکڑی کاٹ کاٹ کر لیجائیں جیسے پہاڑوں
والاودیۃ والشجر مالم یغرسہ	مرغزاروں، ٹیلوں، وادیوں اور ندیوں وغیرہ کے درختوں
الناس ولا باس بان یاکل من	اور ان کے پھلوں کا حال ہے کہ جب تک کسی خاص
ثمارھا ویتزود مالم یعلم ان	شخص نے ان کو نہ لگایا ہو، ہر شخص کو ان سے استفادہ
ذلک فی ملک انسان وکذلک	کا حق ہے، اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے
العسل یوجد فی الجبال والغیاض	اگر اس قسم کے درختوں کے پھلوں کو آدمی کھائے
(الخراج)	یا توڑ کر گھر لیجائے، عام استفادہ کا یہ حق اسی
	وقت تک ہے، جب تک ان جنگلی درختوں کے
	متعلق معلوم نہ ہوا ہو کہ کسی خاص شخص کی ملکیت
	میں ہیں، پہاڑوں اور جنگلوں میں جو شہد پایا
	جاتا ہے، اس کا بھی یہی حال ہے،

لیکن اگر "زمین" کسی کی مملوکہ ہے تو پھر "الکلاء" کے سوا اس کی اور پیداوارون میں تصرف کرنے کا حق مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہ ہوگا، خواہ زمین کے مالک نے اسے بویا ہو یا خود رو ہو، بدائع میں ہے،

لیس لاحد ان یحتطب من اجمۃ	ایسا اجمہ (نیستان) جو کسی خاص شخص کی ملک
رجل الا باذنہ لان الحطب	میں ہو اس کے متعلق کسی کو اس کا حق نہیں ہے
والقصب مملوکان لصاحب	کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی لکڑی کاٹے،
الاجمۃ ینبتان علی ملکہ وان	کیونکہ لکڑی اور نرے کے ڈنٹھل یہ دونوں اجمہ

لم یوجد منه الا نبات اصلاً

کی مالک کی ملک ہے، وہ زمین سے پیدا ہی ہوتی ہیں، مالک زمین کی ملک میں اگرچہ ان کو اگانے میں مالک زمین نے کوئی کام نہ کیا ہو، یعنی خودرو ہوں جب بھی اسی کے ملک قرار پائیں گے۔

بہرحال اس باب میں کلیہ وہی ہے جو صاحب بدائع نے لکھا ہے کہ

الاصل ان یکون من المملوک مملوکاً الا ان الاباحة فی بعض الاشیاء ثبت علی مخالفة الاصل بالشرع والشرع ورد بها فی اشیاء مخصوصة فیقتصر علیها

اصل یہ ہے کہ مملوکہ چیز سے جو چیز پیدا ہوگی وہ بھی مملوک ہی ہوگی، لیکن اس اصل کے خلاف بعض چیزوں میں شریعت نے "اباحت" کا قانون نافذ کیا ہے یعنی استفادہ کا حق ہر شخص کو دیدیا ہے، لیکن اباحت کا یہ قانون چند مخصوص چیزوں کے ساتھ محدود ہے، اس لئے حکم بھی ان ہی تک محدود رہے گا۔

تیسرے اشتراکی سرمایہ آگ کے احکام

اب تیسرا جزء "النار" کا رہ گیا ہے، جو حدیث میں عام ملک کی مشترک چیز قرار دی گئی ہے، فقہا نے اس کی بھی کچھ تفصیل کی ہے، صاحب بدائع لکھتے ہیں،

النار اسم جوهر مضیٔ دائم محرکة علواً

"آگ ایک تابناک روشن جوہر کا نام ہے جو ہمیشہ اوپر کی طرف متحرک رہتی ہے،

اور اسی بنا پر فقہاء کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ

فلیس لمن اوقدها ان یمنع غیره من الاصطلاء بها لان النبی صلی الله علیه وسلم اثبت الشرکة فیها

پس جس نے آگ سلگائی ہو اس کو اس کا حق نہیں ہے کہ دوسروں کو تاپنے سے روکے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ میں "شرکت" ثابت فرمائی ہے،

اور اصطلاء یعنی تاپنے کا ذکر تو بطور مثال کے کیا گیا ہے، ورنہ مقصد یہ ہے کہ آگ کی حرارت ہو یا روشنی یا اسی قسم کا کوئی کام استفادہ کی ان تمام صورتوں کا حق ہر شخص کو ہے، اور آگ یا لیمپ روشن کرنے والے کو اس کا حق نہیں ہے، کہ وہ استفادہ کے اس حق پر کوئی معاوضہ لے، مگر اس کے بعد سوال آگ سے نہیں، بلکہ اس لکڑی یا تیل یا اس چیز سے ہے جس میں آگ پیدا کیجاتی ہے، کہ کیا اس کا شمار بھی مشترک سرمایہ میں ہو جائے گا، صاحب بدائع لکھتے ہیں،

فاما الجمر فلیس بنار وھو مملوک	لیکن انگارہ تو وہ آگ نہیں ہے پس جس کا
لصاحبه فله حق المنع کسائر	وہ ہے وہ اس کا مالک ہے، اسی لئے دوسروں
املاکه	کو روکنے کا حق اُسے حاصل ہے، جیسے دوسرے
	مملوکات میں یہی حق اس کو دیا گیا ہے۔

اگرچہ جزئیات کا اور طویل سلسلہ موجود ہے، لیکن اس باب میں اسلام کے جو کلی نقاطِ نظر تھے، ایک حد تک ان کی بحث ختم ہو گئی، اب اس سلسلہ کی صرف ایک چیز رہ جاتی ہے، یعنی شوارعِ عام،

عام شوارع اور راستوں کے احکام | جن کی حیثیت اسلام ہی میں نہیں بلکہ تقریباً دنیا کے تمام قوانین اور دستور میں آبادی کے عام باشندوں کے مشترک مفاد کی ہے، اسلامی مقننین نے بھی اس کی اس حیثیت کو باقی رکھا ہے بغیر کسی اختلاف کے فقہ کا یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ

ما کان من الشوارع والطرقات	راستے کوچے، شہر کے میدان، چوک جو آبادیوں کے
والرحاب بین العمران فلیس	درمیان ہوتے ہیں، ان کے متعلق کسی کے لئے جائز
لاحد احیاء لا،	نہیں ہے کہ ان کو آباد کرے،

یعنی کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے، کہ بطور انفرادی ملکیت کے ان پر قبضہ کرکے ان کو اپنی ملکیت بنائے، مثلاً ان پر مکان بنائے یا اس قسم کا کوئی تملیکی تصرف کرے، مندرجۂ بالا عبارت کے الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

یہ حکم صرف سڑکون اور کوچون ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ "الرحاب" یعنی شہرون کے بیچ بیچ مین جو میدان مختلف ضرورتون کے لئے مثلاً کھیلنے کودنے کے لئے یا اس زمانہ مین جو سیر گاہین بنا دی جاتی ہین، یہ بھی پبلک کے مشترک مفاد مین داخل ہو جاتی ہین، اور ان میں بھی کسی شخص واحد کو مالکانہ تصرفات کا حق نہیں ہے، اس قانون کی تفصیل کرتے ہوئے فقہاء نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے، کہ یہ حکم صرف ان ہی سڑکون یا گلیون یا میدانون تک محدود نہین ہے، جن پر تصرف کرنے سے عام مخلوق کو تکلیف ہوتی ہو، بلکہ تکلیف ہو یا نہ ہو، زمین کا ہر وہ حصہ جو عام گزرگاہ کی حیثیت کسی آبادی میں اختیار کر چکا ہے، سب کے لئے یہ حکم عام ہے، ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہین :-

سواء کان واسعا او ضیقا وسواء	خواہ کشادہ ہون یا تنگ، اور خواہ اس مین تصرف
ضیق علی الناس اولم یضیق،	کرنے سے لوگون پر تنگی پیدا ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو"

مسلمانون مین شاہراہون اور شہر کے ان مقامات مین عام باشندون کے مفاد کو کس حد تک اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس حکم کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب مغنی لکھتے ہین :-

لان ذالک مشترک فیه	کیونکہ عام مسلمانون میں یہ چیزین مشترک ہین
المسلمون ومتعلق به مصلحتهم	اور ان کی مصلحتین ان سے متعلق ہیں، تو گویا
فاشبه مساجدهم،	مسلمانون کی مسجدون کی مانند ان کا حال ہے"

عام راستون کا اسلام مین احترام مندرجۂ بالا فقرہ مین "فاشبه مساجدهم" کے الفاظ قابل غور ہین، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہری حقوق کا مسلمانون نے کتنا احترام کیا ہے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اماطة الاذی عن الطریق یعنی راستون سے ان چیزون کا ہٹانا جو راہگیرون کے لئے باعث تکلیف ہون، اس فعل کو من الایمان (یعنی ایمان کا جزء) قرار دیا ہے، اور اس بنا پر مشہور حدیث الطهور شطر الایمان (پاکیزگی اور صفائی ستھرائی ایمان کا ایک بڑا حصہ ہے) میں دوسری چیزون کی تطہیر و ستھرائی کے ساتھ مکانون اور سڑکون کی صفائی کو بھی داخل سمجھنا چاہئے، جب راستون کی صفائی

کی صحیح حدیثون مین اتنی اہمیت ہے تو فقہا نے شوارع و طرق کو مسلمانون کے حقوق کے اعتبار سے اگر اشبہ بالمساجد قرار دیا ہے، تو اس پر قطعاً تعجب نہ ہونا چاہئے، اور اس خیال کی بھی تغلیط ہوتی ہے، کہ بلدیات اور میونسپلٹی وغیرہ کے اصول و قوانین جدید مغربی تمدن کے نتائج ہین۱؎ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، مین گفتگو ان فقہی احکام کے متعلق کر رہا تھا، جو شہرون اور آبادیون کی عام گزرگاہون وغیرہ کے متعلق ہین کہ ان مین کسی قسم کی انفرادی ملکیت کی قطعاً گنجائش نہین ہے، نہ خود ان کو اپنی ملک کوئی بنا سکتا ہے، اور نہ حکومت ایسا کر سکتی ہے، البتہ اس قسم کی سڑکون اور گزرگاہون پر بیٹھ کر عام طور سے جو لوگ خرید و فروخت کرتے ہین فقہا نے اس کے متعلق لکھا ہے،

ان کان مجالس یضیق علی المارة	اگر گزرگاہون کی ان نشست گاہون کی وجہ
لم یحل له الجلوس فیه ولا	سے آمد و رفت کرنے والون کی تنگی محسوس ہو تو
یحل للامام تمکینه بعوض اوغیر	پھر ان میں بیٹھ کر خرید و فروخت جائز نہ ہوگا،
(مغنی)	اور نہ حکومت کے لئے جائز ہے کہ ایسے مقامات
	پر کسی کو قبضہ معاوضہ لے کر عطا کرے،

لیکن سڑک اگر اتنی کشادہ ہے کہ راہگیرون کو کوئی تنگی نہین پیدا ہوتی، تو ایسی صورت مین

یجوز الارتفاق بالقعود فی	ان گزرگاہون میں جو کشادہ اور وسیع
الواسع من ذالك للبیع والشراء	مقامات ہون تو ان پر بیٹھ کر خرید و فروخت
علی وجه لا یضیق علی احد	کی آسانی حاصل کرنا اس وقت جائز ہے

۱؎ واقعہ یہ ہے کہ آج جن قوانین کا تعلق محکمۂ صفائی یا آرایش وغیرہ سے ہے، اسلامی فقہا نے ان کے مختلف پہلوؤن پر اپنی کتابون مین بحث کی ہے، جاننا چاہیے کہ فقہ کی کتابون سے ان قوانین کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار کیا جاسکتا ہے،

ولا یضر المارۃ، — جب آنے جانیوالون کی راہ مین تنگی نہ پیدا ہوتی ہو نہ کسی اور کو،

اس قسم کا استفادہ سڑکون سے شہر کے عام باشندے خود بھی کر سکتے ہین، اور حکومت کو بھی ایسی صورت مین (یعنی جن مین ضرر کا اندیشہ نہو) اختیار ہے کہ سڑکون بلکہ مسجدون کے احاطہ وغیرہ مین جسے رحاب المساجد کہتے ہین، اس قسم کے کاروبار کے لئے جگہ دیسکتی ہے،

ابن قدامہ نے الطرق الواسعۃ اور رحاب المساجد کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

للامام اقطاعھا لمن یجلس فیھا	امام (حکومت) ان مقامات کو بیٹھنے والون کے لئے مخصوص کر سکتا ہے،

لیکن اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے،

ولا یملکھا المقطع بذالک بل یکون احق بالجلوس فیھا من غیرہ،	لیکن حکومت جس کے نام سے اس کو مخصوص کرے، وہ اس کا مالک نہ ہوگا، صرف دوسرون کے اعتبار سے بیٹھنے کا وہ زیادہ حقدار ہوگا،

اسی طرح اگر اس قسم کے مقامات پر حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی خرید و فروخت کے لئے بیٹھ جائے تو

السابق احق بہ ما دام فیہ فان ترک متاعہ فیہ لم یجز لغیرہ ازالتہ لان ید الاول علیہ و ان نقل متاعہ کان لغیرہ ان یقعد فیہ لان یدہ قد زالت	جس نے آگے بڑھکر اس پر قبضہ کر لیا ہو تو وہی اس کا حقدار ہوگا جب تک اس پر قابض رہیگا، اگر اس قسم کے مقامات مین اپنے سامان چھوڑ کر چلا جائے تو کسی دوسرے کو اس کا حق نہ ہوگا کہ اس کے سامان کو اس جگہ سے ہٹائے کیونکہ ابھی پہلے آدمی کا اس پر قبضہ باقی ہے اور اگر اپنے سامان کو وہان سے ہٹا لے تو پھر اب دوسرے کو یہ حق ہے کہ اس مقام پر بیٹھ جائے[۴]

بہر حال مشہور حدیث "منٰی مناخ من سبق" کی بنا پر ایسی صورت میں جس نے پہلے قبضہ کر لیا، اس کو ترجیح دیجائے گی، اس ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مقامات میں کوئی دوکان کے لئے کیا مکان، یا چبوترہ وغیرہ بنا سکتا ہے ؟

ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ

لیس لہ البناء لا دکۃ ولا غیرھا	کسی کو ان مقامات میں کسی قسم کی تعمیر کا حق
لانہ یضیق علی الناس ویعثربہ	نہیں ہے حتی کہ چبوترہ یا چبوترہ کے سوا بھی
المارۃ باللیل والضرر باللیل	کوئی چیز نہیں بنا سکتا، کیونکہ اس قسم کی
والنہار ویبقٰی علی الدوام فربما	چیزوں سے عام لوگ تنگی میں مبتلا ہو جائیں گے
دعی ملکہ بسبب ذلک	اور گزرنے والوں کے لئے خطرہ ہے کہ رات کے
	وقت اس سے ٹھوکر کھائیں، اور پھسل کر گریں،
	اسی طرح شب و روز ضرر کا اس سے اندیشہ ہے،
	اور چونکہ ایسی چیزیں دوامی ہوتی ہیں، اسلئے
	اس کا بھی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اس کی ملکیت

لیکن اس کے ساتھ اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ

لہ ان یظلل علی نفسہ بما	ان مقامات پر بیٹھ کر خرید و فروخت کرنے والوں
لاضرر فیہ من بادیۃ	کو اس کی اجازت ہے کہ اپنے اوپر کوئی سایہ
وتابوت وکساء ونحوہ	کی چیز کھڑی کریں جس میں کسی کو ضرر نہ پہونچے،
لان الحاجۃ تدعو الیہ	مثلاً چٹائی یا ٹاٹ یا کمل یا اسی قسم کی چیزوں

۵۱ منٰی کے میدان میں جو جہاں اپنے اونٹ کو پہلے بٹھادے گا وہی اس جگہ کا حقدار ہو گا، ۱۲

من غیر مضرۃ فیہ، سے سایہ کرین اور یہ اجازت اس لئے دیجاتی ہے کہ اس کا وہ حاجت مند ہے، اور دوسرون کا اس مین ضرر نہین ہے،

یہان یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ جتنے احکام بیان کئے گئے ہین، ان کا زیادہ تر تعلق شوارع عام یا عام گذرگاہون وغیرہ سے ہے، لیکن خاص راستے اور کوچے جنھین صرف کسی خاص مکان یا چند مکان کے رہنے والے ہی اپنی آمد و رفت کے لئے استعمال کرتے ہون، ان کے احکام عام راستون سے مختلف ہین، جن کی تفصیل فقہ کی کتابون مین موجود ہے، (باقی)

آل انڈیا اسلامک ہسٹری کانفرنس

کے

اجلاس پشاور کی رُوداد

از

ڈاکٹر سید عبداللہ ایم اے، ڈی لٹ قائم مقام سکریٹری آل انڈیا اسلامک ہسٹری کانفرنس

آل انڈیا اسلامک ہسٹری کانفرنس کا دوسرا اجلاس ۷، ۸، ۹ راپریل ۱۹۴۴ء کو صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور میں منعقد ہوا، پشاور شمالی ہندوستان کے چند اہم تاریخی شہروں میں سے ہے، اس کے نواح میں بے شمار آثار ومظاہر ایسے ہیں جن سے مورخ کو بہت کچھ مواد مل سکتا ہے، خود پشاور کے اندر عہد اسلام اور عہد قبل از اسلام کی بے شمار یادگاریں موجود ہیں، جو محققین کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں،

ان سب خصوصیات کی وجہ سے جن کا یہ شہر حامل ہے، پشاور فی الحقیقت کانفرنس کے انعقاد کے لئے مناسب اور موزون مقام تھا،

کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے پشاور اور سرحد کے باشندگان نے ایک بااثر اور بارسوخ مجلس استقبالیہ کی تشکیل کی تھی، جس کے صدر آنریبل خان بہادر قاضی محمد امیر احمد خان جج جوڈیشیل کورٹ پشاور تھے، موصوف نہایت خلیق، متواضع اور علم دوست بزرگ ہیں، اور علی گڈھ کے تعلیم یافتہ ہیں، نئی تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں، مجلس استقبالیہ کے سکریٹری قاضی محمد فرید ایم، اے (کینٹب) پروفیسر تاریخ اسلامیہ کالج پشاور مقرر ہوئے، مگر ان کے بے وقت علیل ہو جانے کی وجہ سے بہت سا

کام مسٹر سکاٹ آئی سی ایس پرنسپل اسلامیہ کالج نے انجام دیا، اس میں ان کے ساتھ پروفیسر محمد رضا خان ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور اور دوسرے حضرات نے بھی ہاتھ بٹایا،

کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے مرکزی کمیٹی کی مجلسِ عاملہ نے خان بہادر مولوی محمد شفیع ایم اے (کینٹب) سابق پرنسپل اورنٹیل کالج اور ممبر سنڈیکیٹ پنجاب یونیورسٹی کا انتخاب کیا، علومِ عربیہ میں موصوف کا جو تبحر اور اسلامی تاریخ اور کلچر کے ساتھ جو شغف ہے وہ اصحابِ علم سے پوشیدہ نہیں، نیز موصوف ان بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب (صدر مرکزی کمیٹی آل انڈیا اسلامک ہسٹری کانفرنس) کے ساتھ مل کر آج سے بیس پچیس سال قبل اسلامی تاریخ کے مضمون کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی میں شروع کی، اور باوجود مشکلات کے سالہا سال تک اُسے جاری رکھا، اپنے دورانِ ملازمت میں عربی فارسی زبانوں کے مرتبے اور حیثیت کو برقرار رکھنے اور ان کی تشویق و ترویج کے لئے جو کام کیا، وہ اظہر من الشمس ہے، انہی کی بدولت پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا عربی فارسی شعبہ اس وقت یہ درجہ حاصل کر چکا ہے کہ شاید رامپور اور آصفیہ کے بعد ہندوستان بھر کی کوئی لائبریری قلمیات و مطبوعات کے اعتبار سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، تاریخ سے متعلق موصوف کی ان خدمات و خصوصیات کی بنا پر صدارت کیلئے اس سے زیادہ موزون انتخاب مشکل تھا، اگرچہ وقت کی قلت اور سفر کی صعوبت کے پیش نظر یہ اندیشہ تھا کہ کانفرنس میں شامل ہونے والے مندوبین دوسرے صوبوں سے زیادہ تعداد میں نہ آسکیں گے، مگر یہ امر بے حد باعثِ اطمینان اور اس مضمون کی آئندہ ترقی کا مُبشر ہے کہ کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے پنجاب کے علاوہ حیدرآباد تک کے مندوبین تشریف لائے تھے،

کانفرنس مجوزہ پروگرام کے مطابق، ؍ اپریل کو ۴ بجے بعد دوپہر خیبر یونین ہال اسلامیہ کالج میں شروع ہوئی، معززینِ شہر کثیر تعداد میں موجود تھے، جن میں آنریبل سردار عبدالرب خان نشتر وزیر مالیات، خان بہادر محمد قلی خان او۔بی۔ای، نواب محبوب علی خان ڈپٹی کمشنر کوہاٹ، آنریبل سردار اجیت سنگھ وزیر، میجر اسکندر مرزا ڈپٹی کمشنر پشاور، خان محمد اسلم خان، انڈر سکریٹری حکومت سرحد، خان بہادر شاہ عالم خان

ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم صوبہ سرحد، ملک خدا بخش ایڈوکیٹ جنرل اور بے شمار دوسرے حضرات شامل ہین،

تلاوت قرآن مجید کے بعد صدر استقبالیہ آنریبل قاضی محمد امیر احمد خان نے اپنا خطبہ پڑھا، اس کے بعد صاحبِ صدر نے اردو مین اپنا عالمانہ خطبہ سُناتے ہوئے سب سے پہلے پشاور کی تاریخی اہمیت کا تذکرہ کیا، پشاور کے عہدِ جدید کا ذکر کرتے ہوئے کہا، میرے نزدیک پشاور کے اس دورِ جدید کی سب سے بڑی تاریخی یادگار اسلامیہ کالج ہے جو اس صوبہ اور متصلہ علاقہ مین مشعلِ ہدایت کا کام دے رہا ہے، اور ان اطراف کی حیاتِ ذہنی اسکے دمِ جان بخش سے وابستہ،

اس کے بعد صاحبِ صدر نے مسلمانون مین علم تاریخ کی ابتدا، اور اس کی عہد بعہد کی ترقیون پر تبصرہ کرتے ہوے فرمایا، کہ مورخین عرب کی مساعی مشکورہ اور عربون کے علم تاریخ کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے علامہ سخاوی (م-۹۰۲) کی الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ کی فہرست مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنا کافی ہے، سیرتِ نبویہ، تراجم صحابہ، تاریخ خلفا، تاریخ ملوک دول مخصوصہ و افراد مخصوصین، تاریخ وزرا، تاریخ امرا، طبقاتِ فقہا، و قرّا، و ادبا، تاریخ صوفیہ، تاریخ قضاۃ، تواریخ مغنین و اشراف، کرما، و اذکیا، و مغفلین و بخلا و طفیلیین، و عقلا، و اطبا، تاریخ متبدعۂ اخبار شجعان و عور و عمش و عمیان و حدبان و معمرین و شبان، اخبار عشاق، اخبار رواۃِ حدیث، معاجم بلدان و فیات، غرض کوئی شاخ تاریخ نویسی کی نہ تھی، جس پر انبار در انبار کتابین نہ لکھی گئی ہون، یہ صحیح ہے، کہ ان مین سے بے حساب کتابین دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکین اور بہت سی ایسی ہین جن کے وجود سے ہم اس وقت آگاہ نہین ہین، مگر بحمد اللہ کہ بہت سی ایسی کتابین ہم تک پہنچی ہین اور بعض ایسی ہین کہ وقتاً فوقتاً معرضِ خفا سے منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی رہتی ہین"۔

اس کے بعد جنابِ صدر نے عربی کے علاوہ فارسی اور ترکی کی تاریخی کتابون کا ذکر کرتے ہوے کہا کہ سٹوری کی پرشین لٹریچر مین فارسی زبان کے مورّخون کا ذکر ۱۰۰ شمارون مین آیا ہے، ...... مگر بقول کاراڈوو ایران نے مورخون کی نسبت شاعر زیادہ پیدا کئے ہین، اور فارسی تاریخین عربی کی تاریخون کی بہ نسبت اہمیت، وسعتِ نطاق اور ایجاز کے اعتبار سے بہت پیچھے ہین، "کم از کم ایران کی تاریخون کی صورت

تو یہی ہے، البتہ ہندوستان کی فارسی تاریخون مین اعلیٰ پایہ کی تاریخین موجود ہین' ترکی مورخین کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "ترکون کو من حیث القوم تاریخ سے بے حد شغف ہے، استنبول کے کتب خانون مین بہترین کتب تاریخی محفوظ مین ،.....مگر فی الجملہ ترکون سے ہمارے ادبی روابط حد سے زیادہ کمزور ہین ، اور مخطوطات یا ان کی نقول کا تو کیا ذکر ہے، وہان کی مطبوعہ کتابون کا حاصل کرنا بھی دشواریون سے خالی نہین "،

اس کے بعد ہندوستان مین اسلامی تاریخون کی بعض اہم ضروریات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:۔

"مورخین اسلام کے مدین کارنامون اور اسلامی تاریخ کے لٹریچر کی افراط کے اس نہایت اجمالی ذکر سے مقصد یہ ہے کہ اس گران بہا ورثے کی طرف جو ہم کو ماضی سے ملا ہے، قوم کو متوجہ کیا جائے، اور اس کے مطالعہ کی طرف رغبت دلائی جائے، اُن اسباق سے جو مطالعۂ تاریخ سے حاصل ہوتے ہین فائدہ اٹھانا جب ہی ممکن ہے جب یہ کتابین عام طور پر میسر آجائین ،مفید کتابین جو اب تک طبع نہیں ہوئی ہین ، ان کو طبع کیا جائے، ہر طبقہ کے لئے صحیح تاریخی روایتون پر مشتمل کتابین سہل الحصول ہون، تاریخ اسلام کے جن ابواب پر ابھی تک کافی روشنی نہین پڑی ہے ان کو تحقیق کے بعد روشنی میں لایا جائے، مخطوطات، فرامین و سکون کی جمع آوری کی جائے، مخطوطات کی فہرستین اور پھر ان فہرستون کی فہرستین Catalog of Catalogues مرتب ہون ، مستند تاریخی کتابون کو شائع کیا جائے، تاریخ اسلام کی ترتیب اور اس کی مجملات، متوسطات اور مطولات کی تدوین ہو، مگر یہ سب کچھ جب ہی ممکن ہے جبکہ تحقیقات علمی کے لئے سہولتین مہیا کی جائین ، اور تاریخ اسلامی کے درس کے لئے ملک بھر کی یونیورسٹیون مین معقول انتظام کیا جائے چونکہ ترکی زبان مین تاریخ اسلام کا بہت سا مواد موجود ہے، اس لیے ضروری ہے ، کہ ترکی کی تحصیل و تعلیم کے لئے اولاً علی گڑھ یا لاہور مین کوئی بندوبست کیا جائے ،...."

خطبے کے بعد پہلا اجلاس ختم ہوا ،

اس کے بعد ۶ بجے شام سبجکٹس کمیٹی کا جلسہ ہوا جس مین تمام مندوبین اور مجلس استقبالیہ کے ارکان

شامل ہوئے بحث و تمحیص کے بعد مجلس عام کے لئے تجاویز منظور ہوئین۔

۸ر اپریل کو بوقت ۱۰ بجے صبح کانفرنس کا عام اجلاس شروع ہوا حاضرین مین معززین شہر اسلامیہ کالج کے اساتذہ اور طلبہ سب شامل تھے، ان مین سے میجر اسکندر علی مرزا ڈپٹی کمشنر پشاور، خان بہادر محمد قلی خان، محمد یوسف خان بی اے، (آکسن) خان بہادر سکندر خان، خان بہادر غلام صمدانی خان، پروفیسر شیخ محمد تیمور، پروفیسر مشن کالج لاہور وغیرہ کے اسمار قابل ذکر ہین، اس اجلاس مین ذیل کے مقالات پڑھے گئے،

۱۔ پنجاب اور صوبہ سرحد مین قلمی کتابون کے ذخیرے (انگریزی)	ڈاکٹر سید عبد اللہ لیکچرار اورنٹیل کالج لاہور،
۲۔ سیف الدولہ محمود بن ابراہیم بن مسعود ابن محمود غزنوی (اردو)	مسٹر مشتاق احمد بھٹی ایم اے پنجاب یونیورسٹی
۳۔ دکن کی اسلامی تاریخ کی اہمیت (اردو)	سید مبارز الدین ایم اے، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد،
۴۔ کشمیر مین اسلام کی ابتدا اور اشاعت (انگریزی)	ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی، ایم اے، ڈی لٹ سابق انسپکٹر آف سکولز (سی۔ پی)
۵۔ اکبری دور مین کتابون کی تذہیب اور نقاشی (انگریزی)	ملک شمس الدین بی اے، (عجائب خانہ لاہور)
۶۔ ابن خلدون (انگریزی)	خان محمد یوسف خان، بی اے (آکسفورڈ)
۷۔ شاہان مغلیہ کے ذہنی اور علمی کارنامے، (انگریزی)	پروفیسر محمد موسیٰ کلیم، ایم اے، (اسلامیہ کالج پشاور)
۸۔[1] ہندوستان کے چند سلاطین کے مسکوکات (انگریزی)	مسٹر محمد اسمٰعیل ایم اے، (مہتمم عجائب خانہ لاہور)

---
[1] نمبر ۸ و ۹ کے مقالہ نویس حضرات خود شریک نہ ہو سکے، انھون نے اپنے مقالات بھیج دیے تھے،

(۹) جدید سائنس کا اسلامی پس منظر، (انگریزی)	خواجہ عبدالوحید سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لاہور،

اس اجلاس مین چند تجاویز بھی منظور ہوئین جس کی تفصیل آیندہ آتی ہے،

اسی شام کو ½۸ بجے مجلس استقبالیہ نے بڑے وسیع پیمانے پر دعوت طعام دی، اس دعوت مین شہر کے کم و بیش دو سو مہمان شامل ہوئے،

اس کے بعد ½۱۰ بجے شب کو ملک شمس الدین صاحب بی اے (عجائب خانہ لاہور) نے "مغلون کے عہد مین فن مصوری" کے موضوع پر ایک باتصویر تقریر کی، اس تقریر کو حاضرین نے (جن مین چند وزراء اور دیگر عمائد شہر بھی شامل تھے) بے حد پسند کیا، تقریر کے اختتام پر آنریبل قاضی میر احمد خان صدر مجلس استقبالیہ نے اس تقریر کے لئے مقرر اور کانفرنس کے کارپردازون کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا، کہ ان کی وجہ سے اہل پشاور کو اس دلچسپ موضوع پر کچھ سننے اور جاننے کا موقع ملا،

۹ راپریل کو ۱۰ بجے صبح کانفرنس کی مجلس عام کا اجلاس پھر منعقد ہوا، اس اجلاس مین اتوار کی تعطیل کی وجہ سے زیادہ رونق تھی، اس کے علاوہ اس اجلاس مین کانفرنس کی بہت سی اہم اور ضروری تجاویز پیش ہوئین، جن کی تفصیل آیندہ سطور مین آتی ہے، پہلے سکریٹری نے رپورٹ پڑھی، اس کے بعد ذیل کے مقالات پڑھے گئے،

۱- تاریخ الترسل الی الخلافۃ الراشدہ،	(بزبان عربی)	مولانا سید محمد العربی المراکشی، اورنٹیل کالج لاہور
۲- پشاور کا قلعۂ شاہی،	(انگریزی)	مسٹر ایس، ایم جعفر (پشاور)
۳- خوشحال خان خٹک،	"	مسٹر دوست محمد کامل ایم اے، ایل ایل بی (بنون)
۴- قرآن مجید اور مسئلہ نسخ،	"	مولانا فضل الرحمن ایم اے، (پنجاب یونیورسٹی)
۵- عہد مغلیہ مین جاگیرداری نظام،	"	پروفیسر محمد رضا خان ایم اے (اسلامیہ کالج پشاور)

۶- لاہور شاہیون کے عہد مین[۱]	(انگریزی)	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ڈی لٹ (پروفیسر تاریخ دکن کالج پونا)
۷- مسلمانان ہند کے احیائے جدید مین مطالعۂ تاریخ کا حصہ	(اردو)	ڈاکٹر سید عبداللہ لکچرر اورنٹیل کالج لاہور
۸- عہد شاہجہانی کے پنجابی مورخ،	(اردو)	شیخ صادق علی دلاوری، ایم اے (اورنٹیل کالج لاہور)
۹- آزاد بلگرامی بحیثیت مورخ کے	(انگریزی)	مسٹر سکھ راج الفت لاہور ایم اے (")

یہ اجلاس ۱۲ بجے ختم ہوا، اور ۹ بجے شب کو اسٹیشن پر صدر اجلاس خان بہادر مولوی محمد شفیع صاحب اور مندوبین کو رخصت کیا گیا،

کانفرنس کے اس اجلاس کے سلسلے مین منتظمین نے قلمی کتابون کی نمائش بھی ترتیب دی تھی، افسوس ہے کہ اس نمائش مین باہر کی قلمی کتابین مہیا نہ ہوسکین، صرف اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ مشرقیہ کے نوادر تھے، صدر اجلاس نے متعدد موقعون پر اس امر پر اظہار افسوس کیا، کہ اسلامیہ کالج پشاور مین علوم مشرقیہ کے سلسلہ مین جتنی توجہ ہونی چاہیئے، وہ نہین ہوئی، اور اس کی قلمی کتابون کی مشرح فہرست کی انگریزی زبان مین ضرورت ہے، جس کے بغیر ان نوادر کا حال انگریزی دان دنیا کو نہین معلوم ہوسکتا، اردو کی فہرست مرتبہ مولانا عبدالرحیم غنیمت ہے، مگر وہ ضروریات کے لئے مکتفی نہین،

اسلامیہ کالج پشاور کے لائق پرنسپل مسٹر اسکاٹ آئی سی ایس اور دیگر اساتذہ وارکان مجلس استقبالیہ لائق شکریہ ہین، جن کے تعاون اور حسن اشتراک عمل کے بغیر کانفرنس کو یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی، کار پرداز کانفرنس خان بہادر محمد قلی خان کے بھی شکرگذار ہین،

تجاویز کانفرنس مین مختلف اصحاب کی طرف سے حسب ذیل تجویزین پیش ہوئین، اور ہندوستان کے تعلیمی ادارون اور حکومت کے مختلف شعبون سے حسب ذیل مطالبات کئے گئے:۔

---

[۱] مضامین ۶،۹ کے مقالہ نگار حضرات تشریف نہیں لائے، مقالے پڑھے گئے، ۷، ۸ و بوجہ تنگی وقت پڑھے نہ جاسکے،

۱- مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد اپنے یہان اسلامی تاریخ کا مستقل شعبہ قائم کرین،

۲- اور اپنے یہان ترکی زبان کی تعلیم کا انتظام کرین،

۳- محکمۂ آثار قدیمہ حکومتِ ہند وغیرہ اسلامی آثار قدیمہ کی حفاظت کا بیش از بیش انتظام کرین، کتابات شائع کئے جائین، لاہور مین سلطان قطب الدین ایبک بادشاہ ہند اور نواب عبدالصمد خان وغیرہ صوبہ داران لاہور کے مزارات کو آثار محفوظ قرار دیا جائے،

۴- ہندوستان کی سب یونیورسٹیان، پنجاب یونیورسٹی، عثمانیہ اور مسلم یونیورسٹیان اپنے یہان کی قلمی کتابون کی شرح فہرستین مرتب کرین،

۵- یونیورسٹیان علم کتبہ شناسی کی تعلیم اور اس کے لئے وظائف کا انتظام کرین،

۶- حکومتِ ہند، صوبجاتی حکومتین اور ریاستین اپنے اپنے دائرۂ اثر مین قلمی کتابون کی جمع آوری کا انتظام کرین،

۷- مسلم یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ اعلیٰ پیمانہ پر تاریخِ اسلام اور تاریخ ہند کی تدوین کا انتظام کرین نیز علیگڈھ مین ایک عجائب خانہ آثار اسلامی کا قائم کیا جائے،

۸- فیڈرل سروس کمیشن اور صوبہ جاتی کمیشن اسلامی تاریخ کے مضمون کو مستقل حیثیت دین،

۹- پنجاب یونیورسٹی کے حکام سے دوبارہ مطالبہ کہ وہ اپنے یہان اسلامی تاریخ کا مستقل شعبہ قائم کرین

۱۰- تمام یونیورسٹیون کے حکام اور قومی اور ملی درسگاہین، اور ادارے اپنے زیر اثر عربی اور فارسی زبانون کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرین،

۱۱- قرار پایا کہ سنٹرل کمیٹی مین آنریبل قاضی میر احمد خان، ملک خدا بخش خان، خان بہادر قلی خان، خان بہادر سعد اللہ خان، پروفیسر شیخ تیمور اور مسٹر ایس ایم جعفر کو بطور رکن شامل کیا جائے،

۱۲- طے پایا کہ پشاور مین کانفرنس کے ماتحت ایک مقامی سوسائٹی تاریخی تحقیق کے لئے قائم کی جائے

جو علاوہ اور کاموں کے ایک مستند اور محققانہ تاریخ افاغنہ مرتب کرے،

۱۳- جامعہ عثمانیہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اپنے زیر اہتمام اسلامی تاریخ کی تعلیم کے لئے اردو اور انگریزی مین موزون نصاب کی کتابین مرتب کرائین، اوس سلسلہ مین اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ سے امداد کی درخواست کی جائے،

۱۴- حکومت سرحد سے مطالبہ کہ پشاور مین بھی ایک ریکارڈ آفس قائم کیا جائے،

۱۵- تمام اسلامی درسگاہین تاریخ اسلامی کی ترویج و تشویق کے لئے وظائف دین،

۱۶- پنجاب یونیورسٹی مین اسلامی تاریخ کو بی اے مین پورا مضمون بنایا جائے، جو عہد مغلیہ کے ساتھ متبادل نہ ہو، بلکہ پورے ۱۰۰ نمبر کا مستقل مضمون ہو،

۱۷- طے پایا کہ کانفرنس اپنے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کے لئے نیز تحقیقی کام کی اشاعت کے لئے اپنا ایک رسالہ شائع کرے،

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کا

تیسرا اڈیشن

بچون اور عام مسلمانون کے پڑھنے کے لئے آسان زبان میں سیرت کی یہ مشہور و معروف کتاب سہ بارہ چھپ کر تیار ہے، یہ دکن، پنجاب، یوپی اور بہار کے مختلف اسلامی مدرسون اور مکتبون مین داخل نصاب ہے، اور ہندی، گجراتی اور بنگالی وغیرہ مین اوس کا ترجمہ ہو چکا ہے، جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اوس کی زبان بہت آسان اور عام فہم ہے،

حجم ۱۶۴ صفحے، قیمت: ۶/

"منیجر"

باب الاستفسار والجواب

لفظ اللہ کے معنی

اور

اسم اعظم کا تخیل

جناب اختر حسین نظامی ام اے
لکچرار دربار انٹر کالج ریوا

جناب مولانا

السلام علیکم

آٹھ نو سال کا عرصہ ہوا جب علی گڈھ مین یونین کے کسی جلسہ مین زیارت نصیب ہوئی تھی اس وقت مین نے صوفی سلسلون کے متعلق اعظم گڈھ میں کیا ذخیرہ ہے، اس پر جناب سے ایک سوال کیا تھا غالباً یاد ہوگا، اس مضمون پر تقریباً چھ سات مہینے تک مین نے مطالعہ کیا لیکن قسمت یہان لے آئی، اور اس کے بعد وہ کام آگے نہین بڑھ سکا، تاہم سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا، اب بھی کوئی کام کی بات مل گئی، تو نوٹ کر لیتا ہون، آج کل ادھر کئی برسون سے ریوان کے گھیل خاندان پر کام کر رہا ہون،

سیرۃ النبی جلد چہارم مین لفظ اللہ کے معنی آپ نے "پیار" لکھے ہین، حالانکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ اللہ اسم ذات ہے اسم صفات نہین ہے چونکہ یہ لفظ اسلام سے پہلے کا ہے، یہ نام ہے ایک اعلیٰ ہستی کا جسکی صفات کا تخیل قدیم عربون میں نہین تھا، اس بات کی وضاحت آپنے بھی کر دی ہے، لیکن میرا گمان یہ ہے کہ اللہ کے معنی بیان کرنے کی کوشش بعد کے لغت نویسون کی ہے، میں تو اللہ کو یون سمجھتا ہون

جیسے قدیم آریون کا لفظ "اوم" جو رگ وید مین آیا ہے۔ اللہ کا مشتق تلاش کرنا، اہلِ لغت کی اپج معلوم ہوتی ہے

صوفیون کے ہان ایک مسئلہ اسمِ اعظم کا ہو جس کا چرچا جُہلا مین زیادہ رہتا ہو، ان کا خیال ہو کہ اسمِ اعظم اسرارِ خفی میں سے ہے، جو صرف مرشد کی خاص عنایت سے معلوم ہوسکتا ہے، اسے وہ مشکل کشا مانتے ہین، ہندوؤن مین گرومنتر دینے کا جو رواج ہے، غالبًا اسی کی تقلید ہے، صوفیاے متقدمین کے زمانہ مین بھی لوگون کو اسی قسم کے وہم رہتے تھے لیکن ان بزرگون نے اس کا جواب صاف یہی دیا کہ جس نام سے خدا کو پکارو وہی اسمِ اعظم ہے، اور تعلیماتِ قرآنی کے عین مطابق ہے حضرت نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہی سے پوچھا گیا، تو اونھون نے فرمایا کہ "ہر اسمے کہ خداے تعالیٰ را بخوانی آن اسمِ اعظم است" (فوائد الفوائد) بعضون نے فرمایا کہ "اسمِ اعظم اللہ ہی ہے" (قول حضرت محبوب سبحانی از قلائد الجواہر) متوسطین مین شاہزادہ داراشکوہ فرماتے ہین "این اسمے است بس بزرگ وشامل کفر واسلام جامع جمیع اسمار در ہیچ چیز ازین اسم بیرون نیست ومعنی این اسمِ اعظم اینست کہ ا ست صاحبِ سہ صفت ایجاد وابقا وافنا، وہمہ آفرینش و ذرات موجودات ازین سہ صفت خارج نیست امّا ازین معنی وسرّ این اسمِ اعظم کسے واقف نیست مگر بعضے از اکمل مشائخ بر سبیلِ ندرت (رسالہ حق نما ص ۱۰۰ مطبع قیومی کانپور) چنانچہ یہی نام صوفیہ کے اذکار و اشغال مین مستعمل ہوتا ہو آنجناب اس مسئلہ پر میرے شکوک رفع کرین، تو ممنون ہونگا"

معارف: مکرم دام لطفہ،

السّلام علیکم:- خوشی ہوئی کہ آپ اب بھی علمی مشاغل مین مصروف ہین،

لفظ اللہ کے اشتقاق کی بحث اہلِ لغت کے ہان بھی ہے، اور مفسرین ومتکلمین ومحدثین کے ہان بھی، امام بیہقی نے اپنی کتاب الاسماء والصفات کے ایک باب مین اس پر بحث کی ہے، اور منجملہ اور رایون کے ایک راے یہ بھی نقل کی ہے کہ یہ وُلاہ سے مشتق ہو، جس کے معنی اوس محبت کے ہین، جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے،

مزید تحقیق کے لئے لسان العرب اور نہایۃ ابن اثیر ملاحظہ فرمائیں،

آپ نے میری سیرت جلد چہارم کا حوالہ دیا ہے، وہاں کی عبارت یہ ہے :۔

اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اوس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگردان ہو، دوسروں کی تحقیق ہے کہ اوس کے معنی ہیں، وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت و محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں؛

آپ کی عبارت سے دھوکا ہوتا ہے کہ میں نے لفظ اللہ کے یہی ایک معنی لکھے ہیں، حالانکہ میں نے متعدد اقوال نقل کر دیئے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سیرۃ کی اسی جلد کے دوسرے موقع (محبت الٰہی) پر خاکسار نے یہ بھی لکھا ہے :۔

"ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے، اور گو اون کی حیثیت اب علم اور نام کی ہو تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھکر استعمال کئے گئے تھے، ہر قوم نے اس علم اور نام کے لئے اوسی وصف کو پسند کیا جو اوس کے نزدیک اوس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی،

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے، اس میں اہل لغت کا تقیناً اختلاف ہے مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلَہ سے نکلا اور وَلَہ کے اصل معنی عربی میں اوس غم، محبت اور تعلق خاطر کے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد کو مطلق "عشق و محبت" کے معنی پیدا ہو گئے، اور اسی سے ہماری

زبان میں لفظ وَالِہ (شیدا) مستعمل ہے، اس لئے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں متحیر اور پریشان ہیں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں "من موہن" یعنی دلوں کا محبوب کیا کرتے تھے۔ (صفحہ ۵۲۳)

آپ کا یہ کہنا کہ میں تو لفظ اللہ کو یوں سمجھتا ہوں، جیسے قدیم آریوں کا لفظ "اوم" جو رگ وید میں آیا ہو، آپ کا مقصد گویہ ہے کہ جس طرح ہندوؤں کے لفظ اوم کا کوئی مشتق منہ سنسکرت میں نہیں، اسی طرح اللہ کا لفظ بھی کوئی مشتق منہ نہیں رکھتا، اور ایک اسم جامد ہے، جو صرف خدا کے علم کے لئے وضع ہوا ہے تاہم اس تشبیہ سے مجھے گرانی ہوئی، آپ کا نفس خیال تو عام ابتدائی فلسفیانہ و منطقیانہ کتابوں میں مذکور ہے، اور بڑی کتابوں میں بھی ہے امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں :-

المختار عندنا ان هذا اللفظ	ہمارے نزدیک پسندیدہ قول یہ ہے کہ لفظ
اسم علم الله تعالى وانه	اللہ اسم علم ہے، اور یہ مشتق نہیں ہے،
ليس بمشتق البتة وهو قول الخليل وسيبويه	یہی قول خلیل سیبویہ اور اکثر اصولیین اور
وقول اكثر الاصوليين والفقهاء (تفسیر کبیر اول صفحہ ۱۲۱)	فقہاء کا ہے،

پھر امام رازی نے اس مسلک پر چند دلیلیں قائم کی ہیں، اس کے بعد ان لوگوں کی رائے لکھی ہے جو اس کو مشتق مانتے ہیں، ان کے دلائل ذکر کئے ہیں، پھر اختصار کے ساتھ ان کا رد لکھا ہے،

بہرحال یہ دونوں رائیں ہیں، اور دونوں کے کہنے والے اور ماننے والے ہیں، اور دونوں کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں، لیکن آج کل کے محققین علم الاشتقاق نے یہ بات واضح کی ہے، کہ کوئی لفظ اپنی اصل وضع میں کسی مناسب معنی کے بغیر نہیں ہے، گو مرور زمانہ اور لفظ کی ابتدائی شکلوں کے فراموش ہو جانے سے

یا مختلف زبانون مین اوس کے الٹ پھیر ہو جانے کی وجہ سے اس کی اصلیت باقی رہی، اور نہ اوس کی مناسبت کا ہم کو پتہ چلتا ہے، چنانچہ یہی لفظ اللہ ہے جس کی مختلف شکلیں مختلف سامی زبانون مین ملتی ہین، جیسے، ایل بابل اور اسرائیل وغیرہ مین یا لفظ الوہ مین ملتی ہے، توراۃ کے شروع مین الوہیم آیا ہے تفصیل کے لئے ارض القرآن کی دوسری جلد مین "مذاہب عرب قبل اسلام" دیکھئے، (ص ۲۴۴، ۲۴۵) اس سے معلوم ہوگیا کہ ایل اور الوہ کے الفاظ معبود کے معنی مین اکثر سامی زبانون مین بولے گئے ہین، قدیم عربی زبان مین عرب معبود کا نام ہیروڈٹس یونانی مورخ کے بیان کے مطابق الیلات تھا کیا عجب کہ زمانہ بعثت کے جاہل عربون کے مشہور دیوتا اللات کی اصل ہو، عربی زبان مین اہل لغت نے لکھا ہے، کہ اہل عرب آفتاب دیوی کو الاہتہ، "الُهۃ" کہتے تھے، اور اس کی مختلف شکلیں نقل کی گئی ہین، الایھہ، الاِلھہ، الاَھہ، اُلھہ سب کے معنی آفتاب کے ہیں، جس کی پرستش بعض اہل عرب میں رائج تھی، جیسا کہ قرآن پاک مین ہے،

لاتسجدوا للشمس والقمر واسجدوا	آفتاب و ماہتاب کے سامنے سجدہ نہ کرو
للّٰہ الذی خلقھن،	اس اللہ کا سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا'

قرآنی تعریفون اور قدیم کتبات سے یہ بات ثابت ہے،

قدیم عربی مین لاھُوتَ اور اللّٰھُوتَ کے جو لفظ بولے گئے ہین، اور دوسرا لفظ اب بھی بولا جاتا ہے وہ بھی اسی سامی اشتقاق کی صورت ہے،

قرآن پاک مین معبودان باطل کے لئے "اٰلِھَۃ" کا لفظ بصورت جمع جس کا واحد اِلٰہ ہے بکثرت بولا گیا ہے، جیسے اذا لذھب کل الٰہ بما خلق، ءالٰہ مع اللہ لو کان فیہما اٰلھۃ، اور جیسا کہ کلمۂ اسلام لا الٰہ الا اللہ میں ہے، اس سے بتواتر ثابت ہوگیا، کہ عربی زبان مین سامی زبانون کی طرح "الٰہ" کا لفظ معبود اور قابل پرستش کے معنون مین ہے، اس سے ان لوگون کے خیال کا ابطال ہو جاتا ہے، جو اللہ کو محض اسم جامد غیر مشتق اور اسم علم کے علاوہ دوسرے معنون کیلئے غیر موضوع سمجھتے ہین، اور یہ تفریق معلوم ہوئی کہ الٰہ مطلق معبود کے معنی مین اور

لف لام لگ کر الالٰہ یا اللہ معبود برحق کے معنی میں قدیم زمانہ سے عربوں میں رائج ہے، اور یہ معنی اسم جامد اور محض اسم علم نہیں ہے،

اسم اعظم کے متعلق ہمارے مفسرین نے اسرائیلیات سے لیکر ایک ہی جگہ تذکرہ کیا ہے، اور وہ ملکۂ سبا کے قصہ میں ہے، جہاں حضرت سلیمانؑ کے ملکہ سبا کے تخت منگوانے کا ذکر ہے،

سع قع پر الذی عندہٗ علم الکتاب (نمل) کسی نے توراۃ مراد لیا ہے، اور کسی نے اسم اعظم لیکن اس کے متعلق ارض القرآن جلد اول ص ۲۰۰ میں، میں نے لکھا تھا،

"اسم اعظم کا تخیل ایک جاہلانہ اور غیر ثابت الشرع تخیل ہے، اسلام کے رو سے یہ کوئی شئے نہیں ہے البتہ یہودیوں میں یہ خیال اب تک موجود ہے"

مجھے اب تک اوس کے خلاف معلوم نہیں اور اب تک احادیث سے یہ ثابت ہے اور قرآن پاک سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے، کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کے تمام ناموں کا علم نہیں بخشا گیا ہے، چنانچہ ابن حبان، حاکم، ابو یعلی بن ابی شیبہ، طبرانی کے حوالہ سے ایک دعا منقول ہے، جس میں فرمایا

اسئالك بكل اسم هو لك سميت	تیرے ہر اوس نام کے ذریعہ تجھ سے سوال
به نفسك او انزلته فی کتابك او	کرتا ہوں جس سے تونے اپنا نام رکھا ہے
علمته احدًا من خلقك او	یا تونے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے، یا اپنی
استاثرت به فی علم الغیب عندك	مخلوق میں سے کسی کو بتایا ہے، یا اپنے پاس
	علم غیب میں پوشیدہ رکھا ہے،

الاسماء والصفات بیہقی میں ایک حدیث ہے، جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں،

قالت یا رسول اللّٰہ علمنی اسم اللّٰہ	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ
الذی اذا دعی به اجاب قال لها	یا رسول اللہ مجھکو اللہ تعالیٰ کا وہ نام بتائیے

صلی اللہ علیہ وسلم تو می فتوضی وادخلی المسجد
فصلی رکعتین ثم ادعی حتی اسمع ففعلت
فلما جلست للدعا قال النبی صلی اللہ
علیہ وسلم اللھم وفقھا فقالت
اللھم انی اسئلک بجمیع اسمائک الحسنیٰ
کلھا ما علمنا منھا وما لم نعلم و
واسئلک باسمک العظیم الاعظم
الکبیر الاکبر الذی من دعاک بہ
اجبتہ ومن سالک بہ اعطیتہ
قال یقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم
اصبتہ اصبتہ
(صـ۵)

کہ جب اوس کو لے کر دعا مانگی جائے تو قبول
ضرور ہو، حضورؐ نے فرمایا، اٹھو وضو کرو مسجد
مین جاؤ، اور دو رکعت نماز پڑھو، پھر دعا مانگو،
یہان تک کہ مین سنون، حضرت عائشہؓ نے ایسا
ہی کیا، جب دعا کے لئے اٹھین تو حضورؐ نے
فرمایا، کہ خداوندا ان کو توفیق دے، حضرت
عائشہؓ نے دعا میں فرمایا کہ خداوندا مین تیرے
تمام اچھے نامون کے ذریعہ دعا مانگتی ہون،
جو ہم کو معلوم ہین اور جو نہیں معلوم ہین، اور تیرے
اس بڑے نام کے ذریعہ مانگتی ہون، کہ جو بھی
اس کے ذریعہ مانگے تو اسکی دعا ضرور قبول
فرمائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
کہ تم نے ٹھیک کیا،

اس میں بھی اسم اعظم بطور صفت کے ہے، علم کی حیثیت نہین معلوم ہوتی، البتہ یہودیون مین یہ خیال پرانا ہے، چنانچہ ان کے یہان خدا کا اصلی نام "یہواہ" ہے، مگر لکھتے یہواہ ہین، اور پڑھتے سیدنا (ادونائی) ہین، اور اون کا خیال ہے، کہ حضرت سلیمانؑ کو یہی اسم اعظم معلوم تھا، جس کے ذریعہ سے وہ جن وبشر پر بادشاہی کرتے تھے، لیکن قرآن پاک اور احادیث مین اس کا کوئی بیان نہین ہے،

والسلام

"س"

بوہرے

جناب محمد علی صاحب

بتوسط ایم عبدالحسین اینڈ برادرس پرانی منڈی اجمیر

السلام علیکم :- فرقہائے اسلام سے ایک فرقہ قوم "بواہر" یا "بوہرہ" کے نام سے مشہور ہے یہ لوگ زیادہ تر ہندوستان کے مغربی سواحل بمبئی سورت وغیرہ مقامات اور مالوہ گجرات کے صوبون مین زیادہ پائے جاتے ہین اسی قوم کے چند افراد راجپوتانہ مین خاصکر کے اودیپور میواڑ مین بہت ہین یہان اجمیر مین قریباً سو گھر ہین، یہ لوگ مذہبی نقطہ نگاہ سے اپنے عقیدہ دین مین راسخ واقع ہوئے ہین، ایک صاحب میرے مکان کے قریب رہتے ہین، چنانچہ دلچسپی کا سبب بنے ہوئے ہین، لہذا مین چاہتا ہون کہ ان لوگون کی پوری تاریخ سے واقفیت حاصل کرون یہ فرقہ کہان سے عام اسلامی شاخ سے علحدہ ہوا آیا یہ ہندوستان ہی کی پیداوار ہے یا ان کے مبلغ ایران یا عراق وغیرہ سے یہان آئے، یہ اپنے کو شیعہ کی ایک شاخ بتاتے ہین آج سے غالباً آٹھ دس برس پہلے رسالہ معارف میں میری نظرون سے ایک اشتہار چھپا ہوا گذرا تھا جس میں اس قوم کی پوری تاریخ لکھنے کا اعلان تھا جو کتابی صورت میں شائع ہونے والی تھی، غرض مجھے کوئی جامع اور صحیح تاریخی کتاب کی ضرورت ہے جو اردو مین چھپی ہوئی ہو، اگر آپ کے مطبع نے شائع کی ہو تو بذریعہ وی پی پارسل ارسال فرمادین یا کتاب اور جگہ کا پتہ جہان مل سکتی ہو، تحریر فرمادین، عین نوازش ہوگی، فقط

معارف :- محترم زاد لطفکم

السلام علیکم آپ کا گرامی نامہ متعلق استفسار فرقہ بوہرہ موصول ہوا، یاد فرمائی کا شکریہ، اون کی مختصر سرگذشت یہ ہے :-

مصر کے فاطمی خلفا میں سے آگے چل کر ایک خلیفہ الحاکم بامر اللہ ہوا، جس کے دو بیٹے ہوئے نزار اور علی الظاہر لاعزاز دین اللہ، اسی طرح فاطمی اسماعیلی امامت دو حصوں میں منقسم ہو گئی، ایک نزاری اور دوسرے ظاہری، ظاہر لاعزاز دین اللہ مصر کا خلیفہ ہوا، اور آخر یہ امامت سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں تباہ ہوئی، اس سلسلہ کے لوگ آج ہندوستان میں بوہرے کہلاتے ہیں، اور نزاری کی بنا حسن بن صباح نے کوہستان ایران میں ڈالی اور قلعہ الموت میں باطنی حکومت کی بنیاد استوار کی، جس کا خاتمہ ہلاکو خان تاتار کے ہاتھوں سے ہوا، اس سلسلہ کے امام ہز ہائینس سر آغا خان ہیں، اور اول الذکر سلسلہ کے موجودہ امام ملا طاہر سیف الدین ہیں،

"بوہرہ گجراتی زبان کے لفظ "وہور وو" سے نکلا ہے، جس کے معنی تاجر کے ہیں، بعض محقق اسکو عربی الاصل کہتے ہیں

مغربی ہند میں یہ جماعت صرف مسلمانوں پر مشتمل نہیں، بلکہ ان میں ہندو بوہرے بھی ہیں، چونکہ اس جماعت کے بہت سے لوگ اسی فرقہ اسماعیلی میں داخل ہو کر مسلمان ہوئے، اس لئے اس مسلم جماعت کا نام بھی "بوہرہ" عرف عام میں پڑ گیا، چنانچہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں ۲۶۶۵ ہندو، اور ۲۵ جینیوں نے اپنے کو بوہرہ جماعت میں سے قرار دیا ہے، اور اسی سال کی مردم شماری کے رو سے مسلمان بوہروں کی تعداد ۱۸۲۲۵۵ ہے جن میں سے ۱۸۳۰۷۰ بمبئی پریسیڈنسی میں رہتے ہیں، ان میں سے کچھ بوہرے اپنا تعلق عرب و مصر کے مہاجر خاندانوں سے بتاتے ہیں، ورنہ ان میں کی بڑی جماعت اون ہندو بوہروں پر مشتمل ہے، جو اسماعیلیوں کے ہاتھوں پر اسلام میں داخل کئے گئے ہیں،

ہندوستان سے ان اسماعیلی بوہروں کا تعلق ۴۶۰ھ/۱۰۶۷ء سے پیدا ہوا، جب کہ ان میں کا ایک شخص عبد اللہ نامی یمن سے کھنبایت میں آیا، لیکن یہاں ان کے مبلغ اول کی حیثیت سے محمد علی کا نام لیا جاتا ہے، جس کا زمانہ ۵۳۲ھ/۱۱۳۷ء کے قریب ہے، اور اس کا مقبرہ کھنبایت میں موجود ہے، ۱۲۹۷ء سے گجرات دلی کے ماتحت آگیا، اور ۱۳۹۷ء سے ۱۵۷۲ء تک یہاں خود مختار اسلامی سلطنت رہی، اسی اثنا میں ۹۴۶ھ یعنی ۱۵۳۹ء تک ان

بوہرون کا مرکزی تعلق یمن سے وابستہ رہا، یہان تک کہ اسی سال ۹۷۴ھ مین یوسف بن سلیمان ہندوستان آیا، اور اوس نے سدھ پور مین جو ان دنون ریاست بڑودہ مین ایک شہر ہے، اقامت اختیار کی، پچاس سال کے بعد ۱۰۰۵ھ مین داؤد بن عجب شاہ کی وفات پر بوہرون میں دو فرقے ہوگئے، ایک جماعت نے اوس کے جانشین داؤد بن قطب شاہ کو منتخب کیا، اور دوسرے نے سلیمان کو جانشین بنایا، سلیمان اس دستاویز کے ساتھ گجرات آیا، جو اُسے داؤد بن عجب شاہ سے ملی تھی، مگر یہان بہت تھوڑے سے لوگ اوس کی امامت قبول کرسکے، اوس نے احمد آباد مین اقامت اختیار کی، اس طرح بوہرون کے دو فرقے قرار پائے، ایک داؤدیہ دوسرا سلیمانیہ، مگر موخرالذکر فرقہ کی بہت تھوڑی تعداد رہ سکی، فرقہ داؤدی کے لوگ تقریباً ۔۔۔۔ ۱۳۰ ہین، اون کا امام جو "ملا" یا "داعی" کہا جاتا ہے، سورت مین اقامت گزین ہے،

فرقہ داؤدیہ کے امام کا فیصلہ، مذہبی و معاشرتی جملہ مسائل مین اوس کے پیرؤں کے لئے حکم ناطق ہوتا ہے، وہ ان کو سزائین بھی دیتا ہے، اور ہر پیرو کے لئے اپنی آمدنی کا پانچوان حصہ امام کی نذر کرنا ضروری ہے، نیز دیگر متعین مواقع شادی اور ولادت وغیرہ پر مختلف نذرین پیش کی جاتی ہین، فرقہ داؤدیہ کی تنظیم پورے طور پر مکمل ہے، نائب ملا، نائب دعاۃ مختلف علاقون مین مامور ہین، جو تحصیل وصول و اصلاح و تنظیم مین شریک رہتے ہین،

۱۶۲۴ء اور ۱۷۸۹ء مین داؤدیون کے اندر بھی چند جماعتین پیدا ہوئین، اور وہ اپنی تاریخ پیدائش کی مختلف تفصیلات سے متعلق اپنے ان عقائد و یقینیات کے ساتھ اب بھی موجود ہین،

نیز بوہرون کی ایک جماعت "جعفری بوہرہ" بھی کہی جاتی ہے، یہ وہ بوہرے ہین، جو مظفر شاہ کے عہد حکومت (۱۴۰۷ء - ۱۴۱۱ء) مین سُنی ہو گئے تھے، یہ لوگ پندرہوین صدی عیسوی کے ایک شیخ طریقت سید احمد جعفر شیرازی کی طرف منسوب ہین، جنھون نے غالباً انھیں شیعیت سے نکال کر مذہب اہل سنت مین داخل کیا تھا،

داؤدی بوہروں کی مذہبی کتابیں مستور رکھی گئی ہیں، صرف عبادات کی بعض کتابیں مثلاً صحیفۃ الصلوٰۃ چھپ سکی ہے،

دائم الاسلام اور اتحاف ان کی مذہبی کتابیں ہیں، جن میں بوہرہ دعاۃ کے اقوال سے اسلام کو سمجھایا گیا، بوہروں کے موجودہ امام ملا طاہر سیف الدین کی ایک تصنیف "ضوء نور الحق المبین" کے نام سے ۱۳۳۵ھ میں عربی زبان میں چھپ کر شائع ہوئی تھی، اس کتاب پر ہندوستان کے اسلامی پریس میں شدید ہنگامہ اٹھا اور ان تحریروں کو جناب حاجی عمر حاجی احمد تاجر سورت نے جمع کرا کر ایک مستقل کتاب "سیف بردین" کے نام سے شائع کیا تھا،

سلسلۂ گفتگو کے تتمہ کے طور پر آغا خانی جماعت کے متعلق بھی عرض کر دیا جائے کہ ہندوستان سے اس جماعت کی امامت کا تعلق امام حسن علی شاہ معروف بہ آغا خان اوّل کے ورود ہند سے ہوتا ہے، جو ۱۲۵۰ھ میں فتح علی شاہ ایران کے انتقال کے بعد ہندوستان آئے، اور انگریزی حکومت نے بعض خدمات کے صلہ میں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بمبئی اس کا صدر مقام قرار پایا، موجودہ امام سر آغا خان سوم ہیں، اور اپنے سلسلۂ امامت کے لحاظ سے ۴۸ ویں امام ہیں،

بوہروں کے متعلق ہمارے علم میں اردو میں کوئی مستقل کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی خوجہ یعنی آغا خانی جماعت کے حالات ہفتہ وار صحیفہ اسماعیلی بمبئی کے گولڈن جوبلی نمبر میں مختصراً دیکھنے میں آئے تھے، خوجہ اور بوہرہ دونوں جماعتوں پر انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں آپ کو کسی قدر حالات مل جائیں گے تفصیل کے لئے اس کی طرف رجوع کریں،

مولانا سید ابو ظفر ندوی نے بوہروں پر ایک مستقل کتاب اردو میں لکھی ہے، جو ابھی تک شائع نہ ہو سکی ہے اس کے ایک باب کا ترجمہ اسلامک کلچر حیدرآباد میں ۱۹۳۵ء میں چھپا تھا، مولانا موصوف سے انگلو ورنا کیولر سوسائٹی گجرات احمد آباد کے پتہ سے مزید معلومات آپ حاصل کر سکتے ہیں، والسلام "ر"

ادبیات

پیامِ اقبال

از

جناب نکہت شاہجہانپوری

خرمنِ عقل و ہوش مین آگ سی اک لگائے جا ۔۔۔ کشمکشِ حیات پر برقِ عمل گرائے جا

سوزِ درون بڑھائے جا قلب و جگر جلائے جا ۔۔۔ شمعِ حیات گل نہ کر عشق کی لو لگائے جا

تیرے جہانِ سوز مین طور کی بجلیان بھی ہین ۔۔۔ ذوقِ تجلیات سے روح کو جگمگائے جا

ساغرِ گل کی مستیان وجہِ نشاط بن چکین ۔۔۔ بادۂ تلخکام سے تشنہ لبی بجھائے جا

مقصدِ زندگی مگر کشمکشِ حیات ہے ۔۔۔ لالہ و گل کے رنگ سے خونِ جگر پلائے جا

قیدِ تعینات مین لیلیٰ آرزو کہان ۔۔۔ دشتِ جنون نواز مین گامِ طلب اٹھائے جا

تابِ نظارہ گر نہ ہو حسرتِ دید ہی سہی ۔۔۔ شوقِ تجلیات مین حسنِ نظر بڑھائے جا

تیرے سجود پر مگر عرشِ بریں کو ناز ہو ۔۔۔ غیرِ خدا کے سامنے سر کو نہ یون جھکائے جا

اٹھی ہیں سمتِ غرب سے کفر و بلا کی آندھیان ۔۔۔ عشق کا شعلہ زار بن شمعِ خرد بجھائے جا

قیدِ حیات[1] و بندِ غم شعبدۂ خیال ہے ۔۔۔ تو غمِ زندگی نہ بن موت پہ مسکرائے جا

صاحبِ بالِ جبرئیل اف یہ تری نوازشین

نکہتِ پُرخمار کو جامِ خودی پلائے جا

---

[1] تلمیح بہ طرف شعر غالب، قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونون ایک ہین۔

سرشار و خراب

ازجناب آرش صدیقی

خوب ہے ذوقِ نظر حسن حجاب اچھا ہے — دل ہو بیدار تو ہر خوابِ شباب اچھا ہے

نہ یقین ہو تو اُسی نرگسِ مخمور سے پوچھ — عشق جتنا بھی ہو سرشار و خراب اچھا ہے

کچھ بھی ہو حیرتِ نظارہ کہ تمکینِ جمال — حسن ہر رنگ مین مانوسِ حجاب اچھا ہے

سازِ ناہید فلک ہو کہ دلِ بشکستہ — دردِ مضراب ہو جس کی وہ رباب اچھا ہے

ماورا عالمِ اسباب سے ہے عالمِ عشق — سب سوالون کا یہی ایک جواب اچھا ہے

اک نگاہ غلط انداز ہے جس کا عنوان — لاکھ بیداری عالم سے وہ خواب اچھا ہے

زندگی حرفِ غلط ہے رخِ محبوب آرش — ورنہ یون مشغلۂ علم و کتاب اچھا ہے

غزل

ازجناب شفیق صدیقی جونپوری

چمن سے قفس تک دھوان دیکھتا ہون — نشیمن کی چنگاریان دیکھتا ہون

یہ محدود سی شے اور اتنی رسائی — مقامِ دلِ ناتوان دیکھتا ہون

تری عظمتِ کبریائی کے آگے — خودی کو بھی سجدہ کنان دیکھتا ہون

جہان طائرِ سدرہ اڑ کر نہ پہنچے — قلندر کی منزل وہان دیکھتا ہون

زہے اوجِ آدم کہ نقشِ قدم پر — فرشتون کی پیشانیان دیکھتا ہون

محبت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا — یہ شے حاصلِ دو جہان دیکھتا ہون

جہان حسن کی بے نیازی بھی گم ہے — وہان عشق کو حکمران دیکھتا ہون

شفیقِ سخنور جو ننگِ وطن تھا — اُسے فخرِ ہندوستان دیکھتا ہون

مطبوعات جدیدہ

تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول، مرتبہ جناب ڈاکٹر محی الدین صاحب زور قادری معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو، تقطیع بڑی ضخامت ۳۹۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۔/صر

پتہ :- سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدرآباد دکن،

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اردو زبان کی جو مختلف النوع مفید خدمات انجام دے رہا ہے، وہ باخبر اصحاب سے مخفی نہیں، اس سلسلہ میں اوس نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا ہے جس کے مخطوطات کی تعداد کئی ہزار تک پہونچ گئی ہے، ان میں بہت سے نادر اور تاریخی مخطوطے بھی ہیں، ادارہ کے لائق کارکنوں نے اب اس کتب خانے میں مخطوطات کی فہرست کی ترتیب کا کام شروع کیا ہے، چنانچہ اس کے فاضل معتمد ڈاکٹر محی الدین صاحب زور نے اردو مخطوطات کی پہلی جلد مرتب کی ہے، اس میں مذہبیات، قرآن و حدیث، فقہ و تصوف، مواعظ و نصائح، ادعیہ و مناجات، سیر و مناقب نبوی، اہل بیت و صحابۂ کرام اور دوسرے بزرگان دین کے سوانح و فضائل اور سلاطین و امراء کے حالات، منظومات، قصص و حکایات، لغت، عروض و انشا، طب، اور بعض عقلی علوم کے ۲۷۵ مخطوطات کی مفصل فہرست ہے، جن مصنفین کے حالات معلوم ہو سکے ہیں، ان کے مختصر حالات مخطوطہ کی کیفیت، تصنیف و کتابت کے سنین، کتاب کے شروع و آخر کی عبارت یا اشعار، ہر کتاب کے متعلق ضروری معلومات دیدیئے ہیں، لیکن مخطوطات خصوصاً غیر معروف مصنفین اور ان کی تصانیف کی فہرست کی ترتیب کا کام اتنا دشوار ہے، کہ اس سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے، تاہم لائق مرتب نے ہر کتاب کے متعلق حتی الامکان ضروری اور صحیح معلومات جمع کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی یہ کوشش اس حیثیت سے

زیادہ قابلِ قدر ہی کہ اس فہرست کے ذریعہ اردو کے بہت سے نادر مخطوطات کا علم شائقین کو ہو جائے گا، کتاب کے آخر مین اسمار اور اشخاص کے اعلام کا اشاریہ بھی دیدیا ہے، جس سے تصانیف اور مصنفین کی تلاش مین سہولت پیدا ہو گئی ہے، امید ہے کہ دوسری جلد بھی جلد شائع ہو گی،

دورِ جدید کے چند منتخب ہند و شعرا } از جناب عبدالشکور صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سے ر پتہ :- کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

اردو زبان کی تعمیر و ترقی مین ہند و مسلمان دونون کا مساوی حصہ ہے، اور کوئی دور ایسا نہین گذرا ہے جس مین مسلمانون کے ساتھ اردو زبان اور شعر و ادب کے ہند و اہلِ کمال موجود نہ رہے ہون، اور بعض جماعتون کی جانب سے اردو کی مخالفت کے باوجود آج بھی اردو زبان کے ہر شعبہ مین ایسے ہند و اہلِ کمال موجود ہین جن کا درجہ کسی طرح مسلمانون سے کم نہین ہو، اردو شعرا کے تذکرہ نگارون کی یہ بڑی فروگذاشت ہے، کہ انھون نے مسلمان اہلِ کمال کے مقابلہ مین ہند و اصحابِ کمال کا تذکرہ کم لکھا ہے، اس لئے اس کی بڑی ضرورت تھی کہ اردو شعر و ادب کی کتابون مین ان کے خدمات کا پورا اعتراف کیا جائے، اور اس کے مطابق ان کو جگہ دیجائے، لائق مؤلف نے مذکورۂ بالا کتاب لکھ کر ایک حد تک یہ فرض انجام دیا ہے، اس مین رتن ناتھ سرشار اور چکبست بر ق کے زمانہ سے لیکر موجودہ دور تک نو متوفی اور بائیس موجود ممتاز ہند و شعرا کے مختصر حالات لکھے ہین ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے، اور اس کا نمونہ دیا ہے لیکن اس کتاب مین صرف ممتاز و مشاہیر شعرا کے حالات ہین، اگر اس کو اور وسعت دیجائے تو یہ تعداد اور زیادہ بڑھ سکتی ہے، لائق مؤلف کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے، انھون نے یہ کتاب لکھ کر ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا، اور اہلِ قلم کو ایک ضروری موضوع کی طرف متوجہ کر دیا، ممکن ہے آیندہ کوئی صاحبِ قلم اس موضوع پر اس سے زیادہ وسعت و جامعیت کے ساتھ لکھنے کی کوشش کرین،

مشاہیر یونان و روما جلد اول مترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی تقطیع بڑی،

ضخامت ۴۴۸ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد:- سےہ
پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند، دہلی،

حکیم پلوٹارک یونانی کی مشہور کتاب Parallel Lives دنیا کی اہم کتابوں میں سے ہے، اس میں یونان ورومہ کے ایسے مختلف اصناف کمال کے چھیالیس اکابر اور نامور اشخاص کے حالات ہیں، جو اپنے اخلاق وسیرت کی بلندی قوم وملک کے لئے ایثار وجانبازی اور اپنے زندہ جاوید کارناموں کے لحاظ سے ساری دنیا کے لئے نمونۂ عمل تھے، اور جن کی مثال نے یورپ کے بڑے بڑے مصلحین کو متاثر کیا، اور انھوں نے جدید یورپ کی تجدید واصلاح کے سلسلہ میں کارہاے نمایاں انجام دیئے، یہ اہم کتاب اردو میں ترجمہ کے لائق تھی، انجمن ترقی اردو نے آج سے تقریباً پچیس سال پیشتر مشاہیر یونان ورومہ کے نام سے اس کی پہلی جلد کا ترجمہ شائع کیا تھا، اب اوس نے پوری کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے، اس سلسلہ میں پہلی جلد کے ترجمہ پر نظر ثانی اور ترمیم کرکے اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، اس جلد میں آٹھ مشاہیر کے حالات ہیں، کتاب کے شروع میں فاضل مترجم کے قلم سے قدیم یونان ورومہ کی مختصر تاریخ ہے جس سے کتاب کے اشخاص کے حالات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ترجمہ کی خوبی کے لئے لائق مترجم کا نام کافی ہے، اس کتاب کی مکمل اشاعت کے بعد اردو میں ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوگا،

تعلیم کا مسئلہ، از جناب ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ،
تقطیع چھوٹی، ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- عہ، پتہ :- سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدرآباد دکن،

حکومت نے اپنے مصالح کے اعتبار سے ہندوستان کا نظام تعلیم ایک خاص نہج کا بنایا تھا، جو نہ صرف قومی اور ملکی بلکہ خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی اتنا ناقص اور تعلیم کے اصلی مقاصد سے اتنا دور ہے، کہ وہ ملک کے لئے مفید اور کارآمد تعلیم یافتہ اشخاص پیدا نہیں کرسکتا اور یہ مسئلہ اتنا مسلم ہوچکا ہے کہ ہندوستان کے قومی ماہرین

تعلیم کے لئے بھی لائق غور بنا ہوا ہے، جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اس کتاب مین صحیح تعلیمی اور قومی و ملی نقطۂ نظر سے مسئلہ تعلیم پر بحث کر کے مسلمانون کے نظامِ تعلیم کا خاکہ پیش کیا ہے، اور تعلیم و تربیت کی اصلی غرض و غایت ظاہر کر کے موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دکھائے ہین، اور قومی و ملکی ضروریات کے مطابق ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تینون تعلیمی مدارج کا نظام اور نصاب پیش کیا ہے، اور جامعات کے شعبۂ فنون کی موجودہ تقسیم کے متعلق بعض تجویزین پیش کی ہین، اس خاکہ مین مسلمانون کی تعلیم کا کوئی اہم اور ضروری پہلو چھوٹنے نہین پایا ہے، اور ملکی و ملی اور مذہبی ہر نقطۂ نظر سے تعلیم کے تمام اجزاء و عناصر اور تعلیم سے متعلق دوسرے ضروری مسائل پر بڑی سنجیدگی اور اعتدال و توازن کے ساتھ بحث کی گئی ہے، اور نصاب مین ان سب کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، یہ کتاب مسلمانون کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب، اساتذہ، آزادی پسند نوجوان طلبہ اور ان کے غلط بین والدین سب کے مطالعہ کے لائق ہے، اگرچہ یہ کتاب مسلمانون کی تعلیم پر لکھی گئی ہے لیکن بیشتر تعلیمی مسائل ہندو مسلمان دونون کے مشترکہ ہین، اس لئے یہ کتاب دونون قومون کے لئے مفید ہے گو یہ ایک مختصر رسالہ ہے، لیکن اپنے مغز کے اعتبار سے طویل کتابون سے بھی بہتر ہے،

روح القرآن، مولفہ جناب فیروز الدین خان تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ؎۱۲ پتہ ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور،

اس کتاب کا مقصد مسلمانون مین اسلامی امارت اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی تبلیغ ہے، تمہید مین مصنف نے توحید، یومِ آخرت، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مقصد، کلامِ مجید کی اہمیت و ضرورت، اس کے آخر الکتب ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کے مسائل پر مختصر روشنی ڈالی ہے، اس کے بعد عقائد، عبادات، اخلاق و معاملات اور انسانی معاشرت کے دوسرے مسائل اور حکومت کے بارہ مین کلامِ مجید کے احکام و تعلیمات اور اس کے اوامر و نواہی کی آیات کا ترجمہ پیش کیا ہے، اور سیرتِ نبوی اور سیرتِ خلفائے راشدین اور ان دونون زمانون کے واقعات سے اسلامی تعلیمات کے اثرات و نتائج دکھائے ہین اور اسلامی حکومت

کا نصب العین بتا کر قرآن پاک سے مسلمانوں کی غفلت دکھائی ہے، اور مسلمانوں کی تنظیم اسلامی امارت کی مذہبی اہمیت واضح کرکے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعتِ اسلامیہ مین شامل ہونے کی ترغیب دی ہے، ان مباحث کے ضمن مین اور بھی بہت سے مفید مذہبی معلومات آگئے ہین، اس کتاب میں کلام مجید کی بہت سی تعلیمات یکجا کردی گئی ہین، اس لئے عام مسلمانون کے لئے مفید ہے، لیکن غالباً مصنف نے کتاب کی ترتیب مین اصل عربی ماخذون کے بجائے زیادہ تر اردو تصانیف سے مدد لی ہے، اس لئے اون کی نگاہ سے بہت سے تاریخی گوشے مخفی رہ گئے ہیں جس کا اندازہ کتاب کے بعض مندرجات سے ہوتا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہین "ابوذر ایک متمول صحابی تھے، (ص ۸۰) جو صحیح نہین ہے، حضرت ابوذر غفاریؓ تو سرمایہ داری کے سخت خلاف تھے، وہ کل کے لئے کچھ اٹھا رکھنا گناہ سمجھتے تھے، اور عمر بھر اس کی تبلیغ کرتے رہے، اس سلسلہ میں مؤلف نے غلامون کی تحقیر اور ان کو مارنے کا جو واقعہ ان کی جانب منسوب کیا ہو وہ بھی ان کی مساوات پسندی سے بعید ہے، معلوم نہین کہان سے نقل کیا ہے، حضرت ابوذر غفاریؓ تو غلامون کے ساتھ کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہ رکھتے تھے، جو خود کھاتے اور پہنتے تھے، وہی غلامون کو کھلاتے اور پہناتے تھے، یا ایک مقام پر لکھتے ہین "۹۹ھ میں ایک شخص عمر بن عبد العزیز کو مسلمانون نے خلیفہ منتخب کیا" اس اندازِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی جلالتِ شان سے ناواقف ہین، اس قسم کی بعض اور فروگذاشتین بھی ہین لیکن ان سے قطع نظر کتاب عام مسلمانون کیلئے مفید ہو، اس کا بڑا حصہ دار المصنفین کی سیرۃ النبی اور سیر الصحابہ سے ماخوذ ہے،

الف لیلۃ ولیلۃ حصہ سوم، مترجمہ ڈاکٹر ابو الحسن منصور احمد صاحب مرحوم سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈہ، تقطیع بڑی ضخامت ۷۵۵ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد غیر مجلد للعہ پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند دہلی،

الف لیلہ عربی کی اتنی مشہور و مقبول کتاب ہے کہ اس کا ترجمہ تقریباً دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانون مین

ہو چکا ہے، اردو مین بھی عرصہ ہوا، اس کا ترجمہ ہوا تھا، لیکن غالباً مکمل نہین ہے، دوسرے پرانا ہونے کی وجہ سے جدید مذاق کے مطابق نہین ہے، اس لئے مترجم مرحوم نے دوبارہ اس کا ترجمہ کیا تھا، اس کے دو حصے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہین، یہ تیسرا حصہ ہے، اس مین دوسو بیسوین رات سے چارسو اکسٹھوین رات تک کی حکایات ہین، ترجمہ کی صحت کا پورا اندازہ تو اصل سے مطابق کے بعد ہی ہو سکتا ہے لیکن مترجم مرحوم عربی کے فاضل تھے، اس لئے امید یہی ہے کہ ترجمہ صحیح ہوگا، ترجمہ کی عبارت سے مترجم کی احتیاط پوری طرح ظاہر ہے، امید ہے کہ یہ ترجمہ مقبول ہوگا،

تذکرہ دار العلوم از جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت مدرسہ حبیب کمپنی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن،

ہندوستان کی سب سے قدیم درس گاہ حیدرآباد دکا مدرسہ دار العلوم تھا، جس نے اب جامعہ عثمانیہ کی شکل اختیار کر لی ہے، یہ دار العلوم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء مین قائم ہوا، سنہ ہجری کے حساب سے اس کے قیام کو نوّے سال ہو چکے، اس لئے گذشتہ سال اوس کی ۹۰ سالہ جوبلی منائی گئی تھی، اس طویل مدت مین دار العلوم پر مد وجزر، اور ترقی و تنزل کے مختلف دور گذرے، مصنف نے جوبلی کی یادگار مین اسکی ۹۰ سالہ سرگذشت قلمبند کی ہے، حیدرآباد مین یہ دار العلوم تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تھا، اس لئے اس سرگذشت مین حیدرآباد کی پوری تعلیمی تاریخ آگئی ہے، آخر میں دار العلوم کے تعلیم یافتہ اشخاص کی علمی و مذہبی خدمات کا ذکر اور ممتاز و نامور اشخاص کے نام دیدیئے ہین،

چاند سورج کی چوری از جناب حیم حسن دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے قیمت ۸ر پتہ: نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی

یہ ایک جاسوسی افسانہ ہے جس مین ہیرونکی چوری اور اس کا انکشاف دکھایا گیا ہے، اس قسم کے افسانے عموماً دوسری زبانون سے ماخوذ ہوتے ہین، اس کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ مصنف کا طبعزاد ہے، اسکی تصدیق افسانہ کے پلاٹ سے بھی ہوتی ہے، اسمین پیچ اور حیرت انگیز واقعات کے بجای سادہ طریقہ سے واقعات کو بیان کر دیا گیا ہے تاہم افسانہ دلچسپی سے خالی نہین، "م"

جلد ۵۳ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۴ء عدد ۶

مضامین

موجودہ جنگ کے مصائب سے دنیا تنگ آچکی ہے اور بڑے بڑے عقلاء و مفکرین آیندہ لڑائیوں کے انسداد اور مخلوق کو اس کی تباہیوں سے بچانے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں، گو اس سلسلہ میں ابھی کوئی مترح اور متعین تجویز سامنے نہیں آئی ہے لیکن یقین ہے کہ اسی قسم کی کوئی مادی و سیاسی تدبیر ہوگی جیسی تدبیریں اس سے پہلے اختیار کی جاچکی ہیں اور جن کی ناکامی کا تجربہ ہوچکا ہے، ممکن ہے ان تدبیروں سے لڑائیوں کا درمیانی وقفہ کچھ زیادہ طویل ہوجائے لیکن ان سے ان کا انسداد ہونا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ یہ لڑائیاں نتیجہ ہیں مغربی تمدن کی بنیادی خرابی کا، جب تک اس کی اصلاح نہ ہوگی دنیا کو امن و سکون حاصل نہیں ہوسکتا، جو تمدن و نظام حیات خدائے واحد کے یقین اور مذہب و روحانیت کے تصور سے خالی ہو اور جس کی بنیاد تمام تر مادیت پر ہو اس کا لازمی نتیجہ خود غرضی اور فساد فی الارض ہے، صرف زبان سے خدا کا نام لے لینا اور کسی مذہب کی جانب انتساب کافی نہیں ہے، جب تک اعمال میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو، انسانی فطرت خود غرض اور نفس پرست واقع ہوئی ہے، اس کو روکنے والی چند چیزیں ہیں کسی اعلیٰ و برتر اور دانا و بینا ذات اور غالب و عادل قوت کا یقین، اعمال کے دنیوی یا اُخروی محاسبہ و مواخذہ کا خوف، ذاتی اخلاقی احساس و شرافت انسانی کا جذبہ، ان کے علاوہ دنیا کی کوئی اور طاقت انسانوں کو عالمگیر نظام اخلاق اور شرافت انسانی کے ضابطوں کا پابند نہیں بناسکتی، فطری صالح اشخاص کے وجود اور ان کے انفرادی اخلاقی احساس سے انکار نہیں، ایسے اشخاص ہر قوم میں پائے جاتے ہیں، لیکن من حیث القوم

مغربی قومیں اس احساس سے بالکل بے گانہ ہیں اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنی قوم کے ساتھ جن کی ضابطہ کی پابندی ضرب المثل ہے وہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں سب سے بڑی قانون شکن بنجاتی ہیں،

درحقیقت زندگی کے بارہ میں موجودہ تمدن کے خالص مادی تصور کے ساتھ عالمگیر اخلاقی احساس کا اجتماع ہو ہی نہیں سکتا، اس تصور نے مذہب وروحانیت سے قطع نظر خالص اخلاقی قدروں کو بھی ختم اور محدود قومیت ووطنیت نے عالمگیر انسانی اخوت وہمدردی کا جذبہ بالکل سرد کردیا ہے، اور اپنی سیاسی سربلندی، اقتصادی برتری، ذاتی منفعت، تعیش کے زیادہ سے زیادہ وسائل کی فراہمی اور ان سے لذت اندوزی ہر قوم کا نصب العین بن گیا ہے، ان مقاصد کا لازمی نتیجہ خود غرضی، رشک و رقابت، اور جنگ وخونریزی ہے، اس لئے کہ ذاتی تفوق وبرتری اور غیر محدود تعیش میں اخلاقی احساس، عالمگیر انسانی اخوت اور دوسروں کے حقوق کی گنجایش کہاں، چنانچہ اس تمدن کے پُرفخر کارنامے، علم وسائنس کی حیرت انگیز ترقی، مشینی صنعت وحرفت وتجارت کا غیر معمولی فروغ، مصنوعات کا تنوع اور ان کی کثرت اور تعیش کے سامانوں کی فراوانی ہی جنگ وخونریزی کا سبب بن گئے ہیں، جو قوم ان اسباب و وسائل کے لحاظ سے ترقی کے جتنے ہی بلند درجہ پر ہوگی، اتنے ہی وہ اپنی برتری کے قیام اور جلب منفعت کے لئے دوسری قوموں کے حقوق کی پامالی پر مجبور ہوگی، جس کا لازمی نتیجہ جنگ وخونریزی ہے، اس لئے جب تک اس بنیادی خرابی کی اصلاح نہ ہوگی، اسوقت تک دنیا کو جنگ وبدامنی سے نجات نہیں مل سکتی،

بہت سی قدیم قومیں جو اپنے دور کی تمدنی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر تھیں، اس مادی تصور حیات اور عیش پرستی کی بدولت تباہ ہوچکی ہیں، کیا عجب ہے کہ آج بھی تاریخ اسی عبرت آموز سبق کو دہرا رہی ہو، اس لئے اگر یورپ کو

اپنی بقا منظور ہے تو اس کو اپنا تصور حیات بدلنا پڑے گا، اور خدا کے برحق قانون کے سامنے سرِ خم کرنا پڑے گا، ورنہ گذشتہ قوموں کی طرح اس کی تاریخ بھی فسانۂ عبرت بن جائیگی، یہ محض خوش اعتقادی ہے کہ ایسا عالمگیر اور عظیم الشان تمدن تباہ نہیں ہو سکتا، روما کے دورِ عروج میں کون اس کے زوال کا یقین کر سکتا تھا، قوموں کی بقا و فنا ان کے اعمال پر موقوف ہے، اور اس کا فیصلہ مستقبل کرتا ہے، تباہی کے معنی محض بے نام و نشان ہی ہو جانے کے نہیں ہیں، انسانی فلاح و سعادت کے بارہ میں کسی تمدن کی ناکامی بھی درحقیقت اس کی تباہی ہے، اس تمدن کی ناکامی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ جو دنیا کو جنت ارضی بنا دینے کا مدعی تھا وہ آج اس کو جہنم بنا رہا ہے، خود یورپ کے مذہبی اور روحانی حلقوں سے اس مادہ پرستی کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی ہیں لیکن سیاست کے نقار خانہ میں چرچ کے طوطیوں کی آواز کون سنتا ہے،

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے اپنی چھوٹی عمر میں اردو زبان کی جو گوناگوں اور متنوع خدمات انجام دی ہیں اسکی مثال دوسرے اداروں میں مشکل سے ملیگی، اب اس کے نوجوان اور بلند ہمت کارکنوں نے سارے ہندوستان میں اردو کی خدمت کیلئے ایک وسیع نظام کی ترتیب و قیام کی جانب قدم بڑھایا ہے، اور اس سلسلہ میں ۲۱، ۲۲، ۲۳ جولائی ۱۹۴۴ء کو حیدرآباد میں ایک آل انڈیا اردو کانگریس منعقد کی ہے اور اردو کے تمام بہی خواہوں، خدمتگذاروں اور ہندوستان کے ممتاز اہل علم اور اصحاب قلم کو اس میں شرکت کی دعوت دی ہے، ادارۂ ادبیات اردو ایک عملی اور کارکن ادارہ ہے، اسلئے یقین ہے کہ یہ کانگریس عملی نتائج کے اعتبار سے بھی نتیجہ خیز ہوگی، اردو کے بہی خواہوں کو اپنی شرکت اور مفید مشوروں سے اس کو کامیاب بنانا چاہئے، شمالی ہند میں اس مقصد کے لئے انجمن ترقی اردو موجود ہے، اور اس کے کہن سال لیکن جوان ہمت بزرگ جس ہمت و استقلال کے ساتھ اس کام میں منہمک ہیں وہ نوجوانوں کے لئے باعث رشک ہے، اس قطب شمالی کے ساتھ قطب جنوبی کی حرکت بھی مفید ہوگی اور امید ہے کہ ان دونوں کے اتحاد و اشتراک عمل سے کرۂ اردو کی رفتار میں اور تیزی پیدا ہوگی،

مقالات

سلسلۂ شاہ ولی اللہ کی خدمت حدیث

از مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی

(۲)

قطب الارشاد مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ (ف ۱۳۲۳ھ)

امام وقت ابو حنیفۂ عصر امیر المومنین فی الحدیث تھے، شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی سے حدیث پڑھی، اور درس حدیث نبوی کے لئے اپنی زندگی کو وقف کردیا، صدہا علماء نے آپ سے سند حدیث حاصل کی، جبتک بینائی قائم رہی، ہر سال دورۂ حدیث پورا کرتے تھے، جملہ صحاح ستہ پر آپ کی تقریریں ضبط کی گئی ہیں، جن میں سے الکوکب الدری ترمذی پر دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، جو آپ کے اجل تلامذہ مولانا شیخ محمد یحییٰؒ کاندھلوی کی ضبط کردہ اور ان کے صاحبزادہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا استاذ حدیث مظاہر علوم سہارنپور کے تحشیہ کے ساتھ مزین ہے، ایک اور تقریر اردو میں النفخ الشذی کے نام سے شائع ہوئی ہے، آپ کی تقریریں تمام صحاح پر عربی، فارسی، اردو میں مولانا امان اللہ خان صاحب، اور مولانا سعد الدین خان صاحب کے پاس محفوظ ہیں، خدا کرے اون کی اشاعت کا انتظام ہو جائے،

حضرت محدث گنگوہی کی تقاریر حدیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کو شرح معانی حدیث اور تطبیق متعارضات کا خداداد ملکہ عطا ہوا تھا، عدد رکعات تراویح اور قرأت خلف الامام کے متعلق آپ نے مستقل رسالے بھی تالیف فرمائے، لطائف رشیدیہ میں بعض مشکل احادیث کا عجیب و غریب حل فرمایا ہے، جن کو دیکھکر یہ ماننا پڑتا ہے کہ فیوض ولی اللٰہی سے اللہ تعالیٰ نے بہت اعلیٰ حصہ آپ کو عطا فرمایا تھا،

کتب حدیث کی تلاش کا آپ کو بہت اہتمام تھا، سنن بیہقی کا نسخہ بڑی کوشش سے نقل کرا کے حاصل کیا" (جواب حیدر آباد میں مکمل طبع ہو گئی ہے)

مولانا کی اولیات میں سے یہ ہے کہ دورۂ حدیث میں ترمذی شریف کو مقدم کرتے تھے، کیونکہ موطا امام مالک اگرچہ اولیت اور فضیلت کے اعتبار سے سب پر مقدم ہے مگر صناعت حدیث میں ترمذی کا مقام بہت بلند ہے، امام ترمذی ہر حدیث پر جرحاً و تعدیلاً کلام کرتے ہیں، وجوہ علل سے خوب بحث کرتے ہیں جن کو سمجھ لینے کے بعد طالب علم کو فن حدیث سے پوری مناسبت ہو جاتی ہے، وہ ہر باب میں ایک دو حدیث روایت کر کے اوسی باب کی دوسری احادیث کی جانب اشارہ بھی کر دیتے ہیں، جس پر تحقیق کے ساتھ کام کرنے سے طالب علم کو وسعت نظر حاصل ہو جاتی ہے، ابواب الاحکام کے ہر باب میں اقوال فقہاء و مذاہب صحابہؓ و تابعین بھی بیان کر جاتے ہیں جس کا جاننا مقلد اور مجتہد دونوں کو ضروری ہے، ترمذی کو سمجھ کر پڑھ لینے کے بعد ہی طالب علم کو بخاری کے لطائف اسناد اور تراجم ابواب کی خوبیاں نظر آسکتی ہیں، اس لئے بخاری کا درس ترمذی کے بعد ہوتا تھا، مگر ترمذی کی تقدیم کا یہ مطلب نہ تھا کہ موطا امام مالک سے بے اعتنائی کیجائے جیسا آج کل عموماً ہمارے مدارس میں مشاہدہ ہے، مقام شکر ہے کہ اب ہمارے نوجوان شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے موطا امام مالک کی ضخیم شرح بنام اوجز المسالک تصنیف کر کے سنت ولی اللہی کو پھر زندہ کر دیا ہے، اب علما و طلبہ کو موطائے امام مالک پر کچھ ہی توجہ ہونے لگی ہے، جو سلسلۂ ولی اللہی کو ہونا چاہئے،

مولانا احمد حسن محدث امروہی متوفی ۱۳۳۰ھ مولانا محمد قاسم صاحب کے تلامذہ میں بہت زیادہ ذکی اور استاد کے نور نظر تھے درس حدیث کے لئے زندگی وقف کر دی تھی، استاد کی تقریریں آپ کو بہت محفوظ تھیں، اسی لئے آپ کا درس حدیث بہت مشہور تھا، آپ کے تلامذہ کے پاس وہ تقریریں محفوظ ہیں۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب محدث کاندھلوی ف ۱۳۳۴ھ مولانا گنگوہی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، آخری دورۂ حدیث حضرت نے آپ ہی کی وجہ سے پڑھایا، آپ نے مولانا گنگوہی کی تمام صحاح پر تقاریر درس

کو بڑی قابلیت وضبط واتقان سے محفوظ فرمایا ہے، مدرسۂ مظاہر علوم سہارنپور مین حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی جگہ سالہا درس حدیث دیتے رہے، بہت علما آپ سے فیضیاب ہوئے، اس ناچیز کو بھی شرف تلمذ حاصل ہے، فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ نے مجھے چار نعمتین عطا فرمائی ہین جن سے مجھے اپنی مغفرت اور کامیابی کی قوی امید ہے، (۱) محبت شیخ وخدمت شیخ (۲) محبت قرآن وسجود (۳) محبت رسول (۴) شغف حدیث مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی حیات ہی مین آپ کا سہارنپور مین انتقال ہوگیا، تغمدہ اللہ برحمتہ ورضوانہ آپ کے بعد آپکے صاحبزادے مولوی محمد زکریا صاحب سلمہ جو الولد سر لابیہ کے پورے مصداق ہین، تالیف بذل المجہود مین مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے قوت بازو بنے، اور اب اپنے والد اور شیخ کی جگہ مدرسہ مظاہر علوم مین شیخ الحدیث ہین اطال اللہ بقاءہ آمین۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ محدث دیوبند (ف ۱۳۳۹ھ)

آپ مولانا محمد قاسم صاحب کے اجل تلامذہ مین سے ہین، مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم کے بعد آپ کو صدر مدرس دارالعلوم بنایا گیا، آپ سے بیشمار علما نے حدیث پڑھی، اور سند حاصل کی، ترمذی پر آپ کی تقریر طبع ہوچکی ہے، ابوداؤد شریف پر بھی آپ کا حاشیہ ہے، دارالعلوم دیوبند کے فارغین کے پاس آپ کی وہ تقریرین محفوظ ہین، جو صحاح ستہ کے درس مین آپ نے بیان فرمائین، جن سے آپ کی شان تحقیق ظاہر وباہر ہے، رسالۂ عظمت وحی جو حدیث بدء الوحی کی شرح ہے، اور شرح تراجم ابواب بخاری آپ کی حدیث دانی کی کافی دلیل ہے، آپ کا علم بڑا عمیق تھا جس پر الادلہ وایضاح الادلہ واحسن القریٰ شاہد عدل ہے، آپکے زمانہ مین دارالعلوم دیوبند کو بہت زیادہ ترقی ہوئی جس کو عظیم الشان جلسۂ دستاربندی ۱۳۲۸ھ نے دنیا کے سامنے آفتاب کی طرح روشن کردیا تھا،

شیخ وقت حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری مہاجر مدنی (ف ۱۳۴۶ھ)

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

حضرت مولانا اپنے وقت مین محدث عالی الاسناد وفقیہ الوقت قطب الارشاد رئیس الاذکیا راس المناظرین تھے،

روحانی قوت بھی بہت زبردست تھی، آپ نے علم حدیث حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی سے حاصل کیا تھا جو مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپور کے بعد مدرسۂ مظاہر علوم کے صدر مدرس تھے، مولانا محمد مظہر صاحب نے استاذ الکل مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی اور صدر الصدور مولانا صدر الدین دہلوی اور مولانا رشید الدین دہلوی سے جملہ علوم حاصل کئے، اور بخاری شریف شاہ اسحاق صاحب سے پڑھی، پھر مولانا خلیل احمد صاحب نے قیام بھوپال مین حضرت مولانا عبد القیوم بھوپالی سے بھی دوبارہ بخاری شریف، شمائل ترمذی اور کچھ حصہ مسلم شریف کا اور مسلسلات شاہ ولی اللہ اور نوادر و درثمین پڑھکر جملہ کتب حدیث کی اجازت حاصل کی، آخر کی ان تین کتابون کی سند متصل اس زمانہ مین بجز مولانا کے کسی کے پاس نہ تھی، اس لئے علماء جوق جوق مولانا کے پاس آتے، اور ان کتابون کی سند حاصل کرتے تھے، پھر اسی سال ۱۲۹۳ھ مین حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور مکہ مکرمہ مین مولانا الشیخ احمد دحلان مفتی شافعیہ سے روایت و اجازت حدیث حاصل کی، اور مدینہ منورہ مین محدث دار الہجرت مولانا شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی کو جملہ کتب حدیث کے اوائل سناکر اجازت حاصل کی اور مسلسل باجابۃ الدعا رنی الملتزم کی اجازت بالتفصیل حاصل کی، پھر ۱۳۲۳ھ مین جب تیسری بار زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوے تو مولانا السید احمد برزنجی مفتی الشافعیہ سے سند حدیث حاصل کی، اس وقت یہ ناکارہ بھی حضرت مولانا کے ہمراہ تھا، پھر ۱۳۲۹ھ میں مولانا السید بدر الدین محدث شام سے جو امام نووی کے مشہور دار الحدیث کے صدر نشین اور نہایت متبع سنت مرجع العلماء بزرگ تھے بذریعہ خط کے سند حدیث حاصل کی، اس سے حضرت مولانا کا شغف بالحدیث بخوبی واضح ہے، آپ اپنے استاذ مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کے بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے صدر مدرس مقرر ہوئے، اور ساری عمر درس حدیث و تفسیر و فقہ مین گذری، آخر عمر مین بذل المجہود سنن ابی داؤد کی شرح پانچ ضخیم جلدون مین تصنیف فرمائی، اس کی تالیف ۱۳۳۵ھ مین شروع ہوئی، اور شعبان ۱۳۴۵ھ مین مدینہ منورہ مین تمام ہوئی، اور اس خوشی مین مدینہ منورہ کے اعیان و علما کو دعوت دیگئی جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ختم فتح الباری کے وقت مصر مین

شاندار ولیمہ کیا تھا، اس کتاب کے ختم کے بعد ہی آخر رمضان میں حضرت مولانا پر فالج کا اثر شروع ہوگیا، اور ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو بقیع الغرقد میں قبور اہلِ بیت کے قریب دفن ہوئے، جو آپ کی دیرینہ تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ موت مدینہ اور جوار رسول عطا فرمائے، چنانچہ عطا کیا گیا،

تو چنین خواہی خدا خواہد چنین

می دہد یزداں مرادِ متقین "

بذل المجہود میں کیا ہے، اوس کو علماء خود سمجھ سکتے ہیں، مگر نمونہ کے طور پر چند باتیں عرض کر دیتا ہوں (۱) کوئی بات اوس وقت تک نہیں لکھی گئی جب تک متقدمین کے کلام میں اس کی تائید نہ مل گئی (۲) مذہب حنفی کی پوری تحقیق اور کافی دلائل بیان کیے گئے، دوسرے مذاہب کے دلائل کا جواب بھی نہایت تحقیق سے دیا گیا (۳) ہر راوی کے متعلق پوری جرح و تعدیل صناعتِ حدیث کے موافق کی گئی (۴) جو روایات ابوداؤد میں معلق تھیں، ان کا دوسری کتابوں سے متصل ہونا ظاہر کیا گیا (۵) جو روایات ابوداؤد میں مختصر تھیں، ان کو دوسری کتابوں سے جہاں مفصل ہیں، مکمل طور سے بیان کیا گیا یا حوالہ دیدیا گیا، (۶) حدیث رسول کا منشا ظاہر کرکے وہ محاسن و حقائق بیان کئے گئے جن کا حظ فن داں محدث ہی اٹھا سکتا ہے (۷) بعض مقامات کو حضرت نے اول اپنی فہم کے مطابق املا کرایا، پھر خواب میں تنبیہ ہوئی کہ فلاں مضمون کو اس طرح نہیں بلکہ اس طرح لکھنا چاہئے، بیدار ہو کر کتابوں سے مراجعت کی گئی تو معلوم ہوا کہ خواب صحیح تھا، پھر اس مقام کو صحیح طور سے لکھا گیا، غرض اس کتاب کی تالیف میں تائید غیبی مولانا کی شاملِ حال تھی، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ و رفعہ فی اعلیٰ علیین درجتہ وکرامتہ آمین،

حضرت مولانا کو حدیث کی نادر قلمی کتابیں جمع کرنے کا بہت شغف تھا، ابوداؤد کی شرح ابن رسلان جو بہترین شرح ہے، مکہ معظمہ میں دستیاب ہوئی تو اوس کی نقل کراکر تالیف بذل المجہود میں اوس سے مدد لی، مصنف عبدالرزاق کی ایک جلد مدینہ منورہ میں ملی، اوس کی نقل کرائی، پھر کتب خانہ سندھ میں دوسری

جلد کا پتہ لگا، تو اوس کو نقل کرایا، جمع الفوائد مجموعہ جامع الاصول و مجمع الزوائد کا نسخہ مولانا عاشق الٰہی صاحب کو دستیاب ہوا، تو حضرت نے اس کے طبع کا حکم فرمایا، چنانچہ طبع ہو کر علماء کے ہاتھون مین پہنچ گئی،

حافظ حدیث بحر العلوم مولانا سید انور شاہ کشمیری (ف ۱۳۵۲ھ)

آپ حضرت شیخ الہند کے جانشین اور مسند حدیث دار العلوم دیوبند کی زینت تھے اخیر عمر مین چند سال جامعہ ڈابھیل ضلع سورت کے بھی شیخ الحدیث رہے، آپکی قوت حافظہ کو دیکھ کر اسلاف محدثین کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، درس کے وقت روایات و تحقیقات کا سمندر جوش مارتا ہوا نظر آتا تھا، ایک دفعہ اس ناکارہ نے مولانا کی بیاض پر ایک نظر ڈالی جس مین بطور یادداشت کے مولانا کچھ نوٹ کر لیا کرتے تھے، مین حیرت زدہ ہو کر رہ گیا، کہ ایک ایک مسئلہ کے لئے مختلف کتابون کے متعدد صفحات کا حوالہ درج تھا، جو مولانا کے کثرت مطالعہ اور وسعت نظر کی روشن دلیل تھی، کمال یہ کہ وہ یادداشتین صرف کتاب ہی مین نہ تھین، بلکہ دماغ مین بھی محفوظ تھین، اور درس کے وقت ان کے حوالہ سے عجیب و غریب تحقیقات بیان ہوتی تھین، آپ کی امالی مین سے فیض الباری چار ضخیم جلدون مین مصر مین طبع ہوئی ہے، یہ بخاری شریف کے درس کی تقریر ہے، جو آپ کے بعض تلامذہ نے ضبط کی تھی، جامع ترمذی کی تقریر العرف الشذی دو جلدون مین ہے، ابوداؤد کی تقریر بھی دو جلدون مین ہے، سنن ابن ماجہ پر بھی آپ کا حاشیہ ہے، قراءۃ فاتحہ خلف الامام، اور صلوٰۃ الوتر اور رفع الیدین پر الگ الگ مستقل رسالے تصنیف فرمائے ہین جن کو دیکھکر آپکے تبحر علمی اور حفظ حدیث اور وسعت نظر کی داد دینی پڑتی ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کتب نادرۂ علم حدیث و فقہ کے حاصل کرنے کا مولانا کو بڑا اہتمام تھا، معانی الآثار طحاوی کے رجال مین کتاب کشف الاستار بڑی محنت سے نقل کرائی، جو طبع ہو گئی ہے، کتب خانہ دار العلوم دیوبند مین بہت کتابین آپ کی محنت و طلب سے داخل ہوئین،

محدث بنگال مولانا محمد اسحٰق صاحب بردوانی (ف ۱۳۵۷ھ)

آپ مولانا حکیم الامت تھانوی کے اجل تلامذہ سے تھے، حضرت حکیم الامۃ کی جگہ مدرسہ جامع العلوم کانپور مین ۲۵ سال تک درس حدیث و فقہ

وتفسیر دیا، آپ کا حافظہ بڑا عجیب تھا، تلاوت قرآن کی طرح بخاری شریف کا ایک پارہ تلاوت کرنے کا روزانہ معمول تھا، گویا اس زمانہ مین بخاری شریف کے حافظ تھے، ایک نجدی عالم نے مکہ معظمہ مین بعض مسائل مین آپ سے گفتگو کی، اثناے کلام مین ایک حدیث کی بابت مولانا سے دریافت کیا، کہ یہ حدیث بخاری مین کتنی جگہ آئی ہے، مولانا نے برجستہ جواب دیا، کہ چھ جگہ آئی ہے، نجدی عالم اس جواب سے متحیر ہو کر کہنے لگا، مجھے خبر نہ تھی کہ ہندوستان مین بھی حدیث کے حافظ موجود ہین، مولانا نے موطا امام مالک کی شرح عربی مین لکھنی شروع کی تھی، دو چار صفحہ کی شرح ۱۲۵ صفحات مین لکھی گئی، مگر افسوس ہے پوری نہ ہوئی ورنہ عجائب روزگار سے ہوتی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ،

حکیم الامت مجدد ملت مولانا محمد اشرف علی صاحب محدث تھانوی نور اللہ مرقدہ (ف ۱۳۶۲ھ)	وہ حکیم امت مصطفےٰ وہ مجدد طرق ہدیٰ ؛ وہ جو بانٹتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے اشرف علی مدار تقا شمس المعارف والتقی ؛ جو عمل سر اپنے نمونہ عمل صحابہ دکھا گئے

اسلامیان ہند کی یہ بزرگ ہستی ابھی چار مہینے پہلے ہماری نظرون کے سامنے تھی، اور ہمین فخر تھا کہ اگر کوئی ہم سے یہ پوچھتا کہ اس وقت مسلمانون مین سلف کا نمونہ کون ہے ؟ تو ہم یہ کہہ سکتے تھے، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا نے ایک قدم بھی خلاف شریعت نہین اوٹھایا، آپنے صرف اللہ پر نظر رکھکر کام کیا، کسی والیہ ریاست یا سلطان ولایت پر کسی وقت نظر نہین کی، آپ کی آٹھ سو کتابون اور ہزارہا خطوط مین جو مردون کے نام بھی ہین اور عورتون کے بھی، کوئی بات ایسی نہین پیش کی جا سکتی جس کو پڑھتے ہوے تہذیب کے چہرہ پر جھینپ کے آثار نمودار ہون[1]،

مولانا ابتداے عمر ہی سے جب کہ اٹھارہ سال کی عمر تھی، مصنف تھے، اور آخر عمر تک مصنف رہے، ایسا مصنف جس نے تقریبًا ہر علم مین تصنیف کی ہو، اور اتنی کثیر مقدار مین کتابین لکھی ہون، امام سیوطی کے بعد

---

[1] مسائل مخصوصۂ زنان اور مسائل طبیہ کو رہنے دیجئے کہ وہ عورتون کے مطالعہ کے لئے ہین، درس و تدریس کے لئے نہین ہین، اور انکی ضرورت سے کسی طرح انکار نہین ہو سکتا، پھر وہ مولانا کی تصنیف نہین ہین، بلکہ ان کے شاگردون کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں'

مولانا کے سوا نہین دیکھا گیا، وعظ اور خوش بیانی مین تو بے نظیر تھے ہی، کہ جس جلسہ مین تقریر کو کھڑے ہوئے پھر کسی کی تقریر سامعین کو پسند نہ آتی تھی" مولانا نے اپنی تصانیف سے دنیوی نفع کبھی حاصل نہین کیا، نہ کسی کتاب کا حقِ تصنیف کسی سے لیا، تمام کتابین اللہ کے لئے اور اصلاحِ امت کے لئے لکھین، اور ہر شخص کو چھاپنے کی اجازت دیدی،

مین اس وقت صرف آپ کی خدمتِ حدیث پر روشنی ڈالنا چاہتا ہون، کیونکہ عام طور پر مسلمان آپ کو ایک صوفی، عالم، مفسر، فقیہ، واعظ کی حیثیت ہی سے پہچانتے ہین، حالانکہ خدمتِ حدیث بھی اس زمانہ مین آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے، جو آپکے تاجِ مجددیت کا درخشان گوہر ہے، آپنے علم حدیث کی باقاعدہ سند ملا محمود دیوبندی اور مولینا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، اور مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند سے حاصل کی، ملا محمود صاحب اور مولینا محمد یعقوب صاحب نے شاہ عبد الغنی صاحب سے حدیث پڑھی، اور مولانا محمود حسن صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحب سے،

حضرت حکیم الامۃ کو قاری عبد الرحمن صاحب محدث پانی پتی سے بھی سند حدیث حاصل ہے، اور مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب سے بھی بعض کتب حدیث پڑھکر سند حاصل کی ہے، پندرہ برس تک مدرسہ جامع العلوم کانپور مین باقاعدہ حدیث کا درس دیا، اور آپکے شاگردون مین بکثرت محدث پیدا ہوئے، جن مین مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سب سے زیادہ روشن ہے،

حضرت مولانا حکیم الامت نے ۱۳۱۵ھ مین توکلاً علی اللہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون مین قیام فرمایا، اس وقت سے باقاعدہ درسِ حدیث کا سلسلہ ملتوی ہوگیا، اور ہمہ تن تزکیہ و تربیتِ قلوب و اصلاحِ امت مین مشغول ہوگئے، مگر علماء اس مدت مین بھی آپ سے حدیث کی سند حاصل کرتے رہے، علامہ محقق محمد زاہد کوثری مصری نے جو مصر کے اجلۂ علماء محققین و مصنفین سے ہین، بذریعہ خط کے حضرت سے حدیث کی سند حاصل کی، اسانیدِ حدیث مین مولانا کا رسالہ السبعۃ السیارہ طبع ہوچکا ہے، ترمذی پر آپ کا حاشیہ الثواب الجلی بھی طبع

ہو چکا ہے، دوسرا حاشیہ المسک الذکی بصورت مسودہ مکمل ہے، ایک چہل حدیث بھی طبع ہو چکی ہے، جس مین مسلم شریف سے چالیس حدیثین نسخۂ ہمام کی جمع کی گئی ہین، جن کو معمر، ہمام بن منبہ سے وہ ابو ہریرہ سے اور ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہین، سب حدیثون کی سند ایک ہی ہے، مولانا کے مواعظ و رسائل مین میرے اندازہ مین پانچ ہزار حدیثون سے کم نہین جن کی شرح کرکے امت کو تبلیغ کی گئی ہے،

۱۳۳۰ھ مین آپ کو دلائل حدیثیہ للحنفیہ کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا، تو جامع الآثار اور تابع الآثار دو رسالے تصنیف فرمائے، جن مین ابواب الصلوٰۃ تک وہ حدیثیں جمع کی گئین جو حنفیہ کی دلیل ہین، پھر تمام ابواب کے دلائل کا استیعاب کرنا چاہا اور احیاء السنن کے نام سے ضخیم کتاب ابواب الحج تک تالیف فرمائی مگر جس عالم کو اس پر نظرِ ثانی کے لئے متعین کیا گیا تھا، اوس نے اپنی رائے سے اس مین اس قدر ترمیم و تنسیخ کردی، کہ مولانا کی تصنیف باقی نہ رہی، بلکہ مستقل کتاب ہوگئی، اس لئے اوس کی اشاعت ملتوی کردی گئی، اور حضرت کے منشاء کے موافق دوبارہ اس مہم کام کو انجام[1] دیا گیا، پندرہ سال سے کچھ زیادہ مدت مین ابواب الصلوٰۃ سے ابواب المیراث تک جملہ ابوابِ فقہیہ کے دلائلِ احکام حدیث سے جمع کر دیئے گئے،

یہ کتاب جس کا نام اعلاء السنن ہے، بیس جلدون مین تمام ہوئی ہے، ابتدا کی آٹھ جلدین حرفاً حرفاً حضرت حکیم الامۃ کی نظر سے گذر چکی ہین، بقیہ جلدون مین مشکل اور مہم مقامات حضرت کے سامنے پیش کئے گئے ہین، حضرت حکیم الامۃ کو اس کتاب کی تکمیل سے جسقدر مسرت ہوئی ہے، اوس کو لفظون سے بیان نہین کیا جاسکتا، فرماتے تھے، کہ اگر خانقاہ امدادیہ مین اعلاء السنن کے سوا اور کوئی کتاب بھی تصنیف نہ ہوتی، تو یہی کارنامہ اوس کا اتنا عظیم الشان ہے، کہ اسکی نظیر نہین مل سکتی، اس مین صرف حنفیہ ہی کے دلائلِ حدیثیہ نہین بلکہ متن کتاب مین

---

[1] قدر اللہ اتمامہ واکمالہ علی ید ھذا العبد الغریق فی الآثام اقل الانام ظفر احمد العثمانی التھانوی ولیس لی فیہ غیر الرسم والاسم والشیخ نور اللہ مرقدہ ھو الروح فی ھذا الجسم،

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　　آنچہ استاذ ازل گفت ہمان می گویم

احادیث مویدۂ حنفیہ ہین، اور حواشی مین بڑی تحقیق اور تفتیش سے جملہ احادیث احکام کے استیعاب کی کوشش کی گئی ہے، پھر غایت انصاف کے ساتھ محدثانہ وفقیہانہ اصول سے جملہ احادیث پر کلام کیا گیا ہے، کوشش کیگئی ہو کہ ہر مسئلہ مختلف فیہا مین حنفیہ کے سب اقوال کو تلاش کیا جائے، پھر جو قول حدیث کے موافق ہوا، اوسی کو مذہب حنفی قرار دیا گیا، تحقیق کامل کے بعد پورے وثوق سے کہا جاتا ہو کہ جس مسئلہ مین حنفیہ کا ایک قول حدیث کے خلاف ہوگا، تو دوسرا قول حدیث کے موافق ضرور ہوگا، یا کوئی حدیث یا آثار صحابہ اون کے قول کی تائید مین ہون گے۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ مسئلہ مصراۃ مین بھی امام ابوحنیفہ کا ایک قول حدیث صحیح کے بالکل موافق ہے، جس کو علامہ ابن حزم نے محلی مین روایت کیا ہے، اعلاء السنن مین تقلید جامد سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ تحقیق فی التقلید سے کام لیا گیا ہو، جس مسئلہ مین حنفیہ کی دلیل کمزور تھی، وہان صاف طور سے ضعف دلیل کا اعتراف کیا گیا، اور دوسرے مذاہب کی قوت کو تسلیم کیا گیا ہو،

جن حضرات کو مذہب حنفی پر مخالفت حدیث کا اعتراض ہے، وہ انصاف سے کام نہین لیتے، جس مذہب مین مرسل ومنقطع بھی حجت ہے، اور راوی مستور الحال کو قبول کیا گیا ہے، قول صحابی کو بھی قیاس سے مقدم مانا گیا ہے اوس سے زیادہ حدیث پر عمل کرنے والا کون ہوسکتا ہے، ؟ بات یہ ہے کہ خبر واحد کی تصحیح وتضعیف مین جس طرح باہم محدثین مین اصولی اختلاف ہے، اسی طرح حنفیہ کو بھی بعض مقامات مین محدثین سے اصولی اختلاف ہے، مثلاً حنفیہ کے نزدیک صحت خبر واحد کے لئے یہ بھی ضروری شرط ہے، کہ وہ اصول مشہورہ کے خلاف نہ ہو، اور یہ اصول قیاسی نہین، بلکہ نصوص قرآنی اور احادیث مشہورہ سے ماخوذ ہین، بعض علماے عصر نے حنفیہ کے کلام مین موافقت اصول کی شرط دیکھکر جو یہ دعوی کیا ہے، کہ حنفیہ روایت پر درایت کو مقدم کرتے ہین، یہ صحیح نہین ہے، حنفیہ کے نزدیک تو حدیث ضعیف اور مرسل بھی قیاس سے مقدم ہے وہ درایت کو روایت پر مقدم کیسے کرسکتے ہین ؟ حنفیہ کی مراد موافقت اصول سے اُن اصول کی موافقت ہے جو نصوص قرآنیہ اور سنت مشہورہ سے ماخوذ اور امت کے نزدیک مسلّم ہین، یہ اور بات ہے کہ یہ اصول درایت

قیاس کے موافق بھی ہین، مگر قیاس سے ماخوذ نہین، (ملاحظہ ہو ملفوظات عزیزیہ ص ۱۱۵ و ۱۱۶ طبع مجتبائی میرٹھ)
اس قاعدہ کی بنا پر حنفیہ بعض بعض دفعہ ضعیف حدیث کو صحیح حدیث پر مقدم کر دیتے ہین، کیونکہ ضعیف موافق اصول ہے، اور صحیح خلاف اصول، مگر وہ کسی حدیث کو رد نہین کرتے، بلکہ حدیث مرجوح کا بھی اچھا محمل بیان کر دیتے ہین، جس کی تائید حدیث کے تمام طرق کو جمع کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے، اسی طرح حنفیہ کے نزدیک آثار و اقوال صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سمجھنے مین بڑا دخل ہے، وہ ہر خبر واحد کو آثار صحابہ کی روشنی مین سمجھنے کی کوشش کرتے ہین، یہ ایک اجمالی اشارہ ہے جس کی تفصیل کے لئے اعلاء السنن کا مطالعہ کرنا چاہئے

اس کتاب کا مقدمہ بھی مستقل کتاب کی صورت مین الگ چھپ چکا ہے، جس مین حنفیہ کے اصول حدیث جمع کئے گئے ہین، اور ثابت کیا گیا ہے، کہ جن اصول مین حنفیہ عام محدثین سے منفرد ہین، ان مین بھی بعض محدثین ان کے موافق ہین، پھر مقدمۂ فتح الباری کی ایک طویل فصل کا خلاصہ لکھ کر ثابت کیا گیا ہے، کہ امام بخاری جیسا محدث بھی بعض دفعہ حنفیہ کے اصول پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے، پس جب تک حنفیہ کے اصول حدیث سے پوری واقفیت حاصل نہ ہو جائے، اس وقت تک اون کی کسی دلیل کو کسی محدث کے ضعیف کہنے سے ضعیف نہین کہا جا سکتا،

الحمد للہ اس کتاب کی تکمیل سے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی وہ بات پوری ہو گئی، جس کو اونھون نے فیوض الحرمین مین کبریت احمر و اکسیر اعظم بتلایا ہے،

قال عرفنی رسول اللہ صلی اللہ	فرماتے ہین کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
علیہ وسلم ان فی المذھب الحنفی	نے بتلایا ہے کہ مذہب حنفی مین ایک طریقہ بڑا
طریقۃ انیقۃ ھی اوفق الطرق	عمدہ ہے، جو اوس طریق سنت کے بہت زیادہ
بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت	موافق ہے، جو بخاری اور ان کے اصحاب کے
ونقحت فی زمان البخاری واصحابہ	زمانہ مین مدون اور منقح ہو چکا ہے وہ یہ کہ

وذلك ان يوخذ من اقوال الثلاثة قول اقربهم بها في المسئلة ثم بعد ذلك يتبع اختيارات الفقهاء الحنفيين الذين كانوا من اهل الحديث فرب شئ سكت عنه الثلاثة في الاصول وما تعرضوا لنفيه ودلت الاحاديث عليه فليس بد من اثباته والكل مذهب حنفي، اه

(ائمہ) ثلاثہ (ابو حنیفہ وابو یوسف ومحمد رحمہم اللہ) کے اقوال میں سے اوس قول کو لیا جائے جو اس مسئلہ میں سب سے زیادہ حدیث کے قریب ہو پھر ان فقہائے حنفیہ کے جو محدثین میں سے تھے اختیارات کا تتبع کیا جائے، کیونکہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن سے ائمہ ثلاثہ نے ظاہر روایت میں سکوت کیا ہے، اوران کی نفی سے تعرض نہیں کیا، اور احادیث اون پر دلالت کر رہی ہیں، تو ان کو ثابت ماننا ضروری ہے، اور یہ سب مذہب حنفی ہوگا، (مذہب سے خارج نہ ہوگا)

آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:-

وهذه الطريقة ان اتمها الله تعالى و اكملها فهي الكبريت الاحمر والاكسير الاعظم

(شاہ صاحب فرماتے ہیں) کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طریقہ کو پورا کردیں تو وہ کبریت احمر اور اکسیر اعظم ہوگا،

الحمدللہ یہ طریقہ، کبریت احمر واکسیر اعظم شاہ ولی اللہ صاحب ہی کے سلسلہ میں حضرت حکیم الامت مو تھانوی نوراللہ مرقدہ کے دورِ تجدید میں پورا ہوگیا، کیونکہ اعلاء السنن میں یہی کیا گیا ہے، کہ ائمہ ثلاثہ اور علما کے اقوال کا پورا تتبع کر کے جو قول حدیث کے زیادہ موافق ملا، اوسی کو مذہب قرار دیا گیا،

اس وقت تک اس کتاب کی گیارہ جلدیں طبع ہوچکی ہیں، نو جلدیں بصورتِ مسودہ رکھی ہوئی جن میں سے تین کی کاپی ہوچکی ہے، کاغذ کی گرانی کی وجہ سے طباعت میں تاخیر ہورہی ہے، حضرت حکیم ا کی جماعت کا خصوصاً اور تمام مسلمانوں کا عموماً فرض ہے کہ اس کتاب کی تکمیل طباعت میں پوری کوشش

علامہ محمد زاہد کوثری مصری نے اس کی دس جلدون پر نظر فرما کر اپنی طرف سے مفصل تقریظ جریدۃ الاسلام مصر مین شائع فرمائی ہے، جس کو دیکھکر اندازہ ہو سکتا ہو کہ بیرون ہند کے علما رنے اس کتاب کو کس وقعت کی نظر سے دیکھا ہے، ان کی تقریظ کے آخری چند جملے یہ ہین، فرماتے ہین ،:-

والحق یقال انی دُهشت من هذا	حق بات کہنا پڑتی ہے مین تو اس طرح حدیثون
الجمع وهذا الاستقصاء ومن هذا	کے جمع کرنے تلاش کرنے اور پوری طرح ہر حدیث کے
الاستیفاء البالغ فی الکلام علی کل	متن وسند پر فن حدیث کے موافق مفصل کلام
حدیث بما تقتضی به الصناعة متنا	کرنے سے حیرت مین رہ گیا، پھر خوبی یہ ہو کہ اپنے مذہب
وسندا من غیر ان یبدو علیه آثار	کی تائید مین تکلف کے آثار کا نام ونشان نہین بلکہ
التکلف فی تائید مذهبه بل الانصاف	جملہ اہل مذاہب کی رایون پر انصاف کو امام بنا کر
رائده عند الکلام علی آراء اهل المذاهب	کلام کیا گیا ہے، مجھے اس کتاب سے بے انتہا خوشی ہوئی،
فاغتبطت به غایة الاغتباط وهذا تکون همة	ہمت مردانہ ایسے ہی کہتے ہین اور بہادرون کا
الرجال وصبر الابطال اطال الله بقائه فی خیر	استقلال ایسا ہی ہوتا ہو، اللہ تعالیٰ مولف
عافیة ووفقه لتالیف امثاله من المؤلفات النافعة	کو خیر وعافیت کے ساتھ تا دیر سلامت رکھے اور اس

(جریدۃ الاسلام [illegible])

حضرت حکیم الامۃ نے ایک طرف مذہب حنفی کو احادیث کی روشنی مین منقح فرمایا، اور دوسری طرف مسائل سلوک وتصوف کو قرآن کی آیات کثیرہ سے مجتہدانہ شان کے ساتھ مدون فرمایا، جس کا نام مسائل السلوک ہے، پھر احادیث تصوف کو کتاب التعرف باحادیث التصوف مین جمع فرمایا اور دنیا کو تبلا دیا کہ صحیح اسلامی تصوف صرف قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے، اوس کا کوئی مسئلہ بھی کسی غیر اسلامی ماخذ سے لیا ہوا نہین، التعرف سے پہلے احادیث تصوف مین مستقل کتاب سننے مین نہین آئی، الحمد للہ اس کتاب نے صحیح اسلامی تصوف سے مسلمانون کو روشناس کر دیا ہے، ضرورت ہو کہ حکیم الامۃ رح کی جماعت مین کوئی صاحب ہمت اس موضوع کی تکمیل کے لئے

قدم آگے بڑھائیں، کیونکہ التعرف میں ہنوز جملہ احادیث تصوف کا استیعاب نہیں ہوا،

اب میں سلسلۂ ولی اللّٰہی کی چند عظیم الشان شروح حدیث کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن کے مصنف بحمد اللہ اس وقت بقید حیات ہیں،

فتح الملہم فی شرح صحیح مسلم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی شیخ الحدیث جامعۂ ڈابھیل کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں مسلم شریف کی شرح محدثانہ فقیہانہ و متکلمانہ انداز سے کی گئی ہے، جن احادیث پر آج کل عقلی اشکالات کئے جاتے ہیں، ان کے جوابات متکلمانہ طرز استدلال کے ساتھ بہت خوبی سے دیئے گئے ہیں، جا بجا نکات تصوف بھی بیان کئے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب سلسلۂ ولی اللّٰہی کی حدیث دانی تفقہ اور علم کلام و تصوف کی آئینہ دار بن گئی ہے، پانچ ضخیم جلدوں میں تمام ہونے کی امید ہے، اس وقت تک تین جلدیں طبع ہو چکی ہیں، سرکار نظام والی دکن خلد اللہ ملکہ کی امداد مالی مولف کے شامل حال ہے، امید ہے کہ بقیہ جلدیں بھی جلد طبع ہو جائیں گی، جلد اول کے شروع میں مقدمۂ علم حدیث قابل دید اور بہت مفید ہے،

اوجز المسالک فی شرح الموطا المالک یہ ہمارے نوجوان شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی بہترین تالیف ہے، اس سے پہلے آپ نے شمائل ترمذی کی شرح بھی اردو میں بہت عمدہ لکھی ہے، جو بیحد مقبول ہوئی، اوجز المسالک موطا مالک کی بے نظیر شرح ہے، ہر مسئلہ میں فقہاء اربعہ کے مذاہب نہایت بسط و ایضاح سے بیان کئے گئے ہیں، جملہ مذاہب کے دلائل بھی اجمالاً بیان کئے گئے ہیں، اگرچونکہ اس کا موضوع شرح موطا ہے، اس لئے جملہ مسائل و احکام سے تعرض نہیں کیا گیا، صرف انہی مسائل سے بحث کی گئی ہے جن سے موطا میں تعرض ہے، اس میں بلاغات و مراسیل و مقاطیع کو موصول کرنے کی بھی پوری کوشش کی گئی ہے، جو شارح کی وسعت نظر کی بڑی دلیل ہے، پہلی جلد کے ساتھ ضخیم مقدمہ ملحق ہے، جو بہت ہی کارآمد اور مفید ہے، تین جلدیں طبع ہو چکی ہیں، بقیہ زیر تالیف و زیر طبع ہیں، گرانی کاغذ سدّراہ بن رہی ہے، اطال اللّٰہ بقاء مولفہ و وفقہ لا متالہ (آمین) آپکے چچازاد بھائی مولوی محمد یوسف سلمہ بھی ماشاء اللہ

نوعمری ہی مین مصنف ہین، شرح معانی الآثار طحاوی پر بڑی محنت سے کام کر رہے ہین، امید ہے کہ طحاوی کا یہ حاشیہ بے نظیر ہوگا، علماے حنفیہ کا فرض ہے کہ شرح معانی الآثار طحاوی کی پوری طرح خدمت کرین، ابھی تک اس کتاب کے شایان شان کام نہین ہوا، امید ہے کہ مولوی محمد یوسف سلمہ اس فرض کو بخوبی انجام دین گے، وفقہ اللہ واعانہ (آمین)

التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح یہ ہمارے نوجوان محدث مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی تالیف ہے، عربی زبان مین مشکوٰۃ شریف کی بہترین شرح ہے، دمشق میں طبع ہوئی ہے، میری نظر کے چار جلدین گذری ہین، خود مؤلف سے بھی بعض مقامات کو سنا ہے، مؤلف کی محنت، وسعت نظر، سلیس طرز بیان قابلِ داد ہے، اللہ تعالیٰ ہماری نوجوان علما کو اس قسم کی محنت و تحقیق کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے، آمین، اکثر اللہ امثالھم وتقبل اعمالھم، قصبہ کاندھلہ کے لئے یہ فخر حاصل ہے، کہ اوس مین بیک وقت تین چار محدث موجود ہین، اور ہر ایک صاحب تصنیف ہے،

بغیۃ الالمعی حاشیۃ نصب الرایۃ للزیلعی یہ علماے مجلس علمی جامعہ ڈابھیل کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس وقت تک ہندوستان مین نصب الرایۃ کا ایک ہی نسخہ مطبوعہ نولکشور علما کے سامنے تھا، جو بہت زیادہ محتاج تصحیح تھا، مجلس علمی جامعہ ڈابھیل نے بڑی محنت سے اوس کی تصحیح کی، پھر اوس پر بہت نفیس حاشیہ لکھوایا، اور عمدہ کاغذ پر خوبصورت جلی حروف مین مصری ٹائپ سے طبع کرا کر شائع کیا، یہ بہت بڑی خدمتِ حدیث ہے، جو مجلس علمی کے علما نے انجام دی ہے، جزاھم اللہ احسن الجزاء وفقھم لامثالہ،

سیرۃ النبی و سیر الصحابہ و سیر الصحابیات و سیر التابعین اسوۂ صحابہ یہ دار المصنفین شبلی منزل اعظم گڈھ کا اردو زبان مین بڑا بلند اور مفید کارنامہ ہے، جس مین حدیث نبوی کا بڑا ذخیرہ اور قرن اول کے رجال حدیث کی مفصل تاریخ ضبط کی گئی ہے، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے حدیث پڑھی ہے، علامہ شبلی کے حنفی ہونے مین کسی شک و شبہہ کی اصلاً گنجائش نہین، انکی اسکات المعتدی

فی قرأۃ المقتدی اور سیرۃ النعمان اور نعمانی لقب اس پر شاہد ہے، علمائے دار المصنفین علامہ شبلی ہی کے جانشین ہیں، ان کے حنفی ہونے میں بھی کسی طرح کلام نہیں ہو سکتا، پس ان کی یہ تمام تر خدمت حدیث سلسلۂ ولی اللّٰہی کی اسی شاخ کا رنامہ ہے، جو اپنے کو حنفی کہتے ہیں، ان کو حنفیہ سے الگ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے؛ سیرۃ النبی کی چھ جلدیں، اور سیر الصحابہ کی دس جلدیں اور تابعین کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے، ہر جلد کافی ضخیم ہے، اور یہ بہت بڑی خدمت حدیث ہے، جو دار المصنفین کے علما نے انجام دی ہے، حق کو چھپایا نہیں جا سکتا، ہم کو سیرۃ النبی کے بعض مقامات پر اعتراض بھی ہے، اور مقام شکر ہے کہ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی ان کی اصلاح پر توجہ فرما رہے ہیں،

یہ مختصر تذکرہ ہے سلسلۂ ولی اللّٰہی حنفی کی خدمت حدیث کا جس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ آج اس سلسلہ کی برکت سے ہندوستان میں علم حدیث کا مینارہ اتنا بلند ہے، کہ ممالک اسلامیہ میں کوئی ملک اسکی ہمسری نہیں کر سکتا، جامع ازہر مصر کے مشہور ناقد و بصیر عالم سید رشید رضا مرحوم نے مفتاح کنوز السنۃ کے مقدمہ میں اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ سے کیا ہے؛

ولو عنایۃ اخواننا علماء الھند بعلوم الحدیث	اگر ہمارے برادران علمائے ہندوستان کی اس زمانہ میں علوم حدیث
فی ھذا العصر لقضی علیھا بالزوال	پر توجہ نہ کی ہوتی تو اس علم کے زوال کا فیصلہ ہو چکا ہوتا

اور اگر خدمت درس و تالیف کے ساتھ ان خدمات کو بھی ملا لیا جائے جو کتب نادرۂ علم حدیث کی اشاعت و طبع میں اس سلسلہ نے بالخصوص دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے انجام دی ہیں[۱] تو بلا مبالغہ اس وقت سرزمین ہند نے آفتاب علم حدیث کی روشنی کو بہت دور دور تک پہنچا دیا ہے ذالک من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لا یعلمون،

• **معارف:** یہ مضمون دار المصنفین کا سلسلۂ حدیث شمس العلما مولانا محمد حفیظ اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بواسطہ حضرت مولینا ابو الحسنات عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ جن کا ذکر اور سلسلہ اوپر مذکور ہے، سلسلۂ ولی اللّٰہی سے بھی بحمد اللہ متصل و مسلسل ہے "س"

[۱] یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مصححین و ناشرین و ناقلین دائرۃ المعارف کا تقریباً نصف حصہ علمائے ندوۃ العلماء سے معمور ہے، اور سب بھی اسی سلسلۂ ناب سے مربوط ہیں، (س)

اسلامی معاشیات
کے
چند فقہی اور قانونی ابواب

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ

(۳)

ایسی غیر مملوکہ چیزین جن مین قبضہ کے بعد بھی انفرادی ملکیت پیدا نہین ہوتی، ان کی ممکنہ حد تک تفصیل کو اس نقطہ پر ختم کر کے اب ان غیر مملوکہ امور کے بھی کچھ احکام سننے چاہئین جن مین قبضہ کے بعد انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے،

بنجر غیر آباد زمینون کی ملکیت کے قوانین

اسلامی قانون مین ممالک محروسہ کی ایسی غیر آباد زمینین اور علاقے جن کا کوئی مالک نہ ہو، خواہ وہ کبھی آباد نہ ہوئی ہون، یا آباد ہونے کے بعد اس طرح ویران ہوگئی ہون کہ ان کا کوئی مالک باقی نہ رہا ہو، ان کا اسلامی نام (موات) یا مردہ بنجر زمین ہے۔ بظاہر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی زمینون کی مالک حکومت ہے، اور اس لئے حکومت کی اجازت کے بغیر عام طور سے دنیا مین بھی دستور مروج ہے، کہ حکومت یا بادشاہ وقت کی اجازت کے بغیر ایسی زمینون، پہاڑون، جنگلات وغیرہ پر کوئی تصرف نہین کر سکتا، اور نہ کوئی ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے، لیکن اسلام کا نقطۂ نظر اس باب مین بالکل مختلف ہے، وہ اس قسم کی تمام زمینون کو بھی ملک کے عام باشندون کا مشترکہ سرمایہ قرار دیتا ہے، اور بجز

ان چند مستثنیٰ زمینوں اور معاون کے جن کا ذکر گذشتہ فصل میں بہ تفصیل ہو چکا ہے، رعیت کے ہر فرد کا یہ قانونی حق ہے، کہ ان کو بغیر کسی معاوضہ (رائلٹی) ادا کئے، قبضہ کرکے اپنی ملک بنائے، اس باب میں مسلمانوں کے پاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مشہور فرمان ایک ابدی وثیقہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے راوی تقریباً تمام محدثین ہیں، مثلاً امام مالک، امام ترمذی، ابو داؤد وغیرہ، سب کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے، کہ

من احیا ارضا میتة فھی لہ ۔ کسی مردہ غیر آباد زمین کو جو آباد کرے گا یہ زمین اسی کی

اسی بنا پر علامہ مقدسی نے مغنی میں تمام ائمۂ اسلام کا یہ اجماع نقل کیا ہے کہ

عامة فقہاء الامصار علی ان الموات یملك بالاحیاء، فقہاء امصار کا عامۂ اس پر اتفاق ہے، کہ احیاء (آباد کرنے) کی وجہ سے وہ آباد کرنے والے کی ملک بن جاتی ہے، (ج ۶، ۱۴۷)

خواہ یہ ارض موات ایسی زمین ہو جو کبھی کسی کی مملوک نہ ہوئی ہو، اور اس کے آباد نہ ہونے کی نوبت نہ آئی ہو، جیسا کہ وہی لکھتے ہیں، ایسی زمین کہ

مالم یجر علیہ ملك احد ولم یوجد فیہ اثر عمارة فھذا یملك بالاحیاء بغیر خلاف بین القائلین بالاحیاء کسی کی ملک اس میں قائم نہ ہوئی ہو اور اس میں کسی آبادی کی علامت نہ پائی جاتی ہو تو بالاتفاق آباد کرنے کی وجہ سے آدمی اس کا مالک ہو جاتا ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، جو آباد کرنے کو ملک کا سبب کہتے ہیں،

اسی طرح ایسی اراضی،

مایوجد فیہ آثار ملك قدیم جس میں کسی قدیم جاہلی ملک کی علامتیں

جاھلی کآثار دائرۃ مروسا کن ثمود ونحوھم فھذا یملک بالاحیاء ؛ پائی جاتی ہون مثلاً روم کے آثار اور قوم ثمود کے مسکن کا حال ہے، یا جو ایسے مقامات ہون تو آباد کرنے سے ان کا بھی آدمی مالک ہو جاتا ہے،

چونکہ اس قسم کی زمین اسلامی عہد سے قبل ہی سہی لیکن بنی آدم کی مملوکہ چیزون مین ہو چکی تھی، اس لئے شبہہ ہو سکتا تھا کہ دوسرے کی مملوکہ چیز پر قبضہ کرنے یا اوس کو ملک بنانے کا کسی دوسرے کو کیا حق ہے؟ اس شبہہ کے ازالہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے فرمان مین اس کی بھی تصریح فرما دی ہو کہ

عادی الارض للہ ورسولہ ثم ھو بعد لکم، عادی اراضی (یعنی اقوام قدیمہ کے کھنڈریا ان کے آباد کئے ہوئے بنجر علاقے) اللہ اور اسکے رسول کی ملک ہین، پھر اس کے بعد ای مسلمانو! یہ تمھاری ملکیت ہے،

یعنی اس قسم کی زمینین جب اُن کے مالک چھوڑ کر لاپتہ ہو چکے ہون اور وہ اسلامی حکومت کی زیر نگرانی آگئین، تو اب وہ اپنے پرانے مالکون کی ملک سے نکل کر اللہ ورسول کی ملک مین داخل ہوگئین حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی طرف سے پھر ان کو عام مسلمانون کے حوالہ فرما دیا، البتہ ارض موات کی ایک قسم اور رہ جاتی ہے، جو اسلامی عہد مین کسی خاص شخص کی ملکیت تھی، لیکن ان کا مالک ان کو غیر آباد کر کے لاپتہ ہو گیا، ایسی زمینون کے متعلق اگرچہ بعض ائمۂ اسلام کی رائے مختلف ہے، مگر امام ابو حنیفہ، امام مالک وغیرہ کا ان اراضی کے متعلق بھی یہی فتوی ہے، کہ

انھا تملك بالاحیاء وھو مذھب ابی حنیفة ومالك، (مغنی) آباد کرنے سے وہ بھی مملوکہ بن جاتی ہین، یہی ابو حنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے،

بہرحال اس قسم کی تمام اراضی جن کا فقہ کی اصطلاح مین "موات" نام ہے، دراصل یہ ملک کے باشندون

کی مشترکہ جائداد ہے، اور ملک کا ہر باشندہ اس کو اپنی انفرادی ملکیت بنا سکتا ہے جس کی اسلامی قانون کی رو سے دو صورتیں ہیں،

اقطاع یا جاگیروں کا حکم | ایک کو اقطاع کہتے ہیں یعنی خود حکومت اس علاقہ کو کسی شخص کے ساتھ بندوبست کر دے، اور یہ امام کے صوابدید پر ہے، کہ جس کو چاہے جتنی زمین کا اقطاع کر دے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایت ہے، جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے، کہ

اقطع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لبلال بن الحارث المزنی مابین البحر والصخر،	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مزنی کو دریا سے پہاڑ تک جاگیر میں دیدیا تھا، (یہ اصطلاح تھی ساحل سمندر سے کسی خاص سلسلہ کوہ تک کی درمیانی اراضی کیلئے ہندوستان میں جیسے ازگنگ تا سنگ کا لفظ بعض علاقوں میں بولتے ہیں)

ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب کتاب الاموال میں اس قسم کے قطائع (جاگیرات) کا جو بارگاہ رسالت اور سریر خلافت سے مختلف لوگوں کو عطا ہوتے رہے ہیں، ذکر کیا ہے، میں نے خاص کر بلال بن حارث کی جاگیر کا ذکر قصداً اس لئے کیا تاکہ معلوم ہو کہ بڑے سے بڑا علاقہ بھی حکومت اپنے صوابدید سے جاگیر میں عطا کر سکتی ہے، لیکن حکومت کے صرف اقطاع سے اس علاقہ کا وہ شخص مالک نہیں ہو جاتا، جب تک کہ "احیا" کر کے اس پر قبضہ نہ کرے، علامہ مقدسی لکھتے ہیں،

فان اقطعہ الامام شیئاً من الموات لم یملکہ بذلک لکن یصیر احق بہ (مغنی)	اگر "موات" زمین کو امام (حکومت) کسی کی جاگیر میں دیدے تو محض اس سے وہ اس زمین کا مالک نہیں ہو جاتا البتہ بہ نسبت دوسرونکے وہ اسکا زیادہ حقدار ہوگا،

اپنے اس دعوی کی انھون نے دلیل بھی پیش کی، کہ "عقیق" مین جو جاگیر انھی بلال کے نام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقطاع کی تھی، چونکہ ؔ احیا پر قادر نہ ہو سکے، حضرت عمرؓ نے اُن سے واپس لے لی، علامہ مقدسی لکھتے ہین :-

لو ملکہ لم یجز استرجاعہ	اگر صرف اقطاع سے بلال مالک ہو جاتے تو حضرت عمرؓ کو اس کی واپسی جائز نہ ہو سکتی تھی،

اسلامی جاگیرون کا مطلب | یہان جاگیر کا یہ مطلب نہین ہے کہ جیسا ہندوستان مین سمجھا جاتا ہے، کہ وہ لاخراج کر دی جاتی ہے، بلکہ موات کی اراضی کے عطا کرنے کے بعد اس پر "عشر" یا خراج" بھی لگایا جا سکتا ہے؛ اور اس معاملہ مین مختلف زمینون کا حکم مختلف ہے، جس کی تفصیل فقہ کی کتابون مین موجود ہے

خراج کے باب مین صرف امام (بادشاہ وقت) کو اتنا اختیار دیا گیا ہے، کہ ملک و رعایا کے مصالح کی بنا پر مثلاً وقت پر فوجی امداد جاگیر دار سے حاصل کیجائے گی، یا ازین قبیل کوئی اور مصلحت ہو تو جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے،

یکون الامام قد رای الصلاح فی تفویض خراج ارض صاحب الارض فیجوز لہ یسعہ ان یقبلہ	اگر امام اسی مین مصلحت دیکھے کہ زمین کا خراج جاگیر دار کو عطا کر دے تو امام ایسا کر سکتا ہے، اور جاگیر دار کو بھی اجازت ہو کہ وہ اس عطیہ کو قبول کر لے

لیکن امام کے سوا حکومت کے کسی عہدہ دار کو خواہ اس کا درجہ کتنا ہی بلند کیون نہ ہو خراج کی معافی بلکہ تخفیف تک کا اختیار نہین ہے،

بہرحال یہ ایک ذیلی بات تھی، جاگیرون کے متعلق بعض غلط فہمیون کا ازالہ مقصود تھا اور اس کے تفصیلی مسائل تو بہت زیادہ ہین، جن کے ذکر کا یہان موقع نہین، اصل بات یہ کہی جارہی تھی

کہ اراضی موات مین انفرادی ملکیت ایک تو اس احیاء (آباد کرنے) سے حاصل ہوتی ہے جو اقطاع کے ذریعہ سے کسی کو ملی ہو، اور عام طور سے غیر آباد زمینون کے بند وبست کرنے کا دنیا مین یہی طریقہ مروج ہے اگرچہ مختلف حکومتون کا طرز عمل بند وبست کے شرائط اور نتائج مین مختلف ہے، لیکن اراضی موات کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ جو اسلام مین ہے، دوسری حکومتون رعایا کے لئے شاید وہ عجیب ہو،

ملک کی غیر آباد زمینون کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ

میرا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صَلَّی اللہُ علیہ وَسَلَّم کے مذکورۂ بالا فرمان یعنی

مَن احییٰ ارض موات فھی لہ، — موات اراضی کو جو آباد کرے گا اُسی کی وہ ہو جاتی ہے،

کی بنا پر فقہاے امت کی اکثریت کا یہ فتویٰ ہے، کہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو اس کا حق حاصل ہو کہ غیر آباد زمینون اور علاقون (اراضی موات) سے جتنا حصہ بغیر کسی معاوضہ اور رائلٹی کے چاہے، احیاء کرکے اُسے اپنی ملک اور جاگیر بنالے، صرف امام ابو حنیفہ اس مسئلہ مین متفرد ہین، کہ حکومت سے بھی اجازت احیاء کے لئے ضروری قرار دیتے ہین لیکن عام فقہاے اسلام حکومت کی اجازت کو غیر ضروری سمجھتے ہین حتی کہ امام صاحب کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسف نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے مذکورۂ بالا نبوی وثیقہ کی بنا پر لکھا ہے،

ان اذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جائز الیٰ یوم القیمۃ، — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اجازت قیام قیامت تک نافذ رہے گی،

یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان فھی لہ (وہ آباد کرنے والے کی ملک ہے) موجود ہو تو اس مین اب کسی دوسرے شخص سے پوچھنے اور اجازت حاصل کرنے کی قطعاً ضرورت نہین، البتہ حکومت کو صرف اس کی نگرانی کرنی چاہیئے کہ اس سے مفاد عامہ کو کوئی ضرر تو نہیں پہونچا، قاضی ابو یوسف نے

لکھا ہے کہ اس حدیث کی بعض روایتون مین

لیس لعرق ظالم حق (ص ۳۶)

کے الفاظ سے اسی ضرر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ کسی غیر آباد زمین مین (یعنی موات) مین اگر کوئی درخت نصب کرے جس سے دوسرے کو نقصان پہونچے، تو پھر اس ظلم کا حق اس کو نہ دیا جائے گا،

عام فقہائے اسلام سے امام صاحب کے اس اختلاف کے متعلق قاضی ابو یوسف سے پوچھا گیا تھا، کہ اس صحیح و صریح نبوی وثیقہ کے ہوتے ہوئے حکومت کی اجازت کی قید امام صاحب نے کیون بڑھائی کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کافی نہین ہے، اگرچہ اس کا جواب امام صاحب کی طرف سے نقل کیا جاتا ہے، کہ آخر بیت المال کے متعلق بھی تو عام قانون یہی ہے کہ

هو بيت مال المسلمين، یعنی اس کے مالک مسلمان ہین،

لیکن باوجود اس کے کہ امام بیت المال کا مالک نہین ہے لیکن اس پر اتفاق ہے کہ

للامام تعيين مصارفه وترتيبه امام کو بیت المال کے رقوم مصارف کی تعیین وترتیب کا حق ہے، (مقدسی)

اسی طرح "زمین" کے متعلق بھی امام کو نظم و ترتیب مین بھی دخل دینا چاہئے، ورنہ رعایا مین باہمی کشمکش کا اندیشہ ہے، حکومت کی توثیق کے بعد جھگڑے کا خطرہ نہ رہے گا، لیکن لوگون نے امام صاحب کی اس توجیہ کو تسلیم نہین کیا ہے، پوچھا گیا ہے کہ کیا ہو کے ہر بندے پر قبضہ کرنے کے لئے بھی حکومت کی اجازت درکار ہے، آخر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی موات کو تمام مسلمانون کے لئے مباح قرار دیا سند دیدی، کہ جو اس کو آباد کرے گا، اسی کی وہ زمین ہوجائے گی، اس کے بعد حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے،

بہرحال یہان یہ یاد رکھنا چاہئے کہ موات کی اراضی کو احیار کے ذریعہ سے اپنی مملوکہ جاگیر بنا لینے کا اختیار صرف مسلمانون ہی کو نہین بلکہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو ہے، مسلم ہو یا غیر مسلم، اور یہ میرا صرف قیاسی نتیجہ نہین ہے، بلکہ فقہ کی کتابون مین ہمیشہ اس کی تصریح کر دیجاتی ہے، مقدسی لکھتے ہین،

لا فرق بین المسلم والذمی	موات زمین کو آباد کرکے اپنی ملک بنا لینے
فی الاحیاء وبہ قال ابوحنیفۃ	مین مسلم اور ذمی (غیر مسلم رعایا) مین کوئی
	فرق نہین ہے، امام ابوحنیفہ کا بھی یہی
	مذہب ہے،

خلاصہ یہ ہے کہ میدانی علاقہ ہو یا کوہستانی، جزیرہ ہو یا خشکی کا خطہ، جنگل ہو یا بیابان، ملک کا ہر باشندہ جتنی زمین چاہے، موات اراضی مین سے آباد کرکے اس کو اپنی مملوکہ جاگیر مفت بنا سکتا ہے،

قاضی ابو یوسف کے الفاظ یہ ہین :-

کل ما عالج فی اجمۃ او من بحر	اجمہ (نیستان) ہو یا تری کا علاقہ ہو، یا
او من بر بعد ان لا یکون فیہ	خشکی کا اگر کسی خاص انسان کی ملک وہ
ملک لانسان فاستخرجہ رجل	نہیں ہے، اور محنت مشقت کرکے جس نے
وعمرہ فھو لہ بمنزلۃ الموات	اوس کو نکالا اور آباد کیا، تو اس کا وہی مالک
	ہو جائے گا، جیسے موات اراضی کا حال ہے،

مثلاً دجلہ و فرات جیسے دریاؤن مین عموماً بڑی بڑی زمینین باہر نکل آتی ہین، اگر ان کے آباد کرنے مین کسی کا ضرر نہ ہو، تو ان کا حکم بھی مثل ارض الموات ہے،

یعنی اس جزیرہ کا آباد کرنے والا قانوناً مالک ہو جائے گا، یہان یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ احیار یا آباد کرنے کا جو لفظ برابر استعمال ہو رہا ہے، اوس کا کیا مطلب ہے، محض کھیتی کرنا یا باغ لگانا ہی مقصد

نہین ہی، بلکہ جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے :۔

احیاء کل واحدۃ من ذالک بتھیئتھا للانتفاع الذی ارید بہ،

ان میں ہر چیز کی احیار کا مطلب یہ ہے، کہ جو نفع اس سے مقصود ہو، اوس کے لئے اس کو تیار کیا جائے،۔

یعنی آبادی "صرف زراعت یا باغبانی پر منحصر نہین ہے، مکان بنا کر یا دوابگاہ (مویشی رکھنے کی جگہ) یا لکڑی وغیرہ جیسی چیزون کے رکھنے کی جگہ بنانی، یہ سب احیار مین داخل ہی، علامہ مقدسی نے بطور تمثیل کے چند چیزون کا ذکر کیا ہے، مقصد کے سمجھانے کے لئے ہم بجنسہ نقل کرتے ہین،

فاما الدار فان یبنی حیطانھا مما جرت بہ العادۃ وتسقیفھا لانھا لا تکون سکنی الا بذالک واما الحظیرۃ فاحیاءھا بحائط جرت بہ عادۃ مثلھا لیس من شرطھا التسقیف لان العادۃ ذلک من غیر تسقیف سواء ارادحظیرۃ السواشی او الخشب

گھر کے احیار کا مطلب یہ ہے کہ اس کی دیوارین کھڑی کی جائین، یعنی جس طرح اس ملک میں دیوارون کے بنانے کا طریقہ ہو، ویسی دیوار کھڑی کر دی گئی ہو، اور اس کی چھت پاٹ دی گئی ہو، کیونکہ رہنے کے قابل بغیر اس کے نہین ہو سکتا، اسی طرح حظیرہ (احاطہ) کے احیار کا مطلب یہ ہے کہ جس قسم کی دیوار گھیر کر احاطہ بندی کا طریقہ اس ملک مین جاری ہو یعنی چھت پاٹنے کی ضرورت اس کی احیار مین نہین ہے، کیونکہ عام طریقہ یہی ہے، کہ ان احاطون کے لئے چھت نہین پاٹتے، خواہ مویشی کے لئے احاطہ بنایا جائے، یا لکڑی[۲۶]

[illegible]

الغرض آباد کرنے کی جو غرض ہے، اس کا سامان مہیا کرنا یہی اس کا احیار ہے، مثلاً کھیتی ہے تو اس کا جو تنا سیرابی کا انتظام کرنا یہی اس کا احیار ہے، مقدسی لکھتے ہین کہ زراعت کی احیار کی صورت یہ ہے کہ

ان یسوق الیھا ماء من نھر او بئر وان کانت مما لایمکن زرعھا لکثرۃ احجارھا کارض الحجاز فبان یقلع احجارھا وینتقیھا حتی یصلح للزرع وان کانت غیاضاً او اشجاراً کارض الشعری فبان یقلع اشجارھا ویزیل عروقھا اللتی تمنع الزرع،

آدمی اس کی طرف کسی نہر سے یا کنوین سے پانی لیجائین، اور اگر زمین ایسی ہو جس مین کھیتی نہ ہو سکتی ہو، مثلاً کثرت سے اس مین پتھر ہون، جیسا کہ حجاز کی زمینون کا حال ہے تو اس کے احیار کے معنی یہ ہون گے، کہ پتھرون کو زمین سے باہر نکالا جائے، اور زمین صاف کیجائے حتی کہ کھیتی کے قابل ہو جائے، اور اگر بنجر (موات) زمین مین جنگل جھاڑ ہو درخت ہون، جیسا کہ الشعری کی زمین کا حال ہے تو اوس کو احیار کے معنی یہ ہین، کہ درخت اکھاڑے جائین، اور ان جڑون کو کھود کر نکال دیا جائے

احسن التقاسیم [illegible]

بہر حال ہر چیز اور ہر ضرورت کا احیار خود اس ضرورت کے حسب حال ہوتا ہے، اور جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے کہ اس باب مین اعتبار زیادہ عرف عام اور رواج کا ہے، آباد کرنے کا اطلاق جس کاروبار پر کیا جاتا ہو وہی اس کا احیار ہے،

رعایا کی اسلام مین تملیکی قوت

اس کے بعد خواہ اقطاعی (حکومت کی بند وبست کی ہوئی) جاگیر ہو، یا خود کسی نے ارض موات پر قبضہ کر کے احیار کر لیا ہو، یہ آباد کرنے والی کی انفرادی ملک بن جاتی ہے، اقطاعی جاگیرات کا حکم احیار کے بعد جو ہو جاتا ہے، قاضی ابو یوسف لکھتے ہین :-

فلا يحل لمن ياتي من بعد هم من الخلفاء ان يرد ذالك ولا يخرجه من يدي من هو في يده لا وارثا اومشتريا، (ص ۴۳)

بعد کو جو خلفاء ہون ان کے لئے جائز نہ ہوگا کہ کسی امام کی عطا کی ہوئی جاگیر کو، اس شخص سے واپس لین جس کے قبضہ مین وہ جاگیر خواہ بطور وراثت کے ہو، یا خریداری کے ذریعہ سے اس تک پہنچی ہو،

جس سے معلوم ہوا کہ جس نے آباد کی ہو، خود اس کے یا اس آباد کرنے والے سے کسی کو وراثۃً ملی ہو یا آباد کرنے والے سے کسی نے خریدی ہو کسی سے بھی حکومت اس کی یہ مملوکہ زمین چھین نہیں سکتی، انھون نے اسکی تصریح کر دی ہے کہ

فاما ما اخذ الولاة من يد واحد ارضا واقطعها آخر فهذا بمنزلة الغاصب غصب واحد أو اعطى آخر، (کتاب الخراج ۳۴)

اور حکومت کے ولاۃ (صوبہ داردن گورنرون) وغیرہ کا جو یہ طریقہ ہے کہ جاگیر کو ایک شخص کے قبضہ سے نکال کر دوسرے کو جاگیر مین دیدیتے ہین، تو اس کی صورت وہی ہے جو غاصب اور زبردستی چھیننے والوں کی ہوتی ہے یعنی ایک شخص سے اس کی مملوکہ چیز زبردستی چھین کر دوسرے کو دیدے،

دوسری جگہ مزید صراحت کرتے ہوئے فرماتے ہین،

فاما من اخذ من واحد و اقطع آخر فهذا بمنزلة مال غصبه واحد من واحد واعطى واحداً (ص ۳۴)

اور وہ جو ایک شخص سے جاگیر چھین کر دوسری کی جاگیر مین دی جاتی ہے، تو اس کی حیثیت اس مال کی ہے، جو ایک شخص سے چھین کر

اسی طرح اراضی موات کو احیاء کرکے جس نے اپنی مملوکہ جاگیر بنا لی ہو، اس کے متعلق بھی لکھتے ہیں،

ولیس للامام ان یخرج شیئاً من ید احد، (ص ۳۵)	امام (حکومت) کو اس کا اختیار نہیں ہو کہ کسی کے قبضہ اور ملک سے زمین کو چھین لے،

اسی دفعہ کی تعبیر دوسرے الفاظ میں دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں،

فلا یحل للامام و لا یسعہ ان ان یقطع من الناس حق مسلم و لا معاھد و لا یخرج من ید لا من ذالك شیئاً،	امام حکومت کے لئے جائز نہیں ہے، اور نہ قانوناً اس کے لئے اس کی گنجایش ہے، کہ کسی مسلمان یا جس سے اسلامی حکومت نے معاہدہ کیا ہو، کہ اس کے حق کو اس سے منقطع کرے اور نہ یہ کر سکتا ہے، کہ اس کے قبضہ سے ۴

دوامی بندوبست یعنی یہ حکم حکومت کی مسلم غیر مسلم ہر قوم کی رعایا کے لئے عام ہے، گویا ان زمینوں کی حیثیت بندوبست دوام کی ہو جاتی ہے، اور جاگیردار کو اختیار ہے کہ خواہ خود اوس کو آباد کرے یا کسی اور ذریعہ سے آباد کرائے قاضی صاحب لکھتے ہیں،

فمن احیاھا و ھی کذالك فھی لہ و یزرعھا و یزارعھا و یواجرھا و یکری منھا الانھار و یعمرھا بما فیہ مصلحتھا، (ص ۳۷)	جس نے اس زمین کو آباد کیا ہو، اور وہ اس حال میں ہو تو اس زمین کا مالک اس کا آباد کرنے والا ہوگا، اسے حق ہے کہ اس میں خود کاشت کرے یا کسی سے کاشت کرائے، یا کسی کو کرایہ پر دے، اسے اس کا بھی حق ہو، کہ اپنی زمین میں نہر کھودے، اور اس کا بھی کہ جس قسم کی عمارت اور آبادی جس میں مصلحت ہو ۴

البتہ اس پر حکومت کی جو مالگذاری عائد کی گئی ہو، صرف اس کا ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے،

فان کانت فی ارض العشر ادی	اگر اوس کی یہ زمین عشر کی زمین ہو، تو
عنہا العشر، وان کانت فی ارض	اس سے عشر ادا کرے گا، اور اگر خراجی
الخراج ادی عنہا الخراج،	زمین ہو تو اوس سے خراج ادا کرے گا،

تحجیر کا مطلب اور حکم | عشر و خراج کی عدم ادائگی کی صورت مین حکومت اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے، اس کی تفصیل مناسب موقع پر آگے آتی ہے، یہان یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ کسی غیر آباد زمین کے حدود مین صرف پتھر نصب کر کے یا کانٹون وغیرہ سے گھیر کر اس کو اپنی مملوکہ زمین قرار دینا صحیح نہین ہے، فقہاء مین اس عمل کا نام تحجیر ہے، چونکہ یہ زمین کا احیاء نہین ہے، اس لئے ملکیت تو پیدا نہ ہوگی، البتہ بہ نسبت دوسرون کے اس کے حق کو گونہ ترجیح ہوگی، مگر وہ بھی ایک خاص مدت تک جس کی تفصیل فقہ کی کتابون مین موجود ہے، مندرجۂ بالا بیانات سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے، کہ اسلام نے اپنی حکومت کی رعایا کی معاشی سہولتون کے کتنے ذرائع پیدا کر دیئے ہین، آج جب کہ دنیا مین کوئی ایک انچ زمین پر بھی بلامعاوضہ مفت قبضہ نہیں کر سکتا، اس سے اس وقت کا اندازہ لگانا چاہئے، اور اس لئے مین نے اس سلسلہ مین تھوڑی تفصیل سے کام لیا، کیونکہ اسلامی حکومت کا نظام جب سے ناپید ہوگیا ہے، لوگ ان واقعات کو بھول گئے ہین، ورنہ سچ یہ ہے کہ ہندوستان تک مین حکومتِ مغلیہ کے آخری دور تک زیادہ تر اس قسم کی معاشی سہولتین آبادکارون کو حاصل تھین،

بہرحال یہ احکام تو غیر مملوکہ امور کے متعلق تھے، اب بحث ان چیزون پر کرنی چاہئے جو کسی کی ملک مین داخل ہین، مین نے کہا تھا کہ اس کی بھی دو صورتین ہین، مالک کی مرضی کے بغیر ان پر قبضہ کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے یا نہین، پھر ایسی مملوکہ چیزین جن پر مالک کی مرضی کے بغیر بھی قبضہ کر کے ان کو اپنا مملوک بنایا جاسکتا ہے، اس کی بھی اسلام مین دو شکلین ہین،

مالک کی مرضی کے بغیر کسی چیز پر قبضہ کرنا

(۱) اسلامی حکومت کی رعایا کا اگر مال ہو تو مالک کی مرضی کے بغیر صرف دو شکلوں میں ان پر قبضہ کرنے کی اجازت ہے، ایک کی فقہی تعبیر لقطہ ہے،

لقطہ کا مطلب

یعنی گرا پڑا ہوا مال اگر کسی کا مل جائے بعض صورتوں میں یہ جائز ہے، کہ آدمی اوس پر قبضہ کرے، اور خاص شروط و حالات میں اس کو اپنے تصرف میں بھی لا سکتا ہے لیکن جب کبھی اصل مالک کا پتہ مل جائے اور وہ اوس کا مطالبہ کرے تو معاوضہ ادا کرنا پڑے گا، چونکہ اس باب کا تعلق معاشیات سے نہیں ہے، کہ یہ آمدنی کی نہایت نادر شکل ہے، اس لئے اس کے تفصیلات کی یہاں ضرورت نہیں،

قانون شفعہ

دوسری شکل شفعہ کی ہے، یعنی مالکانہ شرکت یا پڑوس کی وجہ سے اسلام نے ملک کے ہر باشندے کو یہ قانونی حق دیا ہے، کہ آدمی دوسرے کی خریدی ہوئی چیز کو زبردستی دام ادا کرکے اپنی ملک بنالے مثلاً کسی مکان یا زمین میں دو آدمی یعنی زید و عمرو شریک ہیں، اگر عمرو کے حصہ کو خالد خریدے تو زید کا یہ قانونی حق ہے، کہ جس دام میں خالد نے اس کے شریک کے حصہ کو خریدا ہے، ادا کرکے خالد کی رضامندی ہو یا نہ ہو خریدلے، قانون اس جبری خریداری کو نافذ کرائے گا، معلوم نہیں اس باب میں دنیا کے اور قوانین کا کیا حال ہے، لیکن اس قانون کی وجہ سے اسلامی حکومت کی رعایا کو دکانوں، کھیتوں، باغوں وغیرہ کے متعلق کتنی آسانیاں بہم پہنچتی ہیں، اور پہنچ سکتی ہیں، اس کا اندازہ تجربہ سے ہو سکتا ہے، خصوصاً حنفی مذہب میں اس قانون کو ملکی شرکت سے آگے بڑھا کر مرافق (مثلاً راستہ ذرائع آبپاشی وغیرہ) کی شرکت اور جوار (پڑوس) کی شرکت تک وسیع کر دیا گیا ہے، فقہ کا یہ ایک طویل باب ہے، میرے لئے اس سلسلہ میں صرف اتنا بیان ہی کافی ہو سکتا ہے،

غیر اسلامی حکومتوں کی رعایا کیساتھ مسلمانوں کے معاشی تعلقات

(۲) غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے مملوکات پر مالکوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ کرکے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے ہیں، اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے بھی اس حق کو اسلام نے قانونی حق قرار دیا ہے یعنی اسلامی حکومت کے باشندوں

کے اموال پر العیاذ باللہ[۱] اگر ان کا قبضہ ہو جائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہو جاتے ہین، دراصل اس دفعہ کا تعلق قانون جنگ سے ہے، اس سلسلہ مین غنیمت، فئی، متعلقات فئی وغیرہ کی آمدنیان ہین علاوہ ان عطایا و وظائف وغیرہ کے جو اسلامی فوجون کو حکومت سے ملتے تھے، چونکہ لڑنے والے ہر سپاہی کو غنیمت سے بھی حصہ ملتا تھا، اس لئے مسلمانون مین آمدنی پیدا کرنے کا یہ بھی ایک بڑا آسان، اور قیمتی ذریعہ تھا، اور ان کی معاشی فراغبالیون پر اس قانون کا کافی اثر مرتب ہوتا تھا، چونکہ اس آمدنی کا تعلق معمولی کاروبار سے نہین ہے، بلکہ اوسکی اکثر شکلون کا تعلق حکومت سے ہے، اس لئے اس باب کی بھی تفصیل کی یہان حاجت نہیں، البتہ اسی بین الاقوامی قانون کی بنا پر، شریعت مین چونکہ یہ طے کر دیا گیا ہے، کہ اسلامی حکومت کی رعایا کا مال غیر اسلامی حکومتون کے باشندون کے لئے مباح اور جائز ہے، یعنی قبضہ کرنے کے بعد ان کی ملک مین داخل ہو جاتا ہے، اور ان سے اگر کوئی مسلمان اس مال کو خریدے، تو یہ قانونی مالک سے مال کا خریدنا ہوگا، اسی لئے اس کا لینا جائز ہوگا،

غنیمت وفئی کی حلت کی وجہ پھر جس طرح مسلمانون کا مال غیر اسلامی حکومتون کے باشندون کی ملک مین صرف قبضہ سے داخل ہو جاتا ہے، اسی طرح اسلامی حکومتون کے باشندون کے لئے غیر اسلامی حکومتون کے باشندون کا بھی مال مباح و جائز ہے، یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے قانونی مالک ہو جاتے ہین، غنیمت (یعنی غیر اسلامی حکومت کے لوگون سے جو مال بزور حاصل کیا جائے) اور فئی (جو مال غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندون کا بغیر کسی جنگ و جدال کے مسلمانون کے قبضہ مین آجائے) ان دونون قسم کے اموال کے قانونی مالک مسلمان اسی بنا پر ہو جاتے ہین، کہ ان لوگون کے اموال کو اسلام نے مسلمانون کے لئے مباح

---

[۱] العیاذ باللہ کا لفظ مین نے اپنے فقہا کی تقلید مین لکھا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ مسلمانون پر ایک وہ وقت بھی گذرا ہے، جب غیر اسلامی اقوام کے تسلط کو اپنے اوپر ناقابل برداشت تصور کرتے تھے، پھر آسمان نے رُخ بدلا، اور جس کا سوچنا بھی ناگوار تھا، اسے دیکھنا پڑا اور کیسا دیکھنا؟

اور جائز قرار دیا ہے،

غیر اسلامی ممالک مین سود، قمار وغیرہ کا حکم

اسی مسئلہ کی بنیاد پر ایک اور معاشی سوال یہان پیدا ہو گیا، یعنی غیر اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم باشندہ کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رو سے لین دین کا قانونی اور شرعی ذریعہ نہین ہے، مثلاً ربوا (سود) یا قمار یا از ین قبیل کسی اور غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ مین آجائے، تو کیا قانوناً یہ مسلمان اس کا مالک ہو سکتا ہے یا نہین،

چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے، اور مباح و جائز مال کے مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے، مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کر کے قبضہ کر لینا اس پرندے کے مالک ہونے کے لئے کافی ہے، اس لئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہو کہ اس قسم کے اموال کا مسلمان قانونی طور پر مالک ہو جاتا ہے، اور یہی ان کا وہ مشہور نقطۂ نظر ہے جس کی وجہ سے حنفی فقہ کی عام کتابون میں

لا ربوا بین الحربی والمسلم الحربی (غیر اسلامی حکومت کا باشندہ) اور المسلم (اسلامی حکومت کا باشندہ) مین ربوا (سود) نہین ہو،

کا ذکر پایا جاتا ہے، گویا یہ بین الاقوامی قانون کی ایک دفعہ ہے، عوام چونکہ اس کے اصل منشاء سے واقف نہین مین، اس لئے ان کو حیرت ہوتی ہے، کہ "ربوا" (سود) جب اسلام مین حرام ہے، تو ہر جگہ ہر شخص سے لینا حرام ہو جانا چاہئے، "حربی" یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندون کے ساتھ اس کے جائز ہونے کے کیا معنی؟ مگر سچی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ ربوا کا معاملہ ہی نہین ہے، بلکہ ایک مباح مال کو قبضہ کر کے اُسے اپنی ملک بنانا ہو، اس قانون سے پہلے ایک اور قانون کا ذکر کتابون مین عموماً کیا جاتا ہے کہ

لا ربوا بین العبد والمولی، یعنی درمیان غلام اور اس کے آقا کے ربوا (سود) کا معاملہ نہین ہے،

یعنی شرعی غلام اور آقا کے درمیان بھی اگر ربوا کا معاملہ کیا جائے گا، تو وہ ربوا نہ ہو گا، یہ بھی امام ابو حنیفہ کا

مذہب ہی ظاہر ہے کہ اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے، کہ باوجود ربوا اور سود ہونے کے امام نے اس کو حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے، بھلا اس کا حق ایک مجتہد کو کیا ہے، بلکہ بات وہی ہے کہ قانوناً غلام کا مال آقا ہی کا ہے پس آقا نے غلام سے جو کچھ لیا وہ اس کا مال نہیں اپنا مال لیا، اور اپنا مال کسی پر کیون حرام ہو سکتا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ آدمی اپنی آمدنی کی مختلف مدّون کو مختلف مصارف کے لئے معین کر دیتا ہے لیکن بسا اوقات کسی ایک ضرورت کے لئے دوسری مد کی آمدنی سے قرض کے نام سے لے لیتا ہے، فرض کیجئے کہ اگر اس قرض مین وہ کچھ سود بھی لگا کر اس مد مین جمع کر دیا کرے جس سے اوس نے قرض لیا تھا، تو کیا واقعی لفظ سود سے وہ سوُد ہو جائے گا، اس نے تو اپنے ہی روپے کو اپنے مال مین ملایا، ہر خواہ کسی نام سے ملائے، قانوناً شرعاً کوئی اس کو سود نہین کہہ سکتا، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں جہان اس وقت اسلامی حکومت قائم نہین ہے یہان کے

ہندوستان مین مسئلہ ربوا (سود) کا حکم غیر مسلم باشندون سے بعض حنفی علماء[1] سودی کاروبار کے جواز کا فتوی دیتے ہین، بعض غیر قانونی دماغون کو یہ شبہہ ہوتا ہے، کہ اگر اس جواز کی بنا اس پر ہے، کہ غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کا مال مسلمانون کے لئے مباح ہے، تو پھر اس ملک میں فریب چوری ڈاکہ وغیرہ جو شرعاً لین دین کے ناجائز ذرائع ہین، کیا ان ذرائع سے بھی مسلمانون کو غیر مسلمون کا مال لینا جائز ہوگا؟ حالانکہ جہان یہ مسئلہ فقہ حنفی مین لکھا گیا ہے، وہین دوسرا فقرہ "من غیر غدر" (یعنی خلافِ معاہدہ) لین دین نہ ہو، کی قید بھی بڑھی ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوستان مین جو حکومت قائم ہے، اس کے قانون مین فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ کے ذریعہ سے لین دین کو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے، اور اس ملک مین جو

---

[1] جس مین سب سے نمایان شخصیت حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، شاہ صاحب کے فتاویٰ عزیزیہ مین یہ فتویٰ ایک سے زیادہ مقام مین موجود ہے یہان یہ بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ شاہ صاحب نے یہ فتوے اس وقت صادر کئے تھے، جب لال قلعہ مین تیموری سلاطین نام نہاد شاہ ہند کے نام سے موجود تھے، لیکن عملاً چونکہ ان کی حکومت ختم ہو چکی تھی، اس لئے شاہ صاحب نے حنفی فقہ کے اس معاشی مسئلہ کا عام اعلان سرزمینِ ہند مین کر دیا تھا،

مسلمان آباد ہین، وہ اس معاہدہ کے ساتھ ہی آباد ہین، کہ حکومت وقت کے قانون کی خلاف ورزی نہ کرینگے، اب اگر چوری ڈاکہ یا فریب وغیرہ ذرائع سے ملک کے کسی باشندے کا روپیہ کوئی لے گا، تو غدر (عہد شکنی) کے اسلامی جرم کا وہ مرتکب ہی، بخلاف ربوا (سود) کے کہ موجودہ حکومت نے اس ذریعہ سے لین دین کو ناجائز نہین قرار دیا ہے، پس یہ حکومت وقت کے ساتھ غدر (عہد شکنی) نہین ہے، اور بغیر کسی عہد شکنی کے مسلمان کے قبضہ مین جب اس ملک کے غیر مسلم باشندہ کا روپیہ آئے تو معًا قبضہ کے ساتھ ہی وہ اس کا مالک ہوجاتا ہے، امام ابوحنیفہ کا یہ اتنا مستحکم قانونی نقطۂ نظر ہے کہ اس قسم کے اموال کی حرمت کی کوئی دلیل شرعی پیش کرنا مشکل ہے، میرا مطلب یہ ہو کہ ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے اموال کے عدم اباحت کی دلیل پیش کرنا آسان نہین ہے، چہ جائیکہ ان کی حرمت کا دعوٰی؟ اور یہی اس معاشی مسئلہ کی بنیاد ہے، افسوس کہ علمائے اسلام نے اسلام کے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہین کیا، ورنہ ادھر سو ڈیڑھ سو سال مین مسلمان جن معاشی دقتوں مین مبتلا ہوگئے، غالبًا صورتِ حال یہ نہ ہوتی، ملک کے باشندون کا ایک طبقہ صرف لیتا رہا، اور دوسرا طبقہ صرف دیتا رہا، اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک مین پیدا ہوگیا ہے، اس کی ذمہ داری اسلام پر نہین، بلکہ زیادہ تر علماء پر اس لئے ہو کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورتِ حال کا علاج موجود تھا، لیکن اونھون نے ایک جزو پر عمل کیا، اور دوسرے کو ترک کر دیا، اور اب تو شاید مرض لاعلاج ہوچکا ہو،

اس مسئلہ کا ذکر چاہئے تو یہ تھا کہ مین سود کے باب مین کرتا، جیسا کہ عمومًا فقہ کی کتابون میں کیا گیا ہو، لیکن سچی بات یہ ہو کہ اس کا تعلق ربوا کے باب سے نہین ہو، بلکہ بین الاقوامی معاشی تعلقات کا یہ ایک قدرتی نتیجہ ہے، اسی لئے بات بآسانی سمجھ مین آجاتی ہے، بخلاف اس باب کے جہان خود مسلمانون کے باہمی مالی و معاشی معاملات سے بحث کیجاتی ہو، غیر موزون مقام پر درج ہونے کی وجہ سے امام صاحب کا صحیح نقطۂ نظر لوگون کے

سلہ اسی لئے ان لوگون سے جو اس مسئلہ مین امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا انکار کرنا چاہتے ہین، میرا مطالبہ ہو کہ قرآن و حدیث و اجماع و قیاس الغرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کے عدم اباحت کا ثبوت پیش کرسکتے ہون تو پیش کرین،

سامنے نہین آتا، بہرکیف مذکورۂ بالا چند استثنائی صورتون کے سوا باہمی لین دین کو قرآن نے

عن تراض منکم — باہمی رضامندی سے لین دین ہو،

پر مبنی کیا ہے یعنی کوئی کسی کے مال کو اس کی مرضی کے بغیر اپنی ملک نہین بنا سکتا، اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فقہائے اسلام نے تمام معاشی ابواب کے قوانین کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، ظاہر ہے کہ لین دین مین باہمی "مراضاۃ" کی شرط تقریباً تمام متمدن اقوام کے قوانین مین مسلّم ہے، چوری، ڈاکہ، فریب، دھوکا، غصب وغیرہ کو جرم اسی بنار پر قرار دیا گیا ہے، کہ ان تمام شکلون میں مالک کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے،

لیکن اسلام نے اس عام قانون کے سوا "مالی معاملات" اور لین دین کے متعلق چند اور امور کا اضافہ بھی کیا ہے، جن مین پہلی اصل تو وہ ہے جس کا ذکر قرآن مین

لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل، — باطل طریقہ سے باہم ایک دوسرے کا مال نہ کھایا کرو۔

کے الفاظ مین کیا گیا ہے، اور دوسری اصل قرآن ہی مین

لاتظلمون ولاتظلمون — نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے،

کے دو مختصر لفظون مین مذکور ہے، ہم اس وقت ان ہی دو اصول اور ان کے نتائج پر بحث کرنا چاہتے ہین کہ "اسلامی معاشیات" کی تصحیح وارتقا مین ان دو قاعدون کو میرے خیال مین بہت زیادہ دخل ہے،

اکل بالباطل کا مطلب پہلی بات یعنی باہم ایک دوسرے کا مال باطل نہ کھایا جائے، پہلے اس کے مفہوم کو سمجھ لینا چاہئے، مثال سے اس کو یون ذہن نشین کیا جا سکتا ہے، مثلاً ایک شخص آپ کا کوئی کام کرکے یا آپ کو اپنی کوئی چیز دے کر یا اپنی چیز سے آپ کو نفع اٹھانے کا موقع دے کر اگر آپ سے آپ کا مال لیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ آپ پر اپنا ایک حق قائم کرنے کے بعد اس کے معاوضہ مین آپ کا مال لے رہا ہے لیکن اس کے مقابلہ مین کوئی حق قائم کئے بغیر اگر آپ کا مال لینا چاہتا ہے، تو یہی اکل بالباطل ہے یعنی بغیر کسی حق کے

آپ کا مال لے رہا ہے، یہ تو الفاظ کا مطلب ہوا، اب ظاہر ہے کہ دنیا مین کاروبار کی ساری سرگرمیان اسی مبنی ہین کہ ہر شخص ایک دوسرے کی ضرورت کو پوری کر رہا ہے، اگر اسی شکل کو یک طرفہ کر دیا جائے یعنی دینے والون کو لینے والون سے کچھ نہ ملے، تو نہ زراعت چل سکتی ہے، نہ تجارت، نہ حرفت، نہ صنعت، جب معاوضہ ادا کئے بغیر لوگون کو زندگی کی ضروریات ملنے لگین گی تو پھر خواہ مخواہ معاوضہ کے مہیا کرنے کی فکر مین کوئی کیون مشغول ہوگا، نتیجہ یہ ہوگا، کہ ملک کے باشندون کی توانائیون کا ایک بڑا حصہ دنیا مین آ آ کر اپنی قیمت حاصل کئے بغیر قبر مین دفن ہوتا چلا جائے گا، نیز ان کے دل و دماغ اور عملی جد و جہد سے ملک کو اپنے معاشی ارتقا مین جو مدد مل سکتی تھی، اس سے وہ محروم ہو جائے گا،

گداگری کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر یہی وہ بنیاد ہے کہ گو دنیا کے اکثر حصون مین گداگرون اور سائلون کو صرف یہی نہین کہ مجرم نہین سمجھا جاتا تھا، بلکہ بعض علاقون مثلاً ہندوستان مین عظمت و احترام کی آخری بلندیون پر وہی لوگ قابض تھے، اور اب تک ہین، جن کا گذارہ بھکشا اور دان پُن پر ہے، سمجھا جاتا ہے کہ یہ بڑی نیکی اور پُن کی بات ہے، لیکن معاشی نقطۂ نظر سے یہ کتنا بڑا خسارہ ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، اسلام نے صرف یہی نہیں کہ کھاتے پیتون کے لئے سوال کو جرم قرار دیا ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

من سال الناس عن ظھر غنی فانما یستکثر من جمر جھنم (صحاح) — باوجود غنی ہونے کے جو لوگون سے بھیک مانگتا ہے وہ جہنم کے انگارے جمع کر رہا ہے،

یعنی باوجود "غنا (استطاعت)" کے جو بھیک مانگتا ہے، وہ جہنم کے انگارون کو اکٹھا کر رہا ہے، اور غنا سے بھی مراد یہ نہین ہے کہ کافی دولت و ثروت رکھتا ہو، بلکہ اسی حدیث مین ہے کہ پوچھنے والے نے دریافت کیا

یا رسول اللہ ما ظھر غنی — غنی کا یا رسول اللہ کیا مطلب ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے جواب مین جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانون کے لئے باعث عبرت ہے، ارشاد ہوا،

ان یعلم ان عند اھلہ مایغدیھم — جو یہ جانتا ہے کہ اس کے گھر میں اتنا سرمایہ

ومایعشیھم، — ہو کہ جس کے ذریعے صبح و شام کی غذا مہیا ہو سکتی ہے،

خواہ وہ کسی شکل میں مہیا ہو سکتی ہو، شلا جو یا جواری، باجرہ کی روٹی ہی کیوں نہ ہو، بہرحال اتنے معمولی سرمایہ رکھنے والے کے لئے بھی اسلام نے سوال کو قطعاً حرام کر دیا ہے، اور اگر کسی کے پاس مالی سرمایہ نہ ہو، لیکن ہاتھ پاؤں کا سرمایہ اور اتنی قوت رکھتا ہو کہ کما کر کھا سکے، اس کے متعلق بھی ارشاد ہے

لاتحل الصدقۃ لغنی ولا لذی — صدقہ حلال نہیں ہو صاحب غنا کے لئے

مرۃ سوی، — نہ مضبوط توانا کے لئے،

لاحق فیھا لغنی ولا لقوی — صدقہ میں حق نہ کسی غنی کا ہے، اور نہ کمانیوالے

مکتسب — توانا آدمی کے لئے اس میں (صدقہ میں) حصہ ہے

بہرحال بجز چند مخصوص صورتوں کے جن کی فقہا نے تشریح کر دی ہے، ملک کے ہر باشندے پر جس میں کسی قسم کی بھی مالی یا بدنی صلاحیت ہو، عموماً اسلام نے سوال کو حرام کر دیا ہے، اور اس سے یہی غرض ہے کہ اس قسم کی تمام قوتیں ملک کے معاشی ارتقاء میں اپنی اپنی وسعت کی حد تک ہاتھ بٹائیں، اس نظام میں مسلمانوں کو کون کہہ سکتا ہے،

تندرست و توانا آدمی کو بھیک دینا بھی ناجائز ہے — ان کو شاید معلوم نہیں کہ اسلام میں لینے والوں ہی پر عموماً بھیک حرام نہیں ہے، بلکہ فقہاء کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ مذکورۂ بالا صفات یعنی کم از کم مالی یا بدنی صلاحیت رکھنے والوں کو بھیک دینا بھی ناجائز ہے، علامہ ابن نجیم حنفی نے الاشباہ والنظائر میں مذکورۂ بالا صورتوں کے متعلق لکھا ہے،

ان السائل والمعطی آثمان، — بھیک مانگنے والے اور بھیک دینے والے

دونوں مجرم ہیں،

سائل اور گداگر کے مجرم ہونے کی وجہ تو ظاہر ہی ہے لیکن دینے والوں کو مجرم کیوں قرار دیا جاتا ہے اسکی وجہ اونھوں نے لکھی ہے،

فلکونہ معیناً علی الحرام، اس نے حرام میں مجرم کی مدد کی،

اگرچہ بعض علماء کو اوس سے اختلاف ہے، مولانا انور شاہ صاحب کشمیری نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ

لوعلم المعطی ان السائل — اگر دینے والا یہ جانتا ہو کہ سوال کرنے والا

لا یتخذہ کسبا فلا اثم علیہ — اس کو اپنا پیشہ نہ بنائے گا، تو ایسے دینے والے

ولو علم انہ یتخذہ کسبا — کو گناہ نہ ہوگا، اور اگر یہ جانتا ہو کہ

ویعتاد السوال فھو آثم[1] — وہ بھیک کو اپنا پیشہ بنائے گا، تو دینے والا

(العرف الشذی ص ۲۹۱) بھی گنہگار ہوگا، (باقی)

---

[1] گداگری کے متعلقہ مسائل کی تھوڑی اور تفصیل آیندہ بھی اپنے مقام پر آنے والی ہے، "فلینتظر"

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کا

تیسرا اڈیشن

بچوں اور عام مسلمانوں کے پڑھنے کے لئے آسان زبان میں سیرت کی یہ مشہور و معروف کتاب سے چھپ کرتی رہی، یہ دکن، پنجاب، یوپی اور بہار کے مختلف اسلامی مدرسوں اور مکتبوں میں داخل نصاب اور ہندی گجراتی اور بنگالی وغیرہ میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا اوسکی زبان بہت آسان اور عام فہم ہے،

ضخامت ۱۶۴ صفحے قیمت: ۱۲

منیجر

موفق الدین عبداللطیف بغدادی

از

مولانا عبدالسلام ندوی

کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کی ایک روایت کا ماخذ عبداللطیف بغدادی کی ایک تاریخی کتاب "کتاب الافادہ والاعتبار فی الامور المشاہدۃ والحوادث المعاینۃ بارض مصر" بھی ہے اور اس لحاظ سے اس مسئلہ کی تحقیق مین ان کا نام ردًّا و قبولاً بار بار آیا ہے لیکن بہت کم لوگ ہین، جو ان کے مفصل حالات سے واقف ہین، حالانکہ ایک اہم اور مختلف فیہ واقعہ کے راوی ہونے کی حیثیت سے ان کے حالات خاص طور پر دلچسپ ہو سکتے تھے لیکن اس خاص واقعہ کو چھوڑ کر بھی ان کے حالات دوسری مختلف حیثیتون سے بھی دلچسپ ہین

فلسفہ اسلام کی تاریخ مین پانچوین اور چھٹی صدی کا زمانہ نہایت اہمیت رکھتا ہے، اس زمانہ مین شیخ بوعلی سینا کی عام شہرت نے دوسرے فلاسفہ کو تقریباً گمنام کر دیا تھا،

کچھ لوگ شیخ الاشراق کے بھی معتقد تھے لیکن ابونصر فارابی کو لوگون نے بالکل بھلا دیا تھا، اور قدما کی کتابون کو تو کوئی شخص آنکھ اٹھا کر بھی نہین دیکھتا تھا لیکن بعض اشخاص ایسے بھی تھے، جو ابونصر فارابی اور قدما کی کتابون سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے، اور شیخ بوعلی سینا کے مخالف تھے، ابتدا مین موفق الدین عبداللطیف بغدادی بھی شیخ بوعلی سینا کے سخت معتقد تھے لیکن بعد کو اسی قسم کے ایک بزرگ سے اُن کی ملاقات ہوئی، تو بحث و مباحثہ کے بعد ان کے قدیم خیالات بالکل بدل گئے، اور معلوم ہوا کہ تمام دنیا کو شیخ بوعلی سینا اور شیخ الاشراق نے گمراہ کر رکھا ہے، اصلی فلسفہ قدما کی کتابون مین ہے، اس لحاظ

سے فلسفۂ اسلام کی تاریخ پر چونکہ ان کے حالات سے روشنی پڑتی ہے، اس لئے وہ خاص طور پر دلچسپی کا موجب ہو سکتے ہین،

وہ ۵۵۷ھ مین بغداد مین پیدا ہوے، اور شیخ ابو النجیب کے دامن مین تربیت پائی، خوش قسمتی سے ان کا خاندان علوم عقلیہ ونقلیہ دونون کا جامع تھا، ان کے والد یوسف علوم شرعیہ یعنی قرآن، حدیث، اصول فقہ اور علم کلام کے ساتھ کسی قدر علوم عقلیہ سے بھی واقف تھے، اور ان کے چچا سلیمان بھی بہت بڑے فقیہ تھے لیکن چونکہ اس خاندان مین غلبہ علوم شرعیہ کا تھا، اس لئے بچپن مین شیخ موفق الدین کی ابتدائی تعلیم حدیث سے شروع ہوئی، لیکن اسی زمانہ میں وہ لکھنا بھی سیکھتے تھے، قرآن مجید، فصیح، مقامات اور دیوان متنبی بھی حفظ کرتے تھے اور ایک مختصر کتاب فقہ کی اور ایک مختصر کتاب نحو کی بھی پڑھتے تھے، جب بڑے ہوئے تو اُن کے والد ان کو شیخ کمال الدین عبد الرحمن الانباری کی خدمت مین لے گئے، جو اس وقت بغداد کے شیخ اور اون کے پرانے دوست تھے، اونھون نے اُن سے فصیح کا خطبہ پڑھنا شروع کیا، لیکن ان کی طویل تقریر کا ایک حرف بھی نہ سمجھے، البتہ اون کے اور تلامذہ ان کی تقریر کو نہایت پسند کرتے تھے لیکن شیخ کمال الدین انباری نے خود کہا کہ مین بچون کو تعلیم نہین دیتا، بلکہ ان کو اپنے شاگرد وجیہ الواسطی کے سپرد کر دیتا ہون، جب ان کی تعلیم سے وہ متوسط درجہ کی قابلیت حاصل کر لیتے ہین، تو خود تعلیم دیتا ہون،

وجیہ واسطی ایک نابینا اور دولت مند شخص تھے، اور بعض رئیسون کے بچون کو تعلیم دیتے تھے، انھون نے نہایت خوشی سے ان کو ہاتھون ہاتھ لیا، اور صبح سے شام تک نہایت لطف و محبت کے ساتھ تعلیم دیتے رہے، وہ مسجد ظفریہ مین اُن کے حلقۂ درس مین شریک ہوتے تھے، اور وہ ان کو تمام کتابون کے درس مین شرکت کا موقع دیتے تھے، پھر خاص طور پر ان کی درسی کتابین پڑھاتے تھے، مسجد سے نکلنے کے بعد راستے مین بھی بحث و مذاکرہ جاری رکھتے تھے، پھر جب ان کے گھر پہونچتے تھے، تو وہ خود اپنی درسی کتابین نکالتے تھے، اور عبد اللطیف بغدادی بھی اون کے ساتھ ان کو یاد کرتے تھے، پھر وہ شیخ کمال الدین کے پاس جاکر اپنی درسی کتابین پڑھتے تھے

تو عبداللطیف بغدادی بھی ان کو سنتے تھے، یہان تک کہ حفظ و فہم مین ان سے بھی بڑھ گئے، اب جس قدر ان کی علمی قابلیت بڑھتی جاتی تھی، وہ ایک اوستاد کو چھوڑ کر دوسرے استاد کی خدمت مین جاتے تھے، اور ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے، اس طرح اونھون نے جو کتابین پڑھین یا ان کو حفظ کیا، یا ان کے مطالعہ مین رہین ان کے نام یہ ہین، اللمع، شرح المتوانین، شرح الشریف عمر بن حمزہ، شرح ابن برہان، ادب الکاتب، تقویم اللسان، مشکل القرآن، غریب القرآن، ایضاح ابو علی فارسی اور اوسکی شرحین، تکملہ، مقتضب للمبرد، کتاب ابن درستویہ، نحو، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، زہد اور تصوف مین شیخ کمال الدین کی ۱۳۰ کتابین، کتاب سیبویہ، کتاب الاصول لابن السراج، فرائض، عروض للخطیب التبریزی، معانی زجاج، علم حدیث مین ان کے شیخ ابو الفتح محمد بن عبد الباقی المعروف بابن البطی، ابو زرعہ طاہر بن محمد المقدسی، ابو القاسم یحیی بن ثابت وغیرہ تھے، اور ان سے اونھون نے بچپن مین علم حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی، اس کے بعد اونھون نے شیخ ابن فضلان سے حدیث اور فقہ پڑھی، اور شیوخ بغداد، شیوخ خراسان، شیوخ شام، اور شیوخ مصر سے علم حدیث کی سند حاصل کی،

منطق و فلسفہ مین ان کے اساتذہ کا نام نہین معلوم ہوتا، اونھون نے اپنے اساتذہ مین امین الدولہ ابن التلمیذ کے ایک لڑکے کا نام لیا ہے، اور چونکہ وہ عیسائی تھا، اس لئے لازمی طور پر اوس سے علم طب یا دوسرے علوم حکمیہ کی تعلیم حاصل کی ہوگی، لیکن عقلی علوم کی طرف جس طرح ان کا میلان پیدا ہوا، اوسکی تاریخ اونھون نے خود یہ بیان کی ہے، کہ بغداد مین ایک مغربی شخص صوفیانہ وضع مین آیا، جو ابن ناتلی کے نام سے مشہور تھا، اور اپنے آپ کو ملثمین کی اولاد مین شمار کرتا تھا، اور مغرب پر عبد المومن کے تسلط و اقتدار کے بعد وہان سے نکل بھاگا تھا، جب اوس نے بغداد مین قیام کیا، تو اوس کے حسن تقریر، اوسکی وجاہت، اور مذہبی حالت نے لوگون کو گرویدہ کر لیا، اور اکابر و اعیان کی ایک جماعت اوس سے ملنے کے لئے آئی، مین بھی اوسکی خدمت مین حاضر ہوا، اور اس سے مقدمۂ حساب اور نحو مین مقدمہ ابن بابشاذ پڑھا، اوس کا طریقۂ تعلیم

ایسا عجیب تھا کہ لوگ اوس کو بڑا ماہر فن سمجھتے تھے لیکن درحقیقت وہ سطحی معلومات رکھتا تھا، البتہ کیمیا، اور
طلسمات وغیرہ کی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا تھا، اور ابن وحشیہ اور جابر کی تمام کتابیں چھان ڈالی تھیں، اور
اپنی شکل وصورت اور گفتگو سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرلیتا تھا، اس نے میرے دل کو تمام علوم
کے شوق سے لبریز کر دیا، اس کے بعد وہ تو خود چلا گیا، لیکن میں ہمہ تن تحصیل علوم میں مشغول ہوگیا، اور
امام غزالی کی کتابوں یعنی مقاصد الفلاسفہ، معیار، میزان اور محک النظر کا مطالعہ کرنا شروع کیا، پھر شیخ
بوعلی سینا کی تمام چھوٹی بڑی کتابوں کی طرف متوجہ ہوا، اور کتاب النجاۃ حفظ کر ڈالی، اور شفا کو اپنے
ہاتھ سے لکھا، شیخ بوعلی سینا کے شاگرد بہمن یار کی کتاب التحصیل پڑھی، اور جابر بن حیان صوفی اور ابن وحشیہ
کی کتابیں بھی پڑھیں، اور کیمیا سازی کرنے لگا، اس گمراہی میں مجھکو سب سے زیادہ شیخ بوعلی سینا کی اوس
کتاب نے مبتلا کیا جو اوس نے فن کیمیا میں لکھی ہے، اور اس سے اپنے فلسفہ کی تکمیل کی ہے،

۵۸۵ھ تک اون کی تحصیل علمی کی یہ سرگذشت ہے، اوس کے بعد بغداد میں ان کو کوئی قابل
اوستاد نظر نہیں آیا، اس لئے وہ موصل میں چلے آئے، اور یہاں بھی ان کی تمنا پوری نہیں ہوئی، یہ
صرف کمال بن یونس ایک شخص تھے، جو فقہ اور ریاضیات کے تو ایک جید عالم تھے، باقی حکمت کی اور شا
سے معمولی واقفیت رکھتے تھے، لیکن وہ اپنا دماغ اور وقت صرف کیمیا سازی میں صرف کرتے تھے
اس کے علاوہ ہر چیز کو ہیچ سمجھتے تھے، یہاں ایک بہت بڑی جماعت نے شیخ عبداللطیف بغدادی سے
ملاقات کی، اور ان کے سامنے بہت سے مناصب پیش کئے، لیکن ان میں انھوں نے مدرسہ ابن المہ
المعلقہ اور اس کے ماتحت دار الحدیث کی خدمت کو اختیار کیا، اور ایک سال تک شب وروز اس م
مصروف رہے، اور اہل موصل پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا، یہاں انھوں نے شیخ شہاب الدین
کی فلسفہ دانی کا غیر معمولی شہرہ سنا، تو ان سے ملنے کا قصد کیا، لیکن ان کے یہاں جانے سے پہلے ا
نے کمال بن یونس سے جو ان کے معتقدین میں تھے، ان کی چند کتابیں لیں اور تلویحات، لمحہ اور مو

کا مطالعہ کیا، لیکن ان کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ دنیا جہالت میں مبتلا ہے، اس کے بعد وہ دمشق مین آئے، تو وہان اعیان بغداد اور دوسرے شہرون کے علماء کی ایک بہت بڑی جماعت نظر آئی جس کو سلطان صلاح الدین کی فیاضی اور قدر دانی نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا، ان مین بعض لوگون سے اونھون نے مناظرے کئے، اور اُن پر غالب آئے، اور یہان بہت سی کتابین تصنیف کین، دمشق مین ان کی ملاقات شیخ عبد اللہ بن ناتلی سے ہوئی جن کے متعلق وہان دو فریق ہو گئے تھے، ایک ان کا موافق اور ایک مخالف تھا، خطیب دولعی ان کے مخالف اور بہت سے اعیان ان کا برا ان کے موافق تھے، لیکن اونھون نے خود کیمیا سازی اور فلسفیانہ مباحث کو چھیڑ کر اپنے آپ کو مطعون کر دیا، شیخ عبد اللطیف بغدادی نے اون سے مل کر بہت سے علوم پر مباحثے کئے، لیکن ان کو معمولی درجہ کا عالم پایا، اس لئے ان کے ساتھ ان کو جو حسن ظن تھا، وہ قائم نہین رہا، اس لئے ان کے یہان آنا جانا کم کر دیا، پھر عبد اللہ بن ناتلی نے ظاہر عکا میں سلطان صلاح الدین سے مل کر دولعی کی شکایت کی، اور وہان سے بیمار ہو کر واپس آئے، تو شفاخانہ مین داخل کر دیئے گئے، اور وہین اون کا انتقال ہو گیا اور ان کی کتابین دمشق کی پولیس نے اپنے قبضہ مین لے لین، اس کے بعد شیخ عبد اللطیف بغدادی بیت المقدس کی زیارت کو گئے، اور اوس کی زیارت سے فارغ ہو کر ظاہر عکا مین سلطان صلاح الدین سے ملنا چاہا، اور پہلے قاضی فوج بہاء الدین بن شداد سے ملاقات کی، وہ موصل ہی مین ان کی شہرت سُن چکے تھے، اس لئے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، اور کہا کہ عماد الدین کاتب کے یہان چلین، انکا خیمہ بھی قاضی بہاء الدین کے خیمہ سے ملا ہوا تھا، وہ گئے تو اونھون نے ان سے علم کلام کے چند مسائل پر گفتگو کی، اور کہا کہ چلو قاضی فاضل کے یہان چلین، یہ ان سب کے ساتھ قاضی فاضل کی خدمت مین گئے، تو ان کو ایک نحیف الجثہ بزرگ نظر آئے، جو ہمہ تن قلب و دماغ تھے، وہ خود بھی لکھ رہے تھے، اور دو شخصون سے لکھوا بھی رہے تھے، اسی حالت مین اونھون نے اُن سے قرآن مجید کے متعلق چند نحوی سوالات کئے اور بہت سے مسائل پوچھے اور کہا کہ دمشق مین چلے جاؤ وہان تم کو وظیفہ مل جائیگا لیکن عبد اللطیف بغدادی نے کہا کہ مین مصر جانا چاہتا ہون اونھون نے کہا

کہ فرنگیون نے چونکہ عکا پر قبضہ کر لیا ہے، اور مسلمانون کا کشت و خون کیا ہے، اس لئے سلطان پریشان خاطر ہے، لیکن اونھون نے کہا کہ مجھے مصر جانا ضروری ہے، تو قاضی فاضل نے مصر مین اپنے وکیل ابن سنا الملک کو ایک مختصر سا رقعہ لکھدیا، اس لئے اوس نے ان کو ایک آرام دہ مکان مین اوتارا، اور اشرفیان اور غلہ لیکر آیا، اس کے بعد ارکان سلطنت کے یہان جاکر کہا، کہ یہ قاضی فاضل کے مہمان ہین، اب ان پر ہدایا و صلات کی بارش ہونے لگی، ہر دسوین دن سرکاری مہمات کے متعلق قاضی فاضل کا ایک سلسلہ دیوان مصر مین آتا تھا، اور اس مین خاص طور پر شیخ عبد اللطیف بغدادی کے ساتھ عمدہ سلوک کرنے کی ہدایت ہوتی تھی، اونھون نے مسجد حاجب لولو مین قیام کیا، اور لوگون کو تعلیم دینے لگے، وہ مصر مین صرف تین آدمیون سے ملنے کے لئے آئے تھے، ایک یاسین سیمیائی، دوسرے موسیٰ بن میمون یہودی، تیسرے ابو القاسم الشارعی ان مین سب کے سب ان سے ملنے کے لئے آئے، اور ان کو ان سب کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقع ملا، یاسین سیمائی محض ایک شعبدہ گر نکلا، اوس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ وہ جس مقدار مین چاہتا تھا، اور جس وقت چاہتا تھا، استشرفیون کا ڈھیر لگا دیتا تھا، اور نیل کے پانی کو خیمہ بنا دیتا تھا، اور اس کے نیچے اپنے رفقا کے ساتھ بیٹھتا تھا، موسیٰ بن میمون غیر محدود علم رکھتا تھا، لیکن سخت دنیا دار اور جاہ پرست تھا اوس نے یہود کے لئے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام کتاب الدلالۃ رکھا تھا، اوس نے یہ کتاب اصول شرائع و اصول عقائد کی اصلاح کے لئے لکھی تھی، لیکن درحقیقت اوس سے ان کی تخریب ہوتی تھی لیکن ابھی تک ابو القاسم الشارعی سے ملاقات نہین ہوئی تھی، اس کی تقریب یہ ہوئی، کہ وہ ایک روز مسجد مین بیٹھے ہوئے تھے، اور ان کے گرد لوگون کا ایک بڑا مجمع تھا اسی حالت مین ایک وجیہ شخص پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے آیا، اور سب لوگ اوس سے مرعوب ہو گئے، اور اوس کو سب کے اوپر بٹھایا، جب مجلس ختم ہو گئی، تو عبد اللطیف بغدادی کے پاس مسجد کے امام نے آکر کہا کہ آپ اس شیخ کو پہچانتے ہین، یہ ابو القاسم الشارعی ہین، اونھون نے ان کو گلے لگایا، اور کہا کہ مین آپ ہی سے ملنے کے لئے آیا ہون، اب وہ ان کو

، مکان پر لے گئے، اور کھانا کھانے کے بعد گفتگو شروع ہوئی، توان کی دلی مراد پوری ہوئی، اونکی
ت اور سیرت دونوں حکیمانہ تھی، دنیوی مال و اسباب مین سے بقدر کفاف پر قناعت کرلی تھی اُو
صحبت رہی، تو معلوم ہوا کہ وہ قدما، اور ابونصر فارابی کی کتابون کے سب سے بڑے ماہر ہین، لیکن خود
عبداللطیف بغدادی کو قدما، اور ابونصر فارابی سے کوئی عقیدت نہ تھی، ان کا خیال تھا کہ حکمت
زانہ صرف شیخ بوعلی سینا نے اپنی کتابون مین بھر دیا ہے، اس پر دونون مین بڑی بحثیں رہین، شیخ
اللطیف بغدادی اپنے عقیدہ پر شدت سے قائم تھے، اور وہ اس عقیدے کو بدلنا چاہتے تھے، اور
غرض سے ابونصر فارابی، اسکندر اور ثامسطیوس کی کتابین دکھاتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ بھی مذبذب
گئے، اسی حالت مین یہ خبر پھیلی کہ سلطان صلاح الدین نے فرنگیون سے صلح کرلی ہے، اور بیت المقدس
واپس آگیا ہے، اس لئے عبداللطیف بغدادی بھی بیت المقدس مین آئے، اور جہان تک ممکن ہوسکا
مار کی کتابین ساتھ لیتے آئے، یہان سلطان صلاح الدین کی علمی مجلس مین اُن کو شرکت کا موقع ملا
اُس نے اُن کے لئے ۳۰ دینار ماہوار کا وظیفہ مقرر کردیا، سلطان کی اولاد نے بھی ان کے لئے وظائف
رکئے، اور اس طرح اون کے لئے سو دینار ماہوار کے وظائف مقرر ہوگئے، اب وہ دمشق مین واپس
ے، اور جامع دمشق مین لوگون کو تعلیم دینے لگے، اب قدما کی کتابون کا بغور مطالعہ کیا، توان کا شوق
تھا، اور بوعلی سینا کی کتابون کا شوق گھٹتا گیا، کیمیا سازی کی لغویت سے بھی ان کو واقفیت ہوئی،
ران کے بیان کے موافق ان کو دو ہلاکت خیز گمراہیون سے جن مین تمام دنیا مبتلا تھی، نجات حاصل ہوئی،
ب بوعلی سینا کی کتابین دوسرے کیمیا سازی کا شوق، اس کے بعد سلطان صلاح الدین کا انتقال ہوگیا
راس کی اولاد ادھر اودھر پھیل گئی، اور مصر کی شادابی اور سرسبزی کی وجہ سے ان مین اکثر لوگ مصر چلے
ئے لیکن شیخ عبداللطیف بغدادی نے دمشق ہی مین قیام کیا، اس وقت دمشق کا بادشاہ سلطان صلاح الدین
بڑا لڑکا ملک الافضل تھا، ملک العزیز نے مصری فوجون کو لیکر دمشق پر چڑھائی کی، اور اپنے بھائی کو

محاصرے میں لے لیا لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی، اور وہ درد قولنج کے لاحق ہو جانے سے مرج الصفر میں چلا گیا، جب اس کو درد سے نجات حاصل ہوئی تو شیخ عبد اللطیف بغدادی اوس سے ملنے کو گئے، تو وہ ان کو بھی ساتھ لیتا گیا، اور بیت المال سے بقدر ضرورت ان کا وظیفہ مقرر کر دیا، اب اونھون نے شیخ ابو القاسم شارعی کے ساتھ قیام کیا، اور شب و روز ان سے صحبت رہنے لگی، یہان تک کہ شیخ ابو القاسم شارعی نے انتقال کیا،

اس زمانہ مین ان کا مشغلہ یہ تھا کہ صبح سے چار گھنٹہ تک جامع ازہر مین تعلیم دیتے تھے، دوپہر کے وقت لوگ ان سے طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے، دن کے اخیر حصہ مین پھر جامع ازہر میں آتے تھے، اور دوسرے لوگ اُن سے پڑھتے تھے، اورہات کو اپنا کام کرتے تھے، پھر ملک العزیز کا انتقال ہوگیا تو اس کے بعد بھی وہ ایک مدت تک مصر مین مقیم رہے، اور سلطان صلاح الدین کی اولاد کی طرف سے ان کو وظیفہ ملتا رہا، اسی زمانہ مین مصر پر قحط اور وبا کی مصیبتین نازل ہوئیں، اور اونھون نے اس کے متعلق ایک کتاب، کتاب الافادہ والاعتبار کے نام سے لکھی، جس مین اس قحط اور وبا کے چشم دید اور متنفر لرزہ خیز واقعات درج کئے، اس کے بعد جب سلطان ملک العادل سیف الدین ابو بکر ایوب نے مصر و شام اور مشرق کے اکثر شہرون پر قبضہ کیا، اور سلطان صلاح الدین کی اولاد کے ہاتھ سے سلطنت نکل گئی، تو وہ بیت المقدس مین چلے آئے، اور وہان قیام کرکے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف مین مشغول ہوگئے، پھر ۶۰۴ھ مین دمشق مین آئے، اور مدرسہ عزیزیہ مین تعلیم دینے لگے، اس سے پہلے ان کی شہرت علم نحو مین تھی، لیکن اب وہ طب مین مشہور ہوئے، اور اس فن میں بہ کثرت کتابین تصنیف کیں، اس کے بعد مختلف شہرون کا سفر کرتے رہے، لیکن ان کا قیام زیادہ تر حلب مین رہا، اور وہان طب اور حدیث کا درس دیتے رہے، اور ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا، وہ حلب سے نکل کر دمشق مین دوبارہ قیام کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس سے پہلے بغداد کے راستے سے حج کے سفر کا ارادہ کیا،

بان خلیفہ مستنصر باللہ کی خدمت مین اپنی چند تصنیفات پیش کرسکین، لیکن بغداد مین پہنچکر بیمار ہوئے اور محرم ۶۲۹ھ مین انتقال کیا، اور بہ مقام وردیہ اپنے باپ کی قبر کے پاس مدفون ہوئے،

شیخ عبداللطیف بغدادی سے علامہ ابن ابی اصیبعہ کے خاندانی تعلقات تھے، علامہ ابن ابی اصیبعہ کے دادا جس زمانہ مین مصر مین تھے، اسی زمانہ مین شیخ عبداللطیف بغدادی بھی مصر مین تھے، اور اس بنا پر دونون مین گہرے دوستانہ تعلقات تھے، اور علامہ ابن ابی اصیبعہ کے باپ اور چچا اون سے علم ادب کی تعلیم حاصل کرتے تھے، علامہ ابن ابی اصیبعہ کے چچا نے اُن سے ارسطو کی کتابین بھی پڑھی تھین، وہ آخری عمر دمشق مین آئے، تو خود علامہ ابن ابی اصیبعہ نے بھی دیکھا، ان کا بیان ہے، کہ وہ نحیف الجثہ میانہ قد آدمی تھے، اور ان کو اپنے علم و فن پر بڑا ناز تھا، وہ اپنے زمانہ کے علما اور بہت سے علماے قدیم کی تنقیص کیا کرتے تھے، اور اس مین حدِ اعتدال سے گذر جاتے تھے، وہ علماے عجم بالخصوص شیخ بو علی سینا پر بہت زیادہ اعتراضات کیا کرتے تھے،

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے شیخ عبداللطیف بغدادی کے بہت سے تعلیمی خیالات نقل کئے ہین، جو غور سے سننے اور پڑھنے کے قابل ہین، وہ فرماتے ہین، کہ تم کو اپنی سمجھ پر کتنا ہی اعتماد ہو، لیکن محض کتب بینی سے علم نہ حاصل کرو، بلکہ ہر علم کو دو اوستادون سے حاصل کرو، اگر ایک استاد ناقص ہو تو جو کچھ علم اوس کے پاس ہے، اوس کو حاصل کرلو، پھر اوس سے زیادہ باکمال اوستاد مل جائے، تو اوس کو چھوڑ دو، جب کوئی کتاب پڑھو تو اوس کو حفظ یاد کرلو، یہان تک کہ اگر اوس کتاب کا وجود بھی باقی نہ رہے، تو تم کو اسکی پروانہ ہو،

جب کوئی کتاب پڑھو، تو اوس کے ساتھ دوسری کتاب نہ پڑھو، بلکہ جو وقت دوسری کتاب کے پڑھنے مین صرف کرنا چاہتے ہو، وہ اسی کتاب مین صرف کرو،

ایک ساتھ دو علم کی تعلیم نہ حاصل کرو، بلکہ سال دو سال تک صرف ایک ہی علم کی تحصیل مین مصروف رہو، جب اوس سے فارغ ہو جاؤ، تو دوسرے علم کی طرف توجہ کرو، جب کوئی علم حاصل کرچکو تو صرف

اسی بنا پر قناعت نہ کرلو، بلکہ بحث ومباحثہ، غور وفکر، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ سے اوس کو ترقی دیتے رہو،

جب کسی علم کی تعلیم دو تو اوس کے ساتھ دوسرے علوم کی آمیزش نہ کرو، کیونکہ ہر علم مستقل حیثیت رکھتا ہے، اس لئے جو شخص اوس کے ساتھ دوسرے علم کی آمیزش کرتا ہے، وہ گویا ایک زبان کی تعلیم دوسری زبان کے ذریعہ سے دیتا ہے،

انسان کو علم تاریخ وسیر کی تعلیم بھی حاصل کرنی چاہئے تاکہ اوسکو گذشتہ قومون کو عیب و ہنر سے بھی واقفیت حاصل ہوجائے، انسان کو صدر اول کی روش اختیار کرنی چاہئے، اس کیلئے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو پڑھنا چاہئے، اس طرح جب اوس کو معلوم ہو جائے گا، کہ خورد و نوش وضع لباس، صحت ومرض وغیرہ مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طرز تھا، اور آپ اپنے اصحاب، ازواج مطہرات اور دشمنون کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے، اور وہ اس پر تھوڑا بہت بھی عمل کریگا تو ایک سعادتمند انسان ہوجائیگا

اپنی ذات سے ہمیشہ بدگمان ہو، اور اپنے خیالات علماء کے سامنے پیش کرتے رہو، جس شخص نے علماء کے دروازون پر ٹھوکرین نہین کھائین، وہ علم وفن کے میدان مین کبھی ثابت قدم نہ رہے گا،

اگر دنیا تم کو حاصل نہ ہو تو رنجیدہ خاطر نہ ہو، کیونکہ اگر وہ تم کو حاصل ہو جائے گی، تو کسب فضائل مین حائل ہوگی، کیونکہ دولت مند لوگ علم کی تحصیل مین بہت کم جد وجہد کرتے ہین، البتہ اگر وہ بہت زیادہ بلند ہمت ہون یا تحصیل علم کے بعد ان کو دولت حاصل ہو جائے، تو یہ دوسری بات ہے، مین یہ نہین کہتا کہ دنیا طالب العلم سے منہ موڑ لیتی ہے، بلکہ وہ خود اوس سے منہ موڑ لیتا ہے، کیونکہ وہ صرف تحصیل علم مین مشغول رہتا ہے، اس لئے وہ دنیا کی طرف متوجہ ہی نہین ہوتا، دنیا حرص وطمع اور بڑے حیلے حوالے سے حاصل ہوتی ہے، لیکن چونکہ وہ حصول دنیا کے تمام اسباب سے بے پروا ہو جاتا ہے، اس لئے وہ اوس کو حاصل نہین ہوتی، اس کے علاوہ ایک طالب العلم ذلیل پیشون کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے تجارت

کی مختلف قسمون کو اپنے رتبہ سے گرا ہوا پاتا ہے، ارباب دنیا کے سامنے سر نہین جھکاتا، دنیا انھی طریقون سے حاصل ہوتی ہے، اور اس مین بڑا وقت صرف کرنا پڑتا ہے، لیکن ایک شخص جو طلب علم مین مصروف ہے وہ اس دردسر مین مبتلا نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ چاہتا ہے، کہ دنیا یونہی بلا وجہ مل جائے، تو کیا یہ ظلم نہین ہے؟ البتہ ایک آدمی جب کسی علم مین پوری دستگاہ حاصل کر لیتا ہے، اور اس مین مشہور ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے اوس کی مانگ ہوتی ہے، اور اس کے سامنے عہدے پیش کئے جاتے ہین، اب دنیا اوس کے سامنے خود سر بسجود ہو کر آتی ہے، اور اس حالت مین آتی ہے، کہ اوسکی عزت، اور اس کا دین محفوظ و برقرار ہوتا ہے،

علم مین ایک خوشبو ہوتی ہے، جو پکار کر صاحب علم کا نام بتاتی ہے، اس مین ایک روشنی ہوتی ہے، جو صاحب علم کا پتہ دیتی ہے، مشک کا تاجر اور اوس کا سرمایہ چھپا نہیں رہ سکتا، جو شخص اندھیری رات مین مشعل لیکر چلتا ہے وہ مخفی نہیں رہ سکتا، پانی کے چشمے ایک بار خشک ہو جاتے ہین، پھر جوش مارنے لگتے ہین، یہی حال علم کا بھی ہے کہ اوس مین جزر و مد ہوتا رہتا ہے،

علم ایک قوم سے نکل کر دوسری قوم مین اور ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک مین جاتا ہے، اور اس طرح چلتا پھرتا رہتا ہے،

شیخ عبداللطیف بغدادی نہایت کثیر التصنیفات ہین، اور حدیث، تفسیر، علم کلام، طب، فلسفہ، منطق، شعر و ادب، تاریخ غرض ہر فن پر کتابین لکھی ہین، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے ان کی تصنیفات کی فہرست ڈھائی صفحون مین درج کی ہے، اور ان مین بہت سی کتابین اچھوتے مضامین پر ہین، افسوس ہے کہ ان کی فلسفیانہ تصنیفات مین کوئی کتاب ابتک شائع نہین ہوئی، ورنہ امام غزالی، امام رازی، اور ابو البرکات بغدادی کے ساتھ فلسفۂ ارسطو اور فلسفہ ابن سینا کے مخالفین مین ایک اور معزز نام کا اضافہ ہو جاتا، اور فلاسفۂ قدیم کے بہت سے مسائل و نظریات منظر عام پر آجاتے،

کچھ تفسیر رازی کے متعلق

از

مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دار المصنفین

اردو زبان مین غالبًا سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے یہ راز فاش کیا، کہ تفسیر کبیر مکمل امام رازی کی کی تصنیف نہین ہی، بلکہ اس کی تکمیل شمس الدین خلیل دمشقی اور نجم الدین قمولی نے کی ہے،

ایک سلسلۂ تحقیق مین اس بحث سے متعلق بعض نئی چیزین سامنے آئین، وہ اس لئے پیش خدمت ہین کہ شاید دوسرے اہل علم کی نظر دن مین بھی اور کچھ باتین ہون، جو منظر عام پر آسکین!

(۱) پہلی بات یہ ہو کہ تکملہ محض شمس الدین خلیل دمشقی اور نجم الدین قمولی کا مرہون منت نہین ہے، بلکہ ان کے سوا اس خدمت مین اور لوگ بھی شامل ہین، کتب خانۂ خدیویہ مصر کی فہرست مین ہی،[۱]

تم تکملہ جماعة منهم شهاب الدين خليل الخويى الدمشقى المتوفى سنة ٦٣٩ھ و نجم الدين احمد بن محمد القمولى	امام رازی کی تفسیر کا تکملہ ایک جماعت نے کیا، ان میں سے شہاب الدین خلیل دمشقی اور نجم الدین قمولی ہین،

افسوس ہو کہ فہرست کے مرتب نے اپنا ماخذ نہین تبلایا، ورنہ جماعۃ کا شاید کچھ اور سراغ لگتا ؟

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ آج تک یہ امر تحقیق طلب ہو کہ اس تفسیر مین تکملہ نگارون نے کہان سے کہان تک لکھا ہے،؟ فہرست کتب خانۂ خدیویہ مصر کے مرتب نے سید مرتضیٰ شارح قاموس اور سید مرتضیٰ نے شرح شفا، خفاجی کے حوالہ سے بیان کیا ہو، کہ امام رازی نے سورۂ انبیاء تک تفسیر لکھی تھی،[۲]

---

۱ فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر جلد اول ص۲۱۳ ۲ فہرست ر ص۲۱۳،

مولانا شبلی مرحوم نے اس سے اختلاف فرمایا ہے، ان کا ارشاد ہے کہ سورۂ فتح تک امام صاحب کی تفسیر لکھا جانا یقینی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ اس سورہ کی تفسیر کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ ۶۰۳ھ میں تمام ہوئی، اور امام کی عادت ہے کہ ہر سورہ کی تفسیر ختم ہونے کی تاریخ لکھدیتے ہیں، امام نے ۶۰۶ھ میں وفات پائی ہے اس لئے ۶۰۳ھ ان کی زندگی کا زمانہ ہے،

اس سورہ کے بعد پھر کہیں اس قسم کی تصریح نہیں ملتی، جس سے ثابت ہوتا ہی کہ یہیں سے تکملہ نگاروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے[۱]

لیکن اس رائے کے قبول کرنے میں دقت یہ ہو کہ سورۂ فتح سے پیشتر کی بعض تفسیری عبارتیں صاف بتلاتی ہیں، کہ امام رازی اس حصۂ تفسیر کے مصنف نہیں ہیں، مثلاً سورۂ یٰسین کی تفسیر کے آخر میں امام غزالی کا یہ قول درج ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ یٰسین کو قرآن کا قلب اس لئے فرمایا، کہ اس سورہ میں حشر ونشر کے اعتقاد کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے، پھر امام غزالی کی اس رائے کے متعلق تحریر ہے،

واستحسنه فخر الدین الرازی	اس کو امام رازی نے پسند فرمایا، امام
رحمه الله سمعته یترحم علیه بسبب	غزالی کے اس کلام کی وجہ سے میں نے رازی
هٰذا الکلام. (تفسیر کبیر ج ۷ ص ۱۲۱ طبع مصر)	کو ان پر دعائے رحمت کرتے ہوئے پایا،

ظاہر ہو کہ یہ حصۂ تفسیر امام رازی کے کسی دیکھنے والے ہی کا ہو سکتا ہو، اور ہمارے خیال میں وہ شمس الخوئی شاگرد امام رازی ہیں، جن کا تذکرہ بعد کو آئے گا!

اسی طرح سورۂ بقرہ میں حروف مقطعات کے متعلق ایک تفصیلی بحث ہے، پھر سورۂ عنکبوت میں مقطعات کے متعلق دوبارہ ایک مستقل بحث ملتی ہے، اس کے بعد سورۂ ص جس کے آخر میں امام رازی نے تاریخ اختتام درج فرمائی ہی، اس کے شروع میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ سورۂ بقرہ میں حروف مقطعات کے متعلق مفصل بحث گذر چکی ہے، مگر یہاں بعض وجوہ کا ذکر کیا جاتا ہی،

---

[۱] مقالات شبلی جلد ۵ ص ۴۳،

اب سوال یہ ہے کہ سورۂ عنکبوت کی بحث کا امام نے تذکرہ کیون نہین فرمایا؟ حالانکہ وہان اس عنوان پر خصوصی بحث ہے، ہم سمجھتے ہین کہ سورۂ عنکبوت کی تفسیر بھی امام کی نہین ہے جس کا پہلا قرینہ تو یہی ہے کہ اگر انھون نے اس کو لکھا ہوتا، تو اس کا حوالہ ضرور دیتے، دوسرے یہ کہ سورۂ یٰسین کی تفسیر جس کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ امام رازی کی تفسیر نہین ہے،

اس کے شروع مین یہ عبارت ہے،

قد ذکرنا کلاماً کلیاً فی حروف التھجی فی سورۃ العنکبوت[1]،	حرفِ تہجی کے متعلق سورۂ عنکبوت مین ہم نے ایک مفصل گفتگو کی ہے،

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نے سورۂ یٰسین کی تفسیر لکھی ہے، وہی سورۂ عنکبوت کا بھی مفسر ہے، یہ چیز بھی قابلِ لحاظ ہے کہ سورۂ یٰسین کا مفسر سورۂ عنکبوت کی بحث کا حوالہ تو دیتا ہے، لیکن سورۂ بقرہ جہان کئی صفحون مین یہ بحث ہے، اس کا حوالہ نہیں دیتا ہے، کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ سورۂ بقرہ کا حصۂ تفسیر اس کا لکھا ہوا نہین ہے!

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ امام رازی نے تفسیر کبیر کو مسلسل نہین لکھا، بلکہ مختلف اوقات مین مختلف حصے لکھے، اور ان باقی ماندہ حصون کو تکملہ نگار ون نے پورا کیا،

اور اگر مولانا شبلی کے ارشاد کے بموجب تاریخ اختتام کے اندراج کو امام رازی کے تفسیری حصہ کی علامت قرار دیا جائے، تو سورۂ فتح سے پیشتر کی حسب ذیل سورتون کی تفسیر کا امام رازی کی طرف انتساب مشکوک ہو جائے گا، اس لئے کہ ان سورتون مین تاریخ کا اندراج نہیں ہے،

(۱) سورۂ فاتحہ (۲) سورۂ بقرہ (۳) سورۂ مائدہ (۴) سورۂ انعام (۵) سورۂ اعراف (۶) سورۂ حجر، (۷) سورۂ مریم (۸) سورۂ طٰہٰ (۹) سورۂ انبیاء (۱۰) سورۂ حج (۱۱) سورۂ مومنون (۱۲) سورۂ نور

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۷، ص۵۰،

(۱۳) سورۂ فرقان (۱۴) سورۂ شعرا (۱۵) سورۂ نمل (۱۶) سورۂ قصص (۱۷) سورۂ عنکبوت (۱۸) سورۂ روم (۱۹) سورۂ لقمان (۲۰) سورۂ سجدہ (۲۱) سورۂ احزاب (۲۲) سورۂ سبا (۲۳) سورہ فاطر (۲۴) سورۂ یٰسین (۲۵) سورۂ محمد،

ہمارے خیال میں امام رازی کے حصۂ تصنیف اور تکملہ نگاروں کے حصۂ تصنیف میں اسی وقت امتیاز کیا جا سکتا ہے جب کہ تفسیر کبیر کا ایک ایک حرف پڑھا جائے، مصنفین نے جا بجا اپنے اپنے عہد کے علما و مشائخ کا تذکرہ کیا ہے، ان علما و مشائخ کے حالات تلاش کئے جائیں، اس طرح زمانہ کی تعیین ہو جائے گی، اور تعیین زمانہ کے بعد مصنف کا معلوم ہو جانا مشکل نہیں ہے، مثال کے طور پر سورہ (ق) میں آیت وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِیْدِ کی تفسیر میں ایک مصری عالم امام زین الدین[1] کا نام لیا گیا ہے، اب تک ہم امام زین الدین کی شخصیت کا پتہ نہ چلا سکے، لیکن ظاہر ہے کہ ان کے حالات کے معلوم ہو جانے کے بعد زمانہ تصنیف اور مصنف کا پتہ چلانا کیا مشکل ہے!

تفسیر رازی کے تکملہ نگار (۱) تفسیر رازی کے پہلے تکملہ نگار قاضی القضاۃ شمس الدین احمد بن خلیل بن سعادہ بن جعفر بن عیسی المہلبی الشافعی ہیں، یہ شوال ۵۸۳ھ میں پیدا ہوئے، خراسان میں علم کلام پڑھا، فقہ امام رافعی سے اور مناظرہ علاؤ الدین طاؤسی سے حاصل کیا، موید طوسی سے بھی نفع اٹھایا، اور ابن زبیدی اور ابن صلاح سے بھی استفادہ کیا، خود ان کے حلقۂ درس سے بھی جلیل القدر اہل علم پیدا ہوئے، مثلاً تاج الدین ابن ابی جعفر ابو عمرو بن حاجب، جمال محمد بن الصابونی، خود ان کے بیٹے قاضی القضاۃ شہاب الدین محمد، یہ ان کے مشاہیر تلامذہ میں سے ہیں[2]

شمس الدین کو امام رازی سے شرف تلمذ حاصل تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق سبکی نے دو قول نقل کئے ہیں، کہ بعض کے نزدیک یہ امام رازی کے شاگرد تھے، اور بعض کے نزدیک قطب مصری شاگرد رازی

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۷، ص ۴۴۶، اس موقع کے الفاظ یہ ہیں، ھذا وجہ جید مستفاد من الامام زین الدین ادام اللہ فوائدہ [2] طبقات شافعیہ ج ۵ ص ۸،

کے شاگرد تھے لیکن ابن ابی اصیبعہ ۶۶۸ھ جو شمس الدین خوئی کے شاگرد ہیں، اور ان سے تبصرہ ابن سہلان پڑھا ہی، ان کا بیان ہے کہ شمس الدین امام رازی کے شاگرد تھے[۱]، (۲) ممکن ہو کہ دونون سے پڑھا ہو،

بہرحال یہ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے، طب کے پورے واقف کار تھے، سلطان ملک معظم عیسیٰ بن الملک العادل کے زمانہ مین شام تشریف لائے، بادشاہ چونکہ خود صاحب علم تھا، اس نے ان کی بہت قدر کی، وظیفہ مقرر کیا، عرصہ تک ساتھ رہا، پھر دمشق مین ان کے قیام کا انتظام کر دیا، یہ دمشق مین قاضی القضاۃ بھی ہو گئے تھے!

بہت متواضع تھے، مزاج مین نرمی تھی، گفتگو بہت شیرین ہوتی، حیا کا غلبہ تھا، مروت طبیعت بن گئی تھی، شکل و شباہت بھی بہت اچھی تھی،

دمشق مین دق کے مرض مین، شعبان ۶۳۷ھ کو انتقال ہوا[۲] اس حساب سے چون[۵۴] سال کی عمر ہوئی،

ان کے نام اور سنہ وفات مین کسی قدر غلط فہمی ہوئی ہے جس کا ازالہ مناسب ہے، کشف الظنون[۳] فہرست کتب خانہ خدیویہ[۴] اور مقالات شبلی[۵] مین بجائے شمس الدین کے ان کا نام شہاب الدین درج ہے، حالانکہ صحیح نام شمس الدین ہے، شہاب الدین ان کے بیٹے کا نام ہو، چنانچہ طبقات شافعیہ، طبقات الاطبار، اور شذرات الذہب وغیرہ مین ان کا نام شمس الدین ہی مذکور ہے، اور ان کے بیٹے کا نام شہاب الدین تبلایا گیا ہی،

سال وفات میں یہ غلطی ہوئی ہے کہ کشف الظنون مین ۶۳۹ھ درج ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی یہی سنہ لکھا ہے لیکن شذرات الذہب[۶] اور طبقات الاطبار[۷] مین ہے کہ شعبان ۶۳۷ھ میں ان کا

---

[۱] طبقات الاطبار، ج ۲ ص ۱۷۱، [۲] ایضاً ، [۳] کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۴۴، [۴] فہرست خدیویہ جلد ۱ ص ۱۶۳، [۵] مقالات شبلی جلد ۵ ج ۵ ص ۱۸۳، ابن عماد حنبلی ۱۰۸۹ھ نے شذرات مین ۶۳۷ھ میں وفات پانے والون کے سلسلہ مین قاضی القضاۃ شمس الدین کا تذکرہ کیا ہو، مگر حیرت انگیز یہ ہے کہ اسی پانچوین جلد مین ص ۲۴۲ میں ۶۹۳ھ مین وفات پانیوالون کے ضمن مین بھی ان کا ذکر ہے، لیکن وہان بھی سال وفات ۶۳۷ھ ہی درج ہے [۷] جلد ۲ ص ۱۷۱،

انتقال ہوا ہے، البتہ سبکی نے، رشعبان ۶۸۶ھ لکھا ہے[1] معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے غلطی سے ثلاثین کو ثمانین لکھدیا ہے،!

اس سلسلہ میں ایک تیسری چیز کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے، وہ یہ کہ مولانا شبلی مرحوم نے بحوالہ کشف الظنون تحریر فرمایا ہے، کہ شمس الدین کے تکملہ کا نام واضح تھا، مولانا مرحوم کو اس مین تسامح ہوا، صاحب کشف الظنون نے اس تکملہ کا نام واضح نہین تبلایا ہے، بلکہ تفسیر رازی کے خلاصہ کا نام واضح بتایا ہے، پوری عبارت یہ ہے،!

وصنف الشیخ نجم الدین احمد	شیخ نجم الدین قمولی متوفی ۷۷۷ھ نے
بن محمد القمولی تکملۃ لہ وتوفی	اور شہاب الدین دمشقی متوفی ۶۳۹ھ نے
۷۷۷ سنہ سبع وسبعین وسبع	اس کا تکملہ لکھا، اور برہان الدین محمد بن
مائۃ وقاضی القضاۃ شہاب الدین	محمد نسفی نے اس کا خلاصہ کیا، اور اس
بن خلیل الخوئی الدمشقی کمل مانقص	کا نام واضح رکھا،
منہ ایضاً وتوفی ۶۳۹ سنہ تسع	
وثلاثین وستمائۃ، واختصرہ	
برہان الدین محمد بن محمد النسفی	
المتوفی ۶۸۶ سنہ سبع وثمانین و	
ست مائۃ وسماہ الواضح،[2]	

الفوائد البہیہ ص ۰۰ مین بھی نسفی کو تفسیر رازی کا خلاصہ نگار بتایا گیا ہے، کشف الظنون ج ۲ ص ۴۷۶ مین ایک دوسرے خلاصہ نگار محمد بن القاضی کا بھی ذکر ہے، اس خلاصہ نگار نے کچھ اضافے بھی کئے ہین، کتبخانہ

---

[1] طبقات شافعیہ جلد ۵ ص ۰۰ [2] کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۷۶،

خدیویہ میں تفسیر رازی کا ایک ناقص خلاصہ موجود ہے، مگر مصنف کا نام معلوم نہیں![1]

تفسیر قمی نیشاپوری بھی تفسیر رازی کا خلاصہ ہی ہے!

(۲) تفسیر رازی کے دوسرے تکملہ نگار احمد بن محمد بن ابی الحزم مکی بن یاسین القمولی نجم الدین ہیں[2] سالِ پیدائش متعین طور سے معلوم نہیں، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی[3] اور سبکی[4] وفات کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال کی بتلاتے ہیں، اور ان کی وفات رجب ۷۲۷ھ میں ہوئی ہے، اس حساب سے سالِ پیدائش ۶۴۷ھ ہوتا ہے، یعنی شمس الدین خوئی کی وفات کے دس سال بعد یہ پیدا ہوئے!

ان کے سالِ وفات میں بھی کسی قدر غلط فہمی ہوئی ہے، کشف الظنون میں ۷۷۷ھ ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی یہی سنہ وفات لکھا ہے[5] لیکن یہ صحیح نہیں ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی[6] ابن عماد حنبلی[7] علامہ سبکی[8] حافظ جلال الدین سیوطی[9] اور ان سب سے بڑھ کر کمال الدین ابو الفضل جعفر بن ثعلب بن جعفر الادفوی ۷۴۸ھ، جو نجم الدین قمولی کے نہ صرف ہم عصر بلکہ ہمدم و ہمراز بھی تھے، وہ بھی سنہ وفات رجب ۷۲۷ھ تبلاتے ہیں[10]

نجم الدین قمولی قاضی القضاۃ بدر الدین جماعہ کے تلامذہ میں سے تھے، بہت صاحبِ علم و فضل تھے، مختلف مقامات میں عہدۂ قضا پر مامور ہوئے، اہلِ علم کا قول تھا کہ ان سے زیادہ مصر میں کوئی فقیہ نہیں، ان کو مزاج میں بہت نرمی تھی، احباب کا بہت خیال رکھتے تھے، وظائف و اوراد کے پابند تھے، رات کو شب بیداری، اور دن کو کثرتِ ذکر سے اپنے اوقات کو پُر نور رکھتے تھے، ادفوی کا بیان ہے کہ مرض الموت میں، میں نے ان سے کہا کہ معمولات میں کچھ کمی کر دیجئے، لیکن راضی نہ ہوئے، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف خاص مشغلہ تھا جب تک لکھنے سے معذور نہ ہوئے، برابر تصنیف کا کام جاری رہا[11] رحمہ اللہ،

---

[1] فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد ۱ ص ۲۰۹ [2] الطالع السعید ص ۴۳ [3] درر کامنہ جلد اول ص ۳۰۴ [4] طبقاتِ شافعیہ جلد ۵ ص ۱۷۹ [5] مقالات شبلی ج ۴ ص ۴۳ [6] درر کامنہ جلد اول ص ۳۰۴ [7] شذرات الذہب جلد ۶ ص ۷۷ [8] طبقاتِ شافعیہ جلد ۵ ص ۱۷۹ [9] حسن المحاضرہ اول ص ۱۷۰ [10] الطالع السعید ص ۶۴ [11] رر ص ۶۴،

امام رازی کی دوسری تفسیری خدمات | تفسیر کبیر کے سوا امام رازی کی دوسری تفسیری خدمات سے عموماً لوگ واقف نہین ہین، ہمارے علم مین اس سلسلہ کی جو کتابین ہیں، ان کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا!

تفطی[1] نے تفسیر کبیر کے سوا حسب ذیل تفسیرون کا پتہ دیا ہے:-

۱- تفسیر سورۂ فاتحہ،

۲- تفسیر سورۂ بقرہ، خالص عقلی حیثیت سے،

۳- تفسیر صغیر جس کا نام اسرار التنزیل وانوار التاویل ہے،

کشف الظنون مین بھی اسرار التاویل کا ذکر ہے، اور لکھا ہے کہ یہ نامکمل رہ گئی تھی[2] یہ کتاب کتب خانہ بانکی پور مین موجود ہے[3] علامہ ابوالوفا نصر ہورینی ۱۲۹۱ھ نے اپنی تفسیر سورۂ ملک مین اس سے نفع بھی اٹھایا ہے[4] لیکن اس کو بجائے تفسیر کے علم کلام کا رسالہ کہہ سکتے ہین،

تفسیر سورۂ فاتحہ کے متعلق کشف الظنون مین ہے کہ یہ دو جلدون مین تھی، اور اس کا نام مفاتیح العلوم تھا،[5]

صاحب طبقات الاطبار نے بھی تفسیر سورۂ فاتحہ اور تفسیر سورۂ بقرہ کو تفسیر کبیر کے سوا مستقل تفسیر شمار کیا ہے، لیکن تاہنوز یہ امر تحقیق طلب ہے کہ واقعی تفسیر سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ موجودہ تفسیر کبیر سے الگ ہے یا اس میں شامل ہے؟ صاحب طبقات الاطبار نے ایک اور کتاب کا حوالہ دیا ہے، جس کا نام رسالہ فی التنبیہ علی بعض الاسرار المودعۃ فی بعض سور القرآن العظیم ہے!

کشف الظنون مین[6] درۃ التنزیل وغرۃ التاویل کے نام سے ایک تفسیری کتاب کو امام رازی

---

[1] اخبار الحکماء ص ۱۹۱ [2] کشف الظنون ج اول ص ۵۹ [3] مفتاح کنوز المخفیہ جلد اول صفحہ ۴۲
[4] فہرست کتب خانہ خدیویہ ج اول ص ۱۴۷ [5] کشف الظنون ج اول ص ۱۳۳ و ج دوم ص ۴۶۲
[6] کشف الظنون جلد اول ص ۴۰۳،

کے نام سے منسوب کیا ہے، اس مین قرآن مجید کی مکرر آیات سے بحث ہے! اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے[۱] لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جو امام رازی کی تصنیف ہے، یا ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب اسکافی کی کتاب ہے، جس کا نام بھی یہی ہے!

کتب خانہ مصر کی فہرست مین ہے کہ اس کتاب پر ایک ورق لگا ہوا ہے جس مین لکھا ہے کہ یہ کتاب ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب کا املا ہے، فہرست کے مرتب نے اس صفحہ کو جعلی قرار دیا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے نزدیک اس کتاب کا انتساب امام رازی کی طرف مشتبہ ہے، اس لئے کہ امام رازی کی طرف منسوب مصری نسخہ کا جسکا حوالہ فہرست میں ہے اور اسکافی کے نسخہ مطبوعہ کا خاتمہ بالکل ایک ہے اور وہ یہ ہے:

هذا آخر ما تكلمنا عليه من الآيات التي يقصد الملحدون التطرق منها الى عيبها،

البتہ یہ چیز لائق توجہ ہے، کہ ان دونون کی ابتدار مین اختلاف ہے، مصری نسخہ منسوب بہ امام رازی کی ابتدار الحمد للہ حمد الشاکرین سے ہے، اور اسکافی کی درۃ التنزیل کی ابتدار ان کلمات سے نہین ہے!

---

[۱] فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد اول ص ۱۷۳،

تفسیر ابو مسلم اصفہانی

عربی معتزلہ کی مفقود و الخبر نادر الوجود عقلی تفسیر قرآن کے اجزار جو نہایت دیدہ ریزی سے امام رازی کی تفسیر کبیر سے جمع کئے گئے ہین، عمدہ ٹائپ مین چھپی ہے، قیمت دو۔ عمر ضخامت ۱۰۲ صفحے،

حدائق البیان فی معارف القرآن

اس کتاب مین قرآن مجید کے متعلق بہت سے لفظی اور معنوی مباحث درج کئے گئے ہین جن سے عام و خاص سب فائدہ اٹھا سکتے ہین، اور قرآن مجید کے متعلق بہت سے معلومات حاصل کر سکتے ہین،

قیمت:۔ ۸ ر، ضخامت ۲۴۲ صفحے

منیجر

استفسار و جواب

"درۃ التاج لغرۃ الدباج"

اور

علامہ قطب الدین شیرازی

جناب حافظ صاحب حافظ محمد (حافظ منزل) راندیر ضلع سورت

مکرم و مخدوم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاجِ اقدس بعافیت ہوگا، احقر بھی بفضلہ تعالیٰ مع الخیر ہے، عرصہ ہوا، کہ جناب راندیر تشریف لائے تھے، اوس وقت مختصر سی ملاقات و زیارت ہوگئی تھی، اس کے بعد نہ ملاقات کا موقع ہوا، اور نہ ہی عریضہ ارسال کرنے کی نوبت آئی، گو اکثر جناب کا تذکرہ احباب کے سامنے آیا کرتا ہو، خصوصاً مجبور رنگونی کے ذریعہ خیریت مزاج گرامی معلوم ہوتی رہتی ہے، ایک خاص امر اس عریضہ کا باعث ہے، میرے ایک دوست کے پاس درۃ التاج مصنفہ علامہ محمود بن مسعود ابن المصلح الشیرازی ہے، یہ نسخہ قلمی ہے، اس کی دو جلدیں ان کے پاس ہیں، ایک جلد غالباً ریاست ٹونک کے کتب خانہ میں ہے، چونکہ صاحب حاجت ہیں، تو ان کا خیال ہوا کہ ممکن ہے اس نایاب کتاب کی قدر حیدرآباد میں ہو، اور ان کو اس کے صلہ میں کچھ رقم مل جائے، چنانچہ وہاں ایک دوست کو لکھا گیا، وہاں سے جواب آیا، کہ اس کے مصنف کون ہیں، کس فن کی کتاب ہے، کتابت کیسی

سنہ کی ہے، براہ راست لکھا جاوے، کتاب کو دیکھنے سے تصنیف کا سنہ معلوم نہین ہوا، اور نہ
اس کی کتابت کا سال معلوم ہوتا ہے، مصنف کا نام تو مین اس عریضہ مین لکھ چکا ہون، ان کا زمانہ
بادشاہ فیل شاہ بن الملک المعظم رستم کی حکومت کا ہے، زبان کتاب کی فارسی ہے، کسی خاص
فن کی کتاب نہین ہے، اس میں منطق و فلسفہ، ریاضی، اقلیدس، اصول دین و فروع کا فلسفہ
سب ہی کچھ ہے، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے بھی بہت ہی پسند فرمایا، اب آپ سے اس کے
متعلق دو باتین عرض کرنی ہین،

ایک یہ کہ علامہ محمود بن مسعود و فیل شاہ کا زمانہ کونسا ہے، کس سنہ مین یہ حضرات تھے، درۃ التاج
کا کہین ذکر ہے یا نہین، دوم یہ کہ مولانا احمد اللہ ندوی دائرۃ المعارف کو اس بارہ مین کچھ سفارش
کے طور پر تحریر فرما دین، مین اس معاملہ مین لوجہ اللہ دلچسپی لے رہا ہون، محض یہ خیال ہے کہ ایک
کتاب بہت حاجت مند شخص ہین، صاحب علم ہین، ان کی ضعیفی کا زمانہ ہے، نیز یہ کہ ایسی عمدہ جامع
کتاب کسی اچھی جگہ پہنچ جائے، اور ان غریب کا کام بھی ہو جائے، اس سلسلہ مین اگر اور کوئی
بہترین صورت ذہن مبارک مین آوے، تو ضرور توجہ فرما دین، آپ کو اجر عظیم ملے گا،

حضرت مولانا سید مرتضی حسن صاحب نے جب اس کتاب کو ملاحظہ فرمایا، تو اونھون نے
اپنا یہ خیال ظاہر فرمایا تھا، کہ اگر یہ کتاب حیدرآباد دائرۃ المعارف پہنچ جائے تو اچھی رقم
مل سکے گی، بہرحال جناب والا کی توجہ گرامی سے امید قوی ہے کہ کوئی بہترین صورت نکل
آئے گی، آپ کو اجر عظیم ملے گا، باقی سب خیریت ہے دعاؤن کا بیحد محتاج ہون،

والسلام

معارف :- محترم زاد مجدکم،

السلام علیکم :- گرامی نامہ ملا، آپ کی کتاب درۃ التاج کے بیش قیمت ہونے مین کوئی

شبہہ نہیں، یہ علوم عقلیات کی ممتاز تصانیف میں شمار کیجاتی ہے، لیکن اب یہ غیر مطبوعہ نہیں رہی، چند سال گذرے، یہ ایران سے رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت میں بڑے اہتمام سے کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس کا مطبوعہ نسخہ ہمارے کتب خانہ میں بھی موجود ہے،

آپنے اس کے مصنف کا حال اور اس کا زمانہ دریافت فرمایا ہے، اس کے مصنف علامہ قطب الدین محمود بن ضیاء الدین مسعود شیرازی ساتوین صدی مین افاضل روزگار مین سے تھے، علوم عقلیات مین ان کی قابل قدر تصانیف ہین، اور فلسفہ، حکمت، منطق، ریاضی اور ہیئت کی مختلف متون و شروح میں "قطب الدین شیرازی" یا "علامہ شیرازی" کے لقب سے یاد کئے گئے ہین،

علامہ قطب الدین شیراز کے ایک ذی علم خاندان مین ماہ صفر ۶۳۴ھ مین پیدا ہوئے، ان کا آبائی وطن شہر کازرون تھا، جو شیراز سے تین دن کی مسافت پر آباد تھا، چنانچہ ان کے والد شیخ ضیاء الدین مسعود ابن مصلح اسی نسبت سے کازرونی کہے گئے، وہ شیراز مین مقیم تھے، اور اپنے زمانہ کے مشہور اطباء و مشائخ صوفیہ میں شمار کئے گئے، انھیں بانی طریقہ سہروردیہ حضرت شہاب الدین ابوحفص عمر بن محمد سہروردی سے بیعت و خرقہ ارادت حاصل تھا، شیراز کے بیمارستان مظفری مین تدریس کی خدمت اور مریضون کے معالجہ مین مصروف تھے، ۶۴۸ھ مین اونھون نے اپنے صاحبزادے قطب الدین محمود کو ۱۴ سال کی عمر میں چھوڑ کر وفات پائی،

شیخ ضیاء الدین جب تک زندہ رہے، اپنے نوعمر صاحبزادے کی تعلیم و تربیت مین مصروف رہے، چنانچہ قطب الدین محمود نے اپنی ابتدائی تعلیم، اور علم طب کی علمی و عملی تحصیل اپنے پدر بزرگوار سے کی، نیز شفیق باپ نے اپنے نوعمر بچہ کو دس برس کی عمر ہی مین تبرکاً خرقۂ تصوف پہنایا، پھر شیخ وقت حضرت نجیب الدین علی بن بُزغش شیرازی کے سپرد کیا، ان کے حلقہ مین وہ بیٹھا کئے، اور شیخ وقت نے بھی اسی کم عمری مین انھیں خرقۂ تصوف سے نوازا،

پھر والد بزرگوار کی وفات کے بعد صرف چودہ سال کی عمر میں یہ اپنے والد کی جگہ پر اسی بیمارستان

مظفری میں خدمت پر مامور کئے گئے، اور دیگر اطبار کی نگرانی، ہدایت اور شفقت سے عملی خدمات کے ساتھ فن کے علمی وعملی تجربے حاصل کرتے رہے، یہانتک کہ دس سال اسی طریقہ سے گذر گئے، اس کے بعد انھیں فن میں تبحر حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ مختلف اساتذۂ روزگار کے حلقۂ درس کا رُخ کیا، اور فن کی مشہور کتابیں ممتاز اہلِ علم سے پڑھیں، اس سلسلہ میں پہلے اپنے چچا شیخ کمال الدین ابوالخیر بن مصلح کازرونی سے کلیات قانون ابن سینا پڑھی، پھر اسی طرح مختلف اساتذہ شیخ شمس الدین محمد بن احمد کیشی، شیخ الکل شرف الدین زکی البوشکانی وغیرہ سے علوم کی تحصیل کی، اس زمانہ میں علوم عقلیات میں حکیم خواجہ نصیر الدین طوسی کا طوطی بول رہا تھا، چنانچہ شیخ قطب الدین محمود ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اشارات ابن سینا اور فن ہیئت کا درس لیا، اور مختلف علمی ونظری علوم کے مشکلات و شکوک اُن سے حل کئے، نیز مشہور زیج ایلخانی کی ترتیب میں خواجہ کا ہاتھ بٹایا،

اس کے بعد شیخ قطب الدین نے اُن مشہور شہروں کی سیاحت شروع کی جو اس زمانہ میں علم کے مرکز تھے، اور ہر مقام کے اکابر سے استفادہ کیا، اسی سلسلہ میں بغداد میں شیخ طریقت حضرت محمد بن سکران بغدادی المتوفی ۶۶۰ھ سے فیوض حاصل کئے، پھر روم پہنچے، اور مولانائے روم جلال الدین رومی المتوفی ۶۷۲ھ کی صحبت میں بیٹھے، پھر قونیہ میں وارد ہوئے، اور حضرت شیخ صدر الدین قونوی المتوفی ۶۷۳ھ کے حلقۂ ارادت میں بیٹھے، اور طریقۂ ارشاد و علوم شریعت و طریقت کی تحصیل کی، نیز حاکم روم معین الدین سلیمان پروانہ سے ان کے مخلصانہ روابط قائم ہوئے، وہ اُن سے غیر معمولی تعظیم و تکریم سے پیش آیا، اسی سلسلہ میں سیواس و ملطیہ کی قضارت کی خدمت پر مامور کئے گئے، نیز درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہوا، چنانچہ ان کی کتاب التحفۃ الشاہیہ اسی زمانہ کی تصنیف ہے،

اسی زمانہ میں انھوں نے بعض دوسرے سیاسی خدمات بھی انجام دیئے، چنانچہ ہلاکو کے لڑکے تکدار نے اسلام لے آنے اور احمد نام اختیار کر لینے کے بعد شاہانِ اسلام کے پاس اپنی جو سفارتیں بھیجیں، ان میں سے

مصر کی سفارت مین جو ملک قلاؤون الفی (۶۷۸ھ - ۶۸۹ھ) کے پاس گئی تھی، قاضی قطب الدین شیرازی بھی تھے، اور اس سلسلہ میں جو شاہی مراسلے ایک دوسرے کی طرف گئے ان مین انھین "اقضی القضاۃ" کے خطاب سے یاد کیا گیا ہے (ابن خلدون ج ۵ ص ۴۰۲، مختصر الدول ص ۵۰۰، شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۷)

علامہ قطب الدین شیرازی نے اس سفر میں شام میں کتاب الشفا اور کتاب قانون کا درس دیا، اس طرح ان کے علمی خدمات جاری رہے،

اس کے بعد حاکم تبریز نے انھین اپنے یہان مدعو کیا، اور غیر معمولی ادب و احترام سے پیش آیا، انھون نے اسی شہر مین اقامت اختیار کر لی، اور علم و فن کی خدمت مین ہمہ تن مصروف ہو گئے، اور اپنے عہد کے شہرۂ آفاق اساتذہ مین شمار کئے گئے، اگرچہ وہ روم، مصر، شام و عراق کے حکمرانون مین بڑی منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، لیکن آخر عمر مین انھون نے امرا کے دولت کدون سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا تھا، اور درس و تدریس و تصنیف و تالیف مین مصروف رہتے تھے، وہ مذہبًا شافعی تھے، علامہ سبکی نے اسی حیثیت سے اپنی طبقات مین ان کا تذکرہ کیا ہے، ۷۶ برس کی عمر مین بماہ رمضان ۷۱۰ھ وفات پائی

ان کے حلقۂ درس سے بیشمار تلامذہ نے فیوض حاصل کئے، اور اپنے زمانہ مین ممتاز اکابر و فضلا مین شمار کئے گئے، ان مین سے شیخ تاج الدین اردبیلی المتوفی ۷۴۶ھ قطب الدین محمد رازی بویہی صاحب شرح مطالع المتوفی ۷۶۶ھ، نظام الدین اعرج نیشاپوری صاحب شرح شافیہ معروف بہ شرح نظام، و تفسیر غرائب القرآن معروف بہ تفسیر نیشاپوری اور کمال الدین حسن بن علی الفارسی المتوفی ۷۱۸ھ وغیرہ ہیں

علامہ قطب الدین اپنے عہد مین علوم عقلیات کے بڑے ماہرین میں شمار کئے گئے ہیں اور مستند مورخین نے اسی حیثیت سے ان کا تعارف کرایا ہے، چنانچہ اسنوی انھیں "امام عصرہ فی المعقولات" کہتا ہے، یافعی نے "عالم العجم" کا لقب دیا ہے، اسی طرح ابوالفداء نے انھین "امام و ماہر علوم ریاضی منطق فنون حکمۃ وطب و اصول فقہ و علم کلام" لکھا ہے،

علامہ قطب الدین عقلیات کے خشک موضوع سے وابستہ رہنے کے باوجود طبعاً نہایت شگفتہ مزاج تھے ظرافت و بذلہ سنجی سے خاص لگاؤ تھا، ان کے دلچسپ لطائف و ظرائف بھی ان کے سوانح میں محفوظ ہیں، ذوق شعری سے بھی مناسبت تھی، فارسی کلام کے کچھ نمونے کتابوں میں ملتے ہیں،

علوم کی خدمت کے ساتھ خاصہ وقت عبادت و ریاضت میں بھی گذارتے، اور لباس صوفیانہ زیب تن رکھتے تھے، تصنیفات کے سلسلہ میں یہ عادت تھی، کہ عموماً روزے رکھ کر مسودے لکھتے اور شب بیداری کرکے مسودہ کو مبیضہ میں منتقل کرتے تھے،

علامہ قطب الدین شیرازی کے مفصل سوانح حیات کے لئے ملاحظہ ہو الدرر الکامنہ ابن حجر ج ۴ ص ۳۳۹ طبقات الشافعیہ سبکی ج ۶ ص ۲۴۸، دول الاسلام ذہبی ج ۲ ص ۲۷، مرأۃ الجنان یافعی جلد ۴ ص ۲۴۴، بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص ۳۸۹، ابو الفدا ج ۴ ص ۶۵، الفوائد البہیہ مولانا عبد الحی ص ۷۵ ابن خلدون جلد ۵ ص ۵۴۷ تاریخ گزیدہ ص ۸۰۹ دیباچہ درۃ التاج سید محمد مشکواۃ بحوالہ روضات الجنۃ ج ۴ ص ۲۱۴، وصاف الحضرۃ ج ۱ ص ۵۱، شرح حکمۃ الاشراق ص ۷، جامع التواریخ رشیدی ج ۱ ص ۶۳، حبیب السیر ج ۳ ص ۷، وغیرہ) نیز ریو نے فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم، وضمیمہ فہرست مخطوطات عربی جلد ۲ ص ۴۳۴ میں اور ایتھ نے فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس ج ۱ ص ۴۹۳ و ۱۲۱۰ میں مصنف کے سوانح و تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے، نیز ہفت اقلیم امین رازی سے ان کے حالات کا خلاصہ درج اور سفینۃ الاولیا سے بعض اقتباسات نقل کئے ہیں،

اسی طرح ان فہرستوں میں بعض دوسری کتابوں کے ضمن میں بھی تذکرہ آیا ہے، نیز معجم المطبوعات الیاس سرکیس میں ان کی بعض مطبوعہ کتابوں کے ضمن میں مختصر حالات مندرج ہیں اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں مختلف کتابوں کا تذکرہ کیا ہے،

مختلف علوم میں حسب ذیل کتابیں ان کی یادگار ہیں،

۱- نهایة الادراک فی درایة الافلاک، اس مین علم ہیئت مین چار مقالے عربی مین قلمبند کئے گئے ہین، مختلف تذکرہ نگارون نے ذکر کیا ہے، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون مین بھی تذکرہ آیا ہی، کتبخانہ خدیویہ مصر (ج ۵ ص ۲۲۵) اور مدرسہ سپہ سالار ایران مین اس کے نسخے موجود ہین، یہ غالباً علامہ قطب الدین کی سب سے پہلی تصنیف ہی، جو محمد بن صاحب السعید بہاء الدین محمد جوینی حاکم اصفہان کے نام سے معنون کی گئی ہی،

۲- التحفة الشاهیه بھی عربی زبان مین فن ہیئت مین ہے، امیر شاہ محمد بن الصدر السعید تاج الدین معتز بن طاہر کے نام سے معنون ہے، ہفت اقلیم امین رازی مین اس کا ذکر آیا ہے، یہ قضاۃ سیواس کے زمانہ کی تصنیف ہے، سید شریف اور ملا علی توشجی نے اس پر حاشیہ اور اسکی شرح لکھی ہے شرح توشجی کا نسخہ کتب خانہ خدیویہ مین موجود ہے، اصل کتاب کے نسخے بھی کتب خانہ ملی معارف طہران (فہرست کتب خانہ مذکور ج ۱ ص ۱۵۵) اور مدرسۂ سپہ سالار مین موجود ہین،

۳- شرح حکمة الاشراق کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ ۱۳۱۵ھ مین طہران سے چھپ چکی ہے، مصنف نے اس کو جمال الدین علی بن محمد الاستجردانی کے نام سے معنون کیا ہے، معجم المطبوعات مین بھی اس کا ذکر آیا ہے،

۴- مفتاح المفتاح، یہ علامہ سکاکی المتوفی ۶۲۶ھ کی مشہور تصنیف مفتاح العلوم کی شرح ہی امین رازی نے ذکر کیا ہے، حاجی خلیفہ نے اس کو اس کتاب کی بہترین شرحون مین شمار کیا ہے، (جلد ۲ ص ۴۰۰) مصنف نے اس کو خواجہ ہمام الدین ابن ہمام المتوفی ۷۱۳ھ کی خواہش سے لکھا تھا، اس کے نسخے دار الکتب مصریہ اور مدرسۂ سپہ سالار مین موجود ہین،

۵- التحفة السعدیه "شرح کلیات ابن سینا" کے نام سے بھی معروف ہی، ہفت اقلیم اور دوسرے تذکرون مین اس کا ذکر آیا ہے، حاجی خلیفہ نے اس کو قانون کی بہترین شرح قرار دیا ہی (ج ۲ ص ۲۱۷) یہ تصنیف خواجہ سعد الدین کے نام سے معنون ہے، مدرسۂ سپہ سالار مین اس کا نسخہ بھی محفوظ ہے، المغنی فی

شرح المعجز کازرونی کے ماخذ میں ہے، (برٹش میوزیم)

۶۔ شرح مختصر الاصول ابن حاجب مصنف نے اس کا تذکرہ مفتاح المفتاح اور التحفۃ المسعدۃ

میں کیا ہے، حاجی خلیفہ کی نظر سے بھی اس کا نسخہ گذرا تھا،

۷۔ فتح المنان فی تفسیر القرآن معروف بہ "تفسیر علامی" (منسوب بہ علامہ قطب الدین) حاجی خلیفہ

نے اس کو چالیس جلدوں میں بتایا ہے، مصنف نے علوم عقلیات سے مناسبت رکھنے کے باوجود آیات

کی تفسیر میں منقولات کے حدود سے تجاوز نہیں کیا ہے، اس کی پہلی جلد کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے،

۸۔ حاشیہ بر کشاف زمخشری، یہ دو جلدوں میں ہو (کشف الظنون ج ۲ ص ۳۱۱)

۹۔ رسالۃ فی بیان الحاجۃ الی الطب وآداب الاطباء، اس کا ایک نسخہ جو ۹۱۳ھ کا مکتوبہ ہے

کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے، لیکن یہ رسالہ کسی نام سے موسوم نہیں، رسالہ کی اصل عبارت اسی فقرہ سے

شروع ہوتی ہے، جو بطور اسم درج کیا گیا،

حاشیہ بر حکمۃ العین، علامہ نجم الدین قزوینی المتوفی ۶۷۵ھ کی حکمۃ العین پر یہ حاشیہ ہے جس کو شمس الدین

محمد بن مبارک شاہ بخاری نے اپنی شرح حکمۃ العین میں تمام وکمال نقل کر لیا ہے، اور "فی الحواشی القطبیۃ" لکھکر

اپنی شرح سے اس کا امتیاز قائم رکھا ہے، شرح حکمۃ العین کا یہی نسخہ اس زمانہ میں طلبہ میں عام طور

پر متداول ہے،

۱۱۔ درۃ التاج لغرۃ الدباج، مصنف کی یہی وہ تصنیف ہے جس کا قلمی نسخہ آپ کے دوست کے

پاس اور مطبوعہ نسخہ ہمارے سامنے موجود ہے، یہ تصنیف امیر دباج بن فیل شاہ کی خواہش سے لکھی گئی، اور اسی

مناسبت سے "درۃ التاج لغرۃ الدباج" کے نام سے موسوم کی گئی، چنانچہ مصنف نے مقدمہ میں دباج بن فیلشاہ

کے علوِ نسب مکارم اخلاق کا تذکرہ کر کے لکھا ہے:۔

"پس موجب حکم شامل مطاع وفرمان معلا کسر این اوراق اتفاق افتاد و بنام آن صاحب دولت

صاحب فکرت کیوان ہمت دوران فسحت فلک رفعت، ملک سیرت، متوج گردانید وآنرا درۃ التاج لغرۃ الدباج نام نہاد" (ج ۱ ص ۲۱)

دباج بن فیلشاہ گیلان کا حکمران تھا، الدرر الکامنہ میں اس کو دباج بن قطلی شاہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جو بلا شبہ نسخہ کی غلطی ہے، اس نے ۲۵ سال حکمرانی کی، ۷۱۴ھ میں حج و زیارت کیلئے روانہ ہوا، دمشق کے قریب ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی، اور دمشق میں دفن کیا گیا، (الدرر الکامنہ جلد ۲ ص ۱۰۳)

آگے چل کر لفظ "دباج" ملوک گیلان کا لقب قرار پایا، چنانچہ ایتھ نے فہرست مخطوطات فارسی میں عبدالرزاق کی مطلع السعدین اور بعض دوسرے حوالوں سے دکھایا ہے کہ گیلان کے سلاطین نے یہ لقب اختیار کر لیا تھا، اور ان کا یہ لقب شاہ اسمٰعیل صفوی کے زمانہ تک قائم رہا،

اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ جیسا کہ کتاب کے بعض داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے، ۶۹۳ھ سے ۷۰۵ھ کے اندر ہے، یہ ابن سینا کی کتاب الشفا، کے طرز پر فارسی زبان میں لکھی گئی، کتاب الشفاء اور درۃ التاج میں مصحح کتاب کے نقطۂ نظر سے یہ بنیادی تصنیفی فرق ہے، کہ ابن سینا نے حکمت نظری کے مباحث کی بنیاد منطقی اصولوں پر رکھی ہے، اور علوم ریاضی کو مختصراً جگہ دیا ہے، اور علامہ قطب الدین نے اس کے برعکس علوم ریاضی پر مسائل کی بنیاد رکھی ہے، اور منطقی مباحث کو اختصار سے لیا ہے، پھر دوسرا فرق یہ ہو کہ ابن سینا کی کتاب الشفاء میں فلسفۂ مشائین کی ترجمانی کی گئی ہے، اور درۃ التاج میں فلسفۂ اشراقیین کو پیش کیا گیا ہے، نیز اس میں کتاب الشفاء سے حکمت عملی کا ایک مستقل باب زیادہ ہے جس میں عبادات، فقہ و سلوک عرفا مندرج ہیں،

اصل کتاب کا اندازہ اس کے ابواب و فصول کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے، کتاب "فاتحہ" سے شروع ہوتی ہے، جو تین فصلوں پر مشتمل اور ہر فصل تین اصولوں میں منقسم ہے:-

اصل اوّل "علی الاطلاق تفضیلتِ علم" کے بیان مین، جس مین کتاب وسنت سے علم کے فضائل دکھائے ہین، اور عقلی دلائل سے انھین ثابت کیا ہو، پھر **اصل دوم** فضیلتِ تعلّم، اور **اصل سوم** "فضیلتِ تعلیم" کے بیان مین ہے، اوران مین آیات، احادیث، آثار واخبار دلائل میں جمع کئے گئے ہین،

اس کے بعد دوسری فصل "حقیقتِ علم" کے بیان مین ہے، اور یہ بھی چند اصول مین تقسیم ہو،

اصل اول "حقیقتِ علم" کی تفصیل مین **اصل دوم**، تصورِ علم بدیہی ہے، یا کسبی؟ اگر کسبی ہے تو اسکی تحدید ممکن ہے یا ناممکن؟ **اصل سوم**، علم کی تحدید کا ممکن لیکن اس کی تعریف کا دشوار ہونا،

فصل سوم "تقسیم علوم" کے بیان مین، اور یہ بھی تین اصول مین منقسم ہے، **اصل اول** علم جو کہ موردِ تقسیم بن سکے، **اصل دوم** علم کی تقسیم حکمی وغیر حکمی مین، اور غیر حکمی کی تقسیم علوم دینی وغیر دینی مین، **اصل سوم** علومِ حکمی ودینی اوران کی تقسیمون کے بیان مین،

اس کے بعد اسی فاتحہ کتاب" مین کتاب کے ابواب ومسائل کی فہرست مصنف نے درج کی ہے اس سے کتاب کے مباحث نگاہ کے سامنے آجاتے ہین، مصنف نے "باب" کے لئے "جُملہ" کا لفظ اختیار کیا ہے، چنانچہ کتاب حسب ذیل جملون یا بابون مین تقسیم ہو :-

جملہ اول، فنِ منطق مین جو سات جدا گانہ مقالون مین تقسیم ہو،

جملہ دوم، فلسفۂ اولیٰ کے بیان مین، یہ دو فنون مین تقسیم کیا گیا، **فنِ اول** امورِ عامہ کے بیان مین جس مین سات مقالات مین، **فنِ دوم** اعراض وجودی واعتباری کے بیان مین، یہ بھی سات مقالات مین ہو،

جملہ سوم، علم اسفل یعنی علم طبیعی کے بیان مین، یہ بھی دو فنون مین تقسیم کیا گیا، **فن اول** اجسام طبیعی **فنِ دوم** نفوس وصفات اوران کے آثار کے بیان میں ہے، دونون فنون بھی حسب معمول سات سات مقالون پر مشتمل ہین،

جملہ چہارم، علم اوسط یعنی علوم ریاضی مین، یہ چار فنون مین تقسیم ہے، **فن اول** اقلیدس (۵ مقالات)

فنِ دوم مجسطی (۱۳ مقالات) فنِ سوم ارثماطیقی (۴ مقالات) فنِ چہارم علم موسیقی (۵ مقالات)

جملہ پنجم علم اعلیٰ یعنی علم الٰہی مین، یہ دو فنون مین ہی فنِ اول عقل اور اس کے آثار عالم جسمانی و روحانی (۱ مقالات) فنِ دوم، واجب الوجود و حدانیت نعوت جلالِ الٰہی، کیفیت فعل وغیرہ (۱ مقالات)

اس کے بعد خاتمہ کتاب ہی جو چار اقطاب پر مشتمل ہی:

قطب اول اصولِ دین،

قطب دوم فروعِ دین،

قطب سیم حکمتِ عملی،

قطب چہارم سلوک،

پچھلے ابواب کی طرح ان اقطاب مین بھی تحتانی مقالات، مقدمات و مسائل مندرج ہین،

مذکورۂ بالا اجمالی فہرست سے اس کتاب کے گوناگون مباحث و مسائل کا ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکتا ہی

اس تصنیف کی نمایان خصوصیت یہ ہی کہ اس کے علمی مسائل، اور اس کی فلسفیانہ موشگافیان، دینی فہم و ادراک کے تابع نظر آتی ہین، اس لئے فلاسفہ و اربابِ عقل اس کی راہ سے دین کے رشتہ کو پا سکتے ہین، اور یونانی فلسفہ و حکمت سے متاثر دماغون مین دینی مباحث و مسائل کے دلائل مستحضر ہو سکتے ہین اسلئے طبقۂ عقلا کیلئے یہ ایک سودمند تصنیف قرار پاتی ہی،

اس کتاب کے قلمی نسخے یورپ کے مختلف کتب خانون مین موجود ہین، برٹش میوزیم مین اس کا نمبر ۴۵۰۸۲ ہی، ریو نے اس نسخہ کا مفصل حال لکھا ہی (فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ج ۲ ص ۴۳۴) نیز انڈیا آفس مین یہ دو نمبرون ۲۲۱۹ و نمبر ۲۲۲۰ مین موجود ہی، اسی طرح وائنا اور برلن کے کتب خانون مین اس کے نسخے موجود ہین اور مختلف ممتاز مستشرقین نے مصنف اور اس کی اس تصنیف کے حالات مختلف فہرستون مین لکھے ہین (فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس جلد ا ص ۱۲۱۰، ۴۹۴ وغیرہ)

اگر علامہ قطب الدین شیرازی کی دوسری تصنیفات کے متعلق بھی جستجو کیجائے تو غالبًا یورپ کے مختلف

کتب خانون میں ان کا سراغ لگ سکتا ہے اور ان کے متعلق مزید معلومات مہیا ہو سکتے ہین،

ہندوستان کے اہلِ علم کے درمیان بھی علامہ شیرازی کی تصنیفات متداول رہی ہین، چنانچہ مولانا عبد الحی فرنگی محلی مرحوم نے اپنے ایک تعلیق مین ان کی شرح القانون شرح المختصر، شرح المفتاح، التحفۃ اور نہایۃ الادراک وغیرہ کے مطالعہ کا تذکرہ کیا ہے (تعلیق بر الفوائد البہیہ ص ۵ ۷) اس لئے یقین ہے کہ ہندوستان کے مختلف کتب خانون مین بھی ان کی تصنیفات محفوظ ہون گی، آپ بانکی پور، رام پور، اور نٹیل کالج لاہور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، وغیرہ کی فہرستون سے ان کا سراغ لگا سکتے ہیں،

درۃ التاج کا یہ مطبوعہ نسخہ بھی پانچ قلمی نسخون سے ترتیب پایا ہے، اور بڑے اہتمام سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، اس کے مصحح سید محمد مشکات نے اس پر ایک پر معلومات مقدمہ لکھا ہے، اور اس کو علٰحدہ علٰحدہ چند جلدون مین شائع کیا ہے، ہمارے یہان اس کی پانچ جلدین جو سوا سوا سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحون پر مشتمل ہین، موجود ہین، پانچوین جلد مین جملہ پنجم کے علم الٰہی کے مباحث ہین، اس کے معنی یہ ہین کہ چھٹی جلد خاتمہ کتاب اور اس کے چارون اقطاب کے مباحث پر مشتمل ہوگی، معلوم نہین آپکے دوست کے پاس اس کی جو دو جلدین ہین، ان مین کہان تک کے مباحث موجود ہین، بہرحال جیسا کہ آپ کو معلوم ہوا، یہ کتاب مطبوعہ کتب مین سے ہے، اس لئے آپکے نسخہ مین جو ندرت ہو سکتی ہے، وہ اس نسخہ کی ذاتی ہوگی، اس کے مطبوع ہونے کی وجہ سے دائرۃ المعارف حیدرآباد مین شاید اس کے لئے گنجایش نہ ہو البتہ قلمی کتابون کے شائقین آپکے نسخہ کی قدر کر سکتے ہین، ہو سکتا ہے کہ یہ سطرین جب معارف مین شائع ہون تو ان کے پڑھنے والون مین سے کوئی صاحب ذوق ایسے نکل آئین، جو آپ کے دوست کے اس نسخہ کی قدردانی فرمائین، اور ان کی نگاہ توجہ سے یہ نسخہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائے اور آپکے دوست کی وقتی ضرورت بھی پوری ہو جائے، والسلام

"س"

ادبیات

ذوق و شوق!

ازجناب انور کرمانی لاہور

سیلِ بلا کو بڑھ کے روک تندیِ موج سے نہ ڈر
منزلِ ذوق و شوق کی موت بھی اک ہے رہگذر

قیدِ مکان و لامکان توڑ گیا میرا جنون!
رازِ حیات پالیا، اپنی خودی میں ڈوب کر

دل کی متاع بے بہا، عشق کا جذبۂ بلند
میری یہ آہِ نیم شب، میرا یہ نالۂ سحر

عزم حسین سے ہے فاش معنی لاالہ کا راز
اب بھی لبِ فرات سے آتی ہے بانگ لاتذر

نکتہ راہلِ ہوش و کیف کھول کے کیا بیان کرون
عقل کا مدعا خبر عشق کی آرزو نظر

آتشِ گل بھڑک اٹھی شعلہ نوا ہے عندلیب
کس کے نفس کے سوز سے صحنِ چمن ہے پُرشرر

معرکہ وجود مین راز یہی بقا کا ہے!
زندہ و جاودان ہے وہ جس کی نظر ہے خودنگر

اٹھنے کو ہے وہ انقلاب، سینۂ کائنات سے
جس کے لئے ہین مہر و ماہ چشم براہ سربسر

یون دلِ ناصبور ہے سینے مین پائمالِ غم!
طائرک بہار ہو جیسے کوئی شکستہ پر

غزل

ازجناب رمز گنوری

دل و دماغ پہ چھایا ہوا ہے رنگِ جمود
ادھر بھی دیکھ لے اونرگسِ خمار آلود

نگاہِ شوق سے مستور دل مین ہے موجود
کہ اوس کی ذات ہے آئینہ دارِ غیب و شہود

خوشا یہ دورِ محبت یہ ساعتِ مسعود　　وہ سامنے ہیں مرے اور میں ہوں محوِ سجود

تجلیوں کی یہاں تک ہوئی فراوانی　　کہ دامنِ نگہ شوق ہو گیا محدود

تصرفِ نگہ مست اے معاذ اللہ　　کہ آج توبہ مری ہو گئی شراب آلود

میں اوس کو دیکھ کے دیوانہ ہوتا جاتا ہوں　　سنبھال اب مجھے نیرنگیٔ طلسم نمود

سرشکِ غم کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے　　بھرے رہیں مرے دامن میں گوہرِ مقصود

یہ سرد سرد ہوائیں یہ چاندنی راتیں　　پلا دے ساقی مہوش اب آتشِ بے دود

اب آستاں پہ اجازت ہو ایک سجدے کی　　کہ دل سے تا بہ جبیں آگیا ہے ذوقِ سجود

بنا دے عالمِ باطن کو عالمِ ظاہر　　کہ ہر مقام سے میں چاہتا ہوں تیری نمود

محبت اصلِ حقیقت ہے چھپ نہیں سکتی

کہ رمز کوششِ اخفائے راز ہے بے سود

بھول گئے!

از جناب شفیع منصور ایم اے شملہ

اب رنگِ بہاراں کیا کہئے، سب رنگِ بہاراں بھول گئے　　شب ہائے خزاں کی ظلمت میں ہم صبحِ گلستاں بھول گئے

سب بھول گئے کچھ یاد نہیں کیوں مہر بلب ہیں کیا کہئے　　کچھ تو ہی بتا دے ہم کیا کیا اے محفلِ جاناں بھول گئے

اک روز جو اُن کے شانے پر بکھری تھی وہ نورِ مستی میں　　ہم شامِ غمِ الفت کی قسم وہ زلفِ پریشاں بھول گئے

کچھ دیکھا تھا ان آنکھوں میں کیا دیکھا تھا اب کیا کہئے　　کیا یاد کریں کچھ یاد بھی ہو سب دیدۂ حیراں بھول گئے

اب یاد کریں ہم کیا اُن کو، اب یاد کریں وہ کیا ہم کو　　سب خواب کی باتیں تھیں شاید وہ خوابِ پریشاں بھول گئے

اب صحرا صحرا پھرنا کیا، اب رونا کیا اب ہنسنا کیا!

منصورؔ وفورِ الفت کے وہ رنگِ نمایاں بھول گئے!!

مطبوعات جدیدہ

ماندو ترجمہ جناب مرزا محمد بشیر صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر،

قیمت مجلد سے غیر مجلد عار، پتہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی،

شادی آباد عرف ماندو (مالوہ) ایک قدیم تاریخی مقام ہے، جو کم وبیش ڈیڑھ صدی تک اسلامی حکومت کا دارالسلطنت رہ چکا ہے، یہ حکومت سلطان محمد بن فیروز تغلق بادشاہ دہلی کے گورنر دلاور خان غوری نے چودہوین صدی عیسوی کے آخر مین قائم کی تھی، سولہوین صدی کے نصف اول مین سلطان محمود خلجی پر اس سلسلہ کا خاتمہ ہوگیا، لیکن اکبری دور تک جبتک مالوہ کا الحاق دلی کی مرکزی حکومت سے نہ ہوگیا، یہان مختلف حکمران ہوتے رہے، ان مین دلاور خان غوری، ہوشنگ غوری، محمود خلجی اول، سلطان غیاث الدین اور باز بہادر نے شادی آباد مین بہت سے محلات، مسجدین، مدرسے، باولیان، حوض، تالاب اور دوسری عالیشان عمارتین بنوائین، جو اپنے دور کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھین، ماندو کا عظیم الشان قلعہ خاص طور سے اہم تاریخی یادگار رہے، اس حکومت کے خاتمہ کے بعد مالوہ کی آب وہوا کی خوبی اور دلکش مناظر کی وجہ سے تیموری سلاطین کو بھی اس سے خاص تعلق رہا، اور وہ سیر وتفریح کے لئے وہان جایا کرتے تھے، شاہجہان کو خاص طور سے مالوہ کی آب وہوا پسند تھی، اس لئے تیموریون نے بھی یہان بعض عمارتین بنوائین، اور پرانی عمارتون کی مرمت کرائی، ان مین سے بعض عمارتین دست برد زمانہ سے کھنڈر بن چکی ہین، لیکن بعض محکمۂ آثار قدیمہ اور ریاست دھار کے بدولت ابتک قائم اور اپنی عظمت گذشتہ کی یاد دلا رہی ہین، جناب غلام یزدانی صاحب ناظم محکمۂ آثار قدیمہ ریاست حیدرآباد نے جنکو آثار قدیمہ سے خاص شغف ہے، ان عمارتون کا مشاہدہ کرکے انکے حالات مین انگریزی مین ایک کتاب "ماندو دی سٹی آف جوائے" لکھی تھی، جو آکسفورڈ یونیورسٹی

پریس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، مذکورۂ بالا کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے، اسمین مانڈو مین اسلامی حکومت کی مختصر تاریخ اور اس کے آثار قدیمہ کے مفصل حالات ہین بعض عمارتون کے فوٹو کے چربے بھی دیدیئے ہین، اور فنی نقطۂ نظر سے ہر عمارت کی تعمیری خصوصیات اس کی موجودہ حالت اور جہان تک مل سکے ہین، ان کے تاریخی حالات دیدیئے ہین، اور جن کتابون اور تصانیف مین ان کا ذکر آیا ہے، ان کے بیانات بھی نقل کر دیئے ہین جس سے اس کتاب کی تاریخی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے، مانڈو کے اسلامی دور کی تاریخ فراموش ہو چکی تھی، اس کتاب سے اس کی تجدید ہوگئی، اس کی اشاعت سے اردو مین ایک مفید تاریخی کتاب کا اضافہ ہوا،

مشرقِ بعید از جناب شاہد حسین صاحب رزاقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۳۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- عہ، پتہ :- دارالاشاعۃ سیاسیہ اشاعت منزل اردو گلی حیدرآباد دکن،

ہندوستان سے مشرقِ بعید کی قربت کے باوجود اردو مین اس کے متعلق بہت کم معلومات ہین جاپان کی حوصلہ مندیون نے مشرقِ بعید کی سیاست کو بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا ہے، اس کے پیشِ نظر جناب شاہد احمد صاحب رزاقی نے اس ضروری موضوع پر یہ کتاب لکھی ہے، کتاب کے شروع مین مشرقی ملکون پر قبضہ و اقتدار کے لئے یورپین حکومتون کی گذشتہ اور موجودہ کشمکش کی تاریخ اور اس کے نتائج بیان کئے ہین، اس کے بعد بحرالکاہل کے تمام بڑے بڑے جزائر اور اوس کے ساحلی ملکون کی گذشتہ تاریخ و موجودہ حالات اور ان مین یورپین طاقتون کی مداخلت اور سیاست کی مختصر سرگذشت بیان کی گئی ہے، جس سے ان ملکون کے متعلق جملہ ضروری معلومات حاصل ہو جاتے ہین، کتاب مفید اور پڑھنے کے لائق ہے،

زندہ روس مرتبہ ادارۂ نیا ادب تقطیع بڑی ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت دو روپیے، پتہ :- کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

ترقی پسند ادیبون نے ایک خاص طرز کے نئے ادب کے علاوہ سوویٹ روس کے متعلق سنجیدہ لٹریچر فراہم کرنے کی بہت کم کوشش کی ہے، اس موضوع پر جو چند متفرق مضامین نکلے ہین، ان کو ادارۂ نیا ادب نے کتابی شکل

مین مرتب کر دیا ہی، یہ مضامین اشتراکیت کے مقصد، سویٹ حکومت کے نظام، روسی کسانون اور مزدورون کی زندگی، ان کی تنظیم موجودہ روسی لٹریچر، افسانے، ڈرامے اور دوسرے فنون، اور دورانِ جنگ مین روسی ادیبون اور فنکارون کی قلمی خدمات وغیرہ سے متعلق ہین، ایک حصہ ان افسانون کا بھی ہے جن سے انقلاب روس اور موجودہ سویٹ زندگی کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، چند انقلابی ترانے بھی ہین، سجاد ظہیر صاحب کا مضمون نسبتہً زیادہ مفید ہے، اس کتاب سے سویٹ روس کے مختلف پہلوؤن کے متعلق متفرق معلومات حاصل ہو جاتے ہین،

مشاہیر کی بیویان (حصہ اول) ازجناب طاہر ورفعت، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍، پتہ :- دارالاشاعت سیاسیہ، حیدر آباد دکن،

اس کتاب مین یورپ کے چھ موجودہ مشاہیر، اسٹالن، مسولینی، چرچل، روزولٹ، جنرل فرانکو، ڈی ویلرا کی بیویون کے حالات ہین، یہ وہ اکابر ہین، جن کو اپنے ملکون مین بادشاہون سے زیادہ عظمت وشان اور اختیارات حاصل ہین، اور انھون نے اپنی قوم و ملک کے لئے جو کارنامے انجام دئیے ہین، وہ دنیا کی نگاہون کے سامنے ہین، یہ حالات اس نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہین جن سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ان عورتون نے اپنے شوہرون کی خانگی، قومی وسیاسی زندگی مین کیسی رفاقت کی ہے، اوران کی ترقی اوران کے کارنامون مین ان کی بیویون کی رفاقت کا کتنا بڑا حصہ ہے، یہ حالات ان تعلیم یافتہ ہندوستانی خواتین کے لئے خاص طور سے سبق آموز ہین، جن کا مقصد تعیش اور آزادی کے سوا اور کچھ نہین ہے، اس سے ان کو معلوم ہوگا کہ دنیا کے بڑے بڑے اور نامور اشخاص کی بیویون نے ان کی زندگی کے مختلف مراحل مین کس دلسوزی سے رفاقت کی ہے، کتاب مفید اور دلچسپ ہے، دوسرا حصہ مشاہیر مشرق کے حالات مین ہوگا،

دیوان بہرام، مرتبہ جناب مسلم ضیائی، ایم اے، تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، غیر مجلد ۸؍، پتہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی،

اس زمانہ مین جب کہ اردو ہندی کا مسئلہ نہ پیدا ہوا تھا، اور سارے ملک کی مشترک اور علمی زبان اردو

ھی جاتی تھی، پارسی، یورپین اور اینگلو انڈین تک اردو زبان سے دلچسپی رکھتے تھے، اور جن کو شعر و سخن کا مذاق تھا
، اس میں شاعری کرتے تھے، ان کی شاعری کے نمونے اردو میں موجود ہیں، انہی میں ایک پارسی شاعر بہرام جی
ماسب جی دستور تھے، ان کا زمانہ کچھ بہت قدیم نہیں ہے ۱۸۹۵ء میں ان کا انتقال ہوا، وہ اردو میں صاحب
یوان تھے، جناب مسلم ضیائی نے ایک مقدمہ کے ساتھ اس دیوان کو مرتب اور انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے
یوان خاصہ ضخیم ہے، گو کلام زیادہ بلند نہیں ہے، لیکن ایک پارسی کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہے اور بہت
سے اشعار تو نہایت صاف اور شستہ ہیں، کلام کا رنگ وہی قدیم ہے جو اس زمانہ میں رائج و مقبول تھا،

حسن ادب و دیگر افسانے، از جناب شوق امرتسری تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت و

طباعت بہتر قیمت ہیر، پتہ ملک محمد عارف خان پبلشر کشمیری بازار لاہور،

ترقی پسند ادب کے ذریعہ جس قسم کے پست و مخرب اخلاق افسانوں کی اشاعت ہو رہی ہے، وہ مخفی نہیں عورتیں فطرۃً
کمزور اور ذکی الحس ہوتی ہیں، اسلئے ان پر اس لٹریچر کا نہایت ناگوار اثر پڑ رہا ہے اور بعض نوجوان تعلیم یافتہ لڑکیاں اس
ادبی فریب میں گرفتار ہو کر اس ادنیٰ درجہ کے پست افسانوی رومان کو اصلی زندگی سمجھنے لگتی ہیں جس کے نتائج نکاح ہوکے
سامنے آتے رہتے ہیں، جناب شوق امرتسری نے اسکی اصلاح کیلئے یہ اخلاقی افسانے لکھے ہیں ان میں عورتوں کی اخلاقی و مذہبی
تربیت اور ان کی سیرت کی اصلاح و تعمیر کو خاص طور سے پیش کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ افسانے قابل قدر ہیں لیکن ان میں
ادبی دلکشی کے بجائے واقعہ نگاری کا رنگ آگیا ہے، اخلاقی نصائح یوں ہی کچھ خوشگوار نہیں ہوتے، اس لئے جب تک ان کو دلکش
انداز میں پیش نہ کیا جائے اس وقت ان کا اثر نہیں ہوتا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اس کا مقابلہ ترقی پسند ادب جیسے فریب لٹریچر سے ہو

خانقاہ، از جناب ایم اسلم تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۶۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ/ر

پتہ :- عبدالحق اکیڈمی اشاعت منزل اردو بازار حیدرآباد دکن،

خانقاہ جناب ایم اسلم کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے، ان کے افسانے تعارف و تبصرہ سے مستغنی ہیں، ان افسانوں
میں مصنف کی تمام افسانوی خصوصیات موجود ہیں، اور حسن انشا، اور حسن تخیل دونوں لحاظ سے دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں

"م"

جلد ۵۴ ماہ رجب المرجب سنہ ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

افسوس کہ گذشتہ مہینہ کی ۲۵ تاریخ کو مولوی محمد بہادر خاں (سابق نواب بہادر یار جنگ) نے حرکت قلب بند ہو جانے سے دفعۃً انتقال کیا، ان کی ناگہانی وفات نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے اندوہناک سانحہ ہے، مرحوم حیدرآباد کے ایک قدیم و ممتاز جاگیردار خانوادہ کے رکن، مخلص دردمند اور علمی مسلمان، زبان آور خطیب، ریاست کے سچے وفادار، مسلمانوں کے غمگسار اور عام اہل ملک کے ہمدرد و بہی خواہ تھے، حیدرآباد کی ہر مفید اسلامی تحریک مین اُن کا دستِ اعانت شامل رہتا تھا، وہ مجلس اتحاد المسلمین کے روح و رواں اور آل انڈیا ریاستی مسلم لیگ کے بانی اور صدر تھے، ابھی کل ۴۱ سال کی عمر تھی جو قومی زندگی کے اعتبار سے بالکل نوجوانی کی عمر ہے، اس عمر میں مرحوم نے حیدرآباد کے مسلمانوں کی جو گوناگوں خدمات انجام دیں وہ کبھی فراموش نہ ہونگی، اور اہل دکن کو مدتوں ان کا بدل نہ مل سکے گا، ملک و قوم کی خدمت کے خاطر انھوں نے اپنا خطاب اور جاگیر تک واپس کردی تھی، ان کی ذات سے بڑی توقعات تھین لیکن افسوس ان کی جوانمرگی سے اہلِ دکن کو اُن کی صلاحیتوں اور خدمات سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ موقع نہ مل سکا، اللہ تعالیٰ اس مخلص خادمِ قوم کو اپنی رحمت و مغفرت کے انعام سے سرفراز فرمائے،

اردو تصانیف و مطبوعات کی رفتار ادھر چند برسوں میں جتنی بڑھ گئی ہے اس کی مثال اس سے پہلے نہین ملتی، اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ قدیم فنون اور پرانے موضوعوں کے علاوہ جدید فنون اور نئے مسائل و ضروریات پر بھی خاصی کتابیں نکلتی رہتی ہیں، خصوصًا حیدرآباد کے بدولت اردو زبان ان سے کافی روشناس ہو چکی ہے، اور مجموعی حیثیت سے اُردو کی ترقی کی رفتار ناقابل اطمینان نہین لیکن ابھی اسکی

وسعت اور ارتفاع کے تناسب مین بڑا فرق ہے، اس کا پھیلاؤ تو بہت بڑھ گیا ہو، لیکن اس کے مقابلہ مین بلندی کم ہو، اس کا سبب یہ ہو کہ ہندوستان کے مخصوص علمی اداروں، علمی رسائل اور سنجیدہ اصحابِ علم کی جماعت کو چھوڑ کر عام مصنفین اور علم فروش اہلِ قلم کی تصانیف و مضامین و مطبوعات کا بڑا حصہ ادنیٰ درجہ کے شعر و ادب، افسانوں اور اس قبیل کے دوسرے ادنیٰ لٹریچر پر مشتمل ہوتا ہو، اور ادبی رسالے تو بیشتر انہی ادبی خرافات سے بھرے رہتے ہیں، جس سے نوجوانوں کی صحیح ذہنی تربیت کے بجائے ان کا مذاق بگڑ جاتا ہے، اس کی اصلاح کی بڑی ضرورت ہے،

مسلمانوں کے فکری و ملی لٹریچر کی بھی اردو مین کمی ہے، خالص مذہبی اور تاریخی لٹریچر تو بقدر ضرورت پیدا ہو گیا ہے، لیکن ہندوستان مین مسلمانون کی فکری و مذہبی سرگذشت کی کمی ہو، جدید تعلیم یافتہ اصحاب علم کی توجہ زیادہ تر ہندوستان کی اسلامی تاریخ و تمدن کی جانب ہو، اسکی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن اس پر بہت سے کام کرنے والے موجود ہین، اور برابر ہوتا رہتا ہے، اس لئے اب دوسرے پہلو کی جانب بھی توجہ کی ضرورت ہے، جو اس سے کم اہم نہین، ایک پہلو پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین کے سیاسی اور تمدنی کارناموں سے تو کم و بیش ہر تعلیم یافتہ شخص واقف ہے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی، خانوادہ ولی اللہی، حضرت مولانا سید احمد بریلوی، مولانا اسمٰعیل شہید، اور اس سلسلہ کے دوسرے بزرگوں نے ہندوستان مین اسلام اور مسلمانوں کی سیاسی سربلندی اور ان کی مذہبی تجدید و اصلاح کے لئے جو قلمی اور مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے اس سے نہ صرف نوجوان بلکہ بہت سے پرانے تعلیم یافتہ اشخاص تک ناواقف ہین،

مسلمان نوجوانوں کی بے راہ روی اور اسلامی قومیت سے دوری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انکو ان بزرگوں کے حالات اور کارناموں سے واقفیت نہیں، اس لئے وہ ہر سیاسی سراب کی جانب لپکتے ہین، بعض اصحابِ علم نے اب ادھر توجہ کی ہے اور اس سلسلہ میں متفرق مفید مضامین اور بعض کتابیں شائع ہوئی ہین لیکن ابھی اس موضوع پر صحیح نقطۂ نظر سے وسیع لٹریچر شائع کرنے اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب علم کو خاص طور سے

اسکی جانب توجہ کی ضرورت ہے لیکن یہ بڑا نازک کام ہے آجکل اقتصادیات، اشتراکیت اور اس قبیل کے دوسرے بین الاقوامی مسائل و نظریات کا دور ہے بغیر اس رنگ کے کوئی خیال اور کوئی تحریک جدید طبقہ مین مشکل سے مقبول ہوتی ہے، اس لئے بعض مخلص اور صاحب علم و نظر علما تک سے اس راہ مین لغزش ہو جاتی ہے اور وہ نیک نیتی سے اسلام کی محبت و خدمت کے جذبہ میں اس کو ان نظریوں کی زد سے بچانے اور نئے طبقہ کو اسکی جانب مائل کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کو جدید سیاسی افکار کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اس کا اصلی چہرہ سیاست کی نقاب میں چھپ جاتا ہے، اور اسلام ایک مُنَزَّل مِنَ اللہ دین کے بجائے محض ایک انٹرنیشنل سیاسی فکر بنکر رہ جاتا ہے، اور اس کی پوری مذہبی تاریخ محض سیاسی سرگذشت کا قالب اختیار کرلیتی ہے، اسلام کی بین الاقوامیت سے کون انکار کرسکتا ہے، وہ خود کَافَّۃً لِلنَّاس ہونے کا مدعی ہے لیکن محض سیاسی فکر کی حیثیت سے نہیں بلکہ بغیر کسی تاویل اور نکتہ آفرینی کے اپنی تمام روحانی و اخلاقی تعلیمات اور مادی قوانین و ضوابط کے ساتھ وہ ایک عالمگیر دعوت ہے، اس پہلو کو بچانے کی بڑی ضرورت ہے، ورنہ اسلام محض ایک سیاسی نظام بن کر رہ جائے گا جس سے اس کا نہ پیش کرنا ہی بہتر ہے کہ یہ اسلام کی خدمت نہیں بلکہ اس کو بگاڑنا ہے،

اس وقت کئی اداروں میں ہندوستانی تاریخ کی تدوین کا کام ہو رہا ہے، حال میں سرسپرو کی صدارت میں ایک نئے ادارہ انڈین ہسٹری انسٹی ٹیوشن کے قیام کی اطلاع ملی ہے، تاریخ نویسی کے لئے اس کے ماتحت تیرہ سب کمیٹیاں بھی بن گئی ہیں، لیکن ابھی اس کے متعلق تفصیلات کا علم نہیں ہوا ہے کہ اس کے بارہ میں کوئی صحیح رائے قائم کی جاسکے، لیکن سرسپرو کی صدارت سے امید ہے کہ یہ تاریخ صحیح قومی نقطۂ نظر سے لکھی جائیگی،

مقالات

فلسفۂ اشراق اور اسلام

(طبیعت)

از
مولانا عبد السلام ندوی

اگرچہ فلسفۂ مشائیہ کی طرح فلسفۂ اشراق کے متعدد مسائل عقائد اسلام کے مخالف ہیں، تاہم بہت سے مسائل ایسے بھی ہیں جن کے ذریعہ سے اسلام کے اصولی عقائد کی تائید کیجا سکتی ہے، اس لئے وہ مسلمانوں کے لئے فلسفۂ مشائیہ سے زیادہ دلچسپی کا مستحق ہے، مثلاً مذہبی اور فلسفیانہ دونوں حیثیتوں سے ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ عالم کون و فساد میں جو تاثیر و تاثر فعل و انفعال اور تغیر و انقلاب ہوتا رہتا ہے، اس کا اصلی سبب کیا ہے؟ فلسفیوں کا ایک گروہ جو طبیعین کے لقب سے مشہور ہے، اس کو طبیعت کا فعل قرار دیتا ہے اور حکماے اسلام میں معتزلہ بھی اسی گروہ کے ہم خیال ہیں اور اسی بنا پر وہ ہر چیز میں ایک طبعی خاصیت کے قائل ہیں جس سے اس کے مخصوص آثار و افعال صادر ہوتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ گروہ خدا کے وجود کا منکر نہیں ہے، بلکہ اس کے نزدیک یہ خواص و آثار خداوند تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کی دلیل ہیں، چنانچہ علامہ جمال الدین قفطی اخبار الحکماء میں لکھتے ہیں کہ حکماء کا گروہ جس نے موجودات کے

اصولی امور پر نظر ڈالی اور خدا کے ضروری اوصاف سے بحث کی، وہ فرقوں میں منقسم ہے، ایک طبعیین اور دوسرے الٰہیین، ان دونوں فرقوں کے علاوہ قدما سے فلاسفہ کا ایک گروہ اور تھا جو خدا کا منکر تھا اور کہتا تھا کہ عالم اسی حالت میں ہمیشہ سے موجود تھا، نہ کسی صانع نے اس کو بنایا اور نہ کسی صاحبِ اختیار ذات نے اسکو اپنے اختیار سے پیدا کیا، آسمان کی حرکت دوریہ کی کوئی ابتدا نہیں ہے، انسان نطفہ سے اور نطفہ انسان سے نباتات دانہ سے اور دانہ نباتات سے پیدا ہوا ہے، اس فرقہ کے حکما میں سب سے زیادہ مشہور شخصیت تالیس ملطی کی ہے اور وہی اس مسئلہ کا موجد ہے، یہی فرقہ ہے جس کو دہریہ اور زنادقہ کہتے ہیں، لیکن حکمائے طبعیین کا گروہ جو طبیعت کے تاثیر و تاثر اور فعل و انفعال سے بحث کرتا ہے، اور یہ پتہ لگاتا ہے کہ اس کے فعل و انفعال سے کون کون سی موجودات پیدا ہوئیں، جو نباتات کے خواص اور حیوانات کے اعضاء کی تشریح و ترکیب سے یہ نتیجہ نکالتا ہے، کہ ان کے اجتماع و امتزاج سے کون کون سی قوتیں پیدا ہوتی ہیں، وہ ان مباحث کے ذریعہ سے خدا کی تعظیم و تقدیس کرتا ہے، اور اس کی مخلوقات کی تحقیق کر کے یہ عقیدہ قائم کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ فاعلِ مختار، قادر، حکیم اور علیم ہے اور تمام موجودات کو اپنی حکمت سے پیدا کیا ہے، اور اپنے علم و ارادہ سے ان کے مخصوص درجے قائم کئے ہیں،

یہاں تک تو اس گروہ کا فلسفہ اسلام کے مخالف نہیں ہے، اور اسی حد تک معتزلہ نے انہی کی تقلید کی ہے، لیکن بدبختی سے اس گروہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس حد سے آگے بڑھ کر یہ رائے قائم کی کہ دنیا میں جس قدر موجودات ہیں وہ اپنے طبعی مقصد کو پہنچ کر فنا ہو جاتی ہیں اور انسان بھی ان ہی موجودات میں داخل ہے، اس لئے اس کی طبعی قوتیں جس حد تک اس کی مدد کرتی ہیں وہ زندہ رہتا ہے، اس کے بعد اور تمام موجودات کی طرح فنا ہو جاتا ہے اور دوبارہ زندہ نہیں ہوتا اس لئے وہ قیامت اور حشر و نشر کا انکار کرتا ہے، اور دہریوں اور زنادقہ

کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے، لیکن حکمائے الٰہیین بالخصوص افلاطون جو فلسفۂ اشراق کا بانی اور اس گروہ کا سرخیل ہے، اگرچہ طبیعت اور اس کے آثار و خواص کا منکر نہیں ہے، تاہم طبیعت کی ایک ایسی تشریح کرتا ہے، جو عقائد اسلام سے بہت کچھ مناسبت و مشابہت رکھتی ہے، لیکن اس تشریح سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے، کہ مشائین کے نزدیک طبیعت کی تعریف کیا ہے؟ اور طبعی افعال کس کو کہتے ہیں؟ حکمائے اسلام میں علامہ ابوالبرکات بغدادی نے کتاب المعتبر میں طبیعت کی مختلف تعریفیں کی ہیں، لیکن ان میں سب سے بہتر تعریف یہ ہے کہ "جو افعال بغیر کسی قسم کی تعلیم اور بغیر کسی خارجی دباؤ کے صادر ہوں وہ طبعی افعال ہیں" لیکن ان کی بھی دو قسمیں ہیں؛

(۱) ایک تو یہ کہ طبیعت سے اس قسم کے جو افعال صادر ہوں ان کا تعلق علم سے ہو، مثلاً انسان کا ہنسنا، رونا، چلنا، بیٹھنا اور سونا وغیرہ اگرچہ کسی خارجی دباؤ اور تعلیم کا نتیجہ نہیں تاہم انسان کا علم ان سے متعلق ہوتا ہے،

(۲) دوسرے وہ طبعی افعال جن کا تعلق علم سے نہ ہو جیسا کہ ایک درخت میں شاخیں اور پتیاں نکلتی ہیں، پھل پیدا ہوتے ہیں، وہ زمین سے اجزائے غذائی کو جذب کرکے اپنے ہر حصہ میں پھیلاتا ہے، لیکن اس کو اس کا مطلق علم نہیں ہوتا، اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ طبیعت علم و شعور سے خالی ہوتی ہے، لیکن اس دوسرے قسم کی بھی دو قسمیں ہیں،

(۱) ایک تو یہ کہ طبیعت کے اس غیر شاعرانہ فعل کا رُخ ایک ہی جانب ہو، مثلاً آگ کا شعلہ ہمیشہ اوپر ہی کا رُخ کرتا ہے، پتھر ہمیشہ نیچے ہی کو گرتا ہے،

(۲) دوسرے یہ کہ اس کا کوئی خاص رُخ نہ ہو، بلکہ وہ ہر طرف مائل ہو سکے، مثلاً درخت کی جڑ نیچے کا رُخ کرتی ہے، شاخیں اوپر کی طرف بڑھتی ہیں، اور ہر طرف پھیلتی ہیں، ان دونوں قسموں میں طبیعت اسی چیز کو کہتے ہیں جس کے افعال کا رُخ صرف ایک ہی ہو،

اس تعریف سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طبیعت اُس غیر شعوری قوت کا نام ہے جس کے افعال ایک ہی نہج ایک ہی طرز اور ایک ہی اسلوب پر واقع ہوں۔ طبیعت کی حقیقت اور ماہیت کے متعین ہو جانے کے بعد ہم کو دیکھنا چاہئے کہ طبیعت کے متعلق متکلمین اسلام کا کیا خیال ہے؟ متکلمین کے گروہ میں سب سے پہلے طبیعت اور اس کے آثار و افعال کا انکار اشاعرہ نے کیا چنانچہ علامہ ابن تیمیہ الرد علی المنطق میں لکھتے ہیں :-

> اسی طرح متکلمین کی یہ بھی غلطی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے کسی چیز کو کسی سبب اور کسی حکمت سے نہیں پیدا کیا اور یہ کہ اجسام میں خدا نے خاصیتیں اور خاص خاص قوتیں اور طبیعتیں نہیں رکھیں، اور یہ کہ جو چیز پیدا ہوتی ہے۔ فاعل مختار اس کو بلا کسی تخصیص کے خود پیدا کر دیتا ہے،

اشاعرہ کے اس انکار کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے معجزات کا ثبوت جو بظاہر قانون قدرت کے مخالف ہوتے ہیں، آسانی سے ہو سکے، کیونکہ جب کوئی قانون قدرت ہی نہیں ہے تو معجزات کو قانون قدرت کے مخالف نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک غیر ذی روح قوت سے اس قدر مختلف، متنوع، عجیب اور بوقلموں آثار و افعال نہیں صادر ہو سکتے، چنانچہ رسائل اخوان الصفا میں ہے

بان الذین انکروا فعل الطبیعة	جن لوگوں نے طبیعت کے فعل کا انکار کیا
یقولون انه لا یصح الفعل الا من	وہ کہتے ہیں کہ فعل صرف ایک زندہ اور
حی قادر،	صاحب قدرت ذات سے سرزد ہو سکتا ہے

اسی بنا پر مصنفین رسائل اخوان الصفا نے جو فلسفہ و شریعت میں تطبیق دینے کے مدعی ہیں طبیعت کو ایک ذی روح اور صاحب قدرت ہستی قرار دیا ہے، اور لکھا ہے کہ" جن حکماء نے عالم مادیات کے حوادث و مخلوقات پر بحث کی ہے، وہ ان تمام آثار و افعال کو طبیعت کی طرف منسوب

کرتے ہیں، اسی طرح علماء کی ایک جماعت طبیعت کے افعال بلکہ خود طبیعت کے وجود ہی کی منکر ہے اس بنا پر ہم کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ طبیعت کے معنی بتائیں اور یہ ظاہر کریں کہ جن لوگوں نے طبیعت کے افعال کا انکار کیا ہے ان کو طبیعت کے معنی معلوم نہ ہو سکے اور اسی وجہ سے انھوں نے اس کے افعال کا انکار کر دیا،

تو برادرمن، تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ طبیعت نفس کلی کی بہت سی قوتوں میں سے ایک قوت کا نام ہے جو اس سے نکل کر ان تمام اجسام میں پھیل گئی ہے، جو فلک قمر کے نیچے ہیں اور ان کے تمام اجزاء میں سرایت کر گئی ہے، شریعت کی اصطلاح میں اسی کا نام ملائکہ ہے۔ جن کے متعلق حفاظت عالم کا کام کیا گیا ہے۔ لیکن فلسفیانہ اصطلاح میں ان کو قوائے طبعیہ کہتے ہیں اور وہ خداوند تعالیٰ کے حکم سے اجسام پر اثر انداز ہوتی ہیں، لیکن جن لوگوں نے طبیعت کے فعل کا انکار کیا وہ اس لفظ کے معنی نہ سمجھ سکے اور یہ خیال کیا کہ اس لفظ کا مفہوم جسم ہے، حالانکہ جسم بحیثیت جسم کے فریقین کے اجماع اور دلائل صحیحہ کے رو سے کوئی فعل صادر نہیں کر سکتا۔

برادرمن! تم کو جاننا چاہئے کہ جن لوگوں نے طبیعت کے فعل کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ فعل صرف زندہ اور صاحب قدرت ہستی سے صادر ہو سکتا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے، لیکن وہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ زندہ اور صاحب قدرت صرف وہ جسم ہو سکتا ہے جو ایک مخصوص ہیئت کے ساتھ اعراض مثلاً حیات، قدرت اور علم وغیرہ کا محل ہو، لیکن یہ لوگ اس سے ناواقف ہیں کہ اس جسم کے ساتھ ایک دوسرا روحانی جوہر بھی ہے جو نظر نہیں آتا اور اس کا نام نفس ہے اور ان تمام اعراض کو جو اُن کے نزدیک جسم میں حلول کئے ہوئے ہیں یہی نفس ان میں عمل کر کے پیدا کرتا ہے، تو برادرمن جن لوگوں نے طبیعت کے فعل کا انکار کیا ہے وہ علم النفس سے واقف نہ تھے اور اس ناواقفیت کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے حواس کے ذریعہ سے اس کا علم حاصل کرنا چاہا اور جب حواس کے ذریعہ

سے اس کا علم حاصل نہ ہو سکا تو اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا، لیکن جن لوگوں نے نفس کے وجود کو معلوم کیا ان کو یہ علم ان افعال سے ہوا جن کو نفس جسم میں کرتا ہے، کیونکہ انھوں نے جب جسم کے حالات کی جانچ پڑتال کی تو ان کو معلوم ہوا کہ صرف جسم کوئی فعل صادر نہیں کر سکتا، اور جو اعراض اس میں حلول کئے ہوئے ہیں وہ بھی کوئی فعل نہیں صادر کر سکتے، بلکہ فعل جو کچھ کرتا ہے صرف نفس کرتا ہے، باقی جسم اور اس کے اعراض تو وہ بمنزلہ نفس کے آلے کے ہیں جیسا کہ تمام کاریگروں کو آلے کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً بڑھئی اپنا فعل لکڑی میں جو ایک طبعی جسم ہے مادی آلات مثلاً بسولے اور آرے وغیرہ کے ذریعہ سے کرتا ہے، لیکن یہ تمام آلے مصنوعی جسم ہیں، اور خود کاریگروں کے جسم بھی طبعی اجسام میں شامل ہیں اور وہ ان کے نفوس کا آلہ ہیں،

اب معلوم ہوا کہ طبیعت کیا چیز ہے؟ اور یہ کہ وہ نفس کلیہ فلکیہ کی قوتوں میں سے ایک قوت ہے اور فعل صرف نفس سے صادر ہوتا ہے اور احیام میں اپنے افعال اپنی قوت کے ذریعہ سے کرتا ہے اور تمام اجسام اس کے آلات و ادوات ہیں اور وہ ان ہی میں وہ عمل کرتا ہے"

بعض صوفیہ بھی طبعی قوت ہی کو ملائکہ کہتے ہیں، البتہ ان کا موضوع چونکہ تمام مادی اجسام میں صرف انسان کی ذات ہے اس لئے وہ صرف انسان کی طبعی قوتوں کو ملائکہ کہتے ہیں، چنانچہ مولانا عبد العلی بحر العلوم مثنوی مولانا روم کے بعض اشعار کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

پس جبرئیل کہ مشہود رسل علیہم السلام است	تو جبرئیل جو انبیاء علیہم السلام کو نظر آتے ہیں
و وحی از جانب حق سبحانہ می رسانند آں	اور خدا کی طرف سے وحی لاتے ہیں وہ حقیقت
حقیقت جبرئیلیہ است کہ قوتے از قوائے	جبرئیلیہ ہے جو انبیاء کی قوتوں میں سے ایک
رسل بود متصور شدہ در عالم مثال بصورتے	قوت کا نام ہے، یہی قوت صورت بن کر
کہ ممکن بود در رسل مشہود می شود مر رسل	عالم مثال میں انبیاء کو محسوس ہوتی ہے اور

می‌گردد و پیغام حق را می‌رساند پس رسل مستفیض
از خود اند نه از دیگرے ایں ہر چہ کہ رسل
مشاہدہ می‌کنند مخزون در خزانۂ خیال ایشان
بود ہمچنیں عزرائیل کہ بہ وقت موت مشہود
می‌شوند میت را آں ہموں حقیقت عزرائیلیہ
است کہ قوتے از قواے میت است
کہ متصور شدہ بہ صورتے در عالم برزخ
مشہود می‌شود میت را و ایں صورت
ہم مکنون بود در میت و بہ ایں مشیر است
قول اللہ تعالیٰ قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ
الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ بگو اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
وفات می‌دہد شمارا آں ملک الموت کہ
سپرد کردہ شدہ است بہ شما یعنی در شما
است قوتے از قواے شما شدہ و در قبر
منکر و نکیر مشہود خواہند شد از ہمیں قبیل است
(شرح مثنوی شاہ عبد العلی بحر العلوم بر مثنوی جلد ۳
صفحہ ۷۵ مطبوعہ نولکشور بحوالہ سوانح مولانا روم)

خدا کی طرف سے قاصد بنکر پیغام لاتی ہے تو
انبیاء انکو آپ ہی سے مستفیض ہوتے ہیں،
نہ کسی اور سے، جو کچھ ان کو نظر آتا ہے وہی
ہے جو خود ان کے خزانے میں مخزون تھا
اسی طرح عزرائیل جو موت کے وقت مردے
کو نظر آتے ہیں وہ حقیقت عزرائیلیہ
ہے، جو مردے کے قویٰ میں سے ایک قوت
ہے، وہی صورت بن کر عالم برزخ میں
مردے کو نظر آتی ہے، اور یہ صورت
بھی مردے میں پہلے ہی سے مخفی تھی؛
اور قرآن مجید کی اس آیت میں قُلْ
یَتَوَفّٰکُمْ الخ اسی کی طرف اشارہ ہے؛
یعنی کہدو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ
ملک الموت تمہاری جان نکالتا ہے، جو
تم پر متعین کیا گیا ہے، یعنی تمھیں میں ایک
قوت ہے منجملہ اور قویٰ کے اور قبر میں
جو منکر و نکیر نظر آئیں گے وہ بھی اسی قسم کی بات ہے

لیکن طبیعیات کا موضوع چونکہ تمام مادی اجسام ہیں اس لئے ہر جسم کی طبعی قوت کو بھی ملائکہ
کہہ سکتے ہیں، اور ہمارے زمانہ کے ارباب طبائع یعنی نیچریوں نے اسی قسم کے فلسفیانہ نظریات کی

بنا پر ملائکہ کی تعبیر قوت ہی سے کی ہے، لیکن یہ نظریہ اسلام کے عقائد سے کسی قدر دور ہے، کیونکہ ظاہر قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کی ایک مستقل روحانی حقیقت ہے اور ان کی دنیا اس مادی دنیا سے بالکل الگ ہے، وہ اگرچہ عالم مادیات سے تدبیر و تصرف کا تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس میں ضم نہیں ہو جاتے، بلکہ اس سے الگ رہتے ہیں، البتہ حکمائے اشراق نے طبیعت کی جو حقیقت بتائی ہے، وہ اسلام کے ظاہری عقیدہ سے قریب تر ہے، اور اس حقیقت کے رو سے اگرچہ طبیعت کو ملائکہ اور ملائکہ کو طبیعت کہا جاسکتا ہے، لیکن با ایں ہمہ ملائکہ کا یہ گروہ اس مادی دنیا سے الگ رہتا ہے، اور اس کی ذات کسی جسم میں مدغم ہو کر نہیں پائی جاتی،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ افلاطون کے نزدیک مادی اجسام کی ہر نوع مثلاً آگ، پانی خاک اور ہوا وغیرہ کے لئے ایک بسیط، نورانی صورت بذات خود قائم و موجود ہے اور اس کے لئے کوئی محل و مکان نہیں ہے، بلکہ وہ خالص روحانی چیز ہے، تمام اجسام کی صور نوعیہ جن سے اس جسم کے آثار و افعال صادر ہوتے ہیں، اس کا مجسمہ اس کا پرتو اور اس کا سایہ ہیں اور وہ ان سب کی روح ہے، کیونکہ وہ لطیف ہے اور یہ کثیف اور اس کی لطافت اور اس کی کثافت کی وجہ سے دونوں میں روح اور مادہ کی نسبت ہے، ان ہی نورانی اور قائم بالذات صورتوں کا نام "مثل افلاطونیہ" ہے جو اگرچہ خاص طور پر افلاطون کی طرف منسوب ہیں، لیکن افلاطون سے پہلے جو حکما گذرے ہیں مثلاً سقراط، اور سقراط سے بھی پہلے ہرمس، اغاثا ذیمون اور انباذقلس بھی اسکے قائل ہیں، اور تمام حکمائے ایران کو بھی اس سے اتفاق ہے کہ ہر جسمانی نوع یعنی آسمان، ستارے عناصر اور ان کے مرکبات کی تربیت و پرداخت اور تدبیر و تصرف کے لئے عالم نور یا عالم روح میں ایک نورانی ہستی موجود ہے جس کو فلسفیانہ اصطلاح میں رب النوع کہتے ہیں، وہی ان کو نشو و نما دیتی ہے، وہی ان کو کھلاتی ہے، اور وہی ان کو پیدا کرتی ہے، کیونکہ نباتات اور حیوانات بعض اس قسم

کے جو مختلف آثار و افعال صادر ہوتے ہیں ان کو ایک بسیط اور غیر ذی شعور طبیعت کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا،

مشائیہ کے نزدیک عقول یعنی ملائکہ کی تعداد صرف دس میں محدود ہے، لیکن حکماے اشراق کے نزدیک چونکہ دنیا میں غیر محدود نوعین موجود ہیں اس لئے ان کی تربیت و پرداخت کے لئے جو فرشتے یا رب النوع مقرر ہیں ان کی تعداد بھی غیر محدود ہے، اور حکماے ایران نے ان میں سے بہتوں کے نام بھی رکھے ہیں، مثلاً پانی کے رب النوع کا نام خرداد، درختوں کے رب النوع کا نام مرداد اور آگ کے رب النوع کا نام اردی بہشت ہے، اور وہی آگ کو روشن کرتا ہے، وہی چراغ کی بتی کی لو کو قائم رکھتا ہے، اور اسی کے ذریعہ سے بتی تیل کو جذب کرتی ہے،

قرآن مجید اور احادیث سے ثابت ہے کہ ملائکہ کا کام نظام عالم کا انصرام ہے، چنانچہ قرآن مجید کی ایک آیت کے اس ٹکڑے "فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان فرشتوں کا کام خدا کے حکم سے نظام عالم میں تدبیر و تصرف کرنا ہو، ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں "وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فرشتوں کا کام عالم کی حفاظت اور نگہبانی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر چیز پر ایک فرشتہ مقرر ہے، یہاں تک کہ بارش کے ہر قطرہ کے ساتھ ایک فرشتہ اترتا ہے، بہرحال ان ہی فرشتوں کا نام اشراقیین کی اصطلاح میں ارباب الانواع ہے، اور انھوں نے ان کے وجود پر حسب ذیل دلائل قائم کئے ہیں،

(۱) دنیا میں جس قدر نوعین موجود ہیں، وہ ایک غیر متبدل اصول کی پابند ہیں، اور ان ہی غیر متبدل اصول کا نام نظام عالم قانون قدرت اور لا آف نیچر ہے، انسان سے ہمیشہ انسان ہی اور گیہوں سے ہمیشہ گیہوں ہی پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ نظام محض بخت و اتفاق سے قائم نہیں ہوا ہے، کیونکہ اتفاقی امور دائمی بلکہ اکثری بھی نہیں ہوتے، حالانکہ نظام عالم ہمیشہ ایک ہی طرز اور ایک ہی اسلوب کے مطابق

چل رہا ہے، اس لئے اس کو ایک ایسی ہستی کا معلول قرار دینا چاہئے جو بذات خود قائم، ثابت اور غیر متبدل ہو، اسی ہستی کا نام رب النوع ہے اور وہی دنیا کی تمام نوعوں میں تدبیر و تصرف کرتی ہے، وہی ان کی محافظ و نگہبان ہے اور اسی کی جانب سے ان پر مناسب اوصاف و عوارض کا فیضان ہوتا ہے، مور کے پروں میں جو عجیب و غریب رنگ اور نقش و نگار پائے جاتے ہیں، ان کی علت یہی رب النوع ہے، مشائین اس کو ان پروں کے مزاج کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن اس پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، اور وہ متعین طور پر ان مختلف رنگوں کا کوئی سبب نہیں بیان کر سکتے،

(۲) اشراقیین کا ایک نہایت اہم اصول قاعدہ امکان اشرف ہے یعنی یہ کہ جب ممکن اخس کا وجود ہوگا، تو اس کے وجود سے پہلے لازمی طور پر ممکن اشرف کا وجود ہوگا، ادنیٰ کے لئے اعلیٰ کا ہونا ضروری ہے، اور اس قاعدہ کے مطابق ارباب الانواع کا وجود خود بخود ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ دنیا میں جس قدر مادی نوعیں موجود ہیں، ان کا درجہ مجردات سے کم ہے اس لئے ان کے وجود کے لئے اس قسم کی مجرد ہستیوں کا وجود ضروری ہے، جو اُن سے اشرف و اعلیٰ ہوں اور ان ہی ہستیوں کا نام ارباب الانواع ہے،

(۳) انبیاء اور حکماء کے کشف و مشاہدہ سے بھی ان کا وجود ثابت ہوتا ہے، اور اس کشف و مشاہدہ کے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بطلیموس وغیرہ نے افلاک و ثوابت وغیرہ کا مشاہدہ کیا، اور اسی مشاہدہ پر علم ہیئت اور علم نجوم کی بنیاد قائم ہوئی، اسی طرح جن حکماء نے اپنے روحانی مشاہدے میں ان ارباب الانواع کو دیکھا ہے، ان کی رائے کیوں نہ تسلیم کی جائے؟ یہی ارباب الانواع ہر نوع کی طبیعت ہیں، اور ان ہی کے ذریعہ سے ان کے آثار و افعال صادر ہوتے ہیں، ارسطو نے طبیعت کی تعریف یہ کی تھی کہ "وہ ہر چیز کی حرکت و سکون کی علت ہے" لیکن یحییٰ نحوی نے اس پر اعتراض کیا کہ اس سے طبیعت کا وجود ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے فعل کا وجود ثابت ہوتا ہے اس کے بعد اس نے اپنی محققانہ رائے یہ ظاہر کی کہ طبیعت اس روحانی قوت کا نام ہے جو تمام اجسام عنصریہ میں

ری ہے وہ ان اجسام میں تصویر بناتی ہے، ان کی تدبیر کرتی ہے، ان کے حرکات وسکنات کی
ت ہے اور ایک خاص مقصد کے لئے اپنا عمل کرتی ہے اور جب وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے، تو
ہ جاتی ہے۔

اسلامی فرقوں میں صرف اشاعرہ طبیعت کے وجود کے منکر ہیں، ان کے علاوہ معتزلہ و محدثین
ں کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں، معتزلہ کے دلائل تو غالباً وہی ہیں جو فلسفہ مشائیہ کی کتابوں میں مذکور
یں، لیکن محدثین نے حدیث اور اشعار عرب سے اس پر استدلال کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن حزم ظاہری
ل ونحل میں لکھتے ہیں کہ "اشاعرہ نے کلیتہً تمام طبائع کا انکار کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ نہ تو آگ میں حرارت
ہے، نہ برف میں برودت ہے، اور نہ دنیا میں کوئی طبیعت ہی صرف چھونے کے وقت آگ میں گرمی
ور برف میں سردی پیدا ہو جاتی ہے، نہ تو شراب میں نشہ کی طبیعت ہے، اور نہ منی میں پیدا کرنے
کی طاقت، بلکہ خدا جو کچھ پیدا کرنا چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے، اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ آدمیوں کے نطفے
سے اونٹ اور گدھے کے نطفے سے انسان پیدا کر دے۔"

اس سے ان کا مقصد معجزات کا اثبات ہے، کیونکہ وہ معجزات کو خرق عادت کہتے ہیں،
خرق طبیعت نہیں کہتے، لیکن علامہ ابن حزم اس کی تردید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میں نے اس کے
متعلق بعض اشاعرہ سے مناظرہ کیا اور کہا کہ جس زبان میں قرآن مجید نازل ہوا ہے وہ تمہارے
خیال کو باطل کرتی ہے، کیونکہ عربی زبان میں طبیعت، خلیقہ، سلیقہ، بحیرہ، عزیزہ، سجیہ اور جبلت
کے الفاظ آئے ہیں اور یہ الفاظ زمانہ جاہلیت میں استعمال کئے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان کو سنا ہے اور ان کا انکار نہیں کیا ہے، صحابہؓ نے اور ان کے بعد کے لوگوں نے بھی ان کا انکار
نہیں کیا، ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھ میں حلم و بردباری پائی جاتی ہے،
مجھ میں یہ اوصاف جبلی ہیں یا کسبی؟ آپؐ نے فرمایا کہ جبلی ہیں، اور یہ تمام الفاظ مترادف اور ہم معنی

اب اس نے مجبور ہو کر کہا کہ میں تو صرف انسان میں طبیعت کو مان سکتا ہوں، میں نے کہا کہ اس تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ بلکہ وہ تو بداہتہً وحسًا دنیا کی ہر مخلوق میں موجود ہے، اب اس کے پاس طبع کاری کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا، لیکن علامہ موصوف نے جو الفاظ گنائے ہیں اور اشعار عرب میں اس قسم کے جو الفاظ آئے ہیں ان سے فلسفیانہ اصطلاح کے مطابق طبیعت کا ثبوت نہیں ہوتا، اہل عرب نے ان الفاظ کو عادت اور ان اوصاف کے متعلق استعمال کیا ہے، جو انسان پر غالب ہوتے ہیں، خود علامۂ موصوف تسلیم کرتے ہیں کہ اہل عرب نے طبیعت کے معنی میں عادت کا لفظ استعمال کیا ہے، چنانچہ حمید بن ثور ہلالی کہتا ہے،

سلی الربع ان یممت یا امّ سالم   وھل عادۃ للربع ان یتکلما

اے ام سالم کھنڈر سے پوچھ   لیکن بولنا کیا کھنڈر کی فطرت ہے،

بعینہ اسی طرح عادت کے معنی میں طبیعت کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے،

علامۂ موصوف نے طبیعت کی تعریف یہ کی ہے کہ "اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی، انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ علوم و فنون سیکھ سکتا ہے، اور گدھے کی فطرت یہ ہے کہ وہ نہیں سیکھ سکتا، گیہوں سے جو اور اخروٹ نہیں پیدا ہو سکتے، غرض اشیاء کے طبعی اوصاف وہ ہیں جن کے زائل ہو جانے کے بعد خود وہ چیز ہی فنا ہو جاتی ہے، شراب میں اگر نشہ کی کیفیت باقی نہ رہے تو وہ سرکہ بن جاتی ہے" لیکن اہل عرب نے اپنے اشعار میں طبیعت اور جبلت وغیرہ کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کی نسبت بہ مشکل یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ طبیعت کے اس معنی میں استعمال کئے گئے ہیں، اگر ایک صحابی میں حلم و بردباری کا وصف جبلتہً موجود تھا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو کبھی غصہ آ ہی نہیں سکتا تھا، خود علامۂ موصوف لکھتے ہیں کہ "بعض اوصاف ایسے ہیں کہ اگر وہ زائل ہو جائیں تو نہ ان کا موصوف فنا ہو سکتا نہ اس کا نام بدل سکتا، اور ان کی تین قسمیں ہیں، ایک تو وہ جن کا زائل ہونا ممکن ہے، مثلاً ناک کا چپٹا ہونا، قد کا چھوٹا

ہونا، حبشی کا رنگ وغیرہ، لیکن اگر ان اوصاف کے زائل ہونے پر بھی انسان انسان ہی رہیگا، دوسرے وہ جو دیر میں زائل ہو سکتے ہیں، مثلاً بالوں کی سیاہی وغیرہ، تیسرے وہ جو بہت جلد زائل ہو سکتے ہیں مثلاً شرمندگی کی سرخی اور خوف کی زردی"، اہل عرب نے اپنے کلام میں طبیعت اور سلیقہ وغیرہ کا جو لفظ استعمال کیا ہے ان میں سے دو پہلی صورتوں کے متعلق استعمال کیا ہے، لیکن اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اہل عرب نے ان الفاظ کا استعمال بالکل فلسفیانہ اصطلاح ہی کے مطابق کیا ہے تو سوال یہ ہے کہ اس معنی میں طبیعت کا مصداق کیا ہے؟ مشائین جسم کو تین جوہری اجزاء سے مرکب مانتے ہیں، ہیولیٰ، صورت جسمیہ اور صورت نوعیہ، ان تینوں میں ہیولیٰ اور صورت تو تمام اجسام میں مشترک ہیں، اور ان سے جسم مطلق بنتا ہے، البتہ صورت نوعیہ ان میں امتیاز و تخصیص پیدا کرتی ہے، اور اسی سے ہر جسم کے آثار و افعال کا صدور ہوتا ہے، لیکن اہل عرب نے طبیعت وغیرہ کے الفاظ صورت نوعیہ کے معنی میں استعمال نہیں کئے ہیں، بہرحال اہل عرب کے اشعار اور حدیث کے الفاظ سے فلسفیانہ اصطلاح کے مطابق طبیعت کا ثبوت نہیں ہو سکتا،

شرعی حیثیت سے سب سے زیادہ موثق چیز قرآن مجید ہے اور قرآن مجید میں طبیعت کا لفظ کہیں نہیں آیا ہے، بلکہ جن مفسرین نے قرآن مجید کی فلسفیانہ تفسیر کی ہے، انھوں نے قرآن مجید کی بعض آیتوں کی تفسیر میں استنباطاً طبیعت کا انکار کیا ہے، چنانچہ قرآن مجید کی ایک آیت جو خداوند تعالیٰ کے وجود اور قدرت کی دلیل ہے، یہ ہے،

وَمَا ذَرَاَ لَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ (نحل)

اور جو کچھ پھیلا دیا ہے واسطے تمھارے بیچ زمین کے کہ مختلف ہیں رنگ اس کے تحقیق بیچ اس کے نشانیاں ہیں واسطے اس قوم کے کہ نصیحت پکڑتی ہیں،

اور اس آیت کی تفسیر سے پہلے امام رازی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ یہ تمام مختلف الوان چیزیں فصول اربعہ کے پیہم آنے جانے، سورج، چاند اور ستاروں کے اثر سے پیدا ہوئی ہوں"۔ پھر اس کا یہ جواب دیا ہے کہ نباتات اور حیوانات کا وجود، طبیعت، آسمان اور ستاروں کے اثر سے نہیں ہو سکتا کیونکہ طبیعت آسمان، ستارے، چاند اور سورج کی تاثیر کی نسبت تمام چیزوں کے ساتھ یکساں ہے، حالانکہ ان کا اثر مختلف ہے، گلاب کے پھول میں ایک ہی پنکھڑی کا ایک رخ نہایت سرخ اور دوسرا رخ نہایت زرد ہوتا ہے، حالانکہ وہ پنکھڑی نہایت باریک اور لطیف ہوتی ہے لیکن ہم کو بداہتہً معلوم ہے کہ ستاروں اور آسمانوں کی نسبت اس پنکھڑی کے دونوں رخ کے ساتھ یکساں ہے اور ایک طبیعت ایک مادہ میں صرف ایک ہی اثر پیدا کر سکتی ہے، اسی بنا پر فلاسفہ کہتے ہیں کہ بسیط شکل صرف کرہ کی ہے، کیونکہ ایک مادہ پر طبیعت کا ایک ہی اثر پڑتا ہے، اور کرہ ہی شکل کے تمام اطراف یکساں ہوتے ہیں، تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ طبیعت کی نسبت اس پنکھڑی کے دونوں رُخ کے ساتھ یکساں ہے تو اس کا اثر بھی یکساں ہونا چاہئے، حالانکہ اثر یکساں نہیں بلکہ مختلف ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہ متنوع اوصاف، یہ مختلف رنگ اور یہ گوناگوں حالات طبیعت کے اثر سے نہیں پیدا ہوئے ہیں، بلکہ ان کو ایک فاعل مختار اور حکیم نے پیدا کیا ہے، جس کو خدا کہتے ہیں اور "ما ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ" کا یہی مطلب ہے"۔

بہر حال دنیا کی تمام بوقلمونیاں اور رنگینیاں طبیعت کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتیں بلکہ خداوند تعالیٰ ان کو مخصوص فرشتوں کے ذریعہ سے پیدا کرتا ہے، جن کو فلسفیانہ اصطلاح میں رب النوع کہتے ہیں، اور یہی فرشتے جیسا کہ حکماے اشراقیین کا نظریہ ہے، ہر نوع کی طبیعت ہیں[1]

---

[1] چنانچہ علامہ قطب الدین شیرازی شرح حکمۃ الاشراق میں لکھتے ہیں کہ "زمین کی طبیعت برودت اور یبوست نہیں ہے

جوہر نوع میں اس کے مناسب اوصاف و عوارض پیدا کرتے رہتے ہیں، ان سے الگ طبیعت کا کوئی وجود نہیں، اس لئے اشاعرہ نے اشیار کے خواص و طبائع کا جو انکار کیا ہے وہ مذہب اور فلسفہ دونوں کے مطابق ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماقبل) بلکہ اس کا رب النوع ہے جس کو حکمائے ایران اسفندار مذ کہتے ہیں (اور اسی رب النوع نے زمین میں برودت اور یبوست کی کیفیت پیدا کی ہے)، اسی طرح ہر نوع کو اگر اس کی کیفیات سے الگ کر لیا جائے تو اس کا رب النوع ہی اس کی طبیعت ہوگا، یہی وجہ ہے کہ ارباب اخوان الصفاء نے طبیعت کا نام ملائکہ رکھا ہے جو عالم کی تدبیر کرتے ہیں، شیخ الاشراق اسی رب النوع کو نور اور اس کا تعلق جس نوع سے ہوتا ہے، اس کو اس کا صنم یعنی بت کہتے ہیں، کیونکہ بت جس طرح غیر ذی روح ہوتا ہے، اسی طرح اس رب النوع کے بغیر وہ نوع ایک قالب بیجان ہوتی ہے۔

ہندوستان مین کاغذ کی تاریخ

از

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی

آج جس کثرت سے ہم کاغذ کا استعمال کرتے ہیں، اس فراوانی کو دیکھ کر بہت کم اشخاص اس حقیقت سے آگاہ ہونگے کہ ایک زمانہ ایسا بھی ہندوستان پر گذرا ہے کہ یہاں کاغذ کا رواج نہ تھا،

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں کاغذ کی جگہ دوسری مختلف چیزیں رائج تھیں، ضرورت کے وقت اُن ہی کو استعمال میں لاتے تھے، بھوج پتر، کھجور کے پتے، تاڑ کے پتے، تانبہ، پتھر، ریشم وغیرہ کا استعمال ہوتا تھا، چنانچہ اشوک کے فرمان آج بھی پتھر پر کندہ ہین، اسی طرح عطیات کے پروانے جو ولبھی خاندان (کاٹھیاوار) کی طرف سے دیئے گئے تھے، تامر پتر (تانبہ کی تختی) پر تحریر ہین، جن کو محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے بمبئی کے عجائب خانہ میں رکھ دیا گیا ہے،

ہندوستان کی ہمعصر قومیں بھی اس سے واقف تھیں جیسا کہ عربی کی ایک قدیم تاریخ مین ہے:

العرب تکتب فی اکتاف الابل	عرب اونٹ کے شانوں کی ہڈیوں اور کھجور
واللخاف..... والهند فی النحاس	کے پتوں پر اور ہندوستانی تانبہ، پتھر اور
والحجارة فی الحریر الابیض[1]	سفید ریشم پر لکھتے تھے،

ہندوستانیوں نے جب اس سے زیادہ ترقی کی تو درخت کے پتے استعمال کرنے لگے، ا

---

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۳۲ مصر،

اس کے لئے انھوں نے بھوج پتر اور تاڑ زیادہ موزوں سمجھا، بیرونی لکھتا ہے:

اما في البلاد الجنوبية فلهم شجر باسق	جنوبی ہند میں ایک اونچا درخت کھجور اور ناریل
كالنخل والنارجيل ذو ثمر يؤكل	کی طرح ہوتا ہے جس کا پھل کھایا جاتا ہے، اس کے
واوراق في طول ذراع وعرض ثلاث	پتے طول میں ایک ہاتھ اور عرض میں تین انگل
اصابع مضمومة، يسمونها تاري	کے برابر ہوتے ہیں، اس کا نام تاڑ ہے، اسی
(تاڑ) ويكتبون عليها ويضم كتابهم	پر لکھتے ہیں، اس کے بیچ میں ایک سوراخ
منها خيط ينظمها من ثقبة في	کرکے دھاگے سے اسکو منظم کر لیتے
اوساطها، فينفذ في جميعها،	ہیں،
واما في واسطة المملكة و	اور وسط مملکت اور اس کے شمالی حصہ میں
شماليها فانهم يأخذون من لحاء	توز کے درخت کی چھال کو جس کی ایک قسم کمان
شجرة التوز الذي يستعمل نوع منه في	کے غلاف میں استعمال کی جاتی ہے، اس کو
اغشية القسي ويسمونه "بهوج" في	بھوج کہتے ہیں، اسکو ایک گز کے طول اور پھیلی
طول ذراع وعرض اصابع ممدودة	ہوئی انگلیوں کے عرض کے برابر یا اس سے
فما دونه، ويعملون به عملاً كالتدهين	کم لیتے ہیں، پھر اس پر ایک طرح سے روغن
والصقل يصلب به ويتملس ثم	اور صیقل کرکے اس کو چکنا بنا دیتے ہیں جس سے
يكتبون عليها، وهي متفرقة يعرف	وہ سخت اور چکنا ہو جاتا ہے تو اس پر لکھتے ہیں،
نظامها بارقام العدد المتوالي، و	یہ متفرق ہوتے ہیں، ان کی نظم و ترتیب کے لئے
يكون جملة الكتاب ملفوفة في قطعة	صفحوں میں ہندسے لکھ دیتے ہیں، اور پوری
ثوب ومشدودة بين لوحين بقدرها	کتاب دو تختیوں کے درمیان کپڑے کے ایک

واسم هذا الكتاب "پوتی" (پوتھی)	ایک ٹکڑے (جزودان) میں لپٹی ہوتی ہو،
ورسائلهم وجميع اسبابهم تنفذ	اور اس کا نام "پوتھی" ہوتا ہے، ان کے خطوط
في التوز۔ ایضاً[1]	اور دیگر چیزیں سب اسی میں لکھی جاتی تھیں،

سجان رائے نے اڑیسہ کے حالات میں لکھا ہے کہ تاڑ کے پتہ پر فولادی قلم سے تحریر کرتے تھے، اس کے اصل الفاظ یہ ہیں :۔

برگ درخت تار بفولادی قلم نامہا نویسند	تاڑ کے پتہ پر لوہے کے قلم سے خطوط لکھتے
وخامہ بہ مشت برگیرند، کاغذ و سیاہی کمتر	تھے، اور قلم کو مٹھی میں پکڑتے، کاغذ (بھوج)
بہ کار برود،	اور سیاہی بہت کم کام میں لاتے،

کشمیر کے حالات میں بیان کرتا ہوا تحریر کرتا ہے :۔

وبیشتر بر توز درخت کہ خاص دراں ملک	اور زیادہ تر بھوج پتر پر جو اس ملک میں
است برنگارند، وہمگی کہن نامہا براں نوشتہ	بکثرت ہوتا ہے لکھتے ہیں، اور قدیم تحریریں
وسیاہی چناں سازند کہ بشست وشو	اسی پر ہیں، اور سیاہی اس طرح بناتے
نمی رود[2]	ہیں کہ دھونے سے زائل نہیں ہوتی،

ان بیانات سے واضح ہوگیا کہ ہندوستان میں کاغذ کا رواج نہ تھا، بلکہ پتوں پر لکھا کرتے تھے، اس قسم کی پوتھی جس کا بیرونی نے بیان کیا ہے، اب بھی ہندوستان میں موجود ہے، جس میں قدیم کتابیں تحریر کی گئی ہیں، ایک دفعہ احمد آباد میں خود راقم الحروف کو اس قسم کی پوتھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ جین مذہب کی ایک قدیم کتاب تھی، جو بھوج پتر پر لکھی گئی تھی، اس کے دونوں جانب دفتی کی جگہ چوبی تختی لگی تھی، جس کے سبب سے ذرا وزنی ہوگئی تھی،

---

[1] کتاب الہند للبیرونی مطبوعہ لیڈن [2] خلاصۃ التواریخ ذکر صوبہ جات قلمی دار المصنفین،

دوسری قدیم کتاب بودھ مذہب کی رنگون کے بڑے مندر میں تھی، جس وقت میں گیا تو اسکی نقل ایک سل (پتھر) پر کندہ کی جارہی تھی، یہ کتاب تاڑ کے پتوں پر تھی،

کاغذ کی اصل ایجاد چینیوں کی ہے، یہ لوگ ایک قسم کی گھاس سے کاغذ بناتے تھے،

الفہرست میں ہے،

والصین فی الورق الصینی ویعمل	چین والے چینی کاغذ پر لکھتے ہیں، جو گھاس
من الحشیش وھو اکثر ارتفاع	سے تیار کیا جاتا ہے، اور یہ شہر کی بڑی آمدنی
البلد[1]	کا ذریعہ ہے،

ابتدا میں اس قسم کے کاغذ سے دنیا ناواقف تھی، آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے اسکو سیکھا، اور پھر اُن کے توسط سے تمام دنیا میں یہ ہنر پھیل گیا،

بیرونی نے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے سمرقند پر حملہ کیا تو قیدیوں میں چند ایسے بھی تھے جو کاغذ بنانا جانتے تھے، مسلمانوں نے ان سے اس صنعت کو سیکھ کر اسے ترقی دی، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

ولیس للھند عادۃ بالکتبۃ علی	ہندوستان میں یونانیوں کی طرح چمڑے پر
الجلود کالیونانیین فی القدیم...	لکھنے کا دستور نہیں.... کاغذ چینیوں کی
.... والکواغذ للصین وانما	ایجاد ہے سمرقند میں اسکو چینی قیدیوں نے جاری
احدث صنعتھا بسمرقند سبی منھم	کیا، پھر وہاں سے مختلف مقامات میں
ثم عمل منہ فی بلاد شتی،[2]	یہ صنعت پھیلی،

ہندوستان فتح کرنے سے پہلے مسلمانوں میں کاغذ رائج ہو چکا تھا، اور مختلف مقامات میں اس کے کارخانے قائم ہو چکے تھے، غالباً سمرقند اور خراسان میں سب سے پہلے اس کا کارخانہ قائم کیا گیا

---

[1] کتاب الفہرست ص۲۱ مصر [2] کتاب الہند ص۸۱ لیڈن،

جہاں اس قسم کی گھاس بکثرت پیدا ہوتی تھی، پھر ۱۴۲۵ھ کے بعد عربوں نے کاغذ سازی میں ترقی کا قدم بڑھایا اور روئی سے کاغذ تیار کرنے لگے، اور دوسری ہجری کے وسط سے اس کا استعمال باقاعدہ سرکاری دفتروں میں بھی ہونے لگا۔[۱]

ہندوستان میں گو مسلمانوں کی آمد و رفت پہلی صدی ہجری کی ابتدا ہی سے شروع ہو گئی تھی، مگر صوبہ سندھ پر قبضہ اس صدی کے آخر (۹۳ھ) میں ہوا، حجاج بن یوسف ثقفی محمد بن قاسم فاتح سندھ کو ہر قسم کی ہدایات تحریری بھیجا کرتا تھا، اور وہ ہر تیسرے دن اس کا جواب دیا کرتا تھا، بلاذری میں ہے،

وکانت کتب الحجاج ترد علی محمد	حجاج کے خطوط محمد کے پاس اور محمد بن قاسم
کتب محمد ترد علیہ بصفۃ ما قبلہ	کے حجاج کے پاس آتے جاتے رہتے، جیسا
واستطلاع رائیہ فیما یعمل بہ	کہ اوپر بیان ہوا، حجاج کی رائے کے مطابق
فی کل ثلاثۃ ایام[۲]	عمل درآمد کے لئے ہر تیسرے دن خط روانہ ہوتا

عرب | سوال یہ ہے کہ یہ کس کاغذ میں خط و کتابت ہوتی تھی؟ قلقشندی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سپید پتھر اور کھجور کی شاخ پر لکھتے تھے، عہد صحابہ میں رق (پتلا چمڑا) استعمال ہوتا تھا ابتداے حکومت بنی عباسیہ تک یہی حال رہا،

ہارون الرشید عباسی پہلا خلیفہ ہے جس نے باقاعدہ سرکاری طور پر یہ حکم صادر کیا کہ تمام دفاتر کاغذ پر لکھے جائیں، اسی دن سے کاغذ کا عام رواج ہو گیا، اور لوگ کاغذ پر لکھنے لگ گئے، صبح الاعشیٰ میں ہے:

.... واجمع رأی الصحابۃ علی کتابۃ	صحابہ کے عہد میں قرآن لکھنے کے لئے مضبوطی کے
القرآن فی الرق لطول بقائہ	خیال سے یا اس لئے کہ یہی چیز اس وقت

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا جلد ۲۰ ص ۴۲۵ طبع یازدہم۔ [۲] صبح الاعشیٰ جلد دوم ص ۴۷۵ مصر ص ۳۱۔ بلاذری ص ۴۴۲ مصر،

اولانہ الموجود عندھم حینئذ وبقی	موجود تھی، رقی (پتلا چمڑہ) استعمال کیا گیا،
الناس علی ذالک الی ان ولی الرشید	(بنی امیہ تک یہی حال رہا) عہد عباسیہ میں
الخلافۃ وقد کثر الورق وفشا عملہ	جب رشید خلیفہ ہوا تو اس وقت کاغذ رائج
بین الناس امران لا یکتب الناس	ہو چکا تھا اور لوگ اسی پر لکھنے لگے تھے، اس
الافی الکاغذ ،	وقت رشید نے حکم دیا کہ سوائے کاغذ کے کسی
	دوسری چیز پر نہ لکھا جائے، پھر عام طور سے
(صبح الاعشی ج ۲ ص ۴۷۵)	کاغذ پر لکھنے کا رواج ہو گیا۔

اس سے معلوم ہو کہ فتح سندھ کے وقت (۹۳ھ) تک ہندوستان میں کاغذ نہیں پہنچا تھا، اغلب یہی ہے کہ عہد عباسی میں عرب پہلی دفعہ سندھ میں کاغذ لائے، اور یہاں اس کا استعمال ہوا، چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں کی ابتدا تک سندھ میں عربوں کی حکومت رہی، اور ان کے نظام حکومت میں باقاعدہ دیوان خراج وغیرہ کا محکمہ تھا، جہاں غالباً وہی عربی کاغذ استعمال میں آتا تھا، جو عرب تاجر خراسان اور دوسرے اسلامی ممالک سے لاتے تھے۔

چوتھی صدی کے آخر میں شمالی ہند سلاطین غزنہ کے مقبوضات مین شامل ہوگیا، اور اسلامی تجارت کو فروغ ہونے لگا، میرا خیال ہے کہ اسی زمانہ سے اسلامی تاجروں کے ذریعہ خراسانی کاغذ ہندوستان میں داخل ہوا، اور جیسے جیسے اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، اس کاغذ کی تجارت بھی بڑھتی گئی، چھٹی صدی کے وسط میں ہندوستان میں بھی کاغذ تیار ہونے لگ گیا، چنانچہ ابو حامد غرناطی المتوفی ۵۵۵ھ لکھتا ہے:۔

وفی سمرقند القراطیس التی عطلت	اور سمرقند کے کاغذ نے مصر کے کاغذ کو اہل
قراطیس مصر لاھل المشرق ،	مشرق کے لئے بیکار کر دیا جس طرح مصر کے

كقراطيس مصر لأهل المغرب و
فی بلخ ابنها متبهة بالعراق و
خراسان والهند، (تحفة الالباب ص ۲۰ ج ۱)

کاغذ نے مغرب کے کاغذ کو بے کار کر دیا تھا، اور
بلخ کا کاغذ عراق خراسان اور ہندوستان
کے کاغذ کے مشابہ ہوتا ہے،

اس سے اس قدر معلوم ہوا کہ ہند میں کاغذ سازی شروع ہو گئی تھی، اور غالباً اس کی ابتدا لاہور یا دہلی سے ہوئی ہوگی، کیونکہ ابتدا میں یہی دونوں شہر پایہ تخت تھے،

۷۹۶ھ میں سلطان سکندر بت شکن تخت نشین ہوا، اس کے عہد میں کشمیر کو بڑی ترقی ہوئی اس کی فیاضی اور قدر دانی نے دور دور تک شہرت حاصل کر لی، اور مختلف ملکوں کے باکمال اس کے دربار میں آکر فیضیاب ہوئے، فرشتہ لکھتا ہے:-

سلطان سکندر بہ مرتبہٴ سخاوت داشت
کہ از شنیدن آوازہٴ آن دانشمندانِ عراق
و خراسان و ماوراء النہر بہ ملازمتش آمدند
و علم و فضل و اسلام در مملکتِ کشمیر رواج
پیدا کردہ نمونہ عراق و خراسان گردید،
(فرشتہ جلد دوم ص ۳۴۲ - نولکشور)

سلطان سکندر کی سخاوت کی شہرت اس
درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ عراق و خراسان اور
ماوراء النہر (بخارا وغیرہ) کے فضلا اس کے
دربار میں حاضر ہوئے، اُن کے باعث ملک
کشمیر میں علم و ہنر کا بہت زیادہ رواج ہوا،
اور اسلام کی خوب اشاعت ہوئی، یہاں تک
کہ کشمیر ملک خراسان اور عراق کا ہم پلہ ہو گیا،

کشمیر | تاریخ کشمیر میں لکھا ہے کہ جب تیمور ۸۰۰ھ میں ہندوستان آیا تو سلطان سکندر نے سفارت بھیجکر دوستانہ تعلقات قائم کئے اور حسب ارشاد امیر تیمور اس سے ملنے کے لئے تیاری میں مصروف تھا کہ سیاسی امور کے سبب وہ جلد از جلد ہندوستان سے سمرقند روانہ ہو گیا، اور اس سبب سے سکندر کی اس سے ملاقات نہ ہو سکی، لیکن سکندر کا لڑکا شاہی خاں، امیر تیمور گورگانی کے ہمرکاب تھا، اس لئے

اس کو وہ سمرقند لیتا گیا، امیر تیمور کی وفات تک وہ نظر بند کی حیثیت سے رہا، وفات کے بعد گو وہ آزاد ہوگیا تھا، لیکن پھر بھی اس نے اپنا قیام عرصہ تک سمرقند میں رکھا،

شاہی خاں کشمیر کے ان بادشاہوں میں سے ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی، وہ بڑا عاقل اور مدبر شخص تھا، سمرقند میں رہ کر اس نے علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی، پھر ارباب کمال کی صحبت سے مستفید ہوتا رہا، جب کشمیر واپس ہونے لگا تو اس نے ارباب صنائع کو ساتھ لے لیا، تاکہ کشمیر میں ہر قسم کی صنعت اور کاریگری کا رواج ہوجائے، چنانچہ کاغذگر، صحاف، قالین باف، زین ساز اور زنان قابلہ کو ساتھ لیتا آیا، اور یہاں پہنچکر اس نے اس کو خوب رواج دیا، تاریخ کشمیر میں ہے:

چندے در سمرقند ماندہ کسب علوم و آداب کرد	کچھ دن سمرقند میں قیام کرکے علوم و آداب
و جمعے از ارباب صنائع رامثل کاغذگرد	حاصل کئے، اور ایک جماعت کاریگروں
صحاف و قالین باف و زین ساز و زنان	کی جیسے کاغذساز، قالین باف، زین ساز
قابلہ کہ وقت وضع حمل خدمت عورات	اور دایہ جو وضع حمل کرانے میں ماہر تھیں اپنے
می کنند باخود بہ کشمیر آورد،	ساتھ کشمیر لایا،

یہی مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے، جبکہ شاہی خاں تخت نشین ہوکر سلطان زین العابدین ہوگیا:

و سلطان بحسن نیت و اہتمام تمام اوقات	سلطان نیک نیتی اور پوری کوشش سے
خود را مصروف عمارات و آبادی این شہر	اپنے اوقات کو شہر کی آبادی اور عمارتوں
شناخت و صنائع کہ ایران و توران خصوصاً	کے بنوانے میں مصروف رکھتا تھا، اور
خراسان کہ بہ کشمیر نزدیک تر است بجد	کاریگروں کو ایران، توران اور خصوصاً
اہتمام فراواں طلبانید،	خراسان سے جو کشمیر سے بہت ہی نزدیک
ارباب حرفہ را از مجلد . . . و کاغذگر	کاریگروں کو مثلاً جلدساز، کاغذساز،

وغیرہ کہ از ولایت با خود آوردہ بود وہم مددمعاش دادہ بہ حرفہ خود سرگرم داشت
وغیرہ کو جو دوسرے ملک سے اپنے ساتھ لایا تھا مددمعاش کے لئے (جاگیریں) دیکر اپنے پیشہ کو فروغ دینے میں معاون ہوا،[1]

غالباً اسی زمانہ میں کشمیر میں کاغذ کا پہلا کارخانہ جاری کیا گیا، کیونکہ اس سے قبل ہندوستان کے کسی صوبہ میں کوئی ایسا کارخانہ تاریخ کے صفحات میں نظر نہیں آتا، اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں کاغذسازی کا سب سے پہلا کارخانہ کشمیر میں قائم ہوا،

کشمیری قدرتی طور پر ذہین ہوتے ہیں۔ (اور آج بھی کشمیری برہمن اس وصف میں شہرت رکھتے ہیں) انھوں نے اس صنعت کو بڑی تیزی سے ترقی دینی شروع کی، یہاں تک کہ چند ہی سال میں یہاں کا کاغذ شہرۂ آفاق ہوگیا، یہ کاغذ اتنا عمدہ اور اعلیٰ ہوتا تھا کہ بادشاہوں کے پاس بطور تحفہ کے بھیجا جاتا تھا، سلاطین کشمیر میں سلطان زین العابدین جو ۸۲۶ھ میں تخت نشین ہوا، گل سرسبد تھا، اس کے عہد میں کشمیر اوج کمال کو پہنچ گیا، ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بادشاہ اس کے ساتھ تبادلہ ہدایا کرنا سیاسی لحاظ سے اپنا فرض سمجھتے تھے، اور اس کی دوستی کے خواہاں رہتے تھے چنانچہ سلطان محمود بیگڑہ (گجرات) اور سلطان ابوسعید (خراسان) نے سلطان زین العابدین کو تحفے اور ہدیے بھیجے، سلطان نے بھی اس کے جواب میں کشمیر کے نوادر ارسال کئے،

ان تحفوں میں سب سے زیادہ نمایاں کاغذ کا تحفہ تھا، کاغذ خراسان میں خود بنتا تھا، اس لئے خراسان والوں کے لئے یہ کوئی نادر چیز نہیں ہوسکتی تھی، اسلئے سلطان ابوسعید والی خراسان کے پاس اس کو بطور تحفہ بھیجنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری کاغذ خراسانی کاغذ سے زیادہ بہتر ہوتا تھا اور اس کا شمار نوادرات میں ہوتا تھا۔

---

[1] واقعات کشمیر قلمی کتب خانہ حبیب گنج علی گڑھ

تاریخ فرشتہ میں ہے،

خاقان ابوسعید شاہ از خراسان اسپان	خاقان ابوسعید نے خراسان سے عمدہ عربی
تازی بادپا و اشتران راہوار و اعلیٰ و	گھوڑے اور اعلیٰ نسل کے قوی اونٹ
شتران قوی ہیکل بادیہ پیما برائے او	سلطان زین العابدین کو بطور تحفے
ہدیہ فرستاد،	کے بھیجے،
شاہ ازیں معنی بسیار خوش حال شدہ	سلطان کو یہ بات بہت پسند ہوئی اس نے
در برابر آں خروارہائے زعفران، وترطاس	بھی زعفران کے گٹھے، کاغذ، مشک، عطر
ومشک وعطر وگلاب، وسرکہ وشانہائے	گلاب، سرکہ خوشنما شانیں، شیشہ کے پیالے
خوب دکاسہ ہائے بلوریں، و دیگر غرائب	اور دوسری نادر چیزیں کشمیری صنعت
کشمیر بملازمت خاقان سعید روانہ گردانید	کی خاقان کے پاس روانہ کیں،

کشمیر سرد ملک ہے اس لئے قدرتی طور پر یہاں کی ہر چیز میں انجماد کا مادہ موجود رہتا ہے، اور اس انجماد کی وجہ سے کوٹائی کا کام خوب ہو سکتا ہے، غالبًا اسی سبب سے یہاں کا کاغذ عمدگی میں مشہور تھا، اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ پائدار اور بے حد مضبوط ہوتا تھا،

گجرات نویں صدی کے شروع میں گجرات کا پایہ تخت "احمد آباد" آباد کیا گیا، اور پچاس برس میں اس قدر ترقی کر گیا کہ ہندوستان میں کوئی شہر اس کا مقابل نہیں سمجھا جاتا تھا، سلطان محمود بیگڑہ کو خصوصیت سے اس کی ترقی کا بڑا خیال تھا، اس کے عہد میں ہر قسم کے اہلِ کمال یہاں جمع ہو گئے تھے، تاریخ کے تتبع سے جہاں تک پتہ چلتا ہے اسی وقت سے یہاں کاغذ کے کارخانے قائم ہوئے اور رفتہ رفتہ اس قدر اس کو ترقی ہوئی کہ خاص احمد آباد کے علاوہ پٹن، اور کھنبایت میں بھی اس کے

لہ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۴۴، نول کشور،

بڑے بڑے کارخانے قائم ہوگئے، پٹن (نہروالہ) کے کاغذ کا نام ہی "پٹنی" ہوگیا تھا، جونا گڈھ کی پبلک لائبریری میں تاریخ بنگالہ کی جو قلمی کتاب موجود ہے، وہ اسی پٹنی کاغذ پر لکھی گئی ہے، جیسا کہ اس کی آخری تحریر سے ظاہر ہوتا ہے،

کھنبائت میں بھی اس کے متعدد کارخانے تھے، اور ابھی تک وہ محلہ موجود ہے جہاں کاغذ تیار ہوتا تھا، احمد آباد کاغذ سازی کا مرکز تھا، وہاں اس کثرت سے مال تیار ہوتا تھا کہ ہندوستان کے علاوہ دوسرے دور دراز ملکوں میں جاتا تھا، یہ کاغذ سفیدی اور چکنے پن میں بے مثل ہوتا تھا، اور ہندوستان کے کسی صوبہ میں ایسا کاغذ نہ تیار ہوتا تھا، موٹے باریک مختلف سائز کے کاغذ تیار کئے جاتے تھے، رنگین کاغذ بھی مختلف اقسام کے بنتے تھے، بادامی رنگ کے کاغذ کا استعمال زیادہ تر تجارتی روزناموں اور آمد و خرچ کے حساب میں کیا جاتا تھا، گو یورپ کی ارزاں تجارت نے اس صنعت کو فنا کر دیا، مگر گجراتی بنیوں اور تاجروں کی بدولت بادامی کاغذ کی صنعت آج بھی زندہ ہے، اور اس کے متعدد کارخانے احمد آباد میں موجود ہیں، ان کارخانہ والوں کو "کاغذی" کہتے ہیں، اس لفظ نے اتنی شہرت حاصل کی کہ متعدد خاندانوں کے نام ہی کاغذی ہوگئے، اور اب وہ اسی انک (خاندانی نام) سے شناخت کئے جاتے ہیں، ان کا ایک خاص محلہ احمد آباد میں آباد تھا، جو کاغذی ہی کے نام سے مشہور تھا، زرافشاں کاغذ بھی احمد آباد میں بنایا جاتا تھا، اس کے نمونے اب بھی ملتے ہیں، احمد آباد کی پیر محمد شاہ لائبریری میں بعض چھوٹی تقطیع کی کتابیں اسی کاغذ پر لکھی ہوئی موجود ہیں، اس وقت تک قدیم زرافشاں کاغذ کے جس قدر نمونے میری نظر سے گذرے افسوس ہے کہ ان میں کوئی خاص خوبی مجھے نظر نہ آئی، یا اس فن کا ماہر نہ ہونے کے سبب خوبی معلوم نہ کر سکا،

احمد آباد کے کاغذ کی خاص خوبی اس کی سپیدی اور چکنا پن ہے، مرآۃ احمدی میں ہے :-

کاغذخانۂ قرطاس، ہرچند کہ کاغذ دولت آبادی و کشمیری خوش قماش نیکو دارد، اما بہ سفیدی و بیاض ساخت احمد آبادی نمی رسد، و چندیں نوع ازاں بہ عمل می آرند[1]

کاغذ سازی کے کارخانے اگرچہ دولت آبادی اور کشمیری کاغذ بہت ہی عمدہ ہوتا ہے، لیکن سفیدی اور چمک میں احمد آبادی کاغذ کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اور یہ مختلف قسم کے تیار کئے جاتے ہیں،

لیکن بڑا عیب اس کاغذ میں یہ ہوتا ہے کہ بننے کی حالت میں اس میں غیر محسوس طور سے چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں، اس کا سبب احمد آباد کی جائے وقوع ہے، جو ریگستان میں آباد ہے، مصنف مرآۃ احمدی لکھتا ہے،

ازآنجا کہ ایں دیار ریگ بوم شدہ در ہنگام ساختن ذرات رملی کہ بہ خمیرش در می آید، وقت مہرہ کشی بیروں می رود، و سوراخہا نامحسوس بہم می رسد، معیوب است[2]،

چونکہ یہ ملک ریگستان میں آباد ہے، اس لئے کاغذ بناتے وقت ریت کے ذرے اس کے خمیر میں گھس جاتے ہیں، اور پھر بہ چکنا کرنے کے وقت خشک ہو کر باہر نکل آتے ہیں اور غیر محسوس سوراخ ہو جاتے ہیں، جو معیوب ہے،

اس عیب کے باوجود اس کی سفیدی، خوشنمائی، اور چکنے پن کی وجہ سے اس کی مانگ بہت بڑھی ہوئی تھی، اور عرب وروم تک اس کا دساور تھا، اور اس سے تاجر معقول فائدہ اٹھاتے تھے، مرآۃ احمدی میں ہے کہ

وہرسالہ بنا بر سفیدی نونش مبلغہا در اطراف بلاد ہند و عرب و روم وغیرہ چوں کاغذ زر می برند[3]،

اور کاغذ کی سفیدی کے سبب ہر سال ہزاروں روپئے کے کاغذ ہند و عرب اور روم میں نوٹ کی طرح تاجر برآمد کرتے ہیں،

---

[1] مرآۃ احمدی مطبع بمبئی [2] ایضاً [3] ایضاً

دولت آباد | عہد مغلیہ میں عمدہ کاغذ کا ایک اور نیا مرکز دولت آباد پیدا ہوگیا، یہاں کا کاغذ بھی پائداری میں کشمیر کی طرح مشہور تھا، اور غالباً تمام جنوبی ہند میں اسی جگہ سے تاجر کاغذ لے جاتے تھے، اس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے،

بہار | صوبہ بہار میں بھی اس کا کارخانہ موجود تھا، پایۂ تخت عظیم آباد اس کی منڈی تھی، اور اسی منڈی سے یہ مال صوبہ کے دوسرے حصوں میں جاتا تھا،

سجان رائے صوبہ بہار کے متعلق بعض تفصیلات کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

کاغذ خوب می شود، پٹنہ میں کاغذ اچھا ہوتا ہے[2]،

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ کاغذ خاص عظیم آباد میں تیار نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس سے تھوڑے فاصلہ پر قصبہ بہار میں بنایا جاتا، چنانچہ احمد آباد کی طرح وہاں بھی کاغذی محلہ آج تک موجود ہے، اور اس محلہ کے اصلی باشندوں کو اس وقت بھی کاغذی کہتے ہیں، یہاں سے کاغذ تیار ہو کر پٹنہ جاتا تھا اور عظیم آباد کا غذی منڈی ہونے کے سبب سے اس کی نسبت پٹنہ کی طرف ہوگئی،

اس قسم کی مثالیں ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں بکثرت موجود ہیں، لاہوری نمک کی نسبت لاہور کی طرف ہے، حالانکہ دراصل وہ کوہ سلیمان سے نکلتا ہے، لاہور منڈی ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت لاہور کی طرف کر دی گئی،

پٹنہ | عظیم آباد (بہار) کا کاغذ گو سجان رائے کی تحریر کے بموجب اچھا ہوتا تھا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی تھی، یہی سبب ہے کہ اس کے متعلق کسی خاص وصف کا ذکر کہیں نہیں ملتا،

گیا | پٹنہ کی طرح ضلع گیا میں بھی کاغذ تیار ہوتا تھا "ارول" میں جو جہان آباد سے مغرب جانب

---

[1] مملکت بیجاپور صفحہ ۲۹۰ حصہ سوم [2] خلاصۃ التواریخ بیان صوبہ بہار در مقدمہ قلمی دار المصنفین،

تقریباً بیس میل پر واقع ہے، کاغذ بنانے کے بے شمار کارخانے تھے،

ایسٹ انڈیا کمپنی نے صوبہ بہار پر قبضہ کرنے کے بعد کاغذ کا ٹھیکہ انھیں لوگوں کو دیا تھا، ان کی نسل آج بھی موجود ہے[۱]، غلام حسین خاں طبا طبائی لکھتے ہیں کہ" وکاغذ در موضع اروِل وبہار خوب بہم می رسد اکنوں ہم می سازند، واگر کارفرمائی بہم رسد وزرے خرچ کنند، شاید کہ بہتر ازآں می ساختہ آید"[۲]

بنگال زمانہ گذشتہ میں بنگال بھی اس صنعت کا اہم ترین مرکز تھا اور وہاں کاغذ سازوں کی پوری جماعت آباد تھی، جو آج بھی کاغذیوں کے نام سے مشہور ہے، اور اب انھوں نے اپنے موروثی پیشہ کو ترک کرکے کسب معیشت کے دوسرے ذرائع اختیار کرلئے ہیں، لیکن اب بھی کچھ لوگ اچھی قسم کا دستی کاغذ تیار کرتے رہتے ہیں، اگرچہ اس کی مالیت سال میں چند سو روپیے سے زیادہ نہیں ہوتی،

مرشدآباد بنگال میں ہوگلی اور مرشدآباد کے اضلاع میں کاغذیوں کی تعداد زیادہ رہی ہے، ہوگلی کے کاغذیوں کے برخلاف مرشدآباد کے کاغذی کاغذ بنانے کے لئے زیادہ تر ردی کاغذ استعمال کرتے تھے، اور اس کے لئے دفتری کی دوکانوں کی کاغذ کی کترن بہترین مصالحہ ثابت ہوتی ہے، کبھی کبھی جوٹ اور ٹاٹ وغیرہ کے بوسیدہ ٹکڑے بھی استعمال ہوتے ہیں،

کاغذسازی کی ترکیب بنگال میں اس صنعت کو لوگ اب بھی بطور پیشہ کے اختیار کرتے ہیں، کاشتکاری سے فراغت کے زمانہ میں ان کا جو وقت بچتا ہے، ان کو کاغذسازی میں صرف کرتے ہیں، احمد آباد کی طرح ان کا تیار کردہ کاغذ زیادہ تر تاجر بہی کھاتوں کے مصرف میں لاتے ہیں، اس طرح ایک کاغذی خاندان سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پیدا کرلیتا ہے، مرشدآبادی کاغذی، کاغذ اس طرح تیار کرتے ہیں کہ کاغذ کی تقریباً دس سیر کترن ایک حوض میں ڈال کر سڑاتے ہیں، جس کو "ڈابہ" کہتے ہیں، اور اس کو گلانے کے لئے اس میں چونے کی تھوڑی مقدار ملا دیتے ہیں، چند دنوں کے بعد نچوڑ کر اس کا پانی نکال دیتے ہیں، اور "ڈھینکی" سے خوب کوٹ کر ایک مسطح اور کھردرے طباق پر

---

[۱] [illegible] [۲] سیرالمتاخرین جلد اول ص۱۹۰

پھیلا دیتے ہیں جس کو "مجلس" کہتے ہیں، اور پھر اس کو دبا کر اس کا پانی نکال لیتے ہیں، اس کے بعد سوملا کر چونے کے سلوشن میں دو تین دن رکھتے ہیں، پھر کینوس کی چادر پر ڈال کر صاف پانی سے خوب دھوتے ہیں، گودے کو پانی سے بھری ہوئی ناند میں ڈال کر ہاتھوں سے ملتے ہیں، اور ایک بہت باریک کھپاچوں کی چھلنی جو لکڑی کے فریم میں ہوتی ہے ناند میں ڈالدیتے ہیں، گودے کے ذرے اس کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں جمع ہو کر ان کی ایک پتلی سطح چھلنی پر جم جاتی ہے، پھر چھلنی کو ناند سے نکال کر فریم سے جدا کرتے ہیں، اور اسے کاغذ کے ایک تختہ پر رکھ کر آہستہ آہستہ دباتے ہیں، اس کے بعد چھلنی کو احتیاط سے اٹھا لیتے ہیں اور کاغذ کا نیا بنا ہوا تختہ جم جاتا ہے، اب اس تختہ کو احتیاط سے اٹھا کر دھوپ میں چٹائی پر خشک کرتے ہیں، خشک ہو جانے پر اس کے کنارے تراشتے ہیں، اور نشاستہ کا سلوشن یعنی مانڈی لگا کر دوبارہ اچھی طرح خشک ہونے کے لئے رکھدیتے ہیں، خشک ہو جانے پر کاغذ کو لکڑی کے ایک تختہ پر پھیلا کر پتھر کی گول بٹیوں سے خوب رگڑ کر جلا دیتے ہیں، جس سے کاغذ چکنا ہو کر بازار میں فروخت کے لائق ہو جاتا ہے،[1]

جون پور | صوبہ اودھ میں جون پور سے متصل ظفرآباد ایک مشہور قصبہ ہے جو کسی زمانہ میں بجائے جون پور کے حاکم نشین جگہ تھی، اس کو لوگ کاغذی شہر کہتے تھے، یہاں بانس کا کاغذ بہت عمدہ پائدار اور چکنا ہوتا تھا، عموماً یہاں کاغذ دو قسم کا بنتا تھا، ایک آہار دیا ہوا بہت چکنا، دوسرے بغیر آہار کے (غیر مہرہ شدہ) کتابوں کی نقل اور تصنیف عموماً قسم اوّل کے کاغذ پر ہوتی، یہ بادامی سفیدی مائل ہوتا تھا، تاجروں کا بہی کھاتہ آج سے پچاس برس قبل تک اسی کاغذ پر ہوتا،[2] بغیر آہار والا کاغذ ذرا دبیز ہوتا، اس کو بنارس کے ریشم فروش تھانوں کی حفاظت کے لئے بکثرت استعمال کرتے تھے، اس وقت بھی ظفرآباد میں ایک محلہ "کاغذی محلّہ" کے نام سے مشہور ہے، جو پور

---

[1] ملخص از رسالہ ریاست دہلی ۷ نومبر ۱۹۳۳ء، [2] اس عینی شہادت کیلئے مولانا ابوبکر شیث صاحب جونپوری مرحوم سابق ناظم دینیات علی گڈھ یونیورسٹی کا ممنون ہوں،

کے لوگ ابھی تک اس شہر کو "کاغذی شہر" کہتے ہیں، یہاں سے کاغذ کی برآمد بہت ہوتی تھی، اور اسی لئے اس تجارت میں بہت زیادہ نفع سمجھ کر بہ کثرت لوگ مشغول ہو گئے تھے،

پنجاب | اس صنعت میں پنجاب بھی کسی صوبہ سے پیچھے نہ رہا، سیال کوٹ میں کاغذ سازی کے متعدد کارخانے تھے، اور اس میں مختلف قسم کے کاغذ تیار کئے جاتے تھے، جن کے علٰحدہ علٰحدہ نام تھے،

یہ کاغذ سفید اور مضبوط ہوتا تھا، اور غالباً پنجاب کے پورے صوبہ میں یہیں کا استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ سیالکوٹ کے علاوہ پنجاب میں اور کسی دوسرے کارخانہ کا وجود کسی تاریخ میں نظر نہیں آتا، کاغذ کے ناموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارخانہ جہانگیر کے عہد یا اس سے قبل ہی قائم ہو چکا تھا، سجان رائے سیال کوٹ کے حالات میں تحریر کرتا ہے:

و دریں شہر کاغذ نیکو می شود، خصوص کاغذ	اور یہاں کاغذ اچھا ہوتا ہے، خاص کر
مان سنگھی، و نیم حریری، و خاصۂ جہانگیری،	مان سنگھی نیم حریری اور خاصۂ جہانگیری
بس نیک تر قماش و سفید و صاف و	بہت ہی عمدہ، سفید، صاف اور مضبوط
دیرپا می سازند[1]	بناتے ہیں،

امرائے اکبری میں راجہ مان سنگھ ایک ممتاز شخص تھا، غالباً اسی کے نام سے یہ کاغذ منسوب کیا گیا تھا، اسی طرح خاصۂ جہانگری، جہانگیر بادشاہ کے نام سے روشناس عالم ہوا،

افسوس ہے کہ اس مورخ نے ان مختلف قسم کے کاغذوں کے علٰحدہ علٰحدہ اوصاف نہیں لکھے، لیکن جہانگیر کی رنگینی اور جدت پسندی کو دیکھتے ہوئے یہ خیال گذرتا ہے کہ خاصۂ جہانگیری، خاص قسم کا کوئی اعلیٰ درجہ کا کاغذ ہوگا،

جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا ہے، ہندوستان میں بجائے کاغذ کے جہاں بھوج پتر اور تاڑ کے پتے

---

[1] خلاصۃ التواریخ قلمی دار المصنفین در مقدمہ،

استعمال میں لائے جاتے تھے، وہاں بعض جگہ سپید ریشمی کپڑے بھی مستعمل تھے، اس وقت کاغذ کا کوئی کارخانہ نہ تھا، اب جبکہ متعدد کارخانے کاغذ سازی کے قائم ہو گئے، تو قدرتی طور پر ہندوستانیوں کا ذہن اس ریشم کی طرف منتقل ہوا ہوگا، اور میرے خیال میں اسی کا نتیجہ "نیم حریری" کاغذ ہے، نیم (نصف) کے لفظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سوتی اور ریشمی ملا ہوا کپڑہ بنا جاتا ہے، اسی طرح ریشم اور روئی کی ملاوٹ سے یہ کاغذ تیار کیا جاتا تھا، یہ کاغذ ریشم کے سبب سے نرم، چکنا اور مضبوط ہوتا ہوگا، جیسا کہ مراکو کا چمڑے کا بنا ہوا کاغذ مشہور ہے، اور ریشم ہی کے سبب سے بہت ہی پتلا کاغذ بھی آجکل کے نوٹوں سے زیادہ پائدار اور مضبوط رہتا ہوگا، ٹیپو سلطان کے عہد میں میسور میں بھی کاغذ سازی کا کارخانہ تھا، جہاں خاص طور سے کاغذ پر سونا چڑھایا جاتا تھا، (تاریخ میسور ص ۲۰۲ مطبوعہ بنگلور)

کاغذ کے نمونے اور اُنکی قسمیں | قدیم ہندوستانی کارخانوں کے بنے ہوئے کاغذوں کے نمونوں کو کسی ایک جگہ تلاش کرنا اور انکا مل جانا بہت دشوار ہے، لیکن خوش قسمتی سے نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کے کتب خانہ حبیب گنج میں مختلف قسم کے نمونے مجھے دستیاب ہو گئے، مولانا موصوف کی ذات تعارف سے بالاتر ہے، موصوف کو قدیم صنعت کے اعلیٰ نمونوں کا شوق نہیں بلکہ عشق ہے، اسی لئے آپ کے پاس ہر قسم کے صنعتی نمونے موجود ہیں، کاغذوں کے نمونے محفوظ طریقہ سے شیشہ میں بند ہیں، اور ہر نمونہ کے سامنے اُردو اور انگریزی میں اس کے مختصر اوصاف تحریر ہیں، راقم الحروف مزید اضافہ کے ساتھ ضبط تحریر میں لاتا ہے،

احمد آبادی | اس کے بیشمار نمونے میری نظر سے گذرے، اس میں موٹے، دبیز، باریک اور بہت ہی باریک ہر قسم کے ہیں، بعض سنہرے اور زرافشاں بھی نظر سے گذرے، یہاں کے کاغذ کی خصوصیت جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، سفیدی اور چکنائی ہے، یہاں کی جیسی سفیدی تمام ہندوستان کے کسی کارخانہ

میں نہیں ہوتی تھی،

حبیب گنج کے کتب خانہ میں جو نمونہ احمد آبادی کاغذ کا نظر سے گذرا وہ ذرا دبیز اور معمولی سفیدی لیے ہوئے تھا، شاید زیادہ دنوں کا ہو جانے کے سبب سے اس کی سفیدی کم ہو گئی ہو یا قدرتی طور پر اسی رنگ و وضع کا کاغذ بنایا ہی گیا ہو،

کشمیری اس ملک کا کاغذ بہت اعلیٰ ہوتا تھا، اس کے بھی مختلف اقسام تھے، بعض باریک، بعض دبیز، کچھ کارخانے ریشمی باریک تیار کرتے تھے، یہاں کی اصلی خصوصیت چکنائی اور مضبوطی تھی، غیر ملکوں میں بھی اس کی بڑی کھپت تھی، لوگ یہاں سے بکثرت باہر لے جاتے تھے، حبیب گنج کے کتب خانہ میں اس کاغذ پر لکھی ہوئی متعدد قلمی کتابیں موجود ہیں، جس سے صحیح طور پر اس کا اندازہ ہوتا ہے، حبیب گنج میں اس کے جو نمونے نظر سے گذرے وہ سادہ ریشمی گہرے اور ہلکے رنگین حنائی ہیں، لفظ ریشمی کے متعلق میں اوپر مفصل لکھ چکا ہوں، لیکن یہاں اس سے مراد باریک ہی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں ریشم کی طرح نرم اور باریک کو "ریشمی" کہنے لگے تھے، کیونکہ ریشمی کے جس قدر نمونے نظر سے گذرے کسی میں بھی ریشم کا جز بظاہر نظر نہیں آیا، اس لئے خیال گذرتا ہے کہ محض مشابہت کی بنا پر اس کو ریشمی کہنے لگے تھے،

جہانگیری غالباً یہ صرف سیالکوٹ میں تیار ہوتا تھا، جیسا کہ سجان (سبحن رائے) رائے نے لکھا ہے کیونکہ اور کسی صوبہ میں اس نام کا کاغذ بنایا جانا کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گذرا، اس کا نمونہ جو حبیب گنج میں دیکھا وہ چکنا، باریک، مہرہ شدہ سفید خفیف نیلاپن لیے ہوئے تھا، اسی قسم کا ایک دوسرا نمونہ خاکی رنگ کا تھا جس میں خفیف سفیدی تھی،

حیدرآبادی حیدرآباد میں بھی کاغذ تیار کیا جاتا تھا، ایک محلہ میاں مشک میں، اور دوسرا کاغذی گوڑا میں، اس کے جو نمونے میری نظر سے گذرے، مجھے ان دونوں میں کوئی فرق نظر نہ آیا، شاید

ارباب فن کے نزدیک اس میں کوئی خاص فرق ہو، دبیز اور باریک دونوں قسم کے ہیں اور رنگ کے اعتبار سے ایک خاکی اور دوسرا سفیدی مائل ہے، اور دونوں غیر مہرہ شدہ ہیں،

اسی قسم کے کاغذوں کے سات نمونے دیکھے، جو قطب شاہی سلاطین کے عہد میں تیار کئے گئے تھے، اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر بادشاہ کے عہد میں جو کاغذ تیار ہوا، اس کا علٰحدہ علٰحدہ نمونہ دکھایا ہے، لیکن ان میں باہم ایک ماہر فن ہی امتیاز کر سکتا ہے۔ ان میں سے بعض بے رنگ کے مہرہ شدہ ہیں، اور کچھ احمد آبادی کاغذ کے مثل ہیں،

فیض آبادی | کسی کتاب میں فیض آباد کے متعلق نظر سے نہیں گذرا کہ وہاں کاغذ کا کارخانہ تھا، لیکن حبیب گنج کے کتب خانہ میں جو نمونہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی یہ کام ہوتا تھا،

نمونہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مہرہ کئے ہوئے اوسط درجہ کا زردی مائل کاغذ بنتا تھا، اور بعض مہرہ شدہ گہرا پن لئے ہوئے تیار کیا جاتا تھا،

کانپوری | یہ معمولی کاغذ بانس سے تیار کیا جاتا تھا، اپنے ماقبل سے بھورے پن میں کم ہوتا تھا بلکہ اسکو خاکی رنگ لئے ہوئے کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا،

دولت آبادی | دولت آباد میں کاغذ کے بے شمار کارخانے تھے، اور اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ یہاں کے کاغذوں کے اقسام بہت ہیں، جو زیادہ تر مخصوص ناموں سے شہرت پذیر ہیں، غذائیاں تو اور عوام میں صرف اُن ہی کی یادباقی رہ گئی جو کسی خاص وجہ سے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے، یہاں کے کاغذ میں خاص وصف تو چکنائی اور پائداری ہے، لیکن تنوع کے لحاظ سے بھی یہ مختلف قسم کے تھے،

بہادر خانی | اس نام کا کاغذ خاص دولت آباد میں تیار کیا جاتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاغذ اس وقت سے تیار ہونا شروع ہوا جبکہ "بہادر خاں" گجراتی نے دولت آباد پر قبضہ کیا (۹۴۳ھ)

اور بعض کارخانہ والوں نے اس کے نام سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس قسم کا کاغذ تیار کیا، بہت ممکن ہے کہ خود بہادر شاہ نے ہی اس کا حکم دیا ہو، کیونکہ اس کو اس قسم کا خاص شوق تھا، چنانچہ اس نے ایک توپ تیار کرائی جس کا نام بہادر شاہی رکھا، ایک خاص قسم کے کپڑے کا نام بھی بہادر شاہی ہے، لیکن یہ صرف میرا قیاس ہے، ورنہ ممکن ہے کہ "بہادر خاں" اس کارخانہ کے مالک کا نام ہو، اور اسے اپنے نام سے اس کاغذ کی شہرت دی ہو، یہ کاغذ معمولی اوسط درجہ کا ذرا دبیز ہے، اور مضبوطی میں کسی دوسرے سے کم نہیں،

صاحب خانی | دولت آباد ہی میں اس کا کارخانہ تھا، اور غالباً صاحب خاں اس کے موجد تھے، اسی لئے اس کو صاحب خانی کہا گیا، اوسط درجہ کا دبیز کاغذ ہے،

مرادشاہی | اس کا بھی یہی حال ہے، دبیز قسم کا اچھا کاغذ ہے، دولت آباد ہی میں اس کا کارخانہ تھا، غالباً مراد شاہ بن اکبر بادشاہ کے نام پر جبکہ وہ دکن میں مقیم تھا، یہ کاغذ تیار کیا گیا، یا ممکن ہے کہ خود مالک کارخانہ کا نام "مراد شاہ" ہو اور اپنے نام سے اس نے کارخانہ کو رونق دی ہو، جیسا کہ آج کل بھی ہوتا ہے،

شربتی | دولت آباد میں ایک اور قسم کا کاغذ بنتا تھا، اس کا نام "شربتی" کاغذ ہے، یہ بھی دبیز اور اچھے قسم کا کاغذ ہے، جو نمونہ میں نے دیکھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاغذ اپنے ماقبل سے کسی اور خصوصیت میں تو ممتاز نہیں ہے، بجز اس کے کہ اس کا رنگ شربتی ہے،

قاسم بیگی | دولت آباد میں ایک صاحب قاسم بیگ تھے، جنھوں نے اپنے کارخانہ میں ایک خاص قسم کا کاغذ بنوانا شروع کیا، یہ دبیز اور سرخ رنگ کا ہوتا ، لوگوں نے غالباً اس کا نام ہی قاسم بیگی رکھ دیا، یہ کاغذ مختلف قسم کا ہوتا تھا، بعض معمولی دبیز اور بعض باریک اور بعض ٹھوس مگر رنگ غالباً سب کا سرخ ہی ہوتا تھا، جو نمونہ میری نظر سے گذرا، اس میں ہلکی سرخی تھی، سرخی

کا ہلکا پن یا تو اس کا اصلی رنگ ہے، اور یا امتداد زمانہ سے ہلکا پڑ گیا ہو،

ان کے علاوہ قاسم بیگی کاغذ کے تین اور نمونے بھی علیحدہ علیحدہ نظر سے گذرے، جن میں بظاہر مجھے کوئی فرق نظر نہ آیا، بہت ممکن ہے کہ ماہران فن ان سب میں فرق محسوس کرتے ہوں،

بالا پوری | یہ کاغذ چار پانچ قسم کا تیار ہوتا تھا، بھورے رنگ کا، سفید رنگ کا جو معمولی ہوتا، اس سے زیادہ سفید رنگ کا اور ایک خاص قسم کا تیار ہوتا، جو بہت ہی سفید اور صاف ہوتا، لیکن احمد آباد کے کاغذ کی طرح اس میں چکنا پن نہ ہوتا تھا،

معلوم نہیں کہ بالا پور دولت آباد کے کسی محلہ کا نام تھا یا کسی دوسری جگہ کا نام تھا، اغلب یہی ہے کہ دولت آباد کے متصل ہی کوئی جگہ ہوگی، جہاں اس قسم کے کاغذ تیار ہوتے ہونگے،

رو بکاری | اس نام کا بھی کارخانہ غالباً دولت آباد ہی میں تھا، یہاں بھی اسی قسم کا کاغذ چار پانچ طرح کا تیار ہوتا تھا، غالباً دفاتر میں اس کی زیادہ کھپت تھی، اسی لئے اس کا نام "روبکاری" رکھا گیا،

غیر ملکی | اکثر کتب خانوں میں دو تین قسم کے اور کاغذ نظر سے گذرے گو وہ ہندوستانی کارخانوں کے نہیں ہیں، لیکن صرف اس لئے میں ان کو تحریر کر دیتا ہوں تاکہ ان کی شناخت ہو جائے، اور ملکی اور غیر ملکی کاغذ میں ناظرین فرق معلوم کر سکیں،

سمرقندی | یہ کاغذ ملگجا رنگ کا کافی دبیز ہوتا ہے، اس قدر دبیز کہ ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی اس کی دبازت محسوس ہوتی ہے، ان میں سے زیادہ غیر مہرہ شدہ ہیں، اسی لئے ان میں خفیف سا کھردرا پن رہ جاتا ہے، ہندوستان میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم ہونے سے پہلے غالباً یہی کاغذ زیادہ تر یہاں آتا تھا، اسی لئے اس کاغذ کے جس قدر نمونے نظر سے گذرے ان میں سے اکثر قدیم کتابوں کے ہیں، یہاں کے کاغذ کی دوسری قسم دبیز، چکنا، سفید با دامی رنگ لئے ہوئے ہز

صفہانی | یہ کاغذ مختلف قسم کے ہوتے تھے، بعض دبیز اور بعض باریک، اس کا اصلی رنگ حنائی ہے، زیادہ تر اسی رنگ کا تیار ہوتا تھا، لیکن اور مختلف رنگوں کے نمونے بھی نظر سے گذرے، یران کے پایۂ تخت اصفہان میں اس کے کارخانے غالباً دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں تھے جبکہ صفوی خاندان برسرِ حکومت تھا، اور ایران کی صنعت وحرفت عروج پر تھی،

خان بالغ | اس لفظ کی تشریح یہ ہے کہ قبلائی خاں نے جو چنگیز کا پوتا تھا، جب چین مکمل طور پر فتح کر لیا تو یہاں ایک نیا شہر بسا کر پایہ تخت قرار دیا، اور اس کا نام خان بالغ رکھا، اسی کو آج پیکن کہتے ہیں[1]، اسی کے نام سے یہ کاغذ مشہور ہو گیا جس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کا کاغذ خالص چینی تھا، یہ کاغذ دو قسم کا ہوتا تھا، ایک دبیز جس کا رنگ زیادہ تر حنائی ہوتا، اس کی دبازت اس قدر زیادہ ہوتی کہ ہاتھ میں لینے سے بالکل مشقِ حروف کی وصلی معلوم ہوتی، اسی لئے اس قسم کے کاغذ کی کتاب ذرا وزنی ہوتی ہے،

اس کاغذ کی دوسری قسم حریری یعنی باریک ہے، یہ نرم اور مہرہ شدہ ہوتا، اس لئے اس میں ذرا چکنا پن رہتا، باریک ہونے کے باعث وزن میں بھی ہلکا ہوتا،

---

[1] صحیفہ چین ص۱۶۲ دہلی،

اسلامی معاشیات

کے

چند فقہی اور قانونی ابواب

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی استاذ جامعہ عثمانیہ

(۴)

قمار اور اس کی مختلف صورتوں کی حرمت

اکل مال بالباطل ہی کی ایک شکل وہ ہے، جس مین لاکھون اور کروڑون کی دولت لوگون کو اس طرح مل جاتی ہے، کہ ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ مین کچھ نہین ملتا، میری مراد قمار اور اس کی مختلف شکلون سے ہے، جس کا رواج اس وقت تک دنیا کے ان علاقون مین بھی موجود ہی، جو کسی معاشی قوت کو بیکار چھوڑنا کسی طرح گوارا نہین کرتے، آخر جوے مین جو رقم جیتنے والے کو ملتی ہے اس کے معاوضہ مین ہارنے والون کو نہ سہی، کسی اور کو وہ کیا دیتا ہے، صرف یہی نہین کہ یہ اکل مال بالباطل ہی، بلکہ گو بظاہر ہارنے والا اپنی مانی ہوئی شرطا کی بنا پر ہارتا ہے، اور اس لئے سمجھا جاتا ہے، کہ رضامندی سے اوس نے اپنا مال جیتنے والون کو دیا، لیکن واقعہ یہ ہی کہ جوے مین جتنے غصہ اور غیظ و غضب مین بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہی، شاید اتنا غصہ اتنا غیظ تو چورون اور ڈاکوؤن پر بھی ان لوگون کو نہین ہوتا جن کا مال چوری جاتا ہے، شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ مین جوے (قمار) کے متعلق جو یہ ارقام فرمایا ہی،

لانہ اختطاف لاموال الناس کیونکہ (جوے مین) لوگون کے اموال کو

عنهم معتمد على اتباع جهل وحرص منية باطلة وركوب غرر تبعثه على هذا الشرط و ليس له دخل في التمدن و التعاون فان سكت المغبون سكت على غيظ وخيبة وان خاصم خاصم فيما التزمه بنفسه اقتحم بقصده والغابن يستلذه ويدعو قليله الى كثيره و لا يدعه حرصه ان يقلع عنه وعما قليل يكون التوة عليه،

اس طرح اچکتا ہے کہ اس میں بالکلیہ جہالت، حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں آدمی گرفتار ہوتا ہے، اور دھوکہ پر سوار ہوکر اس میدان پر کودتا ہے، اور حرص غلط آرزو وغیرہ اس کو ان شرائط کے مان لینے پر آمادہ کرتی ہے جنھیں نہ شہری زندگی کی تعمیر، اور نہ باہمی امداد میں دخل ہے، ہارنے والا اگر ہارنے کے بعد خاموش رہتا ہے، تو اس کی یہ خاموشی غصہ اور اپنی ناکامی و نامرادی کی چنگاریوں پر قائم ہوتی ہے جن میں وہ اپنے قصد و ارادہ سے گھسا تھا، یوں ہی جیتنے والا اپنی جیت سے لذت گیر ہوتا ہے، اور اس کاروبار کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے، اور اس کی حرص اجازت نہیں دیتی کہ اس فعل سے باز آئے، بالآخر کچھ ہی دن کے بعد

۴ [illegible] اس پر مسلط ہو جاتا ہے

شاہ صاحب فرماتے ہیں اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس بدعادت کا رواج ہوجاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ :-

افساد للاموال ومناقشات طويلة واهمال الارتفاقات

ملک کی دولتِ عامہ کے نظام میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اور باہمی طویل جھگڑوں کے سلسلے

المطلوبة واعراض عن التعاون المبنی علیہ التمدن،

کی بنیاد پڑجاتی ہے اور حصول معاش کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع ہیں، ان کے دروازے بند ہونے لگتے ہین، لوگ اس باہمی امداد و اعانت سے لاپروائی برتنے لگتے ہین جس پر ... (حجۃ اللہ البالغہ)

فرماتے ہین،

السعاینۃ یغنیك عن الخبر هل رأیت من اهل القمار الا ما ذکرناه

دوسرون کی خبر سے خود معاینہ اور مشاہدہ اس باب مین تمہیں بے نیاز کرسکتا ہے، آخر جواریون مین تم نے ان امور کے سوا جن کا مین نے ذکر کیا، کبھی بھی کسی اور چیز کا مشاہدہ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۶)

بہرحال ملک کی معاشی قوتون کا ایک بڑا حصہ قمار کے ذریعہ سے ضائع ہوجاتا ہے، اس لئے اسلام نے صرف قمار کی حقیقی شکلون ہی کو نہین، بلکہ جن معاملات مین تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا تھا، ان کو ممنوع قرار دیا، عرب مین خرید و فروخت کی بعض صورتین ایسی تھین جنھیں موجودہ زمانہ کا سٹہ کہہ سکتے ہین، اور متمدن ممالک مین اب تک ان کا رواج ہے، اسلام نے ان کو غیر قانونی قرار دیا، مثلاً منابذہ (کپڑے کو پھینک دیا جاتا، جس پر وہ پڑ جاتا، وہ اس کا جبری خریدار بن جاتا تھا) ملامسہ (جس کپڑے پر مثلاً ہاتھ پڑ گیا، جبراً خریداری اس کی ضروری تھی) ازین قبیل اور صورتین بھی تھین جو اسلامی معاشیات کے باب سے خارج کردی گئین، مقصود یہی ہے کہ ہر شخص ملک اور ملک کے باشندون کی کچھ خدمت کرکے کھائے اور کمائے، تاکہ ملک کی دولتِ عامہ کی پیدایش مین ہر شخص اپنی اپنی استطاعت کی حد تک حصہ دار ہو، اور یہی وجہ ہے کہ ایسی چیزین جن کا استعمال مختلف طبی، اخلاقی، اجتماعی اغراض سے اسلام نے اپنے ماننے والون پر حرام کردی ہین، ان کی تجارت بھی اس نے ممنوع قرار دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ان اللّٰہ اذا حرم شیئاً حرم ثمنہ، حق تعالیٰ نے جب کسی چیز کے استعمال کو حرام قرار دیا، تو اس کے دام کو بھی حرام ؟

کیونکہ ایسی چیزون کے لینے والے جب اس سے نفع ہی نہین اٹھا سکتے، توان کا جو مال ان ن کے معاوضہ مین لیا گیا، وہ بالباطل ہی لیا گیا، اس ذیل مین فقہا ؒ اسلام نے بعض چیزون کی رت ممنوع قرار دی ہی تاہم انھون نے کوشش کی ہی کہ ہروہ چیز جس مین نفع کا پہلو کسی را بھی پیدا ہو سکتا ہے، ان کے استثناء کی بھی راہ نکالی جائے، مثلاً میتہ (مردار) حرام ہے، لیکن جو د اس کے مردہ جانورون کی کھال و باغت کے بعد بلکہ ان کی ہڈیان، ان کے کھر سینگ بھون بر وکی تجارت جائز ہے، خلاصہ یہ ہی کہ جمادات، نباتات، حیوانات، بلکہ ہروہ چیز جس مین انتفاع لو ئی صورت نکل سکتی ہو، فقہا نے کوشش کی ہے، کہ مسلمانون کی معاشی سہولتون کے لئے ان کی تجارت اجازت دیجائے، اور یہی وجہ ہے کہ بجز چند چیزون کے جن کی حرمت قطعی ہے، یا جو نجس العین ہین یا راحتہً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے بیع کی ممانعت فرمادی ہے، عموماً عام چیزون کی خرید فروخت جائز ہے، اور تقریباً تجارت لین دین کے وہ تمام طریقے جو دنیا مین مروج ہین، اگر اکل باطل لبا ر لا یظلمون و لا تظلمون کی زد مین نہ آتے ہون تو اسلام نے ان کی اجازت دے رکھی ہے مثلاً ندے کر ضرورت کی چیزین خرید نی، چیز دے کر چیز لے لینا، یا دام بعد کو دینا، جسے نسیہ (ادھار) کہتے ن، یا دام پہلے دینا اور چیز بعد کو لینا جسے سلم کہتے ہین، (بعض خاص شروط جن کے نہ ہونے کی وجہ سے ہی نہ کسی پر ظلم ہو جاتا تھا) سلم کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے، فقہاے اسلام نے اسلامی اصول کو

---

۵ البتہ اس کی چوتھی عقلی شق یعنی دام بھی نہ دیئے جائین، اور چیز بھی نہ خریدی جائے، دونون کی دونون ادھار ہون عربی مین اُسکو بیع الکالی بالکالی کہتے ہین، یہ بیع کی ناجائز صورت ہی کہ دونون کے نامعلوم و مجہول ہونے سے آگے کے وقت بے شمار جھگڑون کا دروازہ کھل سکتا ہی صحیح حدیثون مین اس بیع کو ناجائز قرار دیا گیا ہی ۱۲

پیش نظر رکھکر ہر شکل کے احکام اپنی کتابون مین درج کئے ہین، پھر اس لئے تاکہ خرید و فروخت کرنے والون کو سوچنے، غور کرنے، دیکھنے بھالنے کا موقع ملے، یا عیب و نقص کی وجہ سے واپسی کا امکان پیدا ہو، تجارت مین خیار[۱] کا قانون بھی رکھا گیا ہے، الغرض ممکن سی ممکن آسانیان جو ہوسکتی ہین، سب فراہم کردی گئی ہین اور قرآن مین:-

احل اللہ البیع — تجارت کو خدا نے حلال فرمایا ہی،

کے ذریعہ سے گویا مذکورۂ بالا صورتون کی حلت کا اعلان کیا گیا ہے، مگر دنیا مین لین دین کی ایک خاص شکل جس کا نام ربوا یا سود ہے، اور آج تک دنیا کے بڑے بڑے معاشی اس کے متعلق حیران ہین، اس کے جواز و عدم جواز کی بحث تقریبًا تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے چھڑی ہوئی ہے، اسلام نے فیصلہ کردیا ہو کہ اس کو قطعی طور پر حرام کر دیا جاتا ہے، انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو اسلام مین کتنی اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہو کہ اسلام مین یون تو اخلاقی، اجتماعی، یا طبی یا کسی اور نقطۂ نظر سے جرائم کی ایک تفصیلی فہرست پائی جاتی ہے لیکن زندگی کے معاشی پہلو کی اہمیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ صرف ایک اسی معاشی جرم پر قرآن نے بجائے کسی ایک سزا کے چار چار سزاؤن کی دھمکیان دی ہین یعنی سودخوار آسیب زدہ مجنوط کی شکل میں کھڑا ہوگا، اس کی دولت کا وہ حصہ جو سود کے ذریعہ سے حاصل ہوگا، محق اور برباد کر دیا جائے گا، وہ ہمیشہ جہنم مین رہے گا، اور آخر مین یہ کہ سودخوار کو حکم دیا گیا، کہ یا وہ اس معاشی جرم سے باز آئے، ورنہ اللہ اور اس کے رسول کو اعلان جنگ دیدے، یہ بات کہ اسلام نے تجارت کے اس طریقہ کو کیون جرم قرار دیا ہے، اس کی توجیہ آسان نہین ہے، بلکہ سچی بات یہی ہے، کہ اگر سود کی خرابیان اتنی واضح اور جلی ہوتین، تو قرآن مین غالبًا اس کا ذکر بھی نہ ہوتا، یا ہوتا تو جیسے اور جرائم مثلاً چوری

---

[۱] خیار یعنی اختیار، مطلب یہ ہے کہ خریدار کو بھی اور بیچنے والے کو بھی چند خاص شروط کے ساتھ اس کا اختیار رہے کہ معاملہ کو نہ کرین، ۱۲

ڈاکہ، فریب، جھوٹ وغیرہ کا ذکر ہے، اس کا بھی اسی نوعیت سے تذکرہ کیا جاتا، لیکن اتنی اہمیت جو اس کو دی گئی ہے، اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ عوام کیا بلکہ انسانون کے خاص عقول کی بھی رسائی اس کے دور رس نازک خطرناک نتائج تک نہیں ہوسکتی، ہزارہا ہزار سال سے علمی معاشیات والے سود کے افادہ و اضرار پر بحث کر رہے ہین، لیکن آج تک کسی قطعی فیصلہ پر نہین پہنچے ہین، اسی لئے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ مین انسان کو عقل سے بھی کسی بالاتر ذریعہ سے اس کے متعلق آخری فیصلہ واضح لفظون مین سُنا دیا جاتا، اور یہی قرآن نے کیا،

<u>حرمت سود کی وجہ</u> تاہم اگر اکل بالباطل اور لا تظلمون ولا تظلمون قرآن کے ان دونون معاشی بنیادون کو سامنے رکھ لین تو شاید ہم کچھ اس مسئلہ کے خطرناک پہلوؤن تک ایک حد تک پہنچ سکتے ہین، مثال سے اس کو یون واضح کیا جا سکتا ہے، کہ دنیا کے سارے کاروبار لین دین مین معاملہ کے فریقین مین ہر ایک دوسرے کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی کرتا ہے، مثلاً تاجر کپڑے دیتا ہے، خریدار روپیہ ادا کرتا ہے، کرایہ کی شکلون مین مثلاً موٹر کے مالک کو اگر کرایہ کا روپیہ ملتا ہے، تو جس وقت تک کرایہ دار اس کی موٹر کو استعمال کرتا رہتا ہے، موٹر کے تمام کل پرزے اپنے صفات کارکردگی کو بتدریج کھوتے رہتے ہین، یا سال بھر کے بعد مکان کو جب کرایہ دار واپس کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ مکان اور اس کے تمام عناصر اجزا اپنی اس حیثیت پر باقی نہین رہتے، جو کرایہ دینے کے وقت ان کی تھی، الغرض کرایہ کی شکلون مین بھی اگرچہ اصل چیز یعنی موٹر مکان وغیرہ مالک کو واپس ہو جاتی ہے لیکن صفات کی قربانی[۱] ان مین بھی ضرور

---

[۱] زراعت کا مطالعہ جنھون نے سائنس اور کیمیائی معلومات کی روشنی مین نہین کیا ہے، ان کو زمین کے متعلق بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہو کہ اگر کوئی کھیتی کرنے کے لئے کرایہ پر کسی کی زمین لے، اور چند سال اس میں کاشت کرنے کے بعد اُسے واپس کر دے تو جس حال مین اوس نے زمین لی تھی، اسی حال مین واپس کر رہا ہے، حالانکہ یہ واقعات سے جہل کا نتیجہ ہے، جاننے والے جانتے ہیں، کہ ایک دفعہ بھی جس زمین سے پیداوار حاصل کی جاتی ہے، تو اس کے بہت سے

ہو جاتی ہے، اُس کے مقابلہ مین جس نے بجاے موٹر کے آپ سے دو ہزار روپئے قرض لئے، اور دس سال بعد واپس کئے، تو لینے کے وقت آپ اپنے روپیون کو اسی طرح ٹھوک بجا کر لین گے، جس طرح آج سے دس سال پہلے دیئے گئے تھے، یہ نہین کہا جا سکتا کہ اس عرصہ مین روپے کے صفات پر کہنگی اور فرسودگی طاری ہو گئی، اور اس کی وجہ روپیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر روپیہ دوسرے روپیہ کا کامل طور سے قائم مقامی کرتا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ قرض دینے والے کی طرف سے نہ اصل مال کی قربانی ہوتی ہے، اور نہ مال کی صفات کی، اب اگر دس سال تک جو روپیہ آپ کا مقروض کے پاس رہا، اس کے معاوضہ مین آپ ہر مہینہ اس کا کرایہ اگر وصول کرین گے، تو سوال یہی ہے کہ آپ کی طرف سے کیا قربانی ہوئی، نہ روپیہ کے ذات کی، نہ صفات کی، خلاصہ یہ ہے کہ قرض دینے والے کا پوزیشن بغیر کسی قربانی کے بالکل محفوظ رہتا ہے، بخلاف لینے والے کے کہ اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا اور اس مین خرچ کر دیا تو روپیہ اور اس کا سود یا کرایہ اس طور پر دے رہا ہے، کہ اُس نے اُس روپیہ سے کچھ آمدنی نہیں پیدا کی اور اگر تجارت وغیرہ کے لئے لیا، تو تجارت کی کامیابی ہر حال مین ضروری نہین لیکن قرض دینے والے کا روپیہ بھی اپنی ذات وصفات کے ساتھ محفوظ اور اس کی دن دونی آمدنی بھی، ایسا شخص جو اپنے کاروبار مین کبھی نفع

(بقیہ حاشیہ ص ۷۴۸) کیمیائی مفید اجزا ضائع ہو جاتے ہین، اسی لئے سائینٹفک کاشت کاری مین ہر سال کھاد وغیرہ کا دینا ضروری خیال کیا جاتا ہے، ہندوستان کے جاہل کسان اس راز سے ناواقف ہونے کی وجہ سے آج جاپان اور یورپ وامریکہ کے کسانون کا مقابلہ نہین کر سکتے، مسٹر مسانی کی کتاب "ہمارا ہندوستان" ایک بڑی دلچسپ کتاب ہے، اردو مین بھی عصمت اللہ بیگ صاحب نے اس کو منتقل کر دیا ہے، اسی کتاب مین "زمین کے کھاد" کے عنوان سے جو باب لکھا گیا ہے، وہ پڑھنے کے قابل ہے، اس مین لکھتے ہین کہ کھاد جو ہماری زمین مین پائے جاتے ہین، جب زمین کے کسی خاص حصہ مین یہ خاص کھاد (نائٹروجن، پوٹاشیم، فاسفورس، لائم) کافی مقدار اور صحیح تناسب مین پائے جاتے ہین، وہان پیداوار خوب تیزی سے ہوتی ہے اور وہ زمین زرخیز کہلاتی ہے، مگر جہان ان مین سے چند یا سرے سے تمام کھاد غائب ہون تو ایسی زمین کو

اٹھاتا ہو اور کبھی نقصان کیا اس شخص کا مقابلہ کرسکتا ہے جس پر نقصان کے تمام دروازے بند ہیں، اور صرف نفع اور کیسا نفع؟ اضعافاً مضاعفۃ (دوگنے چوگنے) کے حساب سے جس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، کیا دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ جو کبھی بیمار نہیں ہوتا، اس کی صحت کا مقابلہ وہ کیسے کرسکتا ہے، جو کبھی اچھا اور کبھی بیمار ہوتا ہے، پس چند دنوں میں تو شاید نہیں لیکن اگر کسی ملک یا قوم میں ذرا زیادہ مدت تک اس قسم کی یک طرفہ گردش دولت کی جب کبھی ہوئی ہے، تو دیکھا جاتا ہے کہ ملک کا ایک قلیل گروہ یعنی ایسے لوگ جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ رہی ہو، اور ان کے پاس قدر حاجت سے بچکر پس انداز بھی ہوتا ہو جو عموماً ہر ملک و قوم میں تھوڑے ہوتے ہیں، جب یہ اپنے روپیہ کو سود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں، تو ان کے یہی روپے ملک کے اکثر افراد کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر آہستہ آہستہ ان کی دولت کو کھینچ کھینچ کر قرض دینے والوں کی جیبوں میں پہنچا دیتے ہیں، اور صدی ڈیڑھ صدی کے بعد یہ تماشا نظر آتا ہے، کہ قوم کے اکثر افراد بد ترین معاشی لاغری میں مبتلا ہیں اور معدودے چند گھرانوں یا شخصوں کے پاس دولت کا ورم پیدا ہوگیا ہے، پھر بات اسی حد پر آکر رُک نہیں جاتی، ان دولت مندوں کے پاس اگر دولت اور سرمایہ کی قوت ہوتی ہے، تو ملک کی اکثریت جو اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے "تنگ آکر ان سودخواروں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۸) بنجر کہتے ہیں، آگے اسی میں ہو کہ دوسری تمام اچھی چیزوں کی طرح زمین میں بھی قدرتی کھاد کا ذخیرہ کم و بیش محدود ہوتا ہے، ابتدا میں یہ کھاد خاصی مقدار میں ہوتے ہیں، اور گو ان کی کمی قدرتی طور پر تھوڑی پوری ہوتی رہتی ہے، لیکن جب کاشت ہونے لگے، تو وہ برابر کم ہوتے جاتے ہیں" چنانچہ ایک ایکڑ زمین میں معمولی فصل پر تقریباً بیس پونڈ نائیٹروجن سال بھر میں خرچ ہوتی ہے"، اور ایک "کھاد" نائیٹروجن کا حساب ایک ایکڑ کے لحاظ سے ہو، اس پر اب دوسرے کھادوں کو قیاس کریجئے، اسی کتاب میں ہے جتنی زیادہ مقدار میں یہ کھاد پودوں اور اناج کا جزبن کر نکلتا رہتا ہے، اتنی ہی مقدار میں زمین کے اندر اس کی کمی ہوتی جاتی ہے،

(ہمارا ہندوستان ص ۶۵)

کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا وحشیانہ حملہ ہو جاتا ہو، پھر اس کے بعد ہوتا ہے، جو کچھ ہوتا ہے، سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہین، امن وامان غارت ہو جاتا ہے، غربا بھوکے غضبناک بھیڑیون کی طرح دولت مندون کو چیر پھاڑ دیتے ہین، تاریخ ان نتائج کو آج یورپ مین دُہرا رہی ہے، یا دہرانے والی ہے، اور یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہو، یہی کہ معاشی کاروبار مین اکل بالباطل (یعنی بغیر کچھ دیئے ہوئے دوسرے کے مال سے استفادہ) اور لا تظلمون ولا تظلمون کے قانون کی پابندی سے بے اعتنائی برتی گئی، حافظ ابن قیم اعلام الموقعین مین فرماتے ہین:

فیربو المال علی المحتاج من غیر	محتاج (مقروض) پر مالی بار زیادتی کے ساتھ
نفع یحصل لہ ویزید من غیر نفع	بڑھ جاتا ہے اور اس طرح پر بڑھتا ہے کہ خود اس
یحصل منہ لاخیہ فیاکل مال	مال کا نفع اسے نہین ملتا، اور (قرض دینے والے)
اخیہ بالباطل	سود خوار کے مال مین اضافہ اس طرح پر ہوتا ہے
	کہ اس سے اوس کے بھائی (مقروض) کو کچھ
	نفع نہین پہنچا، یہی وجہ ہے کہ (سود) مین
(ص ۲۰۰)	آدمی اپنے بھائی کا مال بغیر کسی وجہ کے

آخر سود خوار کو جب اوس کا روپیہ اپنے تمام ذاتی وصفاتی کمالات کے ساتھ بجنسہ واپس ہو جاتا ہے تو بغیر کسی قربانی کے وہ غریب قرضخواہون سے سود کا روپیہ کس بنیاد پر لے رہا ہے، تمھارے روپے کیا بچے دیتے ہین، ارسطو کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے، جس ملک مین اس قسم کے لین دین کی جب کبھی قانونی اجازت دیجائیگی اور اس کے دائرہ مین وسعت پیدا ہوگی، تو آمدنی کے پس انداز کرنے والون کا قلیل گروہ اگرچہ اپنے آپ کو یا اپنے خاندان کو مالی فائدہ پہنچاتا ہے، لیکن ملک کے اکثر افراد کو شدید معاشی ضرر پہنچا رہا ہے، اس قسم کے کاروبار انھی ممالک مین فروغ پا سکتے ہین، جن کے باشندے اپنے آپ کو صرف اپنے لئے یا اپنے خاندان ہی کے لئے سمجھتے اور اپنے ملک یا شہر یا گاؤن کے دوسرے افراد سے انھین کچھ بحث نہ ہو، آخر یہ سارا روپیہ جو ان کی پس انداز

ناگزیر ضرورت رقم نے بشکل سود ان کے گھر پہنچائی ہے، وہ عموماً اسی ملک، اسی شہر، اسی گاؤں اسی محلہ کے باشندوں کی جیبوں ہی سے تو وصول ہوتی ہے، جن میں وہ رہتے بستے ہیں، حیرت ہے کہ یورپ آج قومیت اور (نیشن نیلیٹی) کے دعوی کا اپنے آپ کو ساری دنیا میں علم بردار کہتا ہے، اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ چند ساہوکاروں اور پیشہ ور سود خواروں کو اس کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے، بلکہ بنکنگ سسٹم کو جاری کرکے اوس نے موقع فراہم کردیا ہے اس بات کا کہ جن پس انداز کرنے والوں کو سود خواری کی فرصت نہ تھی، وہ بھی اب بآسانی سود خواروں کی کمیٹی میں شریک ہوکر ملک کی اکثریت کا معاشی خون چوسنے میں مشغول ہیں، اور اس لئے مغربی سود خواری نے اپنے ردعمل کو دنیا پر بہت جلد ظاہر کیا، یہ ایک حیثیت سے اچھا ہوا، ہلکے بخار سے تیز بخار کا ابھر کر آجانا، مریض کو چونکانے کے لئے زیادہ مفید ہے، آج یورپ (اشترا کی حیوانوں بلکہ شیطانوں کے تھپیڑوں سے مجبور ہو رہا ہے، سودی کاروبار کو اختیار کرکے اُس نے قدرت کو جنگ کا اعلان دیا، چیلنج قبول کیا گیا، اسی سود کے بل بوتے وہ جنگ لڑی جا رہی ہے، جس کی نظیر نہ دنیا کی آنکھوں نے پہلے دیکھی تھی، اور کون کہہ سکتا ہے، کہ آیندہ دیکھے گی، ماہرین کا بیان ہے کہ سود پر بآسانی حکومتوں کو روپیہ قرض اگر نہ ملتا، تو یومیہ کروڑہا کروڑ روپیہ کی رقم موجودہ جنگوں میں جو صرف ہو رہی ہے، اتنی رقم کی فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا، گویا آج سود ہی اعلان جنگ اور اس ہولناک جنگ کا ذریعہ بنا ہوا ہے، جس کی نظیر انسانیت کی تاریخ میں مفقود ہے، اور پھر اسی جنگ کے ذریعہ سے انسانوں کی کمائی ہوئی آمدنی دھواں بن بن کر کچھ فضائی ہواؤں میں اور کچھ جہاز، تارپیڈو اور خدا جانے کیا کیا بن بن کر سمندر کے پانیوں میں محو و فرسودہ ہو ہو کر برباد ہو رہی ہے، آیندہ زندگی میں تو جو کچھ ہوگا، وہ تو اس وقت دیکھا جائے گا، لیکن شہر کے جن ڈاکٹروں وکیلوں تاجروں اور ہر پیشہ وروں نے سود خواری کی انجمن (بنک) میں شرکت کی تھی میدان جنگ بلکہ اپنے اپنے محل سراؤں اور کوٹھیوں میں بنگلوں میں برستی ہوئی آگ، اور دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں، نہ گھر کے اندر چین ہے، اور نہ گھر کے باہر کوئی جائے پناہ، خدا سے جنگ کرنے کے بعد

لوگ پناہ کہاں ڈھونڈ رہے ہیں، سود خوار کو جن جن عذابوں کی قرآن نے دھمکی دی تھی جن کی آنکھیں ہیں وہ دیکھیں
اور جن کے کان ہیں وہ سنیں، اور جن کے دل ہیں، وہ سمجھیں، اُن کو کہا گیا تھا کہ نہ دوسروں پر ظلم کرو، اور نہ
اپنے اوپر ظلم کرو لیکن انھوں نے دوسروں پر بھی ظلم کیا اور اپنے اوپر بھی ظلم کیا، وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِن
كَانُوا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ، اور یہ تو ربوا کی عام صورت تھی جس کے خطرناک نتائج پر اسلام سے پہلے بھی
مختلف مذاہب میں تنبیہ کی گئی تھی، بلکہ بعض عقلی معاشیوں نے بھی اس معاملہ کی شدت سے مخالفت کی
تھی، لیکن اسلام نے صرف ربوا کی مروجہ شکل ہی کو اکبر الکبائر اور بدترین جرائم میں شریک نہیں کیا، بلکہ اگر
کوئی شخص کسی کو دس روپیہ دیکر کچھ دن کے بعد اس کے معاوضہ میں بیس روپیہ لے، اور بجائے اس کے
کہ اس کو سودی قرض کا معاملہ قرار دیتا، یوں کہے کہ میں نے اس دس روپیہ سے تمھارے یہ بیس روپیے
خریدے ہیں، یا کسی تاجر نے دس روپئے کے کپڑے ایک ماہ کے لئے کسی کے ہاتھ اس شرط سے ادھار
بیچے، کہ ایک ماہ بعد دام ادا کرنا، خریدار ایک ماہ کے بعد دام ادا نہ کرسکا، تو تاجر اس سے یوں کہے کہ
میں ایک ماہ کی مہلت اس شرط سے دیتا ہوں، کہ تم بجائے دس کے بارہ ادا کرنا، ظاہر ہے کہ ان تم
شکلوں میں صرف لفظوں کا ایرپھیر ہے، ورنہ حاصل وہی ہے جو سودی قرض کا حاصل ہے، اس لئے اسلا
نے قرض کے سودی کاروبار کے ساتھ بیع اور خرید و فروخت کی ان شکلوں کو بھی سود اور ربوا قرار دیا،
جو حالت روپیہ کی ہے، بجنسہ یہی کیفیت اور بھی چند چیزوں میں پائی جاتی ہے، مثلاً اگر ایک من گیہوں د
دیکر دو مہینہ بعد کوئی شخص بجائے ایک من کے مزید ایک من گیہوں کا اضافہ کرکے دو من لیتا ہے، تو اُس میں اور اُس شخ
میں جس نے دس روپیہ دے کر دو مہینے بعد بیس روپئے لئے کیا فرق ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ک
عمیق معاشی نگاہ اس دقیق نکتہ تک پہنچی اور اسی بنا پر آپ نے اعلان فرما دیا، کہ سود یا ربوا صرف روپیہ
لین دین ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ربوا کے ذیل میں اور بھی چند چیزیں شریک ہیں، اور ٹھیک جیسا
میں نے قمار میں عرض کیا تھا، کہ جن جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا تھا، اسلام

نادار کی جڑ کاٹنے کے لئے ان کی بھی ممانعت کر دی، اسی طرح ربوا کی مندرجۂ بالا شکلوں کے سوا جن میں
دینے کے کچھ دن بعد بطور کرایہ کے زیادتی وصول کی جاتی ہو، جیسے اصطلاحًا ربوالنسیہ (ادھار کے معاملہ کا
سود) کہتے ہیں، اسلام نے ان صورتوں کو بھی جن میں ادھار نہیں بلکہ نقد مثلاً ایک تولہ چاندی لے کر کوئی
دو تولہ چاندی یا نقد ایک من گیہوں دے کر اس کے معاوضہ میں دو من گیہوں دے، اس کو بھی ناجائز ٹھہرایا
اور مشہور صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربوا کی ان تمام چھوٹی بڑی واضح غیر واضح شکلوں
کی ممانعت فرما دی، یعنی

الذهب بالذهب والفضة	سونے کا معاملہ سونے سے، چاندی کا چاندی
بالفضة والبر بالبر والشعير	سے، گیہوں کا گیہوں سے، جو کا جو سے،
بالشعير والتمر بالتمر والملح	کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے (یعنی)
بالملح مثلاً بمثل يداً بيد فمن	برابر برابر، اور اس ہاتھ لے اس ہاتھ
زاد واستزاد فقد اربى الآخذ	دے (یعنی نقداً) ہونا چاہئے، پھر جو
والمعطى فيه سواء،	بڑھائے یا بڑھوائے، اس نے سود
	(ربوا) کا معاملہ کیا لینے والا اور دینے والا
(صحاح ستہ)	دونوں اس میں برابر ہیں،

حدیث میں تو صرف یہی چیزیں اموال ربویہ یعنی ایسے اموال قرار دیئے گئے ہیں، جن کا باہمی تبادلہ
زیادتی کے ساتھ نہ ادھار جائز ہے، نہ نقد خواہ یہ تبادلہ قرض کے الفاظ سے ہو، یا بیع کے لفظ
کے ساتھ ہو، بظاہر ربوا کے تحت میں ان شکلوں کو اسلام نے غالبًا پہلی دفعہ داخل کیا ہے ورنہ
اس سے پہلے عمومًا سود اور ربوا روپیہ اور اشرفی یعنی سکہ کے سودی کاروبار ہی تک بظاہر محدود تھا،
پھر بعد کو فقہائے اسلام نے اس حدیث پر غور کیا، تو جو خصوصیات ان چھ چیزوں کی تعیین، اور دوسری

چیزوں میں بھی وہ پائی جاتی تھین، اس لئے اونھون نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے
کے اس بیان کو ایک توضیحی بیان قرار دیتے ہوئے ان چیزون کو بھی اموال ربویہ یا ربائی مالون مین
شریک کر دیا، جن مین ان کی نگاہ مین وہ خصوصیتیں پائی جاتی ہین، امام شافعی اور قریب قریب امام مالک
نے سونا اور چاندی کو دیکھ کر خیال کیا، کہ مراد اس سے ہر وہ چیز ہے جو لین دین مین قیمت کا کام دیتی
ہے، اب خواہ وہ سونا چاندی ہو یا اوس کے سوا کوئی اور چیز ہو، اسی طرح گیہون اور جو، نمک، کھجور
کو دیکھ کر ان بزرگون نے خیال فرمایا، کہ مراد ہر وہ چیز ہے، جو کھانے پینے مین کام آتی ہو، یا جن سے
خورد و نوش کی چیزون کی اصلاح کی جاتی ہو، جیسے نمک لیکن ربائی اموال کی یہ خصوصیت کہ اوس کا ہر فرد
دوسرے فرد کا قائم مقام ہوتا ہے، اور ان کی یہی خصوصیت ان نتائج کی ذمہ وار ہے، جو سودی کاروبار
مین پیش آتے ہین، اس نکتہ پر نظر امام ابو حنیفہ کی گئی، انھون نے خیال کیا کہ یہ خصوصیت کن کن چیزون مین
پائی جا سکتی ہے، چونکہ ہر وہ چیز جس کی خرید و فروخت کیل (پیمانہ) یا وزن (تول) کے ذریعہ سے ہوتی
ہے، ان مین یہ خصوصیت پائی جاتی تھی، اس لئے امام نے بجائے ان چیزون کے ہر اوس چیز کو جو کیل (پیمانہ)
یا وزن (تول) کے ذریعہ سے بکتی ہو، اموال ربوی قرار دیا اور ان کے باہمی تبادلہ مین ربوا (زیادتی) کو
انھون نے ناجائز ٹھہرایا، ان اجتہادی دقیقہ سنجیون کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی ربوا جو اب تک دنیا مین صرف
روپیہ کے قرض کے کاروبار کی ایک شکل تھی، اب ہزارہا چیزون تک پھیل گیا، خصوصاً حنفی مذہب جو اسلام
کے تشریحی مکاتب خیال مین سب سے زیادہ محتاط اسکول ہے، اس مین تو سود کی اتنی گوناگون شکلین پیدا
ہو گئیں، کہ اب ان کا سمیٹنا دشوار ہو گیا ہے، فقہا نے تفصیلات مین دفتر کے دفتر تیار کر دیئے، لیکن اصلی
بحث کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے جو عرض کیا گیا، عموماً فقہ کی کتابون مین سود کے مباحث کو دیکھ کر لوگون
کو تعجب ہوتا ہے، کہ عوام جسے سود کہتے ہین، اس کا تو اس مین گویا ذکر ہی نہین ہے، حتی کہ اس بنا پر عوام
ہی کو نہین بعض اچھے اچھے پڑھے لکھون تک کے پچھلے دنون یہ مغالطہ ہو گیا، کہ اسلام نے جس سود کو حرام

کیا ہو وہ قرض والا موجودہ سود نہین ہے، بلکہ بیع اور خرید و فروخت کی چند نادر شکلین تھین جو ایام جاہلیت مین مروج تھین، اور انہی کا ذکر فقہ کی کتابون مین کیا گیا، مگر ظاہر ہے کہ اگر اسلام نے اس سود کو منع نہین کیا تو پھر آخر اوس نے منع کس چیز کو کیا، دنیا کے اکثر مذاہب بدھ مت، عیسائیت حتی کہ ہندو مت تک مین جس سود کو حرام یا غلیظ کھانے کے برابر قرار دیا گیا ہو، ارسطو نے جس سود کے متعلق یہ رائے دی تھی، کہ تمھارے روپے بچے نہیں دیتے، یہ قرض والا سود نہین ہے، تو اور کیا ہے، کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس "معاشی سرطان" کی تشخیص ارسطو تک کی عقل نے کر لی تھی اسی کے متعلق کہا جائے کہ اسلام کی نگاہ معاشیات کے اس زہریلے گھاؤ پر نہ پڑی، اور پڑی بھی تو کس پر جس کا نہ اب دنیا مین رواج ہے، اور نہ کسی کو ان کا تجربہ ہے، خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، بھلا ایسے لوگون سے کون بحث کر سکتا ہے، جو قرآن کے خنزیر کو عرب کا کوئی چوہا اور قرآن کے خمر کو عرب کے کسی درخت کا خاص رس قرار دے کر واقعی جو خنزیر و خمر ہے، اس کی حلت کا فتویٰ دین، (باقی)

طبقات الامم

اندلس کے نامور فاضل قاضی صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ کی کتاب جس مین اونھون نے اپنے زمانہ تک کی تمام قومون کی عموماً اور مسلمانون کی خصوصاً علمی و ادبی تصانیف اور علوم و فنون کی تاریخ عربی مین لکھی تھی، قاضی احمد میان اختر جوناگڈھی نے اس کو عربی سے اردو مین ترجمہ کیا، اور جابجا حاشیون مین علماء اور فلاسفہ کے حالات اور تصانیف کے متعلق مزید معلومات فراہم کئے ہین،

ضخامت :- ۱۵۰ صفحے، قیمت :- عہ

منیجر

استفسار و جواب

قنوج

جناب حمید الرحمان صاحب — مخدوم و محترم بندہ

محلہ مبارک پور، قنوج — السلام علیکم

"معارف مارچ ۲۲ء میں آپ کا تحقیقی مضمون قنوج پڑھ کے ایک خلش دور ہو گئی جو عرصہ سے دل میں چبھ رہی تھی، یہ خلش اگرچہ اس وقت سے تھی جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ عرب مورخین جس قنوج کا ذکر کرتے ہیں وہ اس موجودہ اور مشہور قنوج کے علاوہ دوسرا قنوج ہے، جو سندھ میں ہے مگر "تعلقات عرب و ہند" پڑھ کے یہ خلش بڑھ گئی تھی، کیونکہ یہ اوس شخص کی تحقیقات کا نتیجہ تھا جسکی قابلیت و تاریخ دانی کا سکہ میرے قلب پر بیٹھا ہوا تھا، اوس کو پڑھنے کے بعد میں نے آپ کی خدمت میں ایک خط لکھا تھا، جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا تھا، جس قنوج میں قاسم تقفی نے تبلیغ بھیجی تھی، یہ وہ قنوج نہیں، بلکہ سندھ میں واقع تھا، (خط نمبر ۲۰۸۳ مورخہ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۲ء) اس خط کو پڑھنے کے بعد ہی بار بار یہ خیال دل میں آتا تھا، کہ اگر سندھ میں کوئی قنوج تھا، تو محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی فتوحات سندھ کے سلسلہ میں اس کی فتح کا ذکر کیوں نہیں آیا، اور تمام سندھ فتح کر لینے کے بعد سندھ ہی کے ایک شہر کو فتح کرنے کے لئے ان کو خاص طور سے دربار خلافت سے اجازت طلب کرنے کی کیا ضرورت تھی، نیز سلطان محمود غزنوی نے پنجاب سندھ، گجرات طے کر کے

۱۰۲۵ء مین کاٹھیاواڑ، پھر سومنات کو فتح کیا، اس وقت بھی سندھ یا گجرات مین کسی قنوج کا پتہ نہین چلتا ہے، حالانکہ مسعودی و بشاری وغیرہ اس سے پہلے سندھ کے قنوج کا ذکر کر چکے ہین، آپ کے اس مضمون "قنوج" سے اب یہ تو صاف ہو گیا، کہ سوائے موجودہ قنوج کے کوئی دوسرا قنوج سندھ مین نہین تھا، مگر اب اس مضمون سے ایک دوسرا تحقیق طلب مسئلہ سامنے آگیا جسکی جانب جناب والا کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہون، امید ہے کہ معارف کے ذریعہ رائے گرامی سے مطلع فرمائے گا،

"مارچ ۱۹۴۲ء کے معارف کے صفحہ ۱۸۱ پر ہے،" قنوج کی تاریخ کے واقف کار جانتے ہین کہ قنوج پر تین دور گذرے ہین، اس کا نام تاریخ مین سب سے پہلی دفعہ چھٹی صدی عیسوی مین آتا ہے" مجھے اس سلسلہ مین کچھ عرض کرنا ہے، اوس کی عبارت سے اگر یہ مطلب ہو کہ دورِ قصص کو چھوڑ کر تاریخی دور مین قنوج کا نام تاریخ مین پہلی دفعہ چھٹی صدی عیسوی مین بحیثیت دار السلطنت یا ایک اہم اور خاص شہر ہونے کے آیا ہے جب تو کچھ کہنا نہین ہے، اور اگر یہ مطلب ہو کہ چھٹی صدی مین پہلی دفعہ اس کا نام تاریخ مین آیا ہے، تو اقتباسات مندرجۂ ذیل قابل توجہ ہین،

(۱) قنوج نہایت قدیم شہر ہندوستان کا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم مین یہ سلطنت پنچالہ کہلاتی تھی، قنوج اور پنچالہ کا ایک ہونا منو کے مجموعہ کے دوسرے باب کے اشلوک ۱۹ سے سمجھا گیا ہے، اور جو حدین اوس کی مہابھارت مین قرار دی گئی ہین، ان کو اورنٹیل میگزین جلد ۳ صفحہ ۳۵ اور جلد ۳ صفحہ ۱۲۲ مین تحقیق کیا گیا ہے، ہم مفروضہ منو کے زمانہ کو سکندر کے زمانہ (۳۰۰ ق م) اور ویدون کے زمانہ (۱۴۰۰ ق م) کے وسط کے آس پاس کا کوئی زمانہ قرار دے سکتے ہین، اس حساب سے مجموعہ کا مصنف نوسو برس قبل مسیح علیہ السلام ہوگا، (الفنسٹن)

(۲) کب اور کس شخص نے اس کو آباد کیا، اس کا پتہ نہین، لیکن یا در کہ رامائن اور مہابھارت دونون کی مہابھاشیا

میں اس کا نام کنیا کبج تھا، اس امر کو واضح کرتا ہے، کہ دوسری صدی قبل مسیح میں اس شہر کا وجود تھا۔ (گزیٹیر ضلع فرخ آباد)

(۳) قنوج کا ذکر نہ صرف ہندوستان کی دو بڑی نظموں ہی میں آیا ہے، بلکہ پتن جلی کی مہابھاشیہ کے موجودہ نسخہ میں بھی اس کا ذکر ہے، جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے، کہ ۱۵۰ ق م تک تصنیف ہوئی، اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ قنوج کی بنیاد حضرت عیسیٰؑ سے کم و بیش دو سو برس قبل پڑی ہوگی،...... قنوج کے متعلق سب سے قدیم بیان جو اب تک مل سکا، وہ فاہیان چینی سیاح کا ہے، جس نے ۳۹۹ء سے ۴۱۴ء تک ہندوستان کی سیاحت چندر گپت ثانی کے زمانہ میں کی ہے، اس کا بیان ہے کہ ناگ مندر میں موسم گرما تک قیام کیا، بعد ازاں جنوب و مشرق کی جانب سات یوجن سفر کیا، اور شہر کنیا کبج میں پہونچا، جو دریائے گنگ پر واقع ہے، اس میں دو خانقاہیں یا دھرم شالے ہیں، جن کے رہنے والے ہینایانا فرقے کے طالب علم ہیں، شہر سے چھ یا سات..... کے فاصلے سے گنگا کے شمالی کنارے پر جہاں مہاتما بدھ اپنے چیلوں کو تعلیم دیتے تھے، اس مقام پر ایک ڈہا تعمیر کیا گیا، جو اب تک موجود ہے۔ (ونسنٹ اسمتھ)

(۴) شہر قنوج کے پاس ہی ایک ستون بر لب دریائے گنگ ہے، جو دو سو فیٹ بلند ہے، اسے راجہ اشوک نے اوس مقام پر تعمیر کرایا تھا، جہاں خود بودھ نے لوگوں کو وعظ و نصیحت کی تھی۔ (ہونگ شیانگ چینی سیاح ۶۴۳)

(۵) کچھ شہروں سے گذرتا ہوا چینی سیاح ہونگ شیانگ حکومت قنوج میں پہنچا، جو بلحاظ اپنی قدامت کے دو ہزار سال پرانی جگہ تھی، اور جو اپنی تہذیب و تمدن کے اوپر ناز کرتی تھی، یہی وہ جگہ تھی، جہاں سے پنچالہ کی تہذیب کا دور شروع ہوتا ہے، اور نسبتاً مگدھ کے جو کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کا مرکز بنا ہوا تھا، زیادہ قدیم اور مہذب تھا، چندر گپت اور

اشوک اعظم کے زمانہ میں مگدھ سے زیادہ بارونق اور دولت مند شہر شمالی ہندوستان میں
بن گیا تھا لیکن سنہ عیسوی کے کچھ ہی عرصہ بعد لیک مرتبہ کنیا کبج پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت
حاصل کر لیتا ہے، (ہندوستان کی قدیم تہذیب، ترجمہ ان شنٹ آف انڈیا جلد دوم مسٹر آر سی دت)

(۶) راے ہر چند گفت وجواب داد که این ولایت قریب کہزار وشش صد سال است که در
ضبط وتصرف ماراست (معارف ماہ مارچ ۱۹۴۳ء ص ۲۰۰ بحوالہ چچ نامہ)

(الف) کیا ان اقتباسات سے تاریخی حیثیت سے قنوج کا نام اس کا ذکر اور اس کا وجود
نہ صرف چھٹی صدی عیسوی بلکہ سن عیسوی سے بھی صدیوں قبل ثابت نہیں ہوتا،

(ب) تاریخی اعتبار سے ان اقتباسات کی کیا قدر وقیمت ہے،

معارف:- محترم زاد لطفکم

السلام علیکم، گرامی نامہ ملا جس عبارت سے آپ کو شبہ پیدا ہوا ہے، اس کا مفہوم وہی ہے جس کو آپ نے ابتدا ظاہر کیا ہے، یعنی یہاں "قنوج" سے مراد قنوج راج ہی ہے، جس کی نشو ونما چھٹی صدی عیسوی میں ہوئی، اور اس حیثیت سے قنوج کا نام تاریخ میں پہلی مرتبہ آیا، ورنہ اس سے پہلے اس آبادی کو کوئی تاریخی اہمیت حاصل نہ تھی، جو اقتباسات آپ نے نقل کئے ہیں، اُن کا تعلق اس آبادی سے ہے، جو اُسی مقام پر تھی، جس پر چھٹی صدی میں نئے سرے سے قنوج نے عروج حاصل کیا، مہابھارت میں اس کے دو جگہ مذکور ہونے کا جو تذکرہ آتا ہے، اس سے مراد وہ آبادی ہے، جو قنوج کے موجودہ مقام پر اس زمانہ میں موجود تھی، نیز سمجھا جاتا ہے کہ بطلیموس کے جغرافیہ (تصنیف ۱۴۰ء) میں بھی "گنگورا" اور "کنوزگا" کے ناموں سے جن آبادیوں کا ذکر آیا ہے، اس سے مراد "قنوج" ہی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک یہ آبادی کنیا کبج یا کان کبج کے نام سے زیادہ مشہور نہیں ہوئی تھی،

ہرش کے زمانہ (۶۰۶ء - ۶۴۷ء) میں یہ شہر دار السلطنت بنایا گیا، اور اوس کی ترقی کی وجہ سے اس

علاقہ کے دوسرے پررونق شہر بے رونق اور گمنام ہوگئے، اور اسی زمانہ سے قنوج کو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی (قدیم تاریخ ہند ونسنٹ اسمتھ ترجمۂ عثمانیہ ص ۵۶۰، ۵۶۰)

اس لئے اس موقع پر حضرۃ الاستاذ مدظلہ کے مقالہ میں "قنوج کی تاریخ" کا جو ذکر آیا ہے اس سے مراد ہندوستان کی قدیم رزمیہ و سیاسی تاریخ ہے جس میں قنوج کا نام پہلی دفعہ اسی مذکورہ بالا زمانہ میں آیا ہے ورنہ اس کی آبادی کی قدامت کے لئے چچ نامہ کی یہ عبارت شاہد ہے، جو اس مقالہ میں نقل کی گئی ہے کہ

"راے ہرچند گفت جواب داد کہ این ولایت قریب یک ہزار و شش صد سال است کہ در ضبط و تصرف ما است" (معارف مارچ ۱۹۴۴ء ص ۱۶۰)

بہرحال جیسا کہ اوپر اسمتھ کے حوالہ سے عرض کیا گیا، کہ کم سے کم ۱۴۰ء تک یہ آبادی کان کبج یعنی قنوج کے نام سے زیادہ مشہور نہیں ہوئی تھی، اور بطلیوس کے جغرافیہ میں اس آبادی کا ذکر کسی اور نام سے آیا ہے اس لئے دراصل اس آبادی کا ذکر تاریخ میں ایک دار السلطنت کی حیثیت سے پہلی مرتبہ چھٹی صدی عیسوی ہی میں آتا ہے اسی لئے محترم قلم سے یہ فقرہ ادا ہوا کہ

"قنوج کی تاریخ کے واقف کار جانتے ہیں، کہ قنوج پر تین مختلف دور گذرے ہیں، اس کا نام تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ چھٹی صدی عیسوی میں آتا ہے" (معارف مارچ ۱۹۴۴ء ص ۱۸۲) "سرنا"

پٹھانوں کی تاریخ

جناب خان ایس کے مالیار انور پورہ ۔ اٹک	بخدمت جناب محترم مولانا سید سلیمان صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

باعث تکلیف ہو رہا ہوں، امید ہے کہ آپ اس عاجز کی استدعا کو منظور فرمائیں گے، مجھے پٹھانوں کی تاریخ سے خاص اُنس ہے، اور چاہتا ہوں کہ اس کی تلاش کروں، مگر اوسط درجہ کی واقفیت میری جستجو کی رہنمائی نہیں کرسکتی، براہ کرم مطلع فرمائیں کہ پٹھان اور افغان کی مکمل اور

واضح تاریخ موجود ہے ؟ (۲) اگر ہے تو کون سی اور کہان مل سکتی ہے،

معارف:- محترم زاد لطفکم السلام علیکم

گرامی نامہ ملا ہندوستان مین پٹھان قوم کے مفہوم مین وسعت پیدا ہوگئی ہے بعض یورپین مورخین جنرل برگز (Briggs) وغیرہ کی غلطیون سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے وہ مسلمان سلاطین جو مغلون سے پہلے گذرے ہین، عام طور پر پٹھان سمجھے گئے، جو صریح غلطی ہے، ان سلاطین کے بیشتر خانوادے ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے صحیح معنون مین جس پٹھان خاندان نے ہندوستان پر حکومت کی، وہ سوریہ یعنی شیر شاہی خاندان ہے، البتہ سوریون سے پہلے لودھیون کا زمانہ گذرا ہے جن کو سلاطین افغان مین شمار کیا جاتا ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی سے پہلے خود افغانستان مین کسی افغانی النسل حکمران کا وجود نہین ہے۔

اس لئے جہان تک پٹھانون کی تاریخ مملکت کا تعلق ہے وہ انھی خانوادون کی سیاسی تاریخ پر مشتمل ہے جنھون نے تھوڑے زمانہ تک ہندوستان اور افغانستان مین حکمرانی کی ہے، ان مین سے ہندوستان کے سوریہ خاندان کی تاریخ دراصل شیر شاہ کی تاریخ ہے، اور اسی سلسلہ مین افغانون اور پٹھانون کا ذکر آتا ہے۔

شیر شاہ کے حالات کے ماخذ کی دو قسمین ہو سکتی ہین، یعنی:-

ایک تو وہ مورخین ہین جو نسلاً افغان یا پٹھان تھے، دوسرے وہ مورخین ہین جو اس نسل سے تعلق نہ رکھتے تھے، ان مین سے اول الذکر مورخین کی نسلی و قبائلی ہمدردی قدرۃً شیر شاہ اور اس خاندان کے ساتھ تھی، اور موخر الذکر مورخین مین کچھ لوگ ایسے تھے، جو سوریون کے حریف مغلون کی سلطنت سے وابستہ تھے، اور ان کے پیش نظر انھی کی تاریخ مرتب کرنا تھا، اس لئے ان کا لب ولہجہ سوریون اور شیر شاہ کے متعلق بہرحال خوشگوار نہین ہے،

ان مین سے اول الذکر کتابون مین تحفۂ اکبر شاہی معروف بہ تاریخ شیر شاہی (عباس سروانی) مخزن افاغنہ (نعمت اللہ) اور تاریخ داؤدی (عبد اللہ) معیاری افغانی تاریخین ہین،

(الف ۲)۱- تاریخ شیرشاہی۔ اگرچہ اکبر کے زمانہ مین اسی کے حکم سے لکھی گئی لیکن اس کا مصنف عباس
ِوانی افغان تھا، اُس کی شادی شیرشاہ کے خاندان مین ہوئی شیرشاہ کے عہدِ حکومت کے چالیس سال
بعد اوس نے اسکا کتاب کو لکھا،ا یسے لوگ موجود تھے، جو شیرشاہ کے ساتھ وقائع مین شریک تھے، نیوبت
) خاندانی روایتین گھرون مین موجود تھین عباس شروانی نے انہی ماخذ سے یہ تاریخ مرتب کی، اگرچہ خاندانی
ِایتون مین رطب و یابس کی آمیزش ہو چکی تھی، باین ہمہ شیرشاہ کے متعلق مستند معلومات کا یہ بہترین ذخیرہ
سمجھا جاتا ہی، الیٹ نے کتاب کے مباحث کی تلخیص اپنی تاریخ مین درج کی ہے (ج ۴ ص ۳۰۱-۴۳۳)

۲- مخزنِ افاغنہ، نعمت اللہ کی معروف تصنیف ہے، یہ عہدِ جہانگیری مین تصنیف ہوئی، یہ تاریخ
انجہانی مخزنِ افغانی" کے نام سے بھی مشہور ہے، اس لئے کہ یہ خان جہان لودی کی ہدایت سے لکھی گئی، اور
اس کا آخری باب خانجہان ہی کے حالات پر مشتمل ہے، الیٹ نے اس کا بھی مفصل تذکرہ کیا ہی، (ج ۵ ص ۶۷-۱۱۵)
ڈورن نے بھی اس کتاب کا انگریزی ترجمہ "تاریخ افغانہ" کے نام سے ۱۸۳۹ء مین شائع کیا ہی ڈورن کے ترجمہ
اور برٹش میوزیم کے اصل نسخہ مین جو فرق ہی اس کا تذکرہ ریو نے نسخہ کے حال مین لکھا ہی (فہرست مخطوطات فارسی
برٹش میوزیم جلد ا ص۲۱۰) بہرحال گویا یہ افغانون کی تاریخ پر ایک مستقل تصنیف ہی جس مین ان کے نسب خاندان
اور افغانی حکمران خاندانون کے سیاسی احوال بیان کئے گئے ہین،

۳- تاریخ داؤدی، کا مصنف عبداللہ کے نام سے موسوم ہے، یہ بھی جہانگیر کے زمانہ مین لکھی گئی،
اسمیں سلطان بہلول لودھی، سکندر، ابراہیم شیرشاہ، اسلام شاہ محمد عادل اور داؤد شاہ کے زمانہ حکومت کے حالات
قلمبند کئے گئے ہین الیٹ نے اس کے کچھ مضامین اپنی تاریخ مین ترجمہ کرکے نقل کئے ہین، (جلد ۴ ص ۴۳۴-۵۱۳)
اور ریو نے بھی فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم (ج ا ص ۲۴۳) مین تذکرہ کیا ہے،

۴- افسانہ شاہان، اس کا مصنف ایک افغان محمد کبیر بن شیخ اسمٰعیل حزباز نواسہ شیخ خلیل اللہ حقانی ہے،
مصنف کا بیان ہی کہ اسکے جدِ بزرگوار اکبر کے زمانہ مین ایک افغانی روحانی پیشوا تھے جو راجگیر (بہار) میں متوطن تھے اور

بقول شے پنجاب مین وفات پائی، مصنف کا بیان ہو کہ اوس نے یہ کتاب اپنے نوجوان لڑکے محمود کی موت کا غم غلط کرنے کے لئے لکھنی شروع کی جس نے اس کو ۱۲ برس کی عمر مین مار گزیدگی سے اچانک داغ مفارقت دیا، یہ کا بیان ہو کہ مصنف نے اس کتاب کو تاریخ کے طرز پر لکھنے کے بجائے دلچسپ انداز اور شگفتہ عبارت مین افسانہ و حکایات کے رنگ مین لکھا ہو، اس مین حسب ذیل شخصیتون کے حالات قلمبند کئے گئے ہین، کالا لودھی (پدر بہلول لودھی) بہلول، سکندر، ابراہیم، شیر شاہ، اسلام شاہ، عادل، ابراہیم، سکندر سور، کالا پہاڑ، اور داؤد لودھی (فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ج ۱ ص ۲۴۳)

(ب) غیر افغانی مورخین کی کتابین بھی دو قسمون کی ہین، ایک تو مغل سلاطین، ہمایون اکبر وغیرہ پر جو خاص طور پر لکھی گئی ہین، اور ان مین شیر شاہ اور دوسرے سلاطین سوریہ کے واقعات کا ذکر آیا ہے، دوسرے ہندوستان کی عام تاریخین ہین، جن مین دوسرے خانوادون کے سلاطین کی طرح افغان سلاطین کا بھی ذکر آیا ہو، اور ان کے لئے بھی ابواب قائم کئے گئے ہین، یہ تاریخین عام طور پر معروف و مشہور ہین، مثلاً تزک بابری، ہمایون نامہ گلبدن بیگم، اکبر نامہ ابو الفضل، تاریخ رشیدی مرزا محمد حیدر، تذکرۃ الواقعات جوہر آفتابچی، طبقات اکبر شاہی نظام الدین احمد، منتخب التواریخ عبد القادر بدایونی، آئین اکبری ابو الفضل، تاریخ فرشتہ، خلاصۃ التواریخ سبحان رائے، منتخب اللباب خوافی خان، زبدۃ التواریخ نور الحق مشرقی، تاریخ نورس نامہ، لب التواریخ رائے بندرابن، منتخب التواریخ جگجیون داس، تحفۃ الہند لال رام، حقیقت ہائے ہندوستان لچھمی نرائن شفیق وغیرہ،

(ج) یورپین مورخین کی تصنیفات مین بھی بعض خاص افغان سلاطین کے حالات مین ہین، اور بعض ہندوستان کی عمومی تاریخین ہین، ان مین سے ایک پرتگالی مورخ کی تصنیف پٹھانون کے سلسلہ مین خاص اہمیت رکھتی ہو کہ وہ پرتگالی شیر شاہ اور محمود شاہ اور ہمایون کی لڑائیون کا چشم دید گواہ ہے، پروفیسر سرکار نے اس کا تعارف کرایا، اور کالی کرنجن قانون گو مصنف "شیر شاہ" کے مآخذ مین بھی اسی طرح جزو تمیل کی "شیر شاہ ایک نئے زاویہ سے" (A new view of Sher Shah

جو ۱۲۲۲ھ میں شائع ہوئی اور دوسری ایچ، ڈبلو، بیلو کی "افغانستان کا جائزہ علم الاقوام کے رو سے"
An Inquiry in to the Ethnography of Af-
-ghanistan) ہے جو ۱۸۹۱ء میں چھپی ہے قابلِ ذکر ہیں،
ان کے علاوہ الفنسٹن ارا سکن، تھامس، الیٹ وغیرہ کی تاریخ ہند میں، اسی طرح انسائیکلوپیڈیا
آف اسلام (سور) وغیرہ میں بھی ذکر آیا ہے،

(د) ہندوستان میں شیر شاہ پر دو قابلِ ذکر کتابیں انگریزی زبان میں نکلی ہیں، ایک تو کالی کرنجن
قانون گو پروفیسر رامجس کالج دہلی کی "شیر شاہ" ہے، جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی ہے، یہ شیر شاہ پر معیاری تصنیف
سمجھی جاتی ہے مصنف نے آخر میں اپنے ماخذ کی فہرست بھی دی ہے، دوسری کتاب سید ذوالفقار علی خان کی
"شیر شاہ سوری" ہے، جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی ہے، یہ ایک مقالہ ہے جسے مصنف نے ۱۹۱۷ء میں پنجاب
ہسٹوریکل سوسائٹی میں پڑھا تھا،

اردو میں اس سلسلہ میں صرف دو کتابیں قابلِ ذکر ہو سکتی ہیں، ایک محمد عبد السلام خان پنشنر سب جج
کی "نسب افاغنہ" ہے، جس کو مصنف نے بڑی محنت اور تلاش و تحقیق سے لکھا ہے، مصنف کے نظریہ کے مطابق
افغان نسلاً اسرائیلی ہیں، اس میں مصنف نے افغانوں کے ہندوستان میں آنے اور "پٹھان" سے موسوم ہونے کا
بھی ضمنی تذکرہ کیا ہے، یہ کتاب ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی ہے، دوسری جناب سید احمد مرتضیٰ کی "صولت شیر شاہی"
ہے جس میں شیر شاہ کے سادہ وقائع زندگی بیان کئے گئے ہیں، یہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی ہے،

(ھ) مختلف زبانوں میں مختلف صوبوں میں مختلف پٹھان صوبہ دار بھی ہوئے ہیں، جنھوں نے کبھی اپنی
خود مختار یا نیم خود مختار حکومتیں قائم کیں، اور ایک دو نسل تک ان کے خاندان میں رہیں، ان کے حالات صوبہ
حکومتوں کی تاریخوں میں ملیں گے جن کی تفصیلات میں جانا بڑا طول امل ہے، کسی خاص مقام یا خاص خاندان
کے متعلق آپ کچھ دریافت کرنا چاہیں تو جواباً کچھ عرض کیا جاسکتا ہے،

"س"

باب التقریظ والانتقاد

سلاطین دہلی کا نظام سلطنت

مؤلفہ جناب اشتیاق حسین قریشی صاحب ام اے، پی ایچ ڈی، (کینٹب) ریڈر شعبۂ تاریخ، دہلی یونیورسٹی، تقطیع اوسط ضخامت ۲۸۸ صفحے، لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت: ۔ سے

ناشر، شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور،

مذکورۂ بالا کتاب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کا وہ مقالہ ہے جو اُنھون نے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لئے کیمبرج یونیورسٹی مین پیش کیا تھا، اس کی اشاعت بھی شیخ محمد اشرف لاہور کی مرہون منت ہے، جو گذشتہ آٹھ سال سے مسلمان مصنفون کی انگریزی تصانیف اعلیٰ طباعت کے ساتھ شائع کر رہی ہین زیر نظر کتاب بھی خوبصورت جلد عمدہ کاغذ اور دیدہ زیب طباعت سے مزین ہے،

اس کتاب مین فاضل مولف نے عہد تیموریہ سے پہلے کے ہندوستانی مسلمان فرمانرواؤن کے نظام سلطنت کے مختلف پہلوؤن کا جائزہ لیا ہے، اور وہ پہلے مسلمان اہلِ قلم ہین جنھون نے اس موضوع پر اس شرح و بسط کے ساتھ قلم اوٹھایا ہے، اس موضوع پر غیر مسلم مورخون نے ضرور لکھا لیکن یا تو وہ اسلامی عہد کی اصلی اسپرٹ کو سمجھنے سے قاصر رہے، یا انھون نے نادان دوست بنکر اس کی بگڑی ہوئی تصویر پیش کی، مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی سعی مشکور سے ایک ایسی کتاب شائع ہوگئی ہے، جس مین تیموریون سے پہلے دور کے ملکی نظم و نسق کا حتی الوسع نہایت صحیح اور واضح خاکہ پیش کیا گیا ہے،

تیموریوں کے مقابلہ میں ان سے پہلے کے سلاطین دہلی کا زمانہ عام طور سے زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا ہے، اسکی وجہ یہ نہیں ہے، کہ اس عہد کے سارے حکمران ادنیٰ درجہ کے تھے، یا ان کا نظام سلطنت اتنا مرتب و مکمل نہ تھا جتنا ان کے بعد کے فرمانرواؤں کا تھا، بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہو کہ ان کے جاہ و جلال اور شوکت و حشمت کو پیش کرنے کے لئے کوئی ابو الفضل، عبد الحمید لاہوری، عبد الباقی نہاوندی اور محمد کاظم پیدا نہ ہوسکا، اور نہ اوس عہد کے حکمرانوں نے اپنے شاندار ملکی اور جنگی کارناموں کو باضابطۂ تحریر مین لانے کی کوشش کی، اسی لئے ان کے دورِ حکومت کی تاریخ بظاہر ویسی پرشکوہ اور پروقار نہیں معلوم ہوتی ہے، جیسی وہ درحقیقت تھی، موجودہ زمانہ کے مسلمان مورخین و محققین کا یہ فرض ہے کہ وہ اُس دور کی سیاسی سطوت اور تمدنی عظمت کی صحیح تصویر پیش کرنیکی کوشش کرین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی زیرِ نظر کتاب اسی فرض کی ادائگی کا پہلا نمونہ ہے،

کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے، ان کے علاوہ چودہ چھوٹے چھوٹے ضمیمے ہین، آخر مین ماخذون کی طویل فہرست ہے، جن کی تعداد تقریباً ۲۳۰ ہے، مقالہ کی تیاری مین ان مین سے ہر ایک سے استفادہ کیا گیا ہے، جو فاضل مؤلف کی غیر معمولی تحقیق و محنت کا ثبوت ہے،

دوسرا اور تیسرا باب سلاطین دہلی کی بادشاہت کی نوعیت پر ہے، یہ موضوع اس لحاظ سے بہت اہم ہے، کہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ سلاطین دہلی مسلمان بادشاہ تو ضرور تھے، لیکن ان کی بادشاہت اسلامی اصولِ حکمرانی پر مبنی نہ تھی، چنانچہ الہ آباد اور عثمانیہ یونیورسٹیون کے بعض ہندو پروفیسرون نے اپنی تصانیف مین اس نقطۂ نظر سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، لیکن وہ چونکہ اسلامی تاریخ کے مذہبی پس منظر سے ناواقف تھے اس لیئے اس عہد کی بادشاہت کے تخیل کا صحیح تجزیہ نہیں کرسکے،

فاضل مؤلف نے زیرِ نظر کتاب مین اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بادشاہت کی بحث مین اسلامی تاریخ کی مذہبی روایات کا ذکر جابجا کیا ہے، لیکن کہین کہین یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ لائق مؤلف نے بعض اسلامی

مسائل کو واضح کرنے کے لئے مسلمان فضلاء وعلماء کو چھوڑ کر آرنلڈ (ص ۴۴، ص ۲۰) جرجی زیدان (ص۲۱۴)
ابن خلدون کریمر (ص ۴۲، ۵۳، ۵۷، و ۶۷) سے استشہاد کیا ہے ان مستشرقین کے حوالہ سے جو باتیں لکھی گئی ہیں
وہ غلط نہیں ہیں، لیکن اسلامی مسائل کی تشریح میں کسی مسلمان مصنف کا غیر مسلم مصنفوں کی تصانیف
کی جانب رجوع کرنا قومی حمیت کے خلاف اور اپنے اسلاف کی علمی بے بضاعتی کا اعتراف ہے۔

ان مباحث میں فاضل مقالہ نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ قانونی حیثیت سے سلاطین
دہلی کی بادشاہت خاندانی وراثت نہ تھی، بلکہ اسلامی روایات کے مطابق بیشتر اصول انتخاب پر مبنی تھی،
چنانچہ (قطب الدین ایبک، التتمش) معز الدین بہرام شاہ، علاء الدین مسعود شاہ، ناصر الدین محمود، کیومرث
شہاب الدین عمر، قطب الدین مبارک شاہ، غیاث الدین تغلق اور (فیروز شاہ) کی تخت نشینی اس کی مثالیں
ہیں، مذہبی حیثیت سے یہ سلاطین اپنے کو خلفائے بغداد کا ماتحت سمجھتے تھے، لیکن عملی حیثیت سے وہ اپنے ذاتی
رجحانات اور قبائلی خصوصیات کی بنا پر ازمنۂ وسطیٰ کے عام حکمرانوں کی طرح استبداد اور مطلق العنانی کی
جانب مائل ہو جاتے تھے، پھر بھی علماء اور امراء کی متحدہ قوتوں کے آگے ان کو اسلامی قوانین کے سامنے سر تسلیم
خم کرنا پڑتا تھا، چنانچہ سلطانہ رضیہ کی معزولی اسی کا نتیجہ تھی، فاضل مؤلف کے یہ نتائج صحیح ہیں لیکن
اس سلسلہ کے مباحث بہت زیادہ مفصل نہیں اگر سلطان رکن الدین، سلطان معز الدین کیقباد، سلطان
شہاب الدین خلجی، سلطان قطب الدین خلجی، خسرو خان، سلطان تغلق شاہ ملقب بہ غیاث الدین تغلق
دوم، سلطان ابو بکر شاہ تغلق اور ابو الفتح مبارک شاہ وغیرہ کے قتل پر روشنی ڈالی جاتی، تو امراء اور
جمہور کے مزید استیلاء کا اندازہ ہوتا، اس میں وہ خیالات بھی نظر انداز کر دیئے گئے ہیں جو ضیاء الدین
برنی نے اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں بلبن، بغرا خان اور محمد تغلق کی زبانی بادشاہت کے اوصاف
اور اصول حکمرانی کے متعلق لکھے ہیں، شمس سراج عفیف نے بھی اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں فیروز شاہ
کے تخیل بادشاہت کا ذکر جا بجا کیا ہے، لیکن اس کا حوالہ بھی فاضل مؤلف کی کتاب میں نہیں، حالانکہ

سلاطین کے خیالات کی روشنی میں یہ نکتہ واضح ہوسکتا ہے کہ بادشاہت کے بارہ میں وہ اسلامی و غیر اسلامی روایات سے متاثر تھے، مگر ملکی مصالح، زمانہ کے حالات اور عملی دقتوں کے باعث وہ اپنے کو شہ اسلامی روایات کا پابند نہیں بنا سکے، پھر بھی اس عہد کے طرزِ حکومت میں اسلامی روح اور اسلامی ار غیر معمولی طریقہ پر موجود تھے، اس پہلو کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ صر موروخون کی دیانت اور سچائی میں شبہ نہیں لیکن وہ اس دور کے تھے جب کہ سپہگری امتیازی وعیت سمجھی جاتی تھی، اور عموماً مسلمان اپنا جوہر میدانِ جنگ میں دکھانا فخر سمجھتا تھا، اہلِ قلم میدان رزار میں شریک نہ ہوسکتے تھے، تو اپنی سپہگری کے سارے جذبات کاغذ کے صفحات پر منتقل کرنے کی کوشش تے تھے، اسی لئے ان کی ساری تاریخیں معرکہ آرائی اور ہنر آزمائی کا مرقع ہیں، جس کے مطالعہ سے خیال آ وتا ہے، کہ اس عہد کی تاریخ محض کشت و خون کی داستان ہے، جو صحیح نہیں، موروخون کے اس اتی رجحانات کی بنا پر تاریخ کے بہت سے اہم رخ پر پردے پڑ گئے ہیں، اگر ان کو ہٹایا جائے تو ہمارے لذشتہ فرمانرواؤں اور اُن کے دورِ حکومت کی تصویر اس سے بہت مختلف نظر آئے، جیسی عام طور سے نظر آتی ہے، اسی کوشش کا یہ نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے سلاطین دہلی کی بادشاہت کا جو مرقع پیش کیا ہے، وہ اس سے بالکل مختلف ہے، جو اب تک پیش ہوتا رہا ہے، لیکن اس مرقع کو اور بھی زیادہ روشن اور واضح کرنے کی ضرورت ہے، جو امید ہے کہ کسی اور اہلِ قلم کے ذریعہ سے انجام پا جائیگا۔

چوتھا باب شاہی محلسرا پر ہے، جس میں زیادہ تر اُن شاہی ملازمون کی تفصیل ہے، جو سلاطین کی ذات خاص سے وابستہ تھے، ان میں سے "وکیل در" اور امیر حاجب کے فرائض بڑی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں، الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے وکیل در کو شاہی محل کے دروازوں کا کلید بردار بتایا ہے، (قرونہ ٹرکس، ہسٹوری پرشا وص ۲۶۲) پروفیسر صاحب کو در کے لفظ سے غلط فہمی ہوئی ہے، حالانکہ در "اصل میں دار" بمعنی گھر ہے، اس لفظی تشریح کے بعد اس عہدہ کی نوعیت سمجھ میں آجاتی ہے، زیر نظر

کتاب کے مولف کی یہ توضیح بہت صحیح ہے، کہ وکیل در مجلسرا کے اندر سلطان کا نائب ہوتا تھا، اور وہ اپنے گوناگون فرائض اور اثر و اقتدار کے لحاظ سے غیر معمولی سیاسی اور معاشرتی اہمیت رکھتا تھا، پروفیسر ایشوری پرشاد نے "امیر حاجب" اور "باربک" کو علحدہ علحدہ عہدہ بتایا ہے، لیکن ڈاکٹر اشتیاق نے دونون عہدون کو ایک ہی قرار دیا ہے، جیسا کہ ذیل کی عبارت سے بھی ظاہر ہوگا،

"سلطان محمد سلطان فیروز شاہ را نائب امیر حاجب گردانید و نائب باربک خطاب کرد"۔

(عفیف ص ۴۴۲)

پروفیسر ایشوری پرشاد "سر جاندار" کے عہدہ کو بھی صحیح نہین سمجھے ہین، پروفیسر صاحب کا یہ خیال ہے کہ "سر جاندار" سلاطین کے سرون پر مگس رانی کے لئے چونری ہلایا کرتے تھے، چنانچہ اپنی انگریزی عبارت مین لفظ چونری ہی استعمال کیا ہے، معلوم نہین چونری کا لفظ کس ماخذ سے لیا گیا ہے، یا خود پروفیسر صاحب کا اضافہ ہے، "سر جاندار" یا "سر جاندار" دراصل جاندار کے سردار کا لقب تھا، اور جاندار جیسا کہ ڈاکٹر اشتیاق نے بتایا ہے سلطان کی ذاتی محافظت کا دستہ ہوتا تھا، جو اس کے دائین بائین رہتا تھا اسی لئے دونون جانب کے سردارون کو سر جاندار میمنہ اور سر جاندار میسرہ کہتے تھے، یہ میدان جنگ مین بھی شریک ہوتے تھے، پروفیسر ایشوری پرشاد نے میر مجلس کی بھی تشریح صحیح نہین کی ہے، میر مجلس کو دربار کا سب سے بڑا عہدہ دار بتایا ہے، حالانکہ دربار کا سب سے بڑا عہدہ دار امیر حاجب ہوتا تھا، ڈاکٹر اشتیاق حسین نے میر مجلس کو سلاطین کی نجی مجلسون (مجلس عیش) کا سردار بتایا ہے، اور یہی صحیح ہے،

پروفیسر ایشوری پرشاد نے ابن بطوطہ کے حوالہ سے رسول دار یا حاجب الارسال کو ایک علحدہ عہدہ قرار دیا ہے، میرا خیال ہے کہ ابن بطوطہ نے امیر حاجب ہی کے لئے یہ دو مترادف الفاظ لکھے ہین، چھوٹے چھوٹے عہدیدارون کے سلسلہ مین پروفیسر ایشوری پرشاد نے ابن بطوطہ کے حوالہ سے ایک عہدہ Vazis. Fal Hu Bo لکھا ہے، سفرنامۂ ابن بطوطہ کے مصری اڈیشن اور

اس کے اردو ترجمہ مین یہ عہدہ نظر سے نہین گذرا، پروفیسر صاحب نے انگریزی مین عہدہ کا نام بھی صحیح نہین لکھا ہو، ڈاکٹر اشتیاق نے بھی اس عہدہ کا ذکر نہین کیا،

مسالک الابصار کے مصنف نے "شمقدار" کی ایک اصطلاح استعمال کی ہے، وہ لکھتا ہے، کہ منجملہ شاہی ملازمین کے شمقدار کی تعداد ایک ہزار تھی، اس عہد کی فارسی تاریخ مین یہ اصطلاح استعمال نہین ہوئی ہے شاید اسی لئے ڈاکٹر اشتیاق نے اس عہدہ کو نظر انداز کر دیا ہے، پروفیسر ایشوری پرشاد نے شمقدار کا ترجمہ Sandal - bearer کیا ہے، معلوم نہین یہ ترجمہ کس لغت کی سند پر کیا گیا ہے؟

ڈاکٹر اشتیاق حسین نے اس باب کے آخر مین دربار کے آداب کے ذکر مین اختصار بلکہ بخل سے کام لیا ہے، ابن بطوطہ نے محمد تغلق کے دربار کی شان وشوکت کو بڑی دلآویزی سے لکھا ہے جس سے اس عہد کے تمدن و ثقافت اور شاہی دبدبہ و حشمت کا نقشہ سامنے آجاتا ہے،

پانچوان باب "وزراء" پر ہے، الہ آباد یونیورسٹی کے لائق پروفیسر ڈاکٹر ترپاٹھی نے بھی اپنی کتاب Some aspects of Muslim Administration مین اس موضوع پر بحث کی ہے، لیکن ان کی بحث بہت سرسری ہے، ڈاکٹر اشتیاق نے وزراء کے فرائض اور وزارت کے مختلف شعبون کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جس سے اس عہد کے نظام سلطنت کی خوبیون کو سمجھنے مین بڑی مدد ملتی ہے، ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وزارت کے دفاتر کی تشکیل موجودہ دور کے دفاتر سے کس قدر مشابہ تھی، مثلاً دیوان وزارت یعنی محکمۂ مالیات کے وزیر کا معاون نائب وزیر ہوتا، اس کے نیچے چار بڑے عہدیدار ہوتے تھے، مشرف ممالک، مستوفی ممالک، ناظر اور وقوف، مشرف ممالک پورے ملک کا اکونٹنٹ جنرل اور مستوفی ممالک آڈیٹر جنرل تھا، ناظر عمال سلطنت کی جمع بندی کو جو وہ مشرف ممالک کے دفتر مین داخل کرتے، جانچتا یعنی آڈٹ کرتا تھا، وقوف مملکت کے سارے اخراجات کی نگرانی کرتا تھا، ان عہدیدارون کے علٰحدہ علٰحدہ دفاتر تھے، ہر دفتر مین قریب تین سو آدمی کے کام کرتے تھے،

چھٹا باب مالیات پر ہے، جس میں یہ دکھایا گیا ہے، کہ سلاطین دہلی کی یہ کوشش برابر جاری رہی کہ مختلف ٹیکس اسلامی شرع کے مطابق ہوں، کبھی کسی وجہ سے غیر شرعی ٹیکس عائد ہو جاتے، تو بہت جلد وہ موقوف بھی کر دیئے جاتے تھے، تاریخ فیروز شاہی، (عفیف) فتوحات فیروز شاہی اور سیرت فیروز شاہی میں ایسے ٹیکس کے نام بکثرت گنائے گئے ہیں، جو غیر شرعی ہونے کی وجہ سے روک دیئے گئے تھے، ایک ضمیمہ میں فاضل مؤلف نے ان ٹیکسوں کی فہرست دی ہے جن کا عائد کرنا ارتھا شاستر نے قانونی طور پر جائز قرار دیا ہے، ان ٹیکسوں کی تعداد ۴۵ ہے، اسی ضمیمہ میں ان ٹیکسوں کی بھی فہرست ہے جو سلاطین کی حکومت میں غیر شرعی سمجھے جاتے تھے، ان کی تعداد ۲۰ ہے، ان میں دو چار کو چھوڑ کر سارے ٹیکس وہ ہیں جن کو ہندوؤں کے سب سے بڑے ماہر قانون اور سیاست داں کوٹلیا یعنی مصنف ارتھا شاستر نے حکومت کا جائز حق قرار دیا ہے، مگر سلاطین دہلی کی حکومت میں ان کا عائد کرنا شرعی جرم تھا، ڈاکٹر اشتیاق کے اس تجزیہ کے بعد پروفیسر ایشوری پرشاد کو شاید اپنی اس رائے میں ترمیم کرنی پڑے گی، کہ سلاطین دہلی مذہبی اور اصولی حیثیت سے ہندوؤں پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس کا بار ڈال کر ان کو محض لکڑ ہارے اور سقے بنا کر رکھنا پسند کرتے تھے، (قرونہ ٹرکس ص ۲۵۵، ۲۰۵)

ساتواں باب فوج پر ہے، جو دوسرے ابواب کی طرح پوری تحقیق و محنت کے ساتھ لکھا گیا ہے، چنانچہ اس میں فوجی نظام کی تمام جزوی اور عمومی تفصیلات موجود ہیں، البتہ اس باب میں ہم سواروں کی بعض اصطلاح کو سمجھنے سے قاصر رہے، فاضل مؤلف رقمطراز ہیں کہ احتیاط کی خاطر سواروں کے لئے فاضل گھوڑے رکھے جاتے تھے، اسی لئے شہسواروں کی قسمیں تھیں، مرتب ایک اسپہ اور دو اسپہ یعنی بعض سوار دو گھوڑے، بعض ایک اور بعض کچھ بھی نہیں رکھتے تھے، (ص ۱۳۵) اس تصریح سے یہ اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ آخر مرتب کو گھوڑوں کی کتنی تعداد رکھنے کا حق تھا، اس سلسلہ میں لائق مؤلف نے کتاب کے آخر میں جو ضمیمہ دیا ہے، اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے، کہ (۱) مرتب (۲) سوار

(۳) دو اسپہ اور شاید یک اسپہ بھی شہسواروں کے علی الترتیب مختلف درجے تھے، تو کیا ان کے لئے گھوڑوں کی مقررہ تعداد رکھنے کی کوئی پابندی نہ تھی،

فوجوں کی تنخواہ کے سلسلہ مین فاضل مؤلف نے عہدِ غلامان کی فوجون کے نظام تنخواہ کو نظرانداز کر دیا ہے، اس عہد مین فوجون کو تنخواہ مین نقد کے بجائے جاگیر (دیہہ ہاے) دی جاتی تھی، شمس الدین التمش نے دو ہزار سوارون کو دوآبہ کے گاؤن تنخواہ کے بدلے دیدیئے تھے، ان سوارون نے ان گاؤن کو موروثی جائداد بنا لیا تھا، اور وہ اقطاع داران شمسی کہلاتے تھے، بلبن نے اپنے زمانہ حکومت مین اس بے اعتدالی کو پسند نہین کیا، اور اوس نے اقطاع داران شمسی کی تین قسمین مقرر کین، اول جو پیرانہ سالی کے سبب کسی کام کے لائق نہیں رہے تھے، ان کی تنخواہ چالیس یا پچاس ٹنکہ مقرر کی، اور ان کے گاؤن یعنی جاگیر کو خالصہ مین داخل کرلیا، دوم جو اقطاع دار جوان اور ادھیڑ تھے، ان کی تنخواہ حسب استعداد مقرر ہوئی، ان کے گاؤن اون سے واپس نہین لئے گئے، لیکن ان کی تنخواہ ادا کرنے کے بعد جو آمدنی پس انداز ہوتی، وہ شاہی اہلکارون کے سپرد ہوتی تھی، قسم سوم بیواؤن اور یتیمون کی تھی، جو اپنے غلامون کو گھوڑون اور ہتھیارون کے ساتھ جنگی خدمت کے لئے بھیجا کرتے تھے، ان سے گاؤن واپس لیکر ان کی تنخواہین مقرر کر دی گئین، اس حکم کا جاری ہونا تھا، کہ شمسی اقطاع دارون مین کھلبلی پڑ گئی، اور انھون نے ملک الامرا فخر الدین کوتوال کی وساطت سے یہ حکم منسوخ کرایا (برنی ص ۶۱، ۶۴) مگر بلبن کے عہد مین بھی جاگیر دینے کا رواج قائم رہا، (برنی ص ۲۹)

آٹھوان باب نظام عدل کے بیان سے شروع ہوتا ہے، جس کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوگا کہ اس عہد مین عدل و انصاف کی عدالتون کی تنظیم کس قدر باضابطہ تھی، پروفیسر ایشوری پرشاد نے بھی اپنی کتاب "قرونہ ٹرکس" مین اس تنظیم کی تفصیلات لکھی ہین، ان تفصیلات کے لکھتے وقت پروفیسر صاحب اس عہد کے نظام عدل کی خوبیون سے متاثر معلوم ہوتے ہین، مگر یکایک اپنی آنکھون پر رنگین عینک

لکھ کر لکھتے ہین، کہ اس عہد کی سزائین وحشیانہ تھین کسی ضابطہ کی پابندی نہ تھی، شہادت کا کوئی قانون نہ تھا، کلام پاک کے قوانین کی پابندی کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا، سلطان جو چاہتا کرتا تھا، (ص ۲۷۲) کسی سلطان کے بعض اضطراری اور اتفاقی افعال کی نظیر پیش کرکے پورے عہد کے متعلق ایک عمومی رائے قائم کر لینا ایک دیانتدار اور ذمہ دار مورخ کا شیوہ نہین، لیکن بہرحال اس سلسلہ مین پروفیسر ایشوری پرشاد نے جو غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، وہ ڈاکٹر اشتیاق کی کتاب کے مطالعہ سے زائل ہو جائیگی،

اسی باب مین اس عہد کے محکمۂ احتساب اور پولیس کا بھی ذکر ہے جس کے مطالعہ کے بعد یہ ظاہر ہوگا کہ سلاطین دہلی میدان کارزار کی رزم آرائیون اور مجلس نشاط کی بزم آرائیون کے ساتھ ساتھ رعایا کی مو[اشرتی] اخلاقی اور مذہبی حالات کو سدھارنے کے لئے کیا کیا تدبیرین کرتے رہے،

نوان باب سلاطین کی تعلیمی، علمی، مذہبی، اور فنی سرپرستی پر ہے، یہ موضوع مقالہ کے مباحث سے خارج اس لئے فاضل مولف کا اس پر تبصرہ اجمالی ہے، لیکن اس اجمالی تبصرہ سے بھی سلاطین کے کلچرل ذوق، دربار کی علمی فضا، اور ملک کے تمدنی حالات کا صحیح اندازہ ہوگا، سلاطین کی علمی سرپرستی کی بعض مثالیں بہت ہی [دلچسپ] ہین، ان مین سے ایک دو ملاحظہ ہون،

عبید زاکانی جب دہلی وارد ہوا، تو اوس نے سلطان محمد بن تغلق کی شان مین ایک قصیدہ لکھا، [دربار] مین قصیدہ کا پہلا شعر پڑھا تو سلطان اس کو سنکر اتنا متاثر ہوا، کہ بول اٹھا، بس! اپنے بقیہ اشعار نہ پڑھو، تمھارے تمام اشعار کے انعام کے لئے میرے خزانے کے روپے کافی نہین، اس کے بعد حکم دیا کہ پہلے شعر کے [صلہ] مین شاعر کے سر سے پاؤن تک اشرفیون کی تھیلیان جمع کرکے اس کے حوالہ کر دی جائین،

ایک بار سلطان اسلام شاہ سوری مخدوم الملک شیخ عبد اللہ کی معیت مین ایک تنگ گلی سے گذر رہا تھا، کہ ایک مست ہاتھی دونون کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا، شیخ عبد اللہ پیشقدمی کرکے اسلام شاہ سوری کے آگے بڑھنا چاہتے تھے، مگر اسلام شاہ نے ان کو روکا، شیخ عبد اللہ نے فرمایا کہ اے شہنشاہ وقت مجھ ہی کو

جانے دیجئے، آپ ہلاک ہو جائیں گے، تو ساری مملکت میں انتشار پیدا ہو جائے گا، لیکن سلطان نے جواب دیا، "مخدوم الملک! میں اگر ہلاک ہو گیا تو میری جگہ نولاکھ افغان پر کریں گے، مگر آپ جان بحق ہوئے تو آپ کا کوئی ثانی صدیوں میں پیدا نہ ہو سکے گا"

دسواں باب صوبجاتی اور مقامی حکومتوں پر ہے، پروفیسر ایشوری پرشاد نے بھی اپنی کتاب میں یہ عنوان قائم کیا ہے، لیکن یہ موضوع ان کی نظروں میں شاید اہم نہیں تھا، اس لئے صرف دو صفحے لکھ کر اپنی اس تبصرانہ رائے کا اظہار کیا ہے، کہ آپس کی سازش، رشک اور حسد کی وجہ سے صوبوں میں اچھی حکومت کا قائم رہنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور تھا، بدانتظامی اور ظلم وستم کا عام رواج تھا، امن و امان میں ہر طرح کا انتشار تھا، (ص ۲۹۵) لیکن امید ہے کہ اس رائے کی تردید ڈاکٹر اشتیاق کی کتاب کے مذکورہ بالا باب کے مطالعہ سے ہو جائیگی،

ڈاکٹر اشتیاق نے تاج المآثر کے حوالہ سے صوبوں کے والیوں کے اصولی فرائض یہ بتائے ہیں کہ وہ خدا کے منکروں اور مشرکوں کے فریب اور دغا سے اپنے سپاہیوں، لشکریوں، ملازموں اور محرروں کی حفاظت کریں، تمام لوگوں کی توقعات کو پورا کرنے کی خاطر ہر قسم کی صعوبتوں کو برداشت کریں، وہ مالی اور جنگی معاملات میں اعلیٰ درجہ کے تدبر سے کام لیں، وہ فیاضی اور کار خیر کی روایات کو برقرار رکھیں تاکہ ان کی نیک نامی ازل تک قائم رہے، وہ شاہراہوں، سڑکوں، پلوں، گھاٹوں اور دوراستوں کے موڑ پر خاص نظر رکھیں، کیونکہ اس سے حکمرانی میں مدد ملتی ہے، وہ تاجروں کے ساتھ اپنا سلوک اچھا رکھیں، تاکہ وہ انکی شہرت کو پھیلانے میں معاون ہوں، وہ بلا امتیاز لوگوں اور تاجروں کی ضروریات کو پورا کرتے رہیں،

اس اصول کو عمل میں لانے کے لئے مختلف محکمے اور ان کے مختلف عہدیدار تھے، جن کی تفصیل ڈاکٹر اشتیاق کی کتاب کے باب ہذا میں ملے گی، عہدیداروں کی خیانت اور بداعمالی کے لئے سخت سے سخت سزائیں مقرر تھیں، محمد تغلق کے عہد میں دیوانِ استخراج کے نام سے اس کے لئے ایک خاص محکمہ بھی قائم ہوا، اس سے انکار نہیں کہ صوبوں میں وقتاً فوقتاً انتشار و اختلال، سرکشی اور بغاوت کے واقعات پیش آتے رہے لیکن

یہ تو سلطنت کے لوازم ہیں جن سے دنیا کی کوئی حکومت خالی نہیں، ان مثالوں سے انتظامی امور کی اصلی سپرٹ کو ایک بدنما صورت میں پیش کرنا محض عصبیت کا نتیجہ ہے، ڈاکٹر اشتیاق رقمطراز ہیں :

"دہلی کے سلاطین کی یہ کوشش رہی کہ وہ اچھے حکمران ثابت ہوں، ان میں کیقباد کی طرح بھی ایک سلطان تخت نشین ہوا جس کا مقصد صرف عیش و طرب تھا، تاریخ کے صفحات بعض وحشیانہ مظالم کی مثالوں سے بھی آلودہ ہیں، ازمنہ وسطیٰ میں تین صدیوں سے زیادہ ان سلاطین نے حکمرانی کی ...... اتنے طویل دور میں اس کی امید کرنا کہ تمام سلاطین خود غرض اور خودآرا نہ ہوتے، گویا انسانیت کو ایک مکمل نمونہ کے مطابق دیکھنے کی توقع کرنا ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سلاطین کا جو اصول کارفرما تھا، وہ ان کی فیاضی اور کریم النفسی تھی، وہ اپنے کو خلق اللہ کا نگہبان سمجھتے تھے، اسی لئے اس کی خدمت اور حفاظت کرنے میں کوشاں رہے، اس بیان کی سچائی ان سلاطین کے رفاہ عام کے کاموں مثلاً شفاخانوں، خانقاہوں، لنگر خانوں، غریبوں کے لئے باورچی خانوں، قحط کے موقع پر مختلف تدابیر، عہدیداروں کو رعایا کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحتوں سے ظاہر ہوگی، رعایا میں سے ایک عاجز اور ادنیٰ فرد بھی سلطان کے یہاں رسائی حاصل کر سکتا تھا، اس کے ملازم یا عمال کسی کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرتے، تو اس کی اطلاع خفیہ خبر رسانی کے ذریعہ سے اس کے پاس پہونچ جاتی، سلطنت کے ہر حصہ میں جابروں کے مقابلہ میں کمزوروں کے تحفظ کے لئے عدل و انصاف کا محکمہ تھا، سلطان اپنے حوصلہ کی تکمیل اسی میں سمجھتا کہ بھیڑیا اور بھیڑ کا بچہ انصاف کے ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہوں، وہ اگر اس کی تکمیل میں ناکام رہتا تو اسکی وجہ اس کے کارکنوں کی نالائقی یا عدول حکمی ہوتی۔"

یہاں پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اسلامی عہد کے راعی کی یہ مراعات ہندو رعایا کے لئے بھی تھیں؟ اس کا جواب زیر نظر کتاب کے آخری باب میں ہے، جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس عہد میں ہندو مذہبی، سیاسی

ثقافتی، اقتصادی اور معاشرتی حیثیت سے اپنے کو کس قدر مطمئن اور محفوظ پاتے تھے، چنانچہ ان کے جذبات اور تاثرات کا اظہار ان کی بعض کتابوں، قصے کہانیوں اور کتبوں سے بھی ہوتا ہے، مثلاً ۱۳۲۸ھ کا ایک کتبہ ہے جس میں کچھ سنسکرت اور کچھ ہریانہ کی مقامی زبان میں سلاطین دہلی کی مدح میں عبارتیں منقوش ہیں، اس میں بلبن کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"اس کی عظیم المرتبت اور جلیل القدر حکومت کے زمانہ میں اس کی خوشحال مملکت کے ہر طرف گوڑ سے غزنہ تک ڈر ویڈا اور رامیشورم ہر سمت زمین پر بہار کا حسن چھایا رہتا ہے، اس کی فوجوں کی وجہ سے تمام لوگوں کو امن و تحفظ حاصل ہے، سلطان اپنی رعایا کا ایسا نگہبان ہو گیا ہے کہ وشنو دنیا کے تفکرات سے آزاد ہو گئے ہیں، اور دودھ کے سمندر میں جا کر محو خواب ہیں۔"

ایک دوسرے کتبہ میں سلطان محمد تغلق کو دنیا کے تمام حکمرانوں کا طغرائے زرین کہا گیا ہے،

یہ تقریظ طویل ہو گئی ہے، مگر اس طوالت کے باوجود ناظرین کو زیرِ نظر کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی ہوگا، اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے، کہ سلاطین دہلی کے عہد پر اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں یہ کتاب اپنی تحقیق و تدقیق کی نوعیت، اسلوب بیان کی متانت اور طرزِ ادا کی سنجیدگی کے لحاظ سے سب سے زیادہ امتیازی حیثیت رکھتی ہے، "ص ع"

مداوا

مرتبہ جناب فرقت کاکوروی

ترقی پسند ادب کے نام سے اردو میں جس قسم کے پست اور مخرب اخلاق لٹریچر کی اشاعت ہو رہی ہے، اسکی اصلاح و تدارک کے لئے بلا تفریق قدیم و جدید دونوں طبقوں کے سنجیدہ اہل علم اور اصحاب قلم نے مضامین لکھے ہیں، کتاب میں ان تمام مضامین کو جمع کر دیا گیا ہے اور مؤلف نے ترقی پسند مصری شاعری کا اسی کے رنگ میں نہایت دلچسپ اور کامیاب خاکہ اڑایا ہے، کتاب ادبی اور اصلاحی دونوں حیثیتوں سے پڑھنے کے لائق ہے، ضخامت ۱۸۰ صفحے، قیمت للعہ

مطبوعات جدیدۃ

Geographical Factors in Arabian Life and History

مؤلفہ شیخ عنایت اللہ ایم اے (پنجاب) پی ایچ ڈی (لندن)

عربی لکچرر، گورنمنٹ کالج لاہور تقطیع اوسط، ضخامت ۱۵۰ صفحے، لکھائی چھپائی اعلیٰ، قیمت للعہ، ناشر شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور،

مذکورۂ بالا کتاب جناب شیخ عنایت اللہ صاحب کا وہ مقالہ ہے جو انھون نے عربی ادب مین ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لندن مین پیش کیا تھا، اس مین فاضل مؤلف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہو کہ عرب کے باشندے اپنے اقتصادی، سیاسی، تمدنی اور معاشرتی امور مین وہان کے جغرافیائی حالات سے کس قدر متأثر ہین، اس مین زیادہ تر بدؤون کی زندگی کے مختلف پہلوؤن کا مطالعہ کیا گیا ہے، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو جو عربون کی حضری زندگی کے مرکز ہین، فاضل مؤلف نے اپنی بحث مین اس لئے شامل نہین کیا ہو کہ ان کے خیال مین ان دونون مقامات مین ان کے بیرونی تعلقات کی بنا پر خالص عرب کے جغرافیائی مظاہر بہت کم ہین یمن کے علاقہ کو بھی خارج کر دیا گیا ہے کیونکہ مؤلف کا بیان ہے کہ عرب کی حضری زندگی کی مثالین وسط عرب کے باشندون مین سے پیش کی گئی ہین، ان حصون کے خارج ہوجانیکے بعد فاضل مؤلف کا دائرۂ تحقیق محدود ہوگیا ہو، کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربون کی سیاسی تاریخ مین ان کے جغرافیائی حالات کی وجہ سے جو سہولتین پیدا ہوتی رہی ہین، ان کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہوگا لیکن یہ بحث صرف چھ سات صفحون مین ختم کردی گئی ہے، اس مقالہ مین جو چیز سب سے زیادہ کھٹکتی ہے، وہ اس کا ماخذ ہے، جس مین مقدمۂ ابن خلدون کے سوا ساری کتابین

یورپین مصنفون کی ہین، کہین کہین کلام پاک کا حوالہ البتہ آگیا ہے، معلوم نہین لائق مؤلف نے کن اسباب کی بنا پر عرب کے حالات مین عربی ماخذون کو نظرانداز کرکے صرف یوروپین مصنفون ہی کا مرہون منت ہونا پسند کیا، یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حجاز کے موجودہ باشندے کیا کھاتے ہین اسکو ڈوٹی اور کارل راؤسن کے حوالے سے بتایا گیا ہے، "وہ کیا پہنتے ہین" اس کے لئے ہک ہارٹ اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی سند پیش کی گئی ہے، "وہ کس طرح گھرون اور خیمون مین رہتے ہین" اس پر روشنی میوسل کے ذریعہ سے ڈالی گئی ہے، "ان کے باغ کس قسم کے ہوتے ہین، وہ کنوئین کس طرح کھودتے ہین، وہ کون کون سے جانور پالتے ہین" ان کی تفصیل ہریسن فلبی اور برٹرام ٹامسن کی مدد سے لکھی گئی ہے، بابل اور نینوا کی طرح حجاز کا تمدن دنیا سے مٹ نہین گیا ہے، یا وہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کا کوئی حصہ نہین ہے، جس کے حالات یورپین سیاحون اور مصنفون کی کتابون کے اوراق مین ڈھونڈنے کی ضرورت ہے، ان پر اعتماد کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ اس مقالہ مین عربون کی تصویر کہین کہین بہت مکروہ ہوگئی ہے، ایک جگہ لکھتے ہین کہ "عرب کے بدو صحرائی چوہے، ساہی، لومڑیان، بھیڑیے، لکڑبگے حتی کہ چیل کوے اور الو تک کھاتے ہین" مولف کے ان معلومات کا سرچشمہ ڈوٹی کی کتاب ARABIA DESERTA ہے،

ڈگری کے لئے انگریزی اساتذہ کی نگرانی مین اس قسم کی تحقیقات مین مضائقہ نہین، مگر علمی تحقیق کی حیثیت سے اس کے شائع ہونے کے بعد اس کی نوعیت بدل جاتی ہے، اور مؤلف کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے خصوصاً جب کہ اس مقالہ کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی بتایا گیا ہے، کہ اس کے مطالعہ سے عربون کی زبان، لٹریچر اور تاریخ کے سمجھنے مین بڑی مدد ملے گی، لیکن اس مین یورپین مصنفون کے حوالہ سے عربون کی زندگی کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس کو اس مقصد سے بظاہر کوئی خاص تعلق معلوم نہین ہوتا، فاضل مؤلف کو اگر واقعی حجاز کے باشندون کی زندگی کی اصلی اور سچی تصویر پیش کرنی تھی تو انھین اس کے لئے عربی تصانیف کو ماخذ بنانا چاہئے تھا اگر وہ اس تحقیق کے سلسلہ مین لندن جاتے ہوئے تھوڑے دنون کے لئے حجاز ٹھہر جاتے تو ایک مذہبی فریضہ سے بھی سبکدوش ہوجاتے، اور عینی مشاہدہ کے بعد عربون کی زندگی کی تصویر یوروپین

مصنفین سے زیادہ بہتر اور صحیح پیش کرسکتے، اور ہم "خرما" و ہم "ثواب" دونوں حاصل ہوجاتا، "م س ع"

ابن خلدون کی عظمت، از جناب نگہت شاہجہان پوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ :- علی بھائی شرف علی اینڈ کمپنی لمیٹڈ تاجران کتب ۲۶۳ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی نمبر ۳،

مورخ ابن خلدون سے پہلے تاریخ صرف واقعات ماضی کا منتشر و پراگندہ مجموعہ سمجھی جاتی تھی، وہ پہلا شخص ہے جس نے تاریخی واقعات میں یکسانی کا نظریہ پیش کیا، اور قوموں اور حکومتوں کے عروج وزوال اور تغیر و انقلاب کے اسباب وعلل کا سراغ لگایا، اقوام عالم کے خصائص اور اختلاف طبائع کے طبیعی وجغرافی اسباب بیان کئے، اور انسانی طبقات کی تقسیم اور ان کے انقلاب وتغیر کے معاشی اسباب کا پتہ چلایا، اور بتایا کہ قوموں اور حکومتوں کو عروج وزوال اور تغیر وانقلاب کے جو مختلف دور پیش آتے ہیں، وہ اتفاقی نہیں ہوتے، بلکہ خاص اسباب وعلل کا نتیجہ ہوتے ہیں، جن کے مطابق قومیں بنتی اور بگڑتی اور گرتی اور ابھرتی ہیں، اور اپنے مشہور مقدمہ میں اس کا مرتب فلسفہ پیش کیا، اس حیثیت سے اس کا مقدمہ دنیا کی مشہور اور بے مثل کتابوں میں ایک ممتاز کتاب ہے، اس کے بہت سے نظریوں نے اب مستقل فن کی حیثیت حاصل کرلی ہے، اور بعض وہ فنون جو دور جدید کی ایجاد سمجھے جاتے ہیں، اس کا بنیادی اور ابتدائی تصور ابن خلدون کے مقدمہ میں موجود ہے اس لئے مشرق سے زیادہ مغرب نے ابن خلدون کی قدر کی، اور اپنی زبانوں میں تاریخ ابن خلدون کے ترجمے کرکے اور اسکے فلسفہ پر مضامین اور کتابیں لکھ کر اسکی عظمت کا عملی اعتراف کیا، لائق مولف نے اس کتاب میں علماے مغرب کے ان اعترافات کو جمع کردیا ہے، کتاب کے شروع میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے دیباچہ اور مؤلف کے قلم سے اسلامی تاریخ کی اہمیت پر تبصرہ ہے، اور آخر میں مختلف زبانوں میں تاریخ ابن خلدون کے تراجم کی فہرست دیدی ہے، کتاب گو مختصر ہے لیکن مفید ہے،

نگارستان از جناب مولانا ظفر علی خان تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۵ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر،

قیمت مجلد للعہ پتہ: ... پبلشر و ناشر چوک انارکلی لاہور،

آج سے چند سال پہلے بہارستان کے نام سے مولانا ظفر علی خان کے کلام کا ایک ضخیم مجموعہ شائع ہو چکا ہے،
نگارستان کے پیکر میں دوسرا مجموعہ جلوہ گر ہوا ہے، اس مجموعے میں مذہب، سیاسیات، قومیات اور دوسری متفرق و اتفاقی
خیالات اور جذبات و تاثرات پر چھوٹی بڑی ۲۰۰ نظمیں ہیں، مولانا کی شاعری تعارف و تحسین سے مستغنی ہے، بلا شائبہ مبالغہ
کہا جاسکتا ہے کہ قادر الکلامی میں کوئی ان کا حریف نہیں، ان کا اشہب فکر ہر میدان میں یکساں جولانی دکھاتا ہے
اتنے گوناگون اور متنوع موضوعون پر طبع آزمائی کی مثال دوسرے شعرا میں نہیں مل سکتی، مشکل سے مشکل قوافی
اور سنگلاخ سے سنگلاخ زمینون میں ان کے رہوار فکر کی سبک خرامی اور کلام کی روانی اور برجستگی میں فرق نہیں آتا، وہ
الفاظ استعمال نہیں کرتے، ان سے کھیلتے ہیں، مشکل سے مشکل قافیون کو نگینہ کی طرح جڑ دیتے ہیں، الفاظ اور خیالات دونون حیثیتون سے
ان کے کلام کی بوقلمونی کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، اس میں بال جبریل کی پرواز اور انفاس عیسی کی جان بخشی بھی ہے،
اور طنز و ظرافت کی چٹکیاں اور پھبتیاں بھی، طوفان کا جوش و خروش بھی ہے، اور نسیم سحر کی مستانہ خرامی بھی، کوہسارون
کی سنگلاخی بھی ہے، اور حریر و پرنیان کی نرمی و ملاحت بھی، باد سموم کی حرارت اور لپٹ بھی ہے، اور قطرات شبنم کی ٹھنڈک بھی، تاہم
ہر کہ اتنے متنوع بلکہ متضاد خیالات و جذبات میں اگر کہیں ناہمواری پیدا ہو جائے تو تعجب خیز نہیں، چنانچہ اس مجموعہ میں
ہر رنگ کے نمونے موجود ہیں، امید ہے کہ ارباب ذوق اس تازہ خوان ادب سے لطف اندوز ہون گے،

تاریخ امارت مولفہ جناب مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت
و طباعت معمولی، قیمت :- عہ پتہ مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ،

اس کتاب میں مولینا عبد الصمد صاحب رحمانی نائب ناظم امارت شرعیہ صوبہ بہار نے امارت شرعیہ کی تاریخ قلمبند فرمائی ہے،
کے شروع میں ہندوستان میں امارت شرعیہ کے قیام کی ضرورت و اہمیت پر بحث اور اسکے لیے مولانا اسمعیل شہید سے لیکر حضرت شیخ الہند کے
دور تک اکابر علماء کی مجاہدانہ کوششون کا مختصر ذکر ہے، پھر اسکی آئینی مساعی کے اسباب و مصالح بیان کیے ہیں، اسکے بعد بہار کی امارت
شرعیہ کی سرگذشت اور اسکے نظام اور کامون کی تفصیل ہے، کتاب مسئلہ امارت سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے، (م)